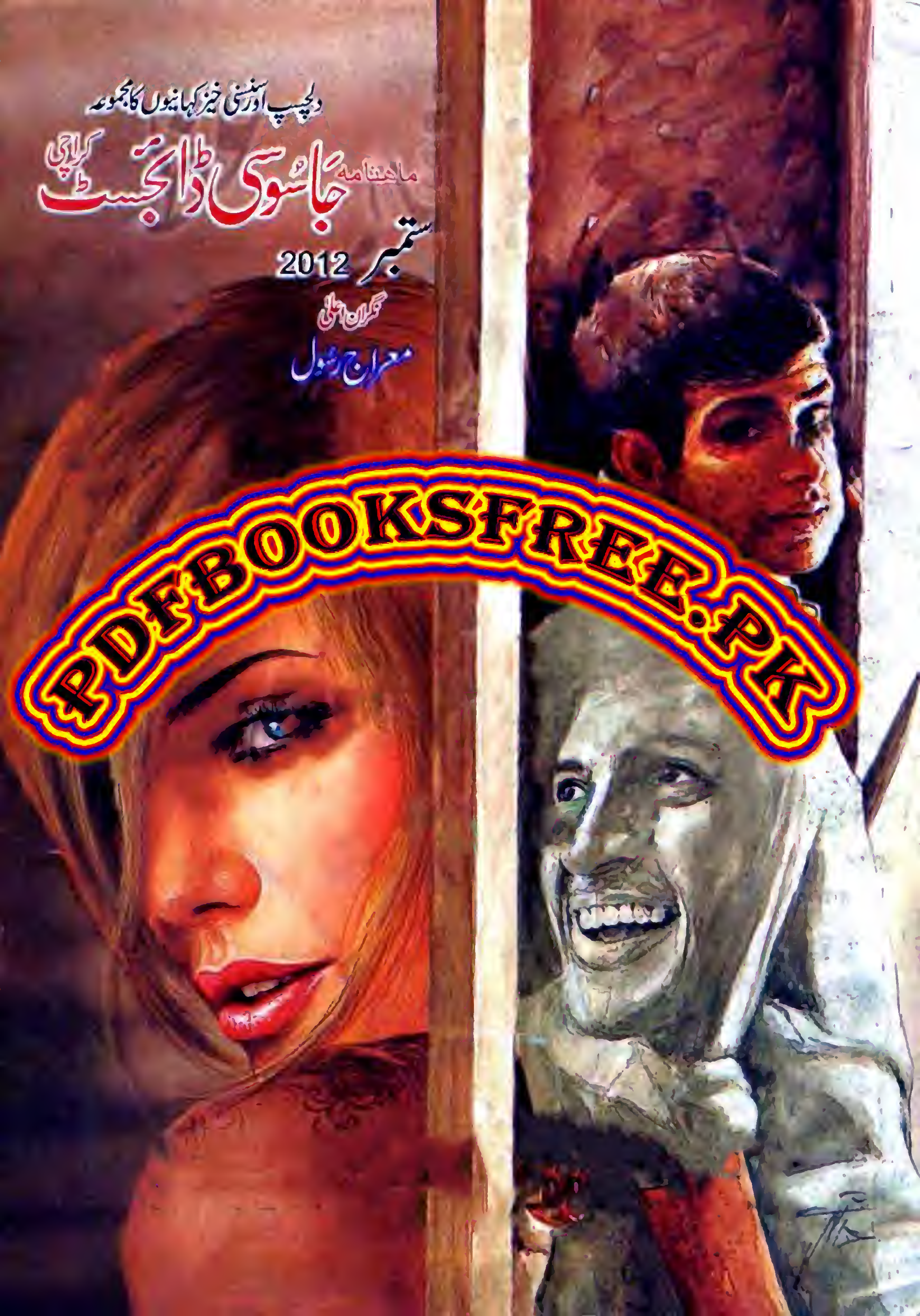
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
ستمبر 2012
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول
PDFBOOKSFREE.PK

جاسوسی ڈائجسٹ

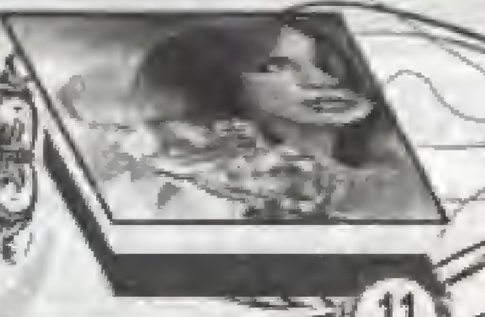

چٹنی نکتہ چینی — مدیر اعلیٰ — 11

قارئین کی کرم فرمائیاں ہیچ اور اپنائیت نامہ و پیام، تجلیات، عنایتیں اور شکایتیں

مکر جال — کاشف زبیر — 18

ہر سیر کو سوا سیر ضرور ملتا ہے وہ سیر تھے یا سوا سیر یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے

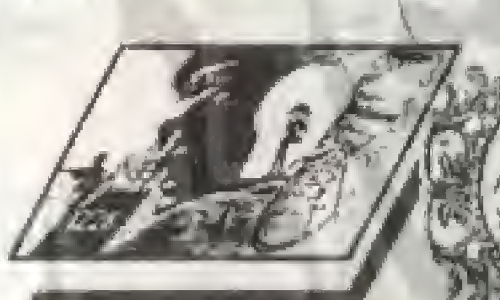

کھوج — تنویر ریاض — 65

ایک سراغ رساں کا امتحان جس نے پس نقاب ایک جرم کا کھوج لگالیا تھا

قیمتِ خواہش — سیرینا راض — 75

انمول سے بے مول ٹھیکروں میں بدل جانے والے خواہشوں کے سوداگر

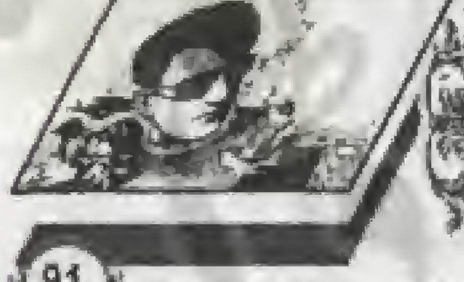

آخری تصویر — سلیم انور — 91

اس فوٹو گرافر کی کارگزاری جو ہر جگہ پہنچنا اپنا اولین فرض سمجھتا تھا

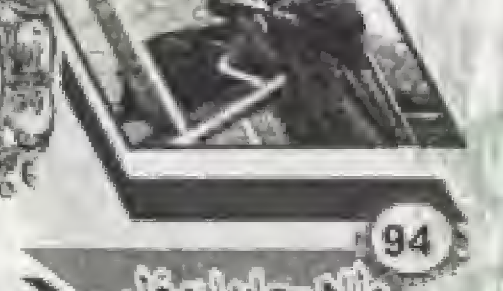

للکار — طاہر جاوید مغل — 94

ان عاشق پروانوں کا ماجرا خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

بچاؤ — اقبال کاظمی — 137

زندگی کی بساط پر ایک بازی کا خوفناک کھیل۔ تمام مہرے اس کی جنبش نگاہ کے منتظر تھے

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

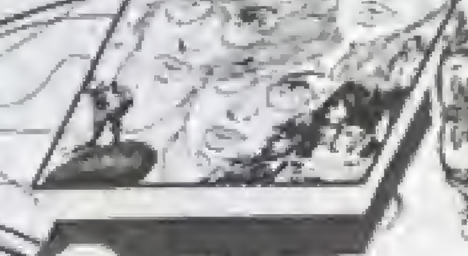

انڈے کی چوری — نجمہ مودی — 149

عالمی شہرت یافتہ چور نک ویلوٹ کا ایک اور یادگار کارنامہ

گرداب — اسما قادری — 160

تقدیر کی فسوں گری قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

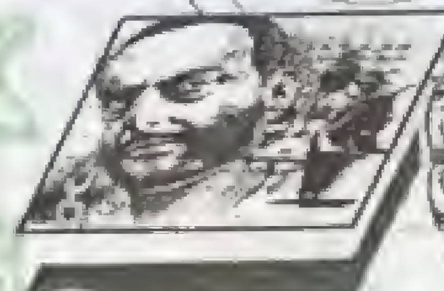

رہائی — مختار آزاد — 195

مغرب کی چمکتی دمکتی روشن خیال دنیا سے الگ دل گداز جذبوں کی ترجمان پر اثر کتھا...

بوجھ — بابر نعیم — 215

ازدواجی زندگی کی چاہتوں میں حائل ہونے والی رنجش کا فسانہ

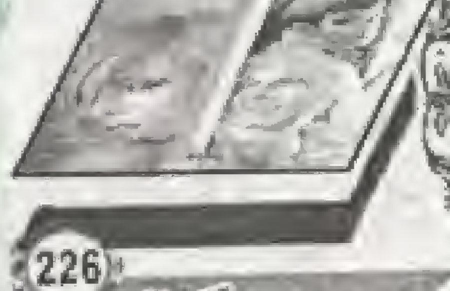

منزل — سرور اکرام — 226

پست اور گمراہ ذہنیت کے مالک افراد کا شاخسانہ جو علم و عرفان کی آگہی سے نابلد تھے...

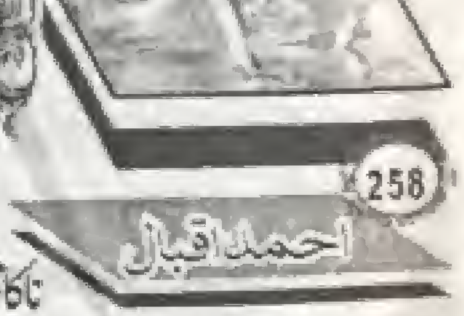

ٹشو پیپر — احمد اقبال — 258

ناکامی اور کامیابی کے سمندر میں ڈوبتی ابھرتی بے پتوار ناؤ کا سفر رائگاں

تراش خراش — ادارہ و قارئین — 000

اقتباسات، گدگدیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کی تفریح طبع اور تواضع کے لیے

جلد 42 • شمارہ 09 • ستمبر 2012 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

www.paksociety.com

عزیزانِ من... السلام علیکم!

ستمبر کا تازہ شمارہ آپ کی نذر ہے۔ وطنِ عزیز میں ہر سو انسانی لہو کی ارزانی عروج پر ہے جس پر ہر حساس پاکستانی کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ سرحدی پٹیوں میں پرائے ڈرون جہازوں سے موت برسا رہے ہیں اور کہیں اپنے ہی اپنوں کا خون بہا رہے ہیں۔ راہ چلتے لوگوں کو... تھڑوں پر بیٹھے نوجوانوں کو... بسوں میں طویل سفر کرنے والوں کو شناخت کر کے موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ چیونٹی بھی کسی کے پیر کے نیچے آ جائے تو اسے ملال ہوتا ہے کہ اس نے بلا سبب ایک جان دار کو مار دیا... مگر یہ کون لوگ ہیں جو شقاوت اور سفاکی سے درجنوں انسانوں کو ان کے خون میں نہلا دیتے ہیں اور آسانی سے غائب ہو جاتے ہیں۔ قانون کہاں ہے؟ رکھوالے کیا کر رہے ہیں... اور بے چارے نچلے درجے کے رکھوالے تو خود اس بربریت کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ ان کے بڑوں کے کاشانوں کے در و دیوار شاید ایسے سنگین ہیں کہ باہر کی آوازیں ان تک نہیں پہنچتیں۔ وہ اپنی دنیا میں مست رہتے ہیں۔ نہ جانے وہ دن کب آئے گا جب ہم سب بھی ان کج کلاہوں اور نام نہاد بڑوں کی طرح مست ہو سکیں گے!

اور اب ایک اہم بات... مہنگائی، ہوش ربا ہو چلی ہے۔ مویشیوں کے چارے سے امراء کے سامانِ تعیش تک، ہر شے اس کی زد میں ہے۔ ہمارے پرچوں کی اشاعت میں نیوز پرنٹ، آرٹ پیپرز، طباعت کی سیاہیاں، کمپیوٹر کے لوازم، ٹونر، ٹریسنگ پیپرز اور فلموں تک، تقریباً نوے فیصد اشیا درآمدی ہوتی ہیں۔ ایک طرف عالمی منڈی میں ان کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں، دوسری طرف روپے کی قدر روز بروز گر رہی ہے۔ اس دہرے مالی دباؤ سے نکلنے کے دو ہی راستے ہیں۔ پرچوں کے صفحات دوسرے پرچوں کی طرح کم کیے جائیں یا قیمت بڑھائی جائے۔ ہمارے قارئین کی تشنگی موجودہ مواد سے بھی پوری نہیں ہوتی۔ ہم نے انتہائی مجبور ہو کر فیصلہ کیا ہے کہ اکتوبر 2012ء کے شماروں سے قیمت 60 روپے فی پرچہ ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے معزز قارئین ہماری مالی مجبوریوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے بحران کے حل میں تعاون فرمائیں گے۔

کوٹلی آزاد کشمیر سے سرمد مشتاق کی شکایت و گزارش "بہت عرصے بعد محفل میں داخل ہو رہے ہیں، گستاخی معاف فرمائی جائے۔ اصل میں لکھنے کی ہزار ہا مرتبہ کوشش کی لیکن آپ کی نظر اندازی ہماری حوصلہ شکنی کی وجہ بنی۔ بہرحال دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ (ہم جان بوجھ کر کسی کی دل آزاری کا سبب نہیں بنتے) جاسوسی ہر دفعہ کے برعکس تھوڑا جلد یعنی 2 اگست کو ہی موصول ہو گیا جو ہماری پیدائش کا یوم بھی ہے۔ یوں جاسوسی ہمارے لیے سال کے خاص دن کا تحفۂ خاص ثابت ہوا۔ (ہماری طرف سے تھوڑی دیر سے سالگرہ مبارک)۔ ٹائٹل کچھ خاص نہ لگا سوائے ایک بالوں سے خالی سر والے آدمی کے جو غالباً لوڈشیڈنگ سے پریشان ہے اور بدست رائفل اس کے ذمے داران کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ ٹائٹل کے بعد تذکرۂ محفلِ یاران کا۔ کرسیِ خاص پر کرن خان براجمان تھیں۔ ان کے خط کا پچاسی فیصد حصہ بے سروپا باتوں پر مشتمل تھا۔ ہاں اگر رسالے پر بات کرتیں تو نامہ قابلِ ستائش کہلاتا۔ کراچی سے احمد توحید کا کہنا کہ سلسلے وار تصانیف کی اقساط کی تعداد بیس سے چوبیس ہونی چاہیے تو عرض ہے کہ اس صورت میں قاری کہانی کے پس منظر و جزئیات سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ اچھا ناول لکھنے کے لیے مصنف کہانی کی باریکیوں کو اجاگر کرتا ہے جو اقساط کی طوالت کا باعث بنتا ہے لیکن اس سب کے بغیر بھی تو کہانی میں چاشنی پیدا نہیں کی جا سکتی نا۔ ہاں جو وجہ جناب نے بیان کی وہ غور طلب ہے۔ ہمایوں سعید کا تبصرہ عمدہ تھا جنھوں نے تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے مخالفین کی باتوں کا مناسب الفاظ میں جامع جواب دیا۔ باقی محفل میں نو وارد زیادہ تھے جو اپنے پہلے یا دوسرے خط کی اشاعت پر پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اس کے بعد ذکر ہو جائے اس ماہ کے شہ پاروں کا۔ للکار سے آغاز کیا۔ طاہر جاوید مغل کا وہی سنسنی خیز دلفل ایکشن انداز۔ صفحہ صفحہ، سطر سطر دلچسپی لیے ہوئے۔ بے شک طاہر صاحب ساحر ہیں جو پڑھنے والوں پر اپنی تحاریر سے سحر طاری کر دیتے ہیں۔ راجا کی انٹری سے ثابت ہے کہ عمو کا قصہ بھی چلے گا ساتھ ساتھ۔ گرداب میں اب کہانی کو مجسم شکل دی گئی ہے۔ اسما قادری بخوبی پاکستان کے خلاف اغیار کی سازشوں کو احاطۂ تحریر میں لا رہی ہیں۔ سلیم فاروقی کی چال در چال کا پہلا حصہ پڑھ کر دوسرے حصے کا کافی بلکہ کافی سے بھی زیادہ انتظار تھا لیکن دو صفحات کا مطالعہ کرتے ہی یہ انتظار لاحاصل محسوس ہوا۔ سلیم فاروقی نے 9/11 کے موضوع کو چنا تھا اور اسے احسن انداز میں ختم کر سکتے تھے لیکن جو سحر انھوں نے پہلی قسط میں طاری کیا تھا، دوسرے حصے میں اسے برقرار نہ رکھ سکے۔ بہرحال، سب قارئین کا میری رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ اب کچھ بات ہو جائے مختصر تحریروں کی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی ہندی ادب کے ساتھ حاضر ہوئے، واہ مزہ آ گیا۔ ڈاکٹر عبدالرب صاحب اس طرح ہندو معاشرے کی باریکیوں کو تحریر میں لاتے ہیں کہ لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ بابر نعیم کی خریدار اپنا اثر چھوڑنے میں ناکام رہی کیونکہ اس طرح کے موضوعات پر بے شمار دفعہ لکھا اور پڑھا گیا ہے بلکہ ہر شمارے میں اس طرز کی ایک آدھ تحریر موجود ہوتی ہے۔ کاشف زبیر جانے پہچانے کرداروں کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے اور ہر دفعہ کی طرح اس مرتبہ پھر بازی لے گئے۔ مذاق لکھنے میں جناب مہارت رکھتے ہیں۔ یہ دروغ گوئی نہیں بلکہ حقیقت ہے اور آپ کی تحریریں اس بات کی گواہ ہیں۔ ہمسفر ایک زیرک سراغ رساں کا قصہ تھا۔ یوسن نے مشاہدے اور معاملہ فہمی سے ناممکن کو ممکن بنایا اور دو ہوشیار ٹھگوں کو حوالۂ پولیس کیا۔ عرصہ حصولِ تعلیم میں اکنامکس سے ہمارا خدا واسطے کا بیر تھا۔ ریٹائرمنٹ کی سودا پڑھتے وقت لگا کہ اکنامکس ہی کا کوئی سبق کھول لیا ہے۔ بہت خشک تحریر ثابت ہوئی۔ تیزی، مندی، خریدار... اُف توبہ۔ کار فرا ڈ ایف بی آئی ایجنٹ کی تفتیش کے گرد گھومتی کہانی تھی جس کے تانے بانے کافی عمدگی سے بُنے گئے تھے۔ شبہ اجر پر کیا جا رہا تھا جو بے گناہ تھا اور مجرم تھا ملٹن جس پر کسی کی نظر بھی نہ تھی لیکن آخرکار مجرم اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ سرور اکرام کے قلم سے لکھا گیا تھا جو اپنے سادہ پیرائن اور مزاح کے عنصر کے ساتھ نمبر لے گیا۔ لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورتِ حال نے شروع سے آخر تک جکڑے رکھا جو کہانی کی کامیابی کا ضامن ہے لیکن اختتام حسبِ توقع تھا۔ دوسرا رنگ وطن فروش ایک پھیکا سا تحریر ثابت ہوئی۔ اچھی بھلی کہانی چل رہی تھی کہ درمیان میں وطن پرستی کو زبردستی شامل کیا گیا۔ یعنی دو کہانیوں کو ایک کہانی میں سمونے کی ناکام کوشش کی گئی۔ یعنی

کھیر کس اور چلی ساس کو مکس کر دیا جائے اور کھانے کو کہا جائے۔ انکل! آپ خود ہی بتائیں کیا خاک مزہ آئے گا۔“

ناظم آباد کراچی سے ادریس احمد خان کی آمد بہار ”سب سے پہلے تو عید الفطر کی پیشگی مبارک باد۔ (ہماری طرف سے بعد از عید مبارک) سب سے پہلے ٹائٹل سے شروع کیا جہاں حسن معصوم کے پاسبان کے سنگین بردار بندوق کے ساتھ نظارہ کیا۔ اس کے بعد اداریہ جس میں ایک ہی رویتِ ہلال کی خوش آئند خبر۔ یہ بہت اچھی روایت ہے مگر اتفاق شاید بہت مشکل ہے۔ اس بحث کو ادھورا چھوڑ کر آگے بڑھتے ہیں اور چینی کم نکتہ چینیوں میں داخل ہوئے جہاں سب سے پہلے نمبر پر کرن خان کو سرِفہرست آنے پر مبارک باد اور موسموں کا اتنا اچھا موازنہ اچھا لگا۔ جو ایک حساس دل ہی محسوس کر سکتا ہے۔ سب ہی شکوے شکایت ایک دوسرے سے کر رہے تھے۔ سب کو مشغولِ گفتار میں باہم چھوڑ آگے بڑھے اور سب سے پہلے خلافِ معمول جال در جال کی دوسری اور آخری قسط سے ابتدا کی۔ سلیم فاروقی کو بہت بہت مبارک باد، خوب صورت اور پُراثر کہانی تھی۔ کہانی کیا حقیقت تھی کہ ایسی حقیقتیں آج دنیا کے کونے کونے میں بکھری پڑی ہیں۔ اس کے بعد للکار کی طرف بڑھے۔ للکار کی دلچسپی حسبِ دستور قائم ہے اور تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ دوسری گرداب تھی۔ یہ بھی کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کے بعد دستِ قاتل پڑھی۔ رمیش نے عزت اور شہرت کے لیے ایسا پروپیگنڈا کیا مگر جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے کے مصداق پکڑا گیا۔ خریدار بھی ٹھیک تھی۔ مکین و مکان اور ہمسفر بھی اچھی تھی۔ سرورق کی دونوں کہانیوں میں وطن فروش زیادہ اچھی تھی۔“

ضلع اٹک سے محمد اسماعیل اجاگر کی واپسی ”اگست 2012ء کے سرورق پر موجود دعانسو قسم کے صاحب بڑے جارحانہ انداز میں کھڑے دکھائی دیے۔ شاید گرمی زیادہ لگ رہی ہے ان کو۔ ویسے اک بات ہے، ذاکر صاحب کے ہاتھ میں وہ نفاست نہیں رہی جو کبھی ان کے ہاتھ میں تھی۔ جاسوسی کا سرورق اپنی پہچان کھو رہا ہے۔ کچھ نیاپن، انفرادیت کچھ منفرد سا ہونا چاہیے۔ (آپ کی بات نوٹ کرلی گئی ہے۔ دیکھتے ہیں اس سلسلے میں کیا کچھ ہوسکتا ہے) اس کے بعد سرورق کے پہلے رنگ پر پہنچے۔ ہمیں تو امید تھی کہ اس دفعہ منظر امام صاحب کا رنگ ہوگا مگر ندارد۔ ویسے منظر امام صاحب کو ضرور شامل کریں کیونکہ کافی ٹائم ہوگیا ہے ان کو شامل کیے ہوئے اور جاسوسی کے رنگ لکھنے میں تو منظر صاحب ماسٹر ہیں۔ ہمزاد بھی ایک اچھی کوشش تھی۔ لوگ غلطیاں خود کرتے ہیں اور جب ان پر ان غلطیوں کی پکڑ آتی ہے تو وہ شریف آدمیوں کو پھنسوا دیتے ہیں لیکن قدرت کی لاٹھی بے آواز ہے۔ وہ ظلم و زیادتی کرنے والے پر ضرور برستی ہے۔ دوسرے رنگ کے حوالے سے اک نیا نام سامنے آیا۔ امیمہ سلیم وطن فروش میں تھوڑی ہلچل نظر آئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج ہمارے وطنِ عزیز میں مسائل کی اکثریت کی وجہ شہاب اور شہزاد جیسے غدار ہیں۔ جاسوسی ڈائجسٹ کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ اس نے جاسوسی کے رنگوں میں بھارتی جاسوسوں، امریکی ایجنٹوں اور غدارانِ وطن کو بڑی ہمت سے بے نقاب کیا ہے اور وطن فروش اسی سلسلے کی اک عمدہ کاوش تھی۔“

کبیر والا سے اختر عباس تھراج، ظفر اقبال ظفری کی مشترکہ باتیں ”اس بار جاسوسی ڈائجسٹ جو کہ ہماری جان، ہماری آن ہے، 2 تاریخ کو ہی کبیر والا سے مل گیا۔ جاسوسی کو گھر میں لانے کے بعد سب سے پہلے اس کی محفل میں پہنچے جہاں ماہا ایمان بالکل نظر نہیں آئیں۔ جب ان کو تفسیر عباس بابر کی طرف سے کرنٹ لگتا ہے تو پھر ظاہری بات ہے وہ کہاں نظر آئیں گی۔ ویسے ماہا جی! آپ نے مجھے چمچہ گیر کہا بالکل درست کہا۔ اگر آپ کے ہاں یا آپ نے دیگ پکوانی ہو تو ضرور بتانا، میں چمچہ لے کر حاضر ہو جاؤں گا کیونکہ دیگ میں چمچہ چلانا بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ بالکل حقیقت ہے۔ اس دفعہ تفسیر عباس کے بغیر محفل پھیکی پھیکی سی لگی۔ صدارت کی کرسی لاہور سے کرن خان لے اڑیں۔ کرن جی مبارکاں۔ کرن آپ کی اسٹوری پڑھی۔ کس مشکل سے آپ کو جاسوسی پڑھنے کی اجازت ملی ہے مگر ایسا بھی تو ہوسکتا ہے آپ اپنی فیملی کو بتائے بنا ہی جاسوسی کو چھپ چھپا کر پڑھ لیا کریں۔ خیر، اب تو آپ کو اجازت مل گئی ہے نا...؟ احمد خان توحیدی صاحب خوش آمدید۔ صابر علی آپ پولیس میں ہو کیا تفسیر کے معاملے میں پوچھ گچھ کا کوئی ارادہ تو نہیں ہے۔ یہ محفل نئے اور پرانے سب کی ہے اور وہ بھی مشترکہ۔ (بجا فرمایا) ساہیوال سے اعجاز راحیل، ماہتاب گل واقعی کنجوس نمبر 1 ہیں کیونکہ ایف ایم میں سائن ہوگئیں یہ گلاب جامن اکیلے اکیلے ہضم کر گئیں۔ کاش اسی وقت بدہضمی ہو جاتی۔ (کچھ تو خوفِ خدا کریں... بددعاؤں پر اتر آئے...) ہمایوں سعید کا تفسیر بابر کو منافق کہنا بالکل اچھا نہیں لگا۔ ویسے ہمایوں بھائی! چلو کوئی تو لڑکی آپ سے متاثر ہوگئی نا۔ عدنان یوسف! اچھا آپ بچ تو گئے ہیں نا؟ محفلِ یاراں میں آہستہ آہستہ چلنا چاہیے آپ نے تو چھلانگیں لگانا شروع کر دیں۔ آئندہ احتیاط کرنا جگر۔ جاوید شبیر اتنا مختصر تبصرہ...؟ ایم عزیر اسد تو آپ خالی کیوں آئے، برفی وغیرہ تو لیتے آتے۔ ہمایوں سعید اور ماہا ایمان غصہ وغیرہ کرتے ہیں ان کو کھلانی تھی۔ سید بادشاہ یعنی سید عبادت علی کاظمی صاحب، آپ کو اس طرح نہیں کرنا چاہیے، آپ کو جاسوسی میں آتے رہنے چاہیے۔ انفال مرزا اینڈ صبا مرزا، کہیں آپ کے داود کو تو فنگل گرل پسند تو نہیں آ گئی...؟ ڈاکٹر مرزا صاحب! تفسیر بابر کا ماہا ایمان سے فساد پلس کا تعلق نہ جوڑنا ورنہ ماہا کو تو تم جانتے ہو نا...؟ بابر عباس! کیسے مزاج ہیں؟ آپ تو آ گئے مگر اپنی پرانی ساتھی وکیل بخاری کو کہاں چھوڑ آئے؟ امید ہے کہ سب دوستوں کا ذکر کیا ہے مگر جن کا نہیں کیا ہو تو ان کے تبصرے بھی جاندار تھے۔ آمنہ پٹھانی! آپ کدھر غائب ہیں؟ جلدی آجائیں۔ دیکھو ہم آپ کو کس قدر مس کر رہے ہیں۔ ہمارے عزیز اور محترم دوست مہر اللہ دتہ سیال! یار آپ تو بس ہمیں بالکل ہی بھول گئے۔ پلیز جلدی جلدی محفل میں آؤ۔ میرے پیارے رائٹر محی الدین نواب نظر نہیں آرہے... وہ مجھے اتنے زیادہ پسند ہیں کہ... جاسوسی میں ان کی کہانی آجائے اس دن میں روٹی کھانا بھول جاتا ہوں۔ (چلیں گھر والوں کی بچت ہو جاتی ہوگی) سب سے پہلے مغل صاحب کی للکار پڑھی۔ ہیرو بہت سے ظلمات کا شکار ہوا۔ اس پر تو ظلم کی انتہا کر دی گئی اگر عمران ساتھ ہوتا تو اس کے ساتھ اس طرح نہ ہوتا۔ بہرحال کہانی کا اینڈ بڑا سنسنی خیز ہے۔ اس کے بعد گرداب شروع کی۔ اسامی اور ایل ذن۔ چلو کچھ تو شہریار اور ماہ بانو، ماسٹر آفتاب اور کشور کے بعد لو اسٹوری شاز مین اور جاوید علی کے درمیان پڑھنے کو ملی۔ مگر پلیز جن کرداروں سے کہانی شروع ہوئی تھی وہ کردار بالکل نظر نہیں آرہے، ان کو واپس لائیں۔“

گوجرہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے رانا حبیب الرحمٰن کا تبصرہ ”جاسوسی کا شمارہ اگست 4 تاریخ کو جلوہ گر ہوا۔ ٹائٹل کچھ بور سا لگا جیسے یہ بھی ایک طرح سے ملک پاکستان کے حالات کا عکس بند لگا ہو۔ اشتہاروں کو پھلانگتے ہوئے ہم جیسے ہی دوستوں کے خطوط میں آن وارد ہوئے اور پہلی ہی گھنٹی پر دروازہ کھلا تو سامنے سے یک دم ہی ایک پری چہرہ لاہور سے کرن خان جلوہ گر ہوئیں جیسے خطوط کی محفل میں گیٹ پر چوکیدار کے فرائض انجام دے رہی تھیں، ویسے ہمیں

کوئی پریشانی نہیں ہوئی کیونکہ آج کل ہر ادارے میں خوب صورت لڑکیاں ضرور ہوتی ہیں۔ احمد خان توحیدی صاحب، اب سرگزشت اور سسپنس کے بعد جاسوسی میں قسمت آزمائی کر رہے تھے توحیدی صاحب، آپ کی قسمت لگتا ہے کس قسم کی ہے۔ اس کے بعد اعجاز صاحب، اللہ آپ کو صحت عطا کرے۔ عدنان یوسف صاحب ذرا دھیان سے ماہا ایمان کے بارے میں کوئی بات کی تو... خبردار، ورنہ آپ کے لیے بچ بچا نا ہوگا۔ ہمایوں سعید صاحب! آپ کے جذبات کا تو آپ کو جواب مل ہی گیا ہے مردِ سیاسی کا، ویسے بھی آپ کے تبصروں نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کچھ فلرٹ قسم کے ہوتے ہیں لیکن لگتے نہیں کیونکہ میں نے آپ سے فون پر بات کی تھی تو آپ کسی اور ہی لائن کے آدمی لگے۔ آپ ایسے تبصرے لکھ کر دوستوں کو مزید دھوکا نہ دو۔ راجن پور سے ماہ تاب گل کی باتیں پسند آئیں۔ احتشام قریشی صاحب! دیکھنا کہیں مٹھائی کے چکر میں کہیں ماہ تاب گل بلکہ ثنا خان رضوی سے سینڈل نہ کھا بیٹھنا۔ راجن پور میں بے وفا چیزیں بھی ہوتی ہیں جو کسی سے بہت دیر بعد ملتی ہیں۔ اقرا بانو، بابر عباس، احسان سحر کے تبصرے پسند آئے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ جال در جال کی دوسری قسط اور للکار کے بعد گرداب بہت ہی پسند آئی بلکہ ہم آہیں بھرنے لگے تھے کیونکہ آنکھوں میں پانی آگیا تھا۔ اس میں تنگ بھی تھا اور تنگ بلڈ پریشر کو تیز کرتا ہے۔ اس کے بعد دستِ قاتل، مکین و مکان، ہمسفر، خاندانی مجرم، ہزاد ہمزاد، وطن فروش جاسوسی کی اعلیٰ تھیں۔“

اوکاڑہ سے تفسیر عباس بابر کی محبتیں ”زندگی کے تلخ، مایوس اور افسردہ لمحوں کا بہترین دوست سالِ رواں کا آٹھواں عجوبہ 14 اگست کو دریافت ہوا... ایکشن سے بھرپور سرورق، مار دھاڑ اور خون خرابے کا پیش خیمہ ہے۔ انڈین اداکارہ دیپکا پڈوکون سے مشابہ دوشیزہ سرورق کافی سے زیادہ اور... خطرناک حد تک خوبرو پُرکشش اور دل آویز ہے۔ ساتھ ہی براجمان پُرخوف و خطرناک شخصیت... کسی ایسے منظر کی بھول بھلیوں میں غرقاب ہے۔ چینی، نکتہ چینی ہماری جان ہے اور جان ہے تو جہان ہے... اداریے میں ادارے کی پراثر و فکر انگیز... گفت و شنید... ہمیشہ خاصے کی چیز ہوتی ہے اسے ٹیپ کا بند بھی کہا جاسکتا ہے ایک ساتھ... تین تین خوشیوں کی مبارک باد... اور ملکی حالات جوں کے توں... کمزور اور نحیف معیشت میں... ملکی سالمیت کا مضبوط ہونا کیسے ممکن ہے؟ لاہور سے کرن خان کا پہلا تبصرہ... تبصرہ تو خیر نہیں داستان الف لیلیٰ... الف سے... ی... تک سنائی گئی جس کا کوئی سرپیر دستیاب نہ ہوسکا۔ آخری چند سطور میں چند کہانیوں پر تبصرہ برائے نام یعنی ضابطے کی کارروائی... بہرحال مبارک دینا فرض ہے لہٰذا مبارک باد... کراچی سے صابر علی! اگر ملنا ہی مقصود ہے تو کیا ساہیوال اور کیا اوکاڑہ... 45 منٹ کا فاصلہ ہے آپ جب حکم کریں گے، ہم اپنے خلوص کی اڑن طشتری پر بیٹھ کر آپ کے شہرِ محبت میں بہ نفسِ نفیس حاضر ہو جائیں گے۔ ساہیوال سے ہمارے بہت پیارے دوست اعجاز احمد راحیل کی خود کلامی نے محظوظ کیا اور اعجاز بھائی... ان بونگیوں کی باتیں دل پر مت لیا کریں یہ کل کی لڑکی بالکل... عقل سے پیدل ہیں اور مہتاب گل کو مت چھیڑیے۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ انتھک محنت اور تگ و دو کے بعد پہاڑ کھودنے کے نتیجے میں... بنوں سے عدنان یوسف... بے چاری ماہا کی چونچ کی نوک ہی نہیں رہی تو وہ کیا نوک جھوک کریں گی... پردھان منتری کو سنتری بننے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے؟ (یہ زیادتی ہے) بنوں ہی سے ہمایوں سعید کی خوش فہمی و غلط فہمی... اسے کہتے ہیں اپنے منہ میاں مٹھو... چکوال سے ایم عزیر اسد... وہ یقیناً آپ ہی ہوں گے جو اپنا نام گول کر گئے لیکن... محنت میں عظمت ہے۔ آپ گرم انڈے فروخت کریں ٹھنڈے یا رس لگے مقصد تو... حصولِ رزقِ حلال ہے جو کہ... عین عبادت ہے۔ ڈی آئی خان سے سید عبادت علی کاظمی... ناممکن ہے کہ یہ آپ کی آخری تحریر ہو کیونکہ محبتوں کا کوئی انت اور... خلوص کی کوئی حد نہیں ہوتی... چکوال سے انفال اینڈ صبا مرزا کی اوٹ پٹانگ حرکتیں... ساحلوں میں سٹھیا گئی ہیں بے چاری بوڑھیاں... راجن پور سے مہتاب گل... بچپن میں... بچپن کی حرکتیں مناسب نہیں ہوتیں۔ کوئی بوڑھی بڑی متاثر ہو گئی تو...؟ مغل خاندان کے ہونہار چشم و چراغ ڈاکٹر انتظار نذیر مغل... آپ نے ہمارے اور ماہا کے ناموں کا فروٹ چاٹ بنا دیا... نظریہ کیا ہے؟ کراچی سے امن کی فاختہ... اقرا بانو ناگوری کا استقبال ان کے مزاج کے خلاف ہوا... بھئی کس نے ٹھہرے ہوئے پُرسکون پانی میں پتھر پھینکا ہے؟ جس نے بھی ہماری اس پیاری سی بہن کی دل آزاری کی ہے... اپنے الفاظ واپس لے کر پہلی فرصت میں... معذرت کریں اور اقرا بانو... سدرہ بانو ناگوری غالباً آپ کی بہن ہیں؟ کھاریاں سے بابر عباس کی غیر متوقع آمد خوشی کا باعث بنی۔ کہانیوں کے مغلِ اعظم طاہر جاوید مغل کی سنسنی خیز اور ہیجان انگیز للکار... اس ماہ بھی باکس آفس پر سپر ہٹ رہی۔ اسما قادری کی گرداب بہتر سے بہترین کی جانب گامزن ہے۔ جذبۂ حب الوطنی... ہر اہلِ ایمان و مسلمان کا اولین فرض ہے اور فرض وہ قرض ہے جس کو چکانے میں جان بھی چلی جائے تو... رائیگاں نہیں جاتی۔ ابتدائی صفحات کا توشۂ خاص جال در جال نے دو ماہ اپنے جال میں الجھائے رکھا۔ کہانی ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ محبت کے دشمنوں نے ہزار کوششیں اور سازشیں کیں لیکن وہ کیا ہے کہ محبت مر نہیں سکتی... اور محبت کرنے والے مر جائیں تو امر ہو جاتے ہیں۔ کانتا کے بھرپور کردار نے بے حد متاثر کیا۔ بابر کی کارکردگی شاندار رہی۔ اختتامی سطور میں مریم کے آخری الفاظ حاصلِ تحریر و مطالعہ ثابت ہوئے۔ پہلا رنگ زادہ ہمزاد سرور اکرام کے نام اور معیار پر پورا نہ اتر سکا۔ بالکل فلمی اور غیر حقیقی... رئیس بے وقوف تھا یا تاج یا پھر سارے ہی بے وقوف تھے... امیمہ سلیم کا دوسرا رنگ وطن فروش، کچھ سرفروشوں اور وطن فروشوں کی جنگ... اصولوں کی جنگ... کہانی دلچسپ مگر کچھ کمزور سی محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر عبد الرب بھٹی کی اثر انگیز روداد... وہی وجودِ زن کی تباہ کاریاں... راجو یوری کو سستی شہرت بہت مہنگی پڑ سکتی تھی مگر... بال بال بچا... یہی غنیمت ہے۔ کاشف زبیر کی شوخ و چنچل اور چلبلی سی تحریر مکین و مکان بوجھل لمحوں کے لیے... اکسیرِ قلب ثابت ہوئی۔ مختار آزاد کی کارفرائڈ بھی زبردست رہی۔ ڈونا شیفرڈ کے پُراثر کردار نے کافی متاثر کیا۔ کلنٹن کوپر بھی دلچسپ کردار تھا۔“

گاؤں بلی، مالاکنڈ ایجنسی سے بلال خان لودھی کا معرکہ ”6 تاریخ کو تپتی دوپہر اور کڑی دھوپ میں بک اسٹال والے بابا نے اطلاع دی کہ جاسوسی آگیا ہے۔ بک اسٹال والے بابا ہمارے قریبی قصبے کا ہے۔ ہمارا گاؤں ہم سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ جاسوسی سے محبت کا اندازہ آپ اس سے لگائیے کہ روزے اور سخت گرمی میں پیدل چل کر رسالہ گھر لے آئے۔ چونکہ راستے سنسان تھے اور کوئی آدم زاد نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے راستے میں ہی ٹائٹل اور چینی، نکتہ چینی کا پوسٹ مارٹم کر ڈالا۔ ذاکر انکل بہت شاندار اور اچھا ٹائٹل بناتے ہیں لیکن اس دفعہ ہمیں ذرا بھی متاثر نہ کرسکے۔ کرن خان، لاہور سے جاسوسی اسمبلی کی اسپیکر کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ تحریر پڑھ کر ایسا لگا کہ پردۂ اسکرین پر آنے کی جستجو میں ہم اکیلے دیوانے نہیں بلکہ سب کی کوشش ہے کہ خط شائع ہو جائے۔ بہرحال تحریر اچھی تھی اور خط کے اول آنے پر مبارک باد قبول کیجیے۔ کراچی سے احمد خان توحیدی نے بالکل بجا فرمایا کہ قسط وار کہانیاں اتنی طویل بھی نہیں ہونی چاہئیں۔ بنوں سے ہمایوں سعید راج میرا بیسٹ تبصرہ نگار ہے اور چینی، نکتہ چینی میں آپ کا تبصرہ شامل دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کچھ نئے دوست بھی نظر آئے۔

www.paksociety.com

بہرحال، تمام دوستوں کے تبصرے اچھے تھے۔ اس کے بعد خلافِ معمول للکار کے بجائے سلیم فاروقی صاحب کی جال در جال کا آغاز کیا۔ کہانی گزشتہ قسط کے بالکل برعکس تھی۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ کہانی گوانتاناموبے کے تحت حالات پر مشتمل ہوگی لیکن وہ عام کہانی ثابت ہوئی۔ بابر خان کے لیے ساری محبت اور بھاگ دوڑ، جی ایس خان کے گروپ اور کاشانے کی۔ دستِ قاتل، عبدالرب بھٹی کی بہترین تحریر تھی۔ ہر انسان شہرت و ناموری کے خواب دیکھتا ہے اور غریب ریشم بھوجوانی نے بھی دیکھا لیکن اس کے لیے وہ بہت مشکل میں پھنسا اور بالآخر اس بھنور سے نکلا۔ للکار پر پہنچے۔ تابش کے بچنے کا تو فیصد یقین تھا لیکن سسپنس میں تھے کہ قید سے کیسے نکلے گا۔ عمران کے ایک دوست راجا کا اضافہ ہوا لیکن اس شخص کا کردار اچھا نہیں ہے اور عمران کو اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر مہناز نے حیران کر دیا۔ گرداب میں شازمین اور جاوید علی کے درمیان دل کے رشتے کا بیج اگا اور تشنہ محبت میں پھنسے نظر آئے۔ اس دفعہ شہریار کا ذکر نہ تھا۔ چونکہ کہانی کے سارے کردار امریکا منتقل ہو چکے ہیں تو لگتا ہے معنفہ صاحبہ شہریار کو بھی امریکا کسی مشن پر بھیج کر کہانی کا اختتام کرنا چاہتی ہیں۔ شالنی جہنم واصل ہوئی اور دل ٹھنڈا ہوا۔ کاشف زبیر صاحب دس بارہ سال پرانے واقعات پر مشتمل جلیل میاں کی کہانی مکین و مکان کے ساتھ موجود تھے جو کہ اچھی لگی۔ امیمہ سلیم کی کہانی وطن فروش بہت زبردست تھی۔ یہ کہانی جشنِ آزادی کے حوالے سے تحفہ ثابت ہوئی۔ باقی کہانیاں خاص طور پر ہمسفر زبردست تھی۔ کچھ کہانیاں ابھی پڑھنا باقی ہیں۔‘‘

انجینئر عمیر شہزاد بنگش کی پشاور منتقلی ’’اس دفعہ جاسوسی نے زیادہ نہیں ترسایا اور تین اگست کو ہی جاسوسی کا دیدار نصیب ہوا۔ سرورق پر ریشمی بالوں والی حسینہ کچھ زیادہ ہی دل کو بھا گئی۔ لیکن رمضان کی وجہ سے خود کو کنٹرول کیا۔ (شکر الحمدللہ) اس کے نیچے ہی ہمایوں سعید راج قمیص پہنے بغیر اور ہاتھ میں بندوق لیے صنفِ نازک کو متوجہ کرنے کے لیے ایکشن مار رہے تھے۔ یہ تو طے ہے کہ جہاں بھی صنفِ نازک ہوگی، وہاں یہ ضرور آدھمکیں گے۔ (یہ بات آپ کو اس لیے معلوم ہے کہ آپ پہلے سے وہاں انٹری مار چکے ہوتے ہیں...؟) اس کے بعد دوستوں کی محفل میں کسی آہٹ کیے بغیر خاموشی سے داخل ہوا تو اس دفعہ خلافِ معمول ایڈیٹر صاحب کو خوش دیکھا۔ تب مجھے ان پر کچھ شک ہوا لیکن یہاں نہیں بتاؤں گا۔ (پھر کہاں بتائیں گے...؟) سب سے پہلے کرن کا تبصرہ پڑھا جو تبصرہ کم اور موسمیات کی خبریں زیادہ تھیں۔ اعجاز احمد راحیل بھائی آپ کے حالات اور آپ کے عشقِ ناکام کے بارے میں جان کر دکھ ہوا۔ عدنان یوسف آپ کو کیوں مہناز کی شادی کا اتنا دکھ ہوا۔ ماہتاب گل آپ کا عزت و احترام دینے کا بہت بہت شکریہ۔ احتشام قریشی صاحب مان گئے کہ آپ نے آپریشن کے باوجود دو چکر لگائے۔ شاید آپ بھی خود کو تالی بنانا چاہ رہے ہوں۔ کبریٰ فہد آپ کا تبصرہ تھا یا اقوالِ زریں جو ایک ہی لائن میں لکھا۔ پلیز دل کھول کر لکھا کرو۔ ماہا ایمان کو کہیں بھی نہ پا کر یہ یقین ہوا کہ رمضان میں شیطانوں کو قید کر دیا جاتا ہے۔ (پھر آپ کیسے باہر ہیں؟) باقی تبصروں میں ڈاکٹر مرزا انتظار نذیر مغل صاحب کا تبصرہ پڑھ کر دل کو خوشی ہوئی اور کاشف علی میراں، ارشاد حسین کلیرا اور احمد خان توحیدی کی شرکت بھی اچھی لگی۔ دوستوں سے علیک سلیک سے فارغ ہو کر فوراً ہی کہانیوں کی طرف متوجہ ہوا تو پہلی نظر سلیم فاروقی کی جال در جال پر پڑی اور ایک ہی نشست میں ختم کی۔ دوسری قسط میں کانتا کا کردار بہت پسند آیا۔ اس کے بعد للکار پڑھی۔ ہمیشہ کی طرح یہ قسط بھی مزے دار تھی اور جلالی صاحب کی موت کا سن کر دل کو خوشی ہوئی۔ یہ منحوس بڈھا جلدی جلدی مر جائے تو اچھا ہے۔ دستِ قاتل ایک دلچسپ تحریر تھی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ اس کے بعد گرداب میں کود گیا تو اس میں بہتا ہی گیا۔ گرداب تو اب مکمل جاسوسی ناچ ناول بن گیا ہے۔ خریدار ایک فضول تحریر تھی۔ اب ہمارا گھر ہنگو کے بجائے پشاور منتقل ہو گیا ہے اس لیے اب میں پشاور کا پتا لکھوں گا۔‘‘ (او کے...)

ریسکیو 1122 پاک پتن سے اعجاز احمد کے خدشات ’’جاسوسی کا عرصہ دس سال سے خاموش قاری ہوں لیکن کچھ دوستوں کی شرکت کی وجہ سے مجھے بھی اس میدان میں کودنا پڑا۔ چھیڑ، نکتہ چینی میں دوست ایک دوسرے پر پھبتیاں کستے ہوئے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اس ماہ ٹائٹل کچھ زیادہ متاثر نہیں کر سکا۔ محفلِ یاراں میں کرن خان کی داستان بہت اچھی تھی۔ اس کے علاوہ میرے دوست سپاہی صابر حسین اور اعجاز احمد راحیل کے تبصرے بھی پسند آئے۔ دوستوں سے گزارش ہے کہ ایک دوسرے کی برائیوں سے قطع نظر کبھی کبھی اچھائیوں کو بھی بیان کر دیا کریں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو جال در جال میں حقیقی طور پر سی آئی اے اور ایف بی آئی کا چہرہ بے نقاب کیا گیا۔ اپنے مغل صاحب کی للکار کی تو کیا بات ہے۔ گرداب اب بہت زیادہ الجھ گئی ہے اور کئی کردار سامنے آ گئے ہیں۔ لگتا ہے ان کو سمیٹنے میں اب کچھ وقت لگے گا۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ یہ میری پہلی کوشش ہے لہٰذا مجھے یقین ہے کہ شائع نہیں ہوگی۔‘‘

سپاہی صابر علی، حیدر آباد سے لکھتے ہیں ’’آپ سب کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ نے مجھے صحت دی اور میں ایک بار پھر چاق و چوبند، خوش و خرم ہوں، خدا کا شکر ہے۔ حیدر آباد میں 2 اگست کی ایک خوب صورت صبح اور بھی بے حد خوب صورت ہو گئی جب اخبار والے سے اپنا ڈائجسٹ لیا۔ سرورق پر سرسری سی نظر ڈال کر کیونکہ ہو سکتا ہے میرا حسینہ کو دیکھنا اس کی طبیعت پر گراں گزرے اور وہ میری ذاکر انکل سے شکایت کر دے، خیر اس کے بعد اپنی محفل میں آئے تو صدارت کی کرسی پر لاہور سے کرن خان کو پایا۔ بہن جی مبارک باد قبول کریں۔ آپ کا اندازِ تحریر بہت خوب صورت ہے لیکن تعلیم پر توجہ دیا کریں۔ کراچی سے احمد خان توحیدی کو مبارک کے بعد جب اپنے نام پر نظر پڑی تو یقین کریں کہ اتنی خوشی ہوئی کہ اگر روزہ نہ ہوتا تو شاید ڈانس شروع کر دیتا۔ انکل جی! آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے اس ناچیز کو بھی اس محفل میں جگہ دینے کے قابل سمجھا، شکریہ۔ ایک مشورہ سب کو دوں کہ ایک دوسرے پر تنقید کے بجائے اگر پیار محبت سے تبصرے میں دوسروں کا تذکرہ کیا جائے تو کیا خیال ہے اس کو شائع نہیں کیا جائے گا۔ اگر کوئی شاعر ہے تو اس کی حوصلہ افزائی کی جائے اگر کوئی دکھی ہے تو اس کے دکھ کو بانٹا جائے اور دوسروں کی خوشی میں خوش رہا جائے۔ کیا خیال ہے آپ سب لوگوں کا؟ تمام لوگوں کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں لیکن جب ان پر تنقید ہوتی ہے تو تھوڑا دکھ ہوتا ہے لیکن خیر، سوچ اپنی اپنی۔ چکوال سے اقبال اینڈ صبا صاحبہ کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ اعجاز احمد راحیل تو تبصرے استادوں کے استاد ہیں۔ ان کی تعریف تو سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ کاشف علی میراں کا تبصرہ بھی زبردست تھا۔ کھاریاں سے بابر عباس صاحب! ابھی کیا آپ جادو وغیرہ جانتے ہیں جو آپ کی نظر لاہور تک جا رہی ہے۔ خیر دعا ہے کہ خوش رہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے گرداب پڑھی کہانی زبردست جا رہی ہے۔ بس اس دفعہ چودھری پارٹی وغیرہ کی غیر حاضری رہی۔ للکار اب کافی دلچسپ ہو گئی۔ کاشف زبیر نے کافی عرصے بعد جلیل وغیرہ کو جاسوسی کی زینت بنایا جو کہ بے حد پسند آیا۔ وطن فروش میں ملک دشمن عناصر کے عزائم سے پردہ اٹھانے کے ساتھ وطن کی محبت اور ذہانت

کے استعمال کو بھی خوب صورت طریقے سے بیان کیا گیا، دل کو بھا گیا۔ ہمزاد میں رئیس نے اس قدر گہری چال ہمت سے انہی پر الٹ دی واہ بھئی کیا کہنے آپ کے سرور اکرام صاحب۔ سودا سرینا راض، کارفرا ڈکٹار آزاد، خاندانی مجرم جمال دتی، یہ کہانیاں جاسوسی کے معیار کے عین مطابق تھیں۔‘‘

بشیر احمد بھٹی فوجی بستی بہاولپور سے حاضر ہوتے ہیں ’’اگست 2012ء کا جاسوسی بروقت مارکیٹ کی زینت بنا۔ اس شمارے کی تمام کہانیاں حسبِ روایت جان دار تھیں۔ کاشف زبیر صاحب نے مکین و مکان کو بڑے مزاحیہ انداز میں تحریری رنگ دیا۔ جلیل کی عشوہ طرازیاں چھوٹا بھائی بڑا کی قلابازیاں۔ شنو کی شرارتیں، راجا کی چالاکیاں دل کو بھا گئیں۔ تنویر ریاض صاحب نے مغربی کہانی کا خوب ترجمہ کیا ہے۔ ہمسفر ایک پُرتجسس کہانی ہے۔ ٹرین کی کھڑکی سے زمین پر حرکت کرتے سائے دیکھ کر یوسن اصل مجرموں تک جا پہنچا۔ اسے کہتے ہیں سراغ رسانی مہم۔ سودا، مغرب سے درآمد اچھی تحریر تھی۔ جان کی سیاست سے ایرک کی فیکٹری مزدوروں کے روزگار کا سبب بنی۔ جینی، ایرک بھی ایک ہو گئے۔ خاندانی مجرم، مغربی تہذیب کی عکاس۔ ناجائز اولاد کا شاخسانہ، ہربرٹ طرا اپنے ناجائز بیٹے کو انشورنس کی رقم دینے کی خواہش دل میں لیے رخصت ہوا۔ کارفراڈ اپنے انداز کی خوب صورت کہانی ہے۔ دستِ قاتل، ہندی ادب کی ایک چٹپٹی تحریر ہے۔ راجو بوری کی سادگی، اصل قاتل شری واستو تھا۔ للکار کی 31 ویں قسط ہنگامہ خیز رہی۔ عمران کی چوکس پھرتیاں، عمران کہانی کا اصل خاص کردار ہے۔ کہانی ہر بار ایک نیا موڑ لیتی ہے۔ گرداب کی قسط نمبر 38 ولولہ انگیز رہی۔ اگلے شمارے کا انتظار ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ ہمزاد بہترین کہانی ہے۔ دوسرا رنگ وطن فروش نہلے پہ دہلا رہی۔‘‘

اوکاڑہ سٹی سے تصویر العین کی عکاسی ’’دو ماہ کے بعد حاضری دی ہے۔ ہو سکتا ہے مصروفیت کی وجہ سے لمبا تبصرہ نہ کر سکوں۔ پہلے ہی معذرت۔ ٹائٹل گرل کو دیکھ کر بے تحاشا گرمی محسوس ہوئی۔ اس کے بال جو کھلے ہوئے تھے۔ اوکاڑہ میں ابھی تک صرف دو بارشیں ہوئی ہیں۔ یہاں تو پہلے ہی بارش نہیں ہوتی لہٰذا کھلے بالوں والی لڑکی صرف گرمی کا احساس ہی جگا سکتی ہے۔ پیچھے موجود شخص جس کی آنکھ کے نیچے پہلے ہی زخم کا نشان تھا، اپنے کم ہوتے بالوں کو چھپانے کے لیے بال بکھرائے نہ جانے کسے گھور رہا تھا اور سامنے موجود گبرو ڈاکو نما شخص اپنی بندوق سے یقیناً ہمایوں سعید راج کا نشانہ لے رہا تھا۔ اس کے بعد اشتہارات پر سے جمپ لگاتے ہوئے ہم نکتہ چینی کی محفل میں پہنچے۔ کرن خان صدارت کی کرسی پر بیٹھ کر اپنا حالِ دل بیان کر رہی تھیں۔ احمد خان توحیدی کو جاسوسی میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ عدنان یوسف آپ کو لگتا ہے کہ جمناسٹک کا بہت شوق ہے جو اتنی قلابازیاں اور چھلانگیں لگا رہے ہیں۔ ہمایوں سعید راج آپ کو کون سی لڑکی جان پہچان والی نہیں لگتی۔ کہیں تو فلرٹ کرنے سے باز آ جائیں۔ اللہ رے خوش فہمیاں۔ ایم اے عزیز اسد آپ اگر اپنے آپ کو پہاڑوں کے بادشاہ کی جگہ پہاڑوں کا بیٹا کہتے تو بہت اچھا لگتا۔ پہاڑوں، زمینوں، سمندروں اور ساری کائنات کا بادشاہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ بس .... للکار میں اس دفعہ زبردست ایکشن دیکھنے کو ملا۔ لگتا ہے کہ ثروت ایک بار پھر تابش سے بچھڑنے والی ہے۔ گرداب میں پچھلی دو اقساط سے شہریار کا کردار اور ماہ بانو اسلم کا کردار نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ اسما سے گزارش ہے کہ وہ پلیز اس پر غور کریں۔ کاشف زبیر، مکین و مکان میں اس دفعہ وہ بات نہیں تھی۔ پہلے کی طرح زیادہ مزاحیہ نہیں تھی۔ کہیں کچھ تھوڑی بہت کی تھی۔ تراش خراش تقریباً تمام اچھی تھیں۔‘‘

ضلع قصور سے علی آتش کی سردمزاجی ’’اگست کا جاسوسی 3 تاریخ کو ملا۔ سرورق ذاکر انکل نے بالکل پنجابی فلم کے پوسٹر جیسا بنایا اور سرورق پر موجود حسینہ کا چہرہ ایسے لگا جیسے وہ پانچ چھ سال کی کوئی بچی ہو۔ چلو خیر، اس کے بعد چلے چھیڑ، نکتہ چینی کی طرف۔ محفل کی مسندِ صدارت پر براجمان کرن خان اپنے شکوے شکایتوں کے ساتھ براجمان تھیں۔ تبصرہ خود تک ہی محدود تھا۔ خیر، رسمِ دنیا مبارک باد قبول کریں۔ سپاہی صابر علی! آپ نے شاید غور نہیں کیا کہ محفل میں ہر ماہ پرانے دوستوں کے برابر نئے دوست بھی شامل ہوتے ہیں۔ اعجاز احمد راحیل صاحب اتنی اداسی، مایوسی، ناامیدی اچھی نہیں ہوتی۔ ہمایوں سعید راج، ہم تو سمجھے تھے کہ آپ شاید سدھر جائیں لیکن.... احتشام قریشی صاحب! آپ کی یہ بات بالکل برحق ہے کہ کوئی ایک صنف بے وفا نہیں ہوتی، دونوں میں سے کوئی بھی بے وفا ہو سکتا ہے۔ اس دفعہ سب سے بہترین تبصرہ ہمیں انتظار نذیر مغل کا لگا۔ کراچی سے اقرا ایاتو کی التجا کچھ عجیب سی لگی۔ اس کے بعد اسٹوریز میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ اسٹوری کی تعریف سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ کہانی بہترین چل رہی ہے۔ ویسے لگتا ہے انکل اسے ختم کرنے کے لیے کلوز کر رہے ہیں۔ اس کے بعد دوسری سلسلے وار کہانی گرداب پڑھی۔ پچھلی دو تین قسطوں سے یہ کہانی بھی ہماری فیورٹ میں شامل ہو چکی ہے۔ جال در جال کی ہمیں اینڈنگ کا پہلے سے ہی پتا تھا کہ سلیم فاروقی اسٹارٹ بہترین اور اینڈ گزارے لائق کرتے ہیں۔ دوسری اور آخری قسط ہمیں تو پسند نہیں آئی۔ رنگوں میں اس دفعہ پرانے پلاٹ پر گھڑی کی گئی اسٹوری زاد ہمزاد ہمیں کچھ خاص متاثر نہیں کر سکی۔ لیکن دوسرے رنگ وطن فروش نے بہت مزہ دیا۔ بہترین رنگ تھا۔ شاید امیمہ سلیم، سلیم فاروقی کی رشتے دار ہیں؟‘‘

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کا تشکر ’’جاسوسی اس بار 3 تاریخ کی ایک طوفانی بارش میں ملا۔ بک اسٹال بھی چھتری میں جانا پڑا۔ بہرحال محنت وصول ہوئی اپنا خط دیکھ کر۔ سرورق حسبِ معمول بس یونہی سا تھا۔ (یونہی سا مطلب؟) چھیڑ، نکتہ چینی کی صدارت پر اس بار کرن خان براجمان تھیں۔ غالباً پہلی بار خط لکھا اور انعام کی حق دار ٹھہریں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ سب سے پہلے اپنی پسندیدہ گرداب پڑھی۔ ابھی تک شہریار ایکشن میں نہیں آیا اور گزشتہ کئی قسطوں سے جاوید علی ہی معروف ہے۔ شاید جلد ہی اس کا کردار ختم کر دیا جائے۔ للکار میں تابش اس بار دشمنوں میں گھر رہا اور راجا کی مدد سے جان چھڑا پایا۔ ڈاکٹر مہناز کا اصل مشن آرا کوئے مجسمہ ہی تھا جو وہ صفائی سے نکال لے گئی۔ دیکھیں اب جلالی بچ پاتا ہے یا نہیں۔ بہت عرصے بعد کاشف زبیر کی جلیل میاں اور راجا کی مزاحیہ کہانی پڑھنے کو ملی۔ بڑا لطف آیا۔ سرورق کی دونوں کہانیاں اچھی تھیں۔ پہلی کہانی زاد ہمزاد نے تو دماغ چکرا دیا کہ کون... کون تھا۔ دوسری کہانی وطن فروش ایک ہلکی پھلکی کہانی تھی جو مزہ دے گئی۔ اس ماہ کی بہترین کہانی مختار آزاد کی کارفراڈ رہی۔ سلیم فاروقی کی جال در جال کی دوسری قسط نے ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں کی سیر کرا دی اور انجام حسبِ توقع ہی رہا۔ اس بار کترنیں کافی کم رہیں۔‘‘

چکوال سے ایم عزیز اسد کا اعتراض ’’دور سے ہی لگا غلط بک اسٹال پر لٹکے ہوئے جاسوسی کے ٹائٹل پر گئی۔ کوئی گنجا سامالی پائپ سے درختوں کو

www.paksociety.com

دھو رہا تھا۔ معاف کیجیے گا ڈاکر انکل جی! (ڈاکر) غلط، غلط جو ہوتی ہے۔ جاسوسی کے پورے ادارے اور قارئین کرام کو عید مبارک۔ محفل میں پہنچے، کرن خان تبصرے کے بجائے افسانچے کے ساتھ پہلے نمبر پر خیر مبارک باد۔ اعجاز احمد راحیل! ہم آپ کے ذاتی تجربے سے اتفاق کرتے ہیں پر کچھ تو ہم پر میاں کیجیے۔ انفال اینڈ صبا مرزا جی، شکر ہے یہ فقیر ذات آپ کی خوشی کا سبب بنی۔ نوید ساجد زیدی صاحب جب کچھ خاص ہاتھوں میں آئے تو بندہ عام بھول جاتا ہے۔ عدنان یوسف یار اتنی ڈھٹائی سے بھی نہ دیکھو کہ کچھ اور نظر ہی نہ آئے۔ اینڈ ماہتاب گل بڑی بات ہے جی جو آپ کو جناتی زبان سمجھ آگئی اور پھر لوٹ پوٹ ہوتی رہیں۔ ہم نے بھی ناسمجھی کے باوجود مزاحیہ کچھ کے قہقہے بکھیر دیا۔ پہلی کہانی جال در جال بہت پسند آئی پر ہیرو اور سائڈ ہیروئن کا حد سے زیادہ تعلق بالکل پسند نہیں آیا۔ للکار میں تابی کا فیصلہ زبردست تھا پر تابی بے چارہ اپنے طور پر جو فیصلہ کرتا ہے عموماً پھنس جاتا ہے۔ پہلا رنگ زیر زبر ہوتی ہوئی ایک اچھی کہانی تھی۔ دوسرا رنگ وطن فروش کہانی پسند آئی پر آخر میں ایک دوسرے سے بار بار اسلحہ پھنکوانا اچھا نہیں لگا۔''

احتشام احسان، صفدر آباد سے ''اگست کا شمارہ 30 اگست کی صبح صبح ایبٹ آباد سے خریدا۔ سیر و تفریح کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ (واہ جی موجاں ہی موجاں) ٹائٹل کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ اشتہارات پھلانگ کر چینی، نکتہ چینی میں تھوڑی چینی شامل کرنے پہنچ گیا۔ اپنا خط محفل میں موجود پایا خوشی ہوئی مگر احتشام احسان کے بجائے احتشام قریشی کیوں لکھوا دیا؟ کرن خان اپنی داستان لیے کرسی صدارت پر براجمان تھیں۔ احمد خان توحیدی کی بات مناسب ہے، سلسلہ وار ناولز کو اسٹار پلس کے ڈراموں کی طرح زیادہ لمبا نہ کیا کریں۔ ہاں گرداب ایسی تحریر ہے جس کا کوئی اختتام نہیں ہے۔ ساہیوال سے اعجاز احمد کی ایک بات دل کو لگی۔ میرا اک اک لکھا ہوا لفظ کسی اپنے کے لیے ہے جواب اپنا نہیں۔ عدنان یوسف! چھلانگ لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ کہیں چوٹ ووٹ تو نہیں آئی؟ ہمایوں بھائی اطلاع دینے کا شکریہ۔ میری آنکھیں بھی ترس رہی تھیں، ابھی آئینے سے رجوع کیا ہے۔ سب سے پہلے جال در جال پڑھی۔ امید کے مطابق اینڈ اچھا تھا۔ آپ نے سلیم فاروقی کے ہاتھ کیوں نہ چومے ویسے بھلا؟ للکار میں امید تھی کہ تابش بچ ہی جائے گا کسی نہ کسی طرح مگر مہناز کی بات پر دھچکا لگا اور آخر میں اندازہ ہوا کہ مہناز نے دھوکا نہیں دیا۔ اب اندازے کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں، آئندہ آنے والی اقساط میں معلوم ہوگا۔ گرداب کی یہ قسط پچھلی بار سے زیادہ پاور فل تھی۔ اسما آپی! بہت زبردست کام جاری ہے۔ دل خوش ہو جاتا ہے یہ تحریر پڑھ کر۔ پہلا رنگ زاد حمزہ دسرور اکرام کی ہلکی پھلکی تحریر پسند آئی۔ ویسے لالچ تو بری بلا ہوتی ہے مگر یہاں لالچ نے رئیس کو رئیس بنا ڈالا۔ دوسری کہانی امیمہ سلیم کی تھی۔ یہ کوئی نئی رائٹر ہیں؟ سچ ہے شاید جیسے لوگوں کو یونہی تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کاشف زبیر کی تحریر پڑھی۔ کوئی خاص مسکراہٹ نہ آئی لبوں پہ۔ تراش خراش فاطمہ سعید اور کاشف احمد کی بہترین تھیں۔''

بنوں سے ہمایوں سعید راج کی اٹکھیلیاں ''روزے کی حالت میں کسی بھی نامحرم کی طرف نظر اٹھانا مجھے اچھا نہیں لگتا لہٰذا افطاری کے بعد جب نہایت فرصت سے سرورق پر نظر ڈالی تو بے تحاشا مایوسی ہوئی۔ انکل! آپ کا کیا جاتا اگر اس خوفناک شکل والی کی جگہ کسی روزہ دار بچی کا چہرہ سجا لیتے۔ (بس ہم نہیں چاہتے تھے کہ روزے اور عبادت میں خلل پڑے) اور نیچے موجود بابر عباس بھی زیادہ بھلے نہیں لگ رہے تھے۔ جنہوں نے بھتا نہ دینے والے ڈرائیوروں کے خلاف بندوق اٹھالی ہے۔ انکل بھی اس بات پر پھولے نہیں سما رہے تھے کہ رمضان اور ماہ آزادی اکٹھے وارد ہوئے۔ پہلے نمبر پر براجمان کرن خان کی داستان کو نہایت بے دلی سے پڑھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی نہایت شدید بخار میں الٹی سیدھی باتیں کر رہا ہو۔ (آپ کی طبیعت تو ٹھیک رہی...) اعجاز برادر! تمہارے لہجے سے ٹپکتی بلکہ برستی مایوسی مجھے بہت غصہ دلاتی ہے۔ مریضوں کے لیے سراپا انتظار ڈاکٹر افتخار صاحب! تو پھر آپ ہی کوئی گرما گرم اور کارآمد تبصرہ عنایت فرمائیں۔ اقرا ابا تو احساس ہونا اچھی بات ہے مگر حساسیت کا ڈھنڈورا پیٹنا قابل ستائش عمل نہیں۔ بابر صاحب! پینڈسم بندے کو دیکھ کر کوئی بڑے بڑے منہ بنا ہی نہیں سکتا۔ ضرور آپ کی پینڈی میں کوئی کمی ہوگی۔ انفال مرزا اینڈ صبا مرزا! اگر کوئی میری تعریف کر رہا ہے تو تم لوگ کیوں جل جل کر کوئلہ ہو رہی ہو؟ تمہاری اس جلن سے اہالیان محفل کوئی بھی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے جال در جال پڑھی اور انتہائی افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ جو ٹرانس پہلے حصے میں قائم ہوا تھا دوسرے حصے نے اسے بُری طرح مجروح کیا۔ للکار میں ایک دفعہ پھر درد والے فلسفے کو نہایت موثر پیرائے میں بیان کیا گیا۔ مہناز کی بے وفائی حلق سے نہیں اتر رہی۔ گرداب میں مرکزی کردار نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں۔ نہ ماہ بانو کی خبر، نہ کشور کا پتا، نہ چودھری کی خباثت نظر آئی، نہ ہی یہودیوں کی عیاریاں۔ (صبر سے بھی کام لیا کرو پینڈسم بوائے) سرورق کے دونوں رنگ وہ مخصوص رنگ نہ جما سکے جو کہ ان رنگوں کا خاصہ ہے۔ کاشف زبیر کی مکین و مکان سب سے خاص الخاص رہی۔ خریدار بھی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔''

صوابی سے مشائیم کی ناراضی ''اس بار جاسوسی خلافِ معمول 3 تاریخ کو مغرب کے وقت موصول ہوا اور جاسوسی کے آتے ہی موسلا دھار بارش شروع ہوئی اور موسم ایک دم فٹ فاٹ ہو گیا۔ ہے نا مزے کی بات۔ (بہت مزے کی... للچانے والی) فہرست جاسوسی میں نظر دوڑائی، جلیل اینڈ راجا کمپنی کو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ اس کے بعد محفل یاراں میں قدم رکھا اور کرن جی سے ٹکرا گئے۔ ہم نے جلدی سے معذرت کے ساتھ ساتھ مبارک باد بھی نوازا اور باقی دوستوں کا حال احوال جاننے کے لیے آگے بڑھ گئے۔ ماہا ایمان کو نہ پا کر دل کو کچھ کچھ ہونے لگا۔ بنوں سے ہمایوں صاحب آپ سے ایک معصوم سا سوال ہے کیا آپ واقعی ویسے ہیں جس طرح شو کر رہے ہیں؟ یقین کریں ہمیں نہیں لگتا کہ آپ فلرٹ ہوں گے۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے عبادت علی کو مبارک باد۔ ہم بھی آپ کی طرح جانے والے ہیں کیونکہ کالج میں داخلہ لینے کے بعد ہم خاصے مصروف ہوں گے اور پھر ٹائم ہی نہیں ملے گا۔ (ہر کام کے لیے وقت نکالنا انسان کے ہاتھ میں ہوتا ہے... تعلیم، مطالعے کی راہ میں حائل نہیں ہوتی اور نہ ہی ایک عدد خط ارسال کرنے میں) سب سے پہلے کاشف انکل کی مکین و مکان سے لطف اندوز ہوئے۔ ہنس ہنس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اتنی مزے کی تحریر، واہ جی واہ کاشف انکل! آپ کے کیا کہنے۔ ویسے جلیل اس دفعہ خدمتِ خلق کرتے نظر آئے۔ اس کے بعد جاوید انکل کی زندہ و جاوید تحریر للکار میں کود پڑے۔ کیونکہ اینڈ خاصی سنسنی خیز موڑ پر ہوا تھا سو تابی کی خبر لینا ضروری سمجھا اس کے جذباتی پن نے اسے مشکل میں گرفتار کیا تھا۔ راجا کی آمد کہانی میں چار چاند لگا گئی۔ تیسرے نمبر پر گرداب پڑھی جو ہمیشہ کی طرح زبردست محسوس ہوئی۔ کہانی میں جاوید کا کردار خاصا جاندار ہے جس سے کہانی میں آٹھ چاند لگ گئے ہیں ہاہاہا... کیونکہ چار تو صرف تیمری سے لگے ہیں۔ فاروقی انکل کی جال در جال ایک درمیانے درجے کی تحریر

ثابت ہوئی۔ آغاز جتنا سنسنی خیز تھا، انجام وہی غیر متوقع... وہی فنی خوشی اینڈ... سوری کہانی کچھ خاص رنگ نہ جما سکی۔ مختصر تحریروں میں صرف دو پڑھیں۔ مختار آزاد کی کارفرما ایک عمدہ تحریر تھی۔ ڈونا نے بہت خوب صورتی کے ساتھ مجرم کو انجام تک پہنچایا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی دستِ قاتل ایک عام سے موضوع پر عام سی تحریر ثابت ہوئی۔ وہی زن وزر کی کارستانیاں۔ باقی تحریروں خاص کر رنگوں پر تو تبصرہ کیونکہ جی رنگوں کے چکر میں پڑتے ہے تبصرہ شائع ہونے سے رہ جاتا۔''

محمد قدرت اللہ نیازی حکیم ٹاؤن خانیوال سے حاضر ہیں ''اگست کا شمارہ رمضان المبارک کی مبارک ساعتوں میں 2 اگست کو موصول ہوا۔ سرورق پر بھی لوڈشیڈنگ کا اثر نظر آیا جہاں انکل شرٹ سے بے نیاز غصے میں بندوق پکڑے نظر آئے۔ اوپری کونے میں آنکھوں میں مکاری لیے ایک صاحب موجود تھے جبکہ اس ساری گرما گرمی سے بے نیاز ڈھلی ڈھلائی حسینہ زلفیں رخ پر ڈالے خیالوں میں گم تھی۔ اداریہ کی جانب سے رمضان اور عیدالفطر کی مبارک باد اور دعائیں وصول کیں۔ کرن خان کی داستان پڑھی جو بے ٹکٹ لفافے کے ساتھ بھی خطوط کی محفل میں انٹری مار چکی ہیں، بلے بھئی بلے۔ کرسی صدارت کی مبارک باد ہو۔ سپاہی صابر علی! ابھی اسپتال سے فارغ ہو کے پڑھ لیتے ایسی بھی کیا جلدی؟ اب کیسے ہیں آپ؟ اعجاز احمد راحیل! ماضی کی یادوں سے نکلیں بقول شاعر

نکل ہی آتی ہے کوئی نہ کوئی گنجائش
کسی کا پیار کبھی آخری نہیں ہوتا

ہمایوں سعید! یہ بھی بتا دیتے کہ پھر آئینے کا کیا حال ہوتا ہے؟ ارے یہ آواز کیسی ہے؟ تڑاخ، تڑاخ۔ بے چارہ آئینہ! سید عبادت علی کاظمی! ابھی آخری خط ہونے کی وجہ؟ فرحان! جناب یہ کوئی کلیہ نہیں آپ آخری کہانی سے بھی تبصرہ شروع کر سکتے ہیں۔ مرزا سسٹرز! ابھی آپ کی دادی تو بڑی زندہ دل ہیں، میرا سلام کہیے گا ان کو۔ ماہ تاب گل! چلیں حسینہ کے چہرے کی لالٹینوں سے آپ کا رات کو روشنی کرنے کا مسئلہ تو حل ہو گیا اور شطرنج کی بساط دیکھ کر شاید آپ کو جوانی کے ایام یاد آگئے، ہے نا؟ کاشف علی میراں صاحب! افغان جنگ اور 9/11 کے بعد امریکا میں رہنے والے مسلمانوں پر جو بیتی، اس پر بھی کچھ نہیں بلکہ اکثر اور بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ آپ کے مطالعے میں نہیں آیا یہ اور بات ہے۔ کبریٰ فہد! خوش قسمت ہیں جو شوہر کے اصرار پر خط لکھ رہی ہیں۔ ہماری بیگم تو جیسے ہی رسالے کو ہاتھ لگائیں، انہیں تمام بھولے ہوئے کام یاد آ جاتے ہیں۔ اقرا ابا! تو اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر؟ یہ چھیڑ چھاڑ تو چلتی رہتی ہیں۔ خطوط کو ذرا غور سے پڑھیں سب سمجھ آ جائے گا۔ بابر عباس کافی عرصے بعد آئے اور اتنی تیزی سے سب کو لتاڑا کہ سب ارے ارے کہتے رہ گئے۔ ویلکم بیک جناب۔ گرداب حسبِ معمول سب سے پہلے پڑھی۔ جاوید علی برا پھنسا۔ پیٹ درد کا بہانہ بروقت سوجھ گیا ورنہ پول اسی وقت کھل جاتا۔ للکار حسبِ معمول مار دھاڑ سے بھرپور رہی۔ جال در جال کو خوامخواہ کھینچا گیا۔ زیادہ تر ایکشن کا مزا ایڈ گروپ کے سر منڈھ دیا گیا۔ بابر خان بس ان کے ساتھ بھاگتا رہا اور آخر میں جیسا کہ سلیم فاروقی صاحب کی عادت ہے، یک دم ایک صفحے میں ساری بساط لپیٹ دی۔ دستِ قاتل میں راجو پوری بہترین منصوبہ ساز ثابت ہوا۔ خریدار میں جارج بلنگ کو ہم سیریل کلر سمجھ رہے تھے مگر وہ واقعی سراغ رساں نکلا۔ مسٹر فیلڈ کا پلان تو زبردست تھا مگر وہ اری قسمت... جس جارج کو اپنے لیے ہائر کیا، اسی نے اس کے پلان کو فیل کر دیا۔ کاشف زبیر مکین و مکان میں جلیل کے تازہ کارنامے کے ساتھ موجود تھے۔ کافی عرصے بعد جلیل اینڈ گروپ سے ملاقات اچھی لگی۔ جس طرح جلیل نے بوڑھی عورت کی مدد کی، بہت خوشی ہوئی اس سے۔''

مری سے کبیر عباسی عرف شہزادہ کوہسار کی بے پناہ خوشی ''سب سے پہلے تو آپ لوگوں کے ساتھ ایک خوش خبری شیئر کرنا چاہوں گا۔ گو کہ صنفِ نازک کے بہت سے ارکان کے نازک سے دلوں کو یہ کافی نقصان سے دوچار کر سکتی ہے۔ بہر حال شیئر کیے بنا چارہ بھی تو نہیں۔ خیر خبر یہ ہے کہ ہم 7 جولائی کو دو سے تین ہو گئے۔ ناں جی ناں، آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ دو تو ہم اسی وقت ہو گئے تھے جس دن جاسوسی کو اپنے لائف پارٹنر کے طور پر چنا تھا۔ اب تین کیسے ہوئے، امید ہے اس کی سمجھ آپ کو آ گئی ہو۔ (ہماری طرف سے بہت بہت مبارک ہو) ٹائٹل پر وہی ریمارکس دیں گے جو پچھلی دفعہ دیے تھے یعنی اوسط۔ ویسے ہم نے ٹائٹل غور سے دیکھنے سے احتراز ہی کیا کیونکہ سامنے وہ بھی بیٹھے تھے۔ کاشف علی! آپ کو سمجھ نہیں آیا کہ سراغ رسی پر مبنی کہانی کا نام فیشن گزیدہ کیوں دکھایا گیا تو کسی مستری سے اپنی سمجھ دانی کو ذرا کشادہ کرائیں۔ شکیل کاظمی! سوشل سائٹ سے اگر آپ کی مراد فیس بک ہی ہے تو آپ ہمیں محمد کبیر، چلیس مری پر جوائن کر سکتے ہیں۔ شادی کے ہنگاموں میں ہماری ای وی او (EVO) گم ہو گئی ہے اور مصروفیت کی وجہ سے آج کل ہم نیٹ سے دور ہی ہیں۔ فیس بک پر جاسوسی، سسپنس اینڈ سرگزشت ڈائجسٹ کے نام سے ایک گروپ بھی موجود ہے جس کی اونر مریم کے خان اور ایک اور شخص ہے۔ اس پر آپ کو کافی رائٹرز اور تبصرہ نگار بھی مل جائیں گے، ضرور جوائن کیجیے گا۔ انکل جی! پلیز میری ان لائنز کو حذف مت کیجیے گا۔ کافی لوگوں کا بھلا ہو جائے گا۔ عمیر شہزاد، اپنی ماہا ایمان ہوش میں تو ہوتی ہیں۔ حواس میں ذرا کم کم ہی رہتی ہیں۔ ماہ تاب گل! راجن پور کا کرایہ تو بھیج دیں تاکہ آپ سے گلاب جامنوں کا ڈبا بدست خود وصول کر سکیں۔ جاوید بلوچ کا تبصرہ اچھا لگا۔ صبا گل بھی اس دفعہ معقول تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ محترمہ پچھلے تبصرے میں تو ہمیں بہت نامعقول معلوم ہوئی تھیں۔ انجم رشید کا یہ کمنٹ پڑھ کر بڑی ہنسی آئی کہ ایک اتے گرمی تے لوڈشیڈنگ اوتوں تیرے روے نئیں مکدے۔ ہم نے پنجابی ورژن پیش کیا ہے۔ ہمایوں سعید! محبت تو واقعی کمینی چیز ہے۔ نہ اپنا رہنے دیتی ہے نہ کسی کو اپنا ہونے دیتی ہے۔ اعجاز احمد! دنیا میں اگر وہ ہی وہ ہوتے تو ٹیسٹ چینج کرنے کے لیے آپ کیا کرتے؟ گرداب کا سفر نئے ٹریک پر جاری ہو گیا۔ اس دفعہ تو قسط کچھ تعارفی تعارفی سی لگی۔ بہر حال آگے کافی تجسس موجود ہے۔ للکار، طاہر جاوید دی گریٹ۔ جلالی کا کردار اور عمران کی اس کو ہینڈل کرنے کی پالیسی ہمیں بھی بہت کچھ سکھا رہی ہے۔ مزاحیہ جملے پڑھ کر بے اختیار ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگے جن پر وہ ہمیں حیرت اور ہمدردی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ دیکھنے لگے۔ جواب میں ہم جھینپ ہی سکتے ہیں تو سو جھینپنے لگے۔ اس دفعہ اتنا ہی ڈائجسٹ پڑھ سکے کیونکہ پرانے پارٹنر سے زیادہ محبت جتا کے نئے پارٹنر کی ناراضی تو افورڈ نہیں کر سکتے نا۔ (یہ غداری ہے) کترنیں تھیں مگر کچھ زیادہ پسند نہیں آئیں۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

محمد نفیس، ملیر کراچی۔ بابر عباس، کھاریاں۔ رانا فیصل جاوید، مظفر گڑھ۔ فلک بانو، چاندنی نگر۔ نازی رحمٰن، چشتیاں۔ محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور۔ ارشاد حسین، ضلع خوشاب۔ محمود وسیم خان، پشاور۔ مہتاب احمد، حیدرآباد۔ شاہین تبسم، کراچی۔ انجم کمال، سکھر۔ ثنا صادق، کراچی۔ عاصم خان، فیصل آباد۔ اختر حسین، ملتان۔

مکڑجال

کاشف زبیر

عالمی معاشی اور سیاسی نظام کی رگوں میں صیہونیت ایک سڑے ہوئے ناسور کی طرح تیزی سے سرایت کرتی جارہی ہے... کہا جاتا ہے کہ ہٹلر یہودیوں کے خون کا پیاسا تھا لیکن آج اندازہ ہوتا ہے کہ اسے ان کے مذہب سے کوئی پرخاش نہیں تھی، اس کی دوربیں نگاہیں ان کے بطن سے پھوٹنے والی اُن سازشوں اور نفرتوں کو دیکھ رہی تھیں جو آج ایک وبال بنی ہوئی ہیں... ان کی سفاکی، خودغرضی اور زہرناکی کے ہولناک پیچ و خم میں گندھی ہوئی ایک چشم کشا کہانی جو قارئین پر سوچ اور فکر کی راہیں کھول دے گی... فرعون کی خدائی کے لیے عصائے موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی بے آواز لاٹھی کا کام کیا... دورِ جدید کے فرعونوں اور عفریتوں کے لیے بھی کہیں سے کوئی نہ کوئی عذاب ضرور نازل ہوگا...

ہر سیر کو سوا سیر ضرور ملتا ہے، وہ سیر تھے یا سوا سیر، یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے

رات کے بارہ بج کر پچاس منٹ ہو رہے تھے۔ عمارت کے چھٹے فلور پر اس چھوٹے سے تاریک کمرے میں صرف لیپ ٹاپ کی اسکرین روشن تھی۔ وہ لیپ ٹاپ پر جھکا کی بورڈ پر انگلیاں چلا رہا تھا۔ جیسے جیسے اسکرین بدل رہی تھی، اس کے چہرے کا رنگ بھی بدلتا جا رہا تھا۔ کمرا معمولی فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ایک طرف ایک چھوٹا بیڈ تھا اور بستر پر کچھ کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ لیپ ٹاپ والی میز پر... کولڈ ڈرنک کے خالی ٹن اور باہر سے آئے تیار کھانوں کے خالی ڈبے بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ یہاں اکیلا رہتا ہے اور یہ بات درست تھی۔ گزشتہ ایک ہفتے سے چوبیس گھنٹوں میں وہ بمشکل چند گھنٹوں کے لیے کمپیوٹر کے سامنے سے اٹھا تھا۔ بالآخر اسے جس چیز کی تلاش تھی، وہ اسے مل گئی۔ چند فائلیں اس کے لیپ ٹاپ میں ڈاؤن لوڈ ہو رہی تھیں۔

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ اس کام میں اتنا مگن تھا کہ اسے اپنے ساتھیوں سے بات کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اس کا ارادہ تھا کہ یہ کام مکمل ہونے کے بعد ان سے رابطہ کرے گا۔ وہ کامیابی کے قریب تھا۔ اس نے کرسی پیچھے کرکے انگڑائی لی اور اٹھ کر کھڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ کھڑکی بند تھی کیونکہ باہر شدت کی سردی تھی مگر اسے تازہ ہوا کی اتنی خواہش تھی کہ اس نے سردی کی پروا کیے بغیر کھڑکی کھول دی اور سر باہر نکالا۔ باہر تاریکی تھی اس لیے کوئی امکان نہیں تھا کہ کوئی اسے دیکھ لیتا۔ اس کا اپارٹمنٹ عقبی گلی کی طرف تھا اور اسی وجہ سے اس کی توجہ گلی میں آنے والی سیاہ وین کی طرف گئی۔ وہ رینگنے والے انداز میں چل رہی تھی اور پھر آکر رک گئی اور اس کا سلائڈنگ ڈور کھلا۔ اس میں سے ایک ایک کرکے چھ سیاہ پوش اترے۔ ان کا مخصوص انداز اور ہاتھوں میں موجود رائفلیں دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا اور جیسے ہی انہوں نے عمارت کی عقبی سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں، وہ تیزی سے بیڈ کی طرف لپکا اور گدے کے نیچے سے پستول نکال لیا۔ پھر وہ تیزی سے لیپ ٹاپ کی طرف آیا۔ ڈاؤن لوڈنگ جاری تھی اور اسے مکمل ہونے میں کچھ وقت لگتا۔ اس نے کچھ سوچا اور اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر چلنے لگیں۔ وہ ایک ای میل لکھ رہا تھا۔ ابھی اس نے چند بٹن دبائے تھے کہ اپارٹمنٹ کے باہر قدموں کی دھمک سنائی دینے لگی۔

وقت نہیں تھا، اس نے تیزی سے صرف ایک لفظ لکھا۔ اپنا مخصوص ای میل گروپ منتخب کیا اور جیسے ہی دروازے پر پہلی ضرب لگی، اس نے سینڈ کا بٹن دبا دیا۔ جیسے ہی میل... سینڈنگ کا اشارہ آیا، اس نے پھرتی سے لائٹر نکالا اور اسے توڑ کر اس کی گیس لیپ ٹاپ پر گرادی۔ دروازے پر پڑنے والی ضربوں کو نظر انداز کرکے اس نے ماچس کی تیلی جلا کر لیپ ٹاپ پر پھینک دی۔ ''بھک'' کی آواز کے ساتھ لیپ ٹاپ نے آگ پکڑلی اور اسی لمحے باہر سے دروازے کے لاک پر برسٹ مارا گیا۔ لاک ٹوٹ گیا اور دروازہ کھل گیا۔ وہ پھرتی سے مڑا اور اندر آنے والے پہلے سیاہ پوش پر گولی چلا دی۔ وہ اچھل کر پیچھے گیا۔ اس کے عقب میں آنے والے دوسرے سیاہ پوش نے رائفل کا ٹریگر دبایا۔ کمرے میں موجود شخص جھٹکے سے پیچھے گیا۔ گولی اس کے سینے پر بائیں طرف دل سے ذرا اوپر لگی تھی۔ میز سے ٹکرا کر وہ نیچے گر پڑا اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نے تاریک ہوتی آنکھوں سے دیکھا۔ سیاہ پوش لیپ ٹاپ میں لگی آگ بجھانے کی ازحد کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے تاریک ہوگئیں۔ لیکن مرنے سے پہلے اسے معلوم ہوگیا تھا کہ آنے والے کون تھے۔ وہ آپس میں عبرانی زبان میں بات کر رہے تھے۔

☆☆☆

اس واقعے کے چالیس منٹ بعد سیاہ وین ایتھنز کے صنعتی علاقے میں ایک گودام کے سامنے رکی۔ ہارن بجتے ہی گودام کا دروازہ کھل گیا اور وین اندر چلی گئی۔ ایک چھوٹے سے کباڑ خانے نما کمپاؤنڈ میں موجود تین افراد جدید ترین مواصلاتی آلات کی مدد سے اس آپریشن کی نگرانی کر رہے تھے۔ سیاہ وین سے مارے جانے والے سیاہ پوش کی لاش اتاری گئی۔ وہاں موجود ایک شخص نے آنے والوں سے پوچھا۔ ''کچھ ملا؟''

لیکن جواب میں صرف ناکامی ہی ملی۔ اس نے دوبارہ پوچھا۔ ''ہمارے ماہرین مواصلاتی رابطوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ انہوں نے جان لیا کہ کوئی ہمارے کمپیوٹرز میں گھس کر مداخلت کر رہا ہے۔''

''اسے روکا نہیں گیا؟''

''اگر اسے روک دیتے تو پھر اس کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ ہم نے اس کے بارے میں جان لیا ہے۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ''عمارت کے منیجر کا کہنا ہے کہ وہ ایک مہینے سے وہاں مقیم تھا اور سوائے چند گھنٹوں کے باقی سارا وقت فلیٹ میں گزارتا تھا۔ اس نے اپنا نام موبین میسکا بتایا تھا۔ بہرحال ہمارے پاس اس کی شناخت کے لیے ایک چیز تو ہے۔''

''وہ کیا؟''

''اس کا چہرہ۔''

☆☆☆

16 مارچ، تل ابیب، اسرائیل

موساد کے ہیڈکوارٹر کی سب سے نچلی منزل پر چند اعلیٰ ترین افسران کا اجلاس جاری تھا۔ ان کی میز کے سامنے کمپیوٹر اسکرین پر وہ آپریشن دکھایا جارہا تھا جس میں موبین نامی شخص کو اس کے اپارٹمنٹ میں ہلاک کیا گیا تھا۔ موبین کا چہرہ نمایاں تھا جس پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ جنرل بازک نے ایشکوف کی طرف دیکھا۔ اس کا انداز سرد تھا۔ ''تم جانتے ہو، ہم کس مشکل میں پڑ گئے ہیں۔''

ایشکوف کا چہرہ بھی متفکر تھا لیکن اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور صرف سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ کلورمین نے اپنے سامنے رکھی فائل کی طرف دیکھا۔ ''خوش قسمتی سے ہمیں

www.paksociety.com

ان تمام افراد کے ای میل پتے مل گئے ہیں جن پر موبین نے آخری میل کی تھی۔ ان ای میل پتوں کی مدد سے ہمیں ان تمام افراد کا پتا چلانا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ ہمارے منصوبے کے بارے میں کچھ جان سکیں، ان کا وجود دنیا سے مٹا دینا ضروری ہے۔''

''یہ کام کرنا ہوگا۔'' ایشکوف بولا۔ وہ نسلاً روسی اور مذہباً یہودی تھا۔ اس کے آباؤاجداد صدیوں سے روس میں آباد تھے، اسرائیل سے وفاداری اس کے خون میں شامل تھی۔ اس لیے جب اسے موساد میں کام کرنے کا موقع ملا تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہچکچایا۔ اپنی نمایاں کارکردگی کی وجہ سے اب وہ یورپ میں موساد کا سربراہ تھا۔ ایشکوف نے کلورمین کی طرف دیکھا۔ ''موبین کے بارے میں معلوم ہوا، یہ کون ہے؟''

کلورمین موساد کے تجزیاتی شعبے کا سربراہ بھی تھا اور یہ اس کا پسندیدہ شعبہ تھا، وہ فوراً شروع ہوگیا۔ ''ہارڈ ڈسک سے حاصل ہونے والی معلومات سے اس کی شخصیت پر کوئی روشنی نہیں پڑی۔ ہم صرف یہ جان سکے ہیں کہ وہ ہمارے سسٹم سے کیا معلوم کرچکا تھا۔ ہمارے ماہرین نے تصویر کی مدد سے اس کی اصل شخصیت کھوج نکالی ہے۔ وہ البانوی نژاد مسلمان ہے اور اس کا نام مبین مسکان ہے۔ البانیہ کی کمیونسٹ حکومت سے بغاوت کے جرم میں اسے گرفتار کرکے سزائے موت سنائی گئی تھی لیکن یہ سزا سے پہلے اپنے ساتھیوں کی مدد سے فرار ہونے میں کامیاب رہا۔ وہ امریکا چلا گیا جہاں اسے سی آئی اے نے بھرتی کرلیا.... سی آئی اے نے اس کی کمیونسٹوں سے نفرت کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اسے افغان جنگ میں استعمال کیا۔ جب روسی فوج افغانستان سے چلی گئی تو مبین نے سی آئی اے سے علیحدگی اختیار کرلی یا اسے ملازمت سے نکال دیا گیا۔ وجہ کا علم نہیں ہے۔ وہ واپس البانیہ چلا گیا اور زیرِزمین رہ کر حکومت کے خلاف کام کرنے لگا۔ اس کے بعد سے اس کے بارے میں ہمارے پاس کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔''

''سی آئی اے کے پاس بھی نہیں ہے؟'' ایشکوف نے پوچھا۔

''نہیں اگر ان کے پاس ہے، تب بھی انہوں نے ہمیں نہیں بتایا ہے۔'' کلورمین نے کہا۔ ''ہم زیادہ انکوائری بھی نہیں کرسکتے کہ ہمارے دوست نہ چوکنا ہوجائیں۔''

''یہ معاملہ بہت خفیہ ہے، سوائے ہم تین افراد کے اور کوئی اس منصوبے کے بارے میں نہیں جانتا۔'' جنرل بازک نے کہا۔

کلورمین بولا۔ ''ایک اور شخص واقف ہے... ٹی ون۔''

''ہاں لیکن اسی نے تو ہمیں اس خطرے سے آگاہ کیا ہے۔'' جنرل بازک نے جواب دیا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں بتا رہی تھیں کہ وہ کوئی خاص بات سوچ رہا ہے۔ ''کیا ہمارے پاس ان مسلمانوں کی فہرست ہے جنہیں سی آئی اے نے افغان جنگ کے دوران میں بھرتی کیا تھا؟''

کلورمین اور ایشکوف چونک گئے۔ کلورمین نے کہا۔ ''بالکل ہونی چاہیے۔'' اس نے کہتے ہوئے سامنے رکھے کی بورڈ پر انگلیاں چلانا شروع کردیں۔ سامنے اسکرین پر موساد کا خفیہ ترین ڈیٹا بیس کھل رہا تھا۔ کلورمین اس میں تلاش کرنے لگا۔ چند منٹ کے اندر اسکرین پر ناموں کی ایک فہرست مع تصاویر کے آگئیں۔ یہ کوئی ایک درجن افراد تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں سی آئی اے نے افغان جنگ کے دوران کسی مقصد کے تحت شامل کیا تھا۔

جنرل بازک نے کہا۔ ''اب ہمارے پاس کچھ نام اور تصاویر بھی ہیں۔ انہیں ای میل پتوں سے ملا کر دیکھو، مجھے یقین ہے ہم نتیجہ حاصل کرلیں گے۔''

کلورمین پُرجوش ہوگیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو جنرل... مجھے یقین ہے کہ ہم ان لوگوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اور جب بھی ایسا ہوا، ہم انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیں گے۔''

''یہ کام پوری احتیاط اور اس یقین کے ساتھ کرنا ہے کہ مارے جانے والے شخص سے آگے کسی کو علم نہیں ہے۔'' جنرل بازک نے حکمتِ عملی بیان کی۔ ایشکوف نے مستعدی سے کہا۔

''ایسا ہی ہوگا۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''تم واپس جاؤ اور اپنی ساری توجہ منصوبے پر رکھو۔ اس کی کامیابی اسرائیل کی بقا کے لیے نہایت ضروری ہے۔'' جنرل بازک نے کہا اور میٹنگ برخاست کردی۔

☆☆☆

2 اپریل، ایبک آباد، ترکمانستان

بحیرۂ کیسپین کے ساحل سے چند میل دور پہاڑوں میں آباد اس چھوٹے سے قصبے کے آس پاس برف تقریباً پگھل چکی تھی اور بہار کے آثار نظر آرہے تھے۔ چھوٹے قد کے لیکن مضبوط جسم کے گھوڑے پر سوار سلطان احمد مقامی ڈاک خانے کی عمارت تک پہنچا۔ پوسٹ ماسٹر جلال الی اس

کے دوستوں میں سے تھا۔ اس نے گرم جوشی سے سلطان احمد کا استقبال کیا۔ سلطان تقریباً پچاس برس کا لیکن صحت مند اور خوب صورت نقوش والا مرد تھا۔ خاص طور سے اس کی ہلکی براؤن آنکھیں دیکھنے والے کو متاثر کرتی تھیں۔ رنگ گورا اور نقوش کھڑے تھے۔ براؤن بالوں میں سفیدی کا عنصر نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے سلطان اپنی عمر سے دس بارہ سال کم لگتا تھا۔ جلال ابی اور قصبے کے دوسرے لوگ اس کے بارے میں اتنا نہیں جانتے تھے۔ وہ کہاں سے آیا تھا، کسی کو کچھ پتا نہیں تھا لیکن ان پندرہ برسوں میں اس نے تقریباً سارے قصبے کو اپنا دوست بنالیا تھا اور شاید ہی کوئی فرد اسے ناپسند کرتا ہو۔ جب وہ یہاں آیا تو اس کے ساتھ صرف اس کی بیوی تھی اور اب اس کے تین بچے بھی تھے۔

''سلیم! تمہارے لیے کافی منگواؤں یا قہوہ؟'' جلال ابی نے پوچھا۔ وہ یہاں سلیم یار خان کہلاتا تھا۔ اس کے اصل نام سے سوائے اس کی بیوی کے اور کوئی واقف نہیں تھا۔

''نہیں، شکریہ جلال! میں یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا تم سے پوچھتا چلوں کہ میری کوئی ڈاک آئی ہے؟''

جلال ابی ہنسا۔ ''دوست! جب سے تم یہاں آئے ہو تو تمہارے لیے مشکل سے دو تین بار ڈاک آئی ہے لیکن تم باقاعدگی سے پوچھتے ہو۔''

''اسی بہانے تم سے ملاقات ہو جاتی ہے۔'' وہ بھی ہنسا۔ ''ڈاک کے بارے میں تم نے نہیں بتایا؟''

جلال ابی سنجیدہ ہو گیا۔ ''ہاں، ایک ٹیلی گرام آیا ہے۔ ابھی چند منٹ پہلے موصول ہوا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ خود تمہیں دے آؤں۔ اتفاق سے تم خود آگئے۔''

جلال ابی نے ایک بند لفافہ اس کے حوالے کیا۔ سلطان احمد نے لفافہ کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور جلال ابی کا شکریہ ادا کر کے باہر آگیا۔ لوگ موسم بہار کے استقبال کی تیاری کر رہے تھے۔ سڑکوں اور گھروں کی صفائی کی جا رہی تھی اور سرما کے دوران گھروں کو موسم سے ہونے والے نقصان کی مرمت کی تیاری جاری تھی۔ یہ معمول تھا۔ خود سلطان کو اپنے مکان کی چھت کی مرمت کرنا تھی۔ شدید برف باری نے اسے نقصان پہنچایا تھا۔ اس کا مکان پہاڑی کے سب سے اوپری حصے میں تھا۔ جیسے ہی اس کا گھوڑا احاطے میں داخل ہوا، اس کی سترہ سالہ بیٹی آمنہ دوڑتی ہوئی اندر سے نمودار ہوئی۔ وہ لڑکپن اور جوانی کی سرحد پر کھڑی پیاری سی لڑکی تھی۔ موسم کی مناسبت سے اس نے گرم لباس پہن رکھا تھا۔ وہ آتے ہی باپ سے لپٹ گئی۔

''بابا آپ آگئے؟''

سلطان ہنسنے لگا۔ ''ایسا لگ رہا ہے کہ میں سال بھر بعد گھر آیا ہوں۔ ابھی دو گھنٹے پہلے تو نکلا تھا۔''

آمنہ مسکرانے لگی۔ ''مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ آپ بہت دیر بعد آئے ہیں۔''

''پاگل...'' اس نے آمنہ کے سر پر پیار کیا اور گھوڑا اصطبل کی طرف لے جاتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہاری ماما کیا کر رہی ہیں؟''

''ماما پلاؤ بنا رہی ہیں۔''

ان کا کتا باش بھی آگیا۔ یہ شاندار قسم کا رکھوالی والا کتا تھا اور اس کے ہوتے ہوئے کسی کی مجال نہیں تھی کہ سلطان کے فارم میں قدم رکھ سکے۔ وہ محافظ بھی تھا اور بچوں کا دوست بھی لیکن اسے گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ باہر ہی رہتا تھا جہاں ابراہیم اور اسحاق نے مل کر اس کے لیے لکڑی سے خوب صورت سا گھر بنایا تھا۔ وہ سلطان کے آس پاس منڈلانے لگا۔ سلطان اس کا سر تھپتھپا کر اندر آیا تو پورے گھر میں پلاؤ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں بیٹے لکڑی کے ٹکڑوں کی مدد سے گھر بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ابراہیم پندرہ سال کا تھا اور اسحاق بارہ سال کا تھا مگر اسحاق زیادہ تیز تھا، البتہ ابراہیم بڑا ہونے کی وجہ سے اپنی چلاتا تھا اور اس کی کم سنتا تھا۔ سلطان نے کوٹ اور جوتے اتارے اور قالین پر بیٹھ گیا۔ آمنہ نے جلدی سے اس کا کوٹ اور جوتے لے جا کر اپنی جگہ رکھے۔ گھر کی نشست گاہ میں بڑے دبیز اور شاندار قالین بچھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ کشن اور گاؤ تکیے رکھے تھے۔ آسیہ نے کچن سے جھانکا۔

''آگئے آپ... آپ کے لیے کافی لاؤں؟''

''نہیں۔'' اس نے پاؤں پھیلاتے ہوئے انکار کر دیا۔ ''کھانے کے بعد بنا دینا۔''

آسیہ تقریباً چالیس برس کی خوب صورت اور چھریرے جسم والی عورت تھی۔ گھر کے سادہ سے حلیے میں بھی وہ اپنی عمر سے دس سال کم لگ رہی تھی۔ اس نے سلطان سے صرف محبت ہی نہیں کی تھی بلکہ اس کی خاطر بہت کچھ چھوڑ بھی دیا تھا۔ اب اس کی زندگی کا محور سلطان، بچے اور یہ گھر تھا۔ لڑکوں کی نسبت آمنہ باپ کے بہت قریب تھی۔ سلطان بھی ... اپنی بیٹی سے محبت کرتا تھا۔ وہ اسے جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی اور اسے بتانے لگی کہ اس بار وہ موسم بہار کا لباس خود بنائے گی اور اس پر خود موتی اور دوسری چیزیں لگائے گی۔ وہ خوش تھی کہ اس بار سرما ذرا

طویل ہے اس لیے اسے اپنا لباس تیار کرنے کا موقع ملے گا۔ اپریل کے آغاز میں بھی برف موجود تھی۔ سلطان توجہ سے اس کی بات سننے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ توجہ مرکوز نہیں کر پا رہا تھا کیونکہ اس کا دھیان اس لفافے کی طرف تھا جو اس کے کوٹ کی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ وہ ابھی اسے نہیں دیکھنا چاہتا تھا اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ لفافہ اس کے لیے پریشانی کا باعث بنے گا۔ کچن سے آسیہ نے آواز دی۔ ''کھانا بن گیا ہے۔ ابراہیم اور اسحاق تم دونوں.... دسترخوان بچھاؤ اور آمنہ، تم یہاں میرے پاس آؤ۔''

بچوں نے ماں کے ساتھ مل کر کھانا لگایا۔ آسیہ نے بہت ذائقے دار پلاؤ بنایا تھا اور سب بہت رغبت سے کھا رہے تھے سوائے سلطان کے۔ اس کا ذہن ابھی تک لفافے میں اٹکا ہوا تھا۔ جیسے تیسے اس نے کھانا ختم کیا۔ ہاتھ دھو کر وہ کوٹ کے پاس آیا تو آسیہ بھی اس کے پیچھے آئی۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ اس کا شوہر کچھ پریشان ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کیا بات ہے... کوئی مسئلہ ہے؟''

سلطان اور آسیہ بچوں کے سامنے مسائل پر بات کرنے سے گریز کرتے تھے۔ بچے اس وقت برتن اور... دسترخوان سمیٹ رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ''شاید... لیکن ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ایک ٹیلی گرام آیا ہے۔'' اس نے کہا اور کوٹ سے لفافہ نکال کر اپنے کمرے میں آگیا۔ آسیہ نے اس کے پیچھے آنے سے گریز کیا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو سلطان اسے ضرور بتائے گا۔ آتش دان کے سامنے کرسی پر دراز ہوتے ہوئے اس نے لفافہ کھولا۔ ٹیلی گرام بلغاریہ صوفیہ سے آیا تھا۔ اس میں صرف ایک سطر تھی۔

''کاروبار کا موقع آگیا ہے، وقت اور مقام تم فون کر کے معلوم کر سکتے ہو۔''

سلطان کی پیشانی پر بل آگئے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پیغام واضح ہے لیکن کیا یہ بہت دیر سے نہیں ہے؟ اس سے پہلے آخری ٹیلی گرام دس سال پہلے آیا تھا۔ دس سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ وہ سوچتا رہا۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے اپنے دوستوں سے کچھ عہد کیے تھے۔ اپنے تحفظ کے لیے کچھ طریقہ کار متعین کیے تھے۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا۔ بین السطور پیغام بتا رہا تھا کہ کوئی بہت بڑا مسئلہ ہو گیا ہے اور ان کی بقا کو خطرہ لاحق ہو چکا ہے کیونکہ یہ ٹیلی گرام وہاں سے نہیں آیا تھا جہاں سے اسے آنا چاہیے تھا۔ وہ ٹیلی گرام ہاتھ میں لیے سوچ رہا تھا کہ آسیہ اندر آئی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے سلطان کی طرف دیکھا تو اس نے ٹیلی گرام آسیہ کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اس کی رازدار بھی تھی۔ اس نے لے کر پڑھا اور گہری سانس لے کر بولی۔

''آپ کو جانا ہے؟''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' سلطان نے اس سے ٹیلی گرام لیا اور اسے لفافے سمیت ٹکڑے ٹکڑے کر کے آتش دان میں ڈال دیا۔ آسیہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''اس بات کو بیس سال سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔''

''ہاں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' اس نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ''میرا بیگ تیار کر دو، مجھے جانا ہے۔''

آسیہ ہراساں نظر آنے لگی۔ ''آپ کب تک واپس آئیں گے؟''

''ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' اس نے جواب دیا اور الماری کی طرف بڑھ گیا۔

''اچھا، کب تک جانا ہے؟''

''میں آج شام ہی اشک آباد کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔'' سلطان نے کہا اور اپنی الماری سے ایک چھوٹا سا... بریف کیس نکالا۔ اس میں نمبروں والا تالا لگا ہوا تھا۔ اس نے نمبر ملا کر اسے کھولا اور اس میں سے ایک مضبوط خاکی کاغذ والا بند لفافہ نکال کر بریف کیس بند کر دیا۔ اس نے لفافہ اس بیگ کی اندرونی جیب میں رکھ دیا جسے آسیہ سفر کے لیے تیار کر رہی تھی۔ اس نے سلطان کے دو سوٹ اور ایک نائٹ سوٹ رکھا۔ اس دوران میں اس نے سرد موسم کی پروا نہ کرتے ہوئے غسل کیا اور لباس تبدیل کیا۔ وہ نیچے آیا تو اس کے بیٹوں نے توجہ نہیں دی لیکن آمنہ چونکنا ہو گئی۔

''بابا! آپ کہیں جا رہے ہیں؟''

سلطان نے سر ہلایا۔ ''ہاں اشک آباد جا رہا ہوں چند دن کے لیے۔''

''لیکن کیوں بابا؟'' آمنہ بے چین ہو گئی۔ اس نے اپنے باپ کو بہت کم گھر سے دور جاتے دیکھا تھا اور وہ بھی ایک دو دن کے لیے۔

''کام سے بابا کی جان۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''بس چند دن میں لوٹ آؤں گا۔''

اس کے مبہم الفاظ سے آمنہ کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ ''کتنے دن میں بابا؟''

''ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ چار پانچ دن لگ سکتے ہیں یا ہو سکتا ہے اس سے بھی کچھ زیادہ دن لگ جائیں۔ تم اس

www.paksociety.com

دوران میں اپنی ماما اور بھائیوں کا خیال رکھنا۔"

آمنہ سمجھ گئی کہ اس کا باپ کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں ہے اس نے بے دلی سے کہا۔ "ٹھیک ہے بابا۔"

سلطان نے بیٹی کے سر پر پیار کیا۔ پھر اس نے بیٹوں کو پیار کیا اور انہیں خبردار کیا کہ وہ اپنی ماں اور بہن کو تنگ کرنے کے بجائے ان کا خیال رکھیں۔ بچوں سے مل کر وہ اوپر آیا تو فکرمند آسیہ اسے دیکھ کر جلدی سے مسکرانے لگی۔ سلطان نے نرمی سے آسیہ کو بازوؤں میں لے لیا۔ "تم فکر مت کرو۔"

"فکر تو ہوگی، میں اس سے خود کو نہیں روک سکتی لیکن میں آپ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ میں دعا کروں گی کہ اللہ آپ کو خیریت سے واپس لائے۔"

"مجھے تم سے یہی توقع ہے۔ آسیہ! تمہیں معلوم ہے چرمی بیگ میں ایک چابی اور ایک فلیٹ کا پتا ہے۔"

"ہاں، مجھے معلوم ہے۔"

"اگر میں چار دن تک واپس نہ آؤں تو تم بچوں کو لے کر وہاں چلی جانا اور اس بارے میں کسی کو نہیں بتانا۔" سلطان نے حکم دینے والے انداز میں کہا۔ "بیگ میں رقم بھی ہے۔ تمہیں اور بچوں کو پریشانی نہیں ہوگی۔"

"پلیز! ایسی بات مت کریں۔" آسیہ روہانسی ہوگئی۔ "میں اور بچے آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

"دنیا میں کوئی انسان ناگزیر نہیں ہوتا اور کس نے کب چلے جانا ہے، یہ اللہ کو معلوم ہے۔ اس لیے تم خود کو مضبوط کرو تاکہ مجھے اطمینان رہے کہ اگر میں واپس نہیں آیا تو تم بچوں کو اچھی طرح سنبھال سکوگی۔"

آسیہ خود کو سنبھال رہی تھی لیکن آنسو اس کے اختیار میں نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے آسیہ نے خود پر قابو پایا اور وہ نیچے آئے۔ ابراہیم اور اسحاق بھی فکرمند تھے۔ وہ باپ سے لپٹ گئے آمنہ تو اسے چھوڑ ہی نہیں رہی تھی۔ بمشکل اس نے بچوں کو سمجھایا۔ وہ بیگ اٹھا کر باہر آیا تو ابراہیم بھاگ کر گھوڑا لے آیا۔ "بابا! میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ آپ کو اسٹاپ پر چھوڑ کر واپس آجاؤں گا۔"

ابراہیم ماہر گھڑ سوار تھا اس لیے سلطان نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اپنے مالک کو کہیں جانے کے لیے تیار دیکھ کر باش بے چین ہوگیا۔ وہ سلطان کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ سلطان نے اس کا سر سہلایا۔ "باش! تم اس گھر کے ایک فرد ہو اور اس کی حفاظت تمہاری ذمے داری ہے۔"

باش جلدی سے سیدھا اور تن کر کھڑا ہوگیا جیسے سلطان کو بتا رہا ہو کہ وہ اپنی ذمے داری پوری کرے گا۔ سلطان نے بیگ گھوڑے کی زین سے باندھا اور پھر اچھل کر سوار ہوگیا۔ اس نے بازو سے تھام کر ابراہیم کو اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ جب وہ دونوں باپ بیٹے ڈھلان سے نیچے جا رہے تھے تو آسیہ اور آمنہ کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

☆☆☆

12 اپریل، کاسک، پولینڈ

ایشکوف، سیف چینل سے تل ابیب میں موجود موساد کے ہیڈ کوارٹر سے رابطے میں تھا۔ یورپ میں موساد کا دفتر پولینڈ میں تھا۔ ایشکوف یہاں روسی مہاجر کی حیثیت سے موجود تھا۔ اس نے پولینڈ کی شہریت حاصل کرلی تھی اور پولش زبان روانی سے بولتا تھا۔ اس کی بیوی بھی مقامی عورت تھی لیکن وہ ایشکوف کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی کہ وہ ایک ٹریول ایجنٹ ہے اور اپنے کام کے سلسلے میں آئے دن سفر میں رہتا ہے۔ دوسری طرف جنرل بازک اور کلورمین تھے۔ ایشکوف نے کہا۔ "کام مکمل ہوگیا ہے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ یہ معاملہ ان سے آگے نہیں گیا ہے؟" کلورمین نے کہا، اس کے لہجے میں شک تھا۔

"مجھے پختہ یقین ہے کیونکہ صرف ایک لفظ سے وہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس بارے میں زیادہ سوچتے، ہم نے انہیں صفحۂ ہستی سے نابود کردیا۔"

"ہمیں اس خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ہمارے منصوبے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" کلورمین نے سرد لہجے میں کہا۔ "ہمیں سو فیصد یقین ہونا چاہیے کہ یہ بات دوسرے لوگوں تک نہیں پہنچی ہے۔"

"دوسرے لوگ کون ہیں؟" ایشکوف نے پوچھا۔

"تم بھول رہے ہو۔ اس گروپ میں ایک درجن افراد شامل تھے۔"

"ہاں لیکن پانچ افراد ان سے الگ ہوگئے تھے اور ان کا کچھ پتا نہیں ہے۔"

"انہیں تلاش کرنا بھی ضروری ہے اور ٹھکانے لگانا بھی۔" جنرل بازک نے کہا۔ "میں نے یہ کام ٹی ون کے سپرد کردیا ہے۔ وہ انہیں تلاش کرے گا۔ تم اس سے مل کر کام کرو۔"

☆☆☆

رات نو بجے بس اشک آباد میں داخل ہوئی۔ وہ مرکزی بس ٹرمینل سے پہلے اتر گیا تھا۔ اشک آباد چھوٹا اور

کسی قدر پرانے انداز کا شہر ہے۔ سلطان نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اس کے گھر میں فون تھا۔ کھانے کے بعد وہ ایک پبلک کال بوتھ میں آیا اور اس نے پہلے گھر فون کیا۔ آسیہ اور بچوں سے مختصر بات کی اور انہیں اپنے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دی۔ فون بند کرکے اس نے مشین میں مزید سکے ڈالے اور ایک نمبر ملایا۔ دوسری طرف کچھ دیر بیل جاتی رہی پھر کسی نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو۔"

"میں بات کر رہا ہوں۔" سلطان نے نام لینے سے گریز کیا۔

"تم آرہے ہو؟"

"ہاں، ملاقات کہاں کرنی ہے؟"

"صوفیہ میں مرکزی کیتھڈرل دیکھا ہے؟ اس کے سامنے تین دن بعد صبح دس بجے۔"

"میں آجاؤں گا۔" اس نے کہا اور فون رکھ دیا۔ اس نے جان بوجھ کر ایسا بوتھ منتخب کیا تھا جو ویرانے میں تھا اور اسے کسی کی طرف سے بات سن لیے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ باہر نکل کر اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور ائرپورٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ اسے کوشش کے بعد اگلے دن کی ایک پرواز میں نشست مل گئی جو استنبول جا رہی تھی۔ استنبول سے اسے صوفیہ کے لیے کوئی نہ کوئی پرواز مل جاتی۔ پرواز صبح چھ بجے کی تھی اور اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے واپس جا کر کسی ہوٹل میں رکنے کے بجائے یہ وقت ائرپورٹ پر گزارنا بہتر سمجھا۔

☆☆☆

صوفیہ کے مرکزی کیتھڈرل کے سامنے وسیع پختہ میدان میں بے شمار افراد اور ہزاروں کی تعداد میں کبوتر تھے جنہیں لوگ باجرا اور دانہ ڈال رہے تھے۔ سردی کی شدت کے باوجود وہاں خاصے لوگ تھے۔ سلطان وہاں پہنچا تو اسے کہیں مطلوبہ شخص نظر نہیں آیا۔ سلطان آخری بار اس سے پندرہ سال پہلے ملا تھا اور وہ اس دنیا میں دوسرا شخص تھا جسے معلوم تھا کہ سلطان کہاں ہے۔ سلطان کو معلوم تھا کہ وہ وہاں آیا ہوگا لیکن وہ کہاں تھا؟ کیا وہ کسی وجہ سے نہیں آیا تھا یا کسی وجہ سے سامنے نہیں آرہا تھا؟ سلطان کے پاس اس سے رابطے کے لیے سوائے ایک فون نمبر کے اور کچھ نہیں تھا۔ اگر وہ دو گھنٹے کے اندر اس سے نہیں ملتا تو سلطان واپس چلا جاتا اور پھر فون پر رابطہ کرتا۔

استنبول سے اسے فوری فلائٹ مل رہی تھی لیکن اس نے اگلے دن کی فلائٹ لینا پسند کی۔ اس طرح ایک دن استنبول میں ٹھہرنے کا موقع مل گیا۔ وہ نیلی مسجد کے پاس ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھہرا تھا جہاں سے مسجد کے مینار صاف نظر آتے تھے۔ ماضی کے مقابلے میں موجودہ استنبول بہت صاف ستھرا، منظم اور خوبصورت شہر بن گیا ہے۔ ان بیس برسوں میں ترکی نے حیرت انگیز ترقی کی تھی۔

دوسرے دن وہ صوفیہ کے لیے روانہ ہوا۔ اس سے پہلے وہ صرف ایک بار یہاں آیا تھا اور وہ کوئی اچھی یاد نہیں تھی۔ بہرحال اب ماضی پیچھے رہ گیا تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اگر ماضی پیچھے رہ جاتا تو آج وہ یوں ایک ٹیلی گرام کے جواب میں اتنا طویل سفر نہ کر رہا ہوتا۔ صوفیہ میں بھی وہ ایک چھوٹے ہوٹل میں رکا۔ دوسرے دن وہ ناشتا کرکے ہوٹل سے روانہ ہوا اور پیدل چلتا ہوا کیتھڈرل تک آیا۔ اس دوران میں وہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ کوئی اس کی نگرانی تو نہیں کر رہا لیکن اسے ایسا کوئی شخص نظر نہیں آیا... اور اب وہ کیتھڈرل کے سامنے اس شخص کا انتظار کر رہا تھا جس کے بلاوے پر وہ اتنی دور سے آیا تھا۔ وقت سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ اس نے باجرے کا ایک پیکٹ لیا اور کبوتروں کو کھلانے لگا۔ تقریباً بیس منٹ میں اس نے پیکٹ خالی کر دیا۔ مزید چالیس منٹ انتظار کے بعد وہ یہاں سے واپس ہوٹل کے لیے روانہ ہوجاتا۔ وہ ایک بینچ پر بیٹھا تھا۔

"سر! پیکٹ چاہیے۔" نسوانی آواز پر اس نے سر گھما کر دیکھا۔ یہ کم عمر لڑکی تھی جس نے باجرے اور دانے کے پیکٹس کی ٹوکری اٹھا رکھی تھی۔

"نہیں۔" اس نے بلغاری زبان میں انکار کیا۔ وہ اس زبان سے واقف تھا۔ لڑکی نے اس کے انکار پر توجہ نہیں دی اور یوں ایک پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا جیسے اس نے ہاں کہا ہو۔

"سر پلیز... اسے لے لیں، ذرا احتیاط سے۔"

اسے لڑکی کا لہجہ عجیب لگا۔ اس نے پیکٹ کی طرف دیکھا تو اسے پیکٹ کے ساتھ لڑکی کے ہاتھ میں ایک سفید کاغذ نظر آیا۔ وہ مضطرب ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ لڑکی سے پیکٹ لے یا نہ لے۔ ممکن ہے پیکٹ کے ساتھ کاغذ لیتے ہی وہ کسی مشکل میں پڑ جائے۔ مطلوبہ آدمی کے نہ آنے سے اسے پہلے ہی تشویش ہو رہی تھی۔ وہ وقت گزاری کے لیے یوں جیبیں ٹٹولنے لگا جیسے ادائیگی کے لیے سکے تلاش کر رہا ہو۔

"ڈرو مت... مجھے فون والے نے بھیجا ہے۔" لڑکی

www.paksociety.com

نے کہا تو اس کی مشکل آسان ہو گئی۔ اس نے بٹوا نکال کر لڑکی کو ایک نوٹ دیا اور اس سے پیکٹ لے لیا۔ لڑکی فوراً آگے بڑھ گئی۔ اس نے نہایت مہارت سے کاغذ پیکٹ سے الگ کر کے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اس نے پیکٹ کھولا اور یوں سکون سے کبوتروں کو باجرا کھلانے لگا جیسے وہ اسی کام کے لیے یہاں آیا ہو۔ لیکن اس کی نظریں لڑکی پر مرکوز تھیں اور وہ لوگوں کے درمیان گھومتی ہوئی انہیں باجرے کے پیکٹ بیچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر وہ ایک طرف چل پڑی اور ذرا دیر بعد نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے جاتے ہی وہ بھی کھڑا ہو گیا اور اس نے ہوٹل کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ اس بار اس نے مختلف راستہ اختیار کیا اور اس بار بھی وہ کسی ایسے فرد کو تلاش نہیں کر سکا جو اس کی نگرانی کر رہا ہو۔ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے کوٹ کی جیب سے کاغذ نکالا۔ اس پر صرف ایک سطر لکھی تھی۔

”بوام پیلس رات نو بجے۔“

اسے بوام پیلس کا علم نہیں تھا۔ اس کی یہ مشکل فون ڈائریکٹری نے آسان کی اور بوام پیلس ایک ہوٹل ثابت ہوا۔ وہ رات آٹھ بجے بوام پیلس کے لیے روانہ ہوا۔ ٹیکسی نے آدھے گھنٹے بعد اسے اس شاندار ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ ہوٹل کی عمارت روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ داخلی دروازے سے اندر آنے کے بعد وہ لاؤنج کی طرف آیا۔ یہی ایک جگہ تھی جہاں اسے آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ ایک نمایاں جگہ صوفے پر بیٹھ گیا، فوراً ایک ویٹر اس کے پاس آیا۔ سلطان نے اسے کافی لانے کو کہا۔ چند منٹ بعد ویٹر نے اسے کافی لا کر اس کے سامنے گلاس ٹاپ میز پر رکھ دی۔ ہوٹل میں اوپری طبقے کے لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ اس نے کافی ختم کی اور اشارے سے اسی ویٹر کو بل لانے کو کہا۔ وہ بل لے کر آیا۔ سلطان ادائیگی کرنے جا رہا تھا کہ اس نے بل کے کونے پر باریک حروف میں لکھا دیکھا۔

”کمرا نمبر دو سو چوبیس۔“

اس نے ویٹر کی طرف دیکھا تو اس نے غیر محسوس انداز میں سر ہلایا۔ وہ تصدیق کر رہا تھا کہ یہ اسی کے لیے لکھا گیا ہے۔ سلطان نے بل کے ساتھ کچھ رقم ٹپ کے طور پر دی اور کھڑا ہو گیا۔ اس کا رخ لفٹ کی طرف تھا۔ اس نے دوسرے فلور کا بٹن دبایا۔ نیچے کی چہل پہل کے مقابلے میں دوسرا فلور خاموش اور سنسان تھا۔ وہ راہداری میں چلتے ہوئے کمروں کے نمبر دیکھ رہا تھا۔ دو سو چوبیس اسے بائیں طرف راہداری کے آخری حصے میں ملا۔ اس نے دستک دی۔ چند لمحے بعد کسی نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”سلطان احمد۔“ اس نے جواب دیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور جب اندر موجود شخص کو اطمینان ہو گیا کہ وہ اکیلا ہے تو اس نے پورا دروازہ کھول دیا اور تب سلطان احمد کو اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا پستول نظر آیا۔ اس کے اندر آتے ہی آدمی نے دروازہ بند کر دیا اور پستول اپنے کوٹ میں رکھتے ہوئے دونوں ہاتھ وا کر دیے۔ سلطان اس کے سینے سے لگ گیا۔ اس نے محبت سے پوچھا۔ ”احمد! کیسے ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ تریم پاشا! تم کیسے ہو؟“

تریم پاشا تقریباً پچاس برس کا تھا۔ وہ متوسط جسامت کا مالک تھا اور سر بالوں سے عاری ہو چکا تھا۔ سرخی مائل رنگت اور کھڑے نقوش کی وجہ سے وہ یورپ کا باشندہ لگتا تھا۔ اپنی متوسط جسامت کے باوجود اس کی حرکات و سکنات میں ایک خاص کیفیت پائی جاتی تھی جیسے وہ بہت تیز اور چست آدمی ہو۔ ”میں بھی ٹھیک ہوں لیکن یہاں سب ٹھیک نہیں ہے۔ بہت گڑبڑ ہو چکی ہے۔“

”یہ تو میں تمہارا ٹیلی گرام ملتے ہی سمجھ گیا تھا۔“ سلطان نے کہا۔ ”باقی لوگ ٹھیک ہیں؟“

”نہیں۔“ تریم پاشا نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”ان میں سے کوئی زندہ نہیں ہے۔“

سلطان کو جھٹکا لگا۔ ”مبین، فہد، صادق، نعمانی اور مصطفیٰ؟“

”ان میں سے کوئی زندہ نہیں ہے۔“ تریم پاشا نے اپنے کان کی لو مسلتے ہوئے کہا۔ ”دشمن ہماری راہ پر لگ گیا ہے۔“

سلطان سوچ رہا تھا۔ ”یہ سب کب ہوا؟“

”گزشتہ دس دن کے اندر۔“ تریم پاشا بولا۔ ”مبین ایتھنز میں مارا گیا۔ فہد اپنے تمام اہل خانہ کے ساتھ مراکش میں قتل کر دیا گیا۔ صادق کو سسلی میں اس کی گرل فرینڈ کے ساتھ نشانہ بنایا گیا۔ نعمانی اسپین میں اور مصطفیٰ لبنان میں اسرائیلیوں کا نشانہ بنا۔“

سلطان کو دوسرا جھٹکا لگا۔ ”اسرائیلی... لیکن میں سمجھا کہ شاید سی آئی اے والے...“

”پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا۔“ تریم نے اپنے لیے ایک گلاس میں برانڈی نکالی۔ اس نے سلطان کو پیش کش نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ نہیں پیتا۔ ”مگر صادق کے قتل میں سسلی میں تعینات موساد کا اسپیشل یونٹ ملوث ہے۔ پولیس اس ہوٹل کے ایک کیمرے سے قاتلوں کی فوٹیج حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اس سے پتا چلا کہ یہ اسرائیلیوں کا کام ہے۔ قاتل اپنا کام کرتے ہی سسلی سے نکل گئے تھے، اس لیے پولیس کسی کو گرفتار نہیں کر سکی۔ باقیوں کے بارے میں بھی نوّے فیصد امکان یہی ہے کہ ان کے قتل میں اسرائیلی ملوث ہیں۔“

”اسرائیلیوں کو ہم سے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟“ سلطان نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم لوگ کسی پروجیکٹ پر کام کر رہے ہو؟“

تریم پاشا نے شانے اچکائے۔ ”میں اپنی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ میں کسی پروجیکٹ میں ملوث نہیں ہوں۔“

سلطان بہ غور اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تریم پاشا بہت گہرا آدمی ہے۔ اگر وہ کوئی راز چھپانے کا فیصلہ کر لے تو دنیا کی کوئی طاقت اس سے اگلوا نہیں سکتی۔ ”پھر بھی کوئی نہ کوئی وجہ تو سامنے آئی ہوگی۔ اسرائیلی کوئی قدم بلاوجہ نہیں اٹھاتے ہیں۔ خاص طور سے یورپ کی حد میں وہ کوئی کام کرتے ہوئے بہت محتاط رہتے ہیں۔ آج کل وہ ویسے بھی ذاتی طور پر کم حرکت میں ہیں۔“

”یہ درست ہے اور میری سمجھ میں بھی یہی آ رہا ہے کہ اس کے پس پشت کوئی بہت اہم وجہ ہے۔“

”تمہارے سامنے کچھ نہیں آیا؟“ سلطان نے اس بار براہ راست پوچھ لیا۔ تریم پاشا نے سر ہلایا اور ایک طرف رکھا اپنا لیپ ٹاپ آن کر کے اس نے اپنا ای میل اکاؤنٹ کھولا اور ایک میل کھول کر لیپ ٹاپ اس کی طرف گھما دیا۔

”یہ دیکھو، شاید اس سے کچھ سمجھ میں آئے۔“

ای میل مبین کی طرف سے تھی اور تریم پاشا کو پندرہ مارچ کی رات بارہ بج کر باون منٹ پر ملی تھی۔ اس میں صرف ایک لفظ لکھا تھا۔ لفظ انگریزی میں تھا لیکن اس کی ادائیگی مختلف انداز میں کی گئی تھی۔ یہ لفظ ”حشاشین“ تھا۔ سلطان نے سوالیہ نظروں سے تریم پاشا کی طرف دیکھا۔ ”حشاشین؟ انگریزی والا اسے سین، یعنی قاتل۔“

تریم پاشا نے ایک گھونٹ لیا اور سر ہلایا۔ ”اصل لفظ حشاشین ہی ہے۔ تم نے تاریخ پڑھی ہو تو حسن بن صباح کا نام سنا ہوگا۔ اس کے تربیت یافتہ خودکش قاتل حملہ آور حشاشین کہلاتے تھے کیونکہ ان کو بھنگ یا حشیش کے زیر اثر حسن بن صباح کے احکامات کی تعمیل کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ وہ اپنا کام مکمل کرتے ہی خودکشی کر لیتے تھے۔“

”میں نے پڑھا ہے لیکن مبین کو صرف یہ ایک لفظ میل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”اور وہ بھی اس حالت میں جب اسرائیلی اس کے فلیٹ میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید یہ میل کرتے ہی وہ مارا گیا تھا۔ اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ یہ کسی قسم کا مذاق نہیں ہے۔ مبین نے یہ میل صرف مجھے ہی نہیں بلکہ باقی سب کو بھی کی ہے۔“

”اس کے بعد وہ سب مارے جانے لگے؟“ سلطان نے پوچھا۔

”صرف پندرہ دن کے اندر اندر۔“ تریم پاشا نے جواب دیا۔ ”مبین نے جتنے افراد کو یہ میل کی، وہ سب مارے جا چکے ہیں۔“

”سوائے ایک شخص کے۔“ سلطان نے آہستہ سے کہا۔ ”اور وہ تم ہو۔“

”یہ درست ہے۔ شاید میں بھی مارا جاتا اگر میں اپنے گھر میں ہوتا۔“

”کیا تمہارے گھر پر بھی حملہ ہوا ہے؟“ سلطان چونکا۔

تریم پاشا نے اپنی جیب سے لندن ٹائمز کا ایک تراشا نکال کر سلطان کی طرف بڑھا دیا۔ اس میں ایک گھر میں ہونے والی شدید آتشزدگی کی خبر تھی۔ ایسٹ لندن میں واقع یہ مکان آگ سے مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا اور اس کے ملبے سے ایک عورت اور ایک مرد کی مکمل طور پر جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں۔ آگ اتنی شدید تھی کہ آس پاس کے مکان بھی متاثر ہوئے تھے۔ پولیس کو شبہ ہے کہ آگ کسی کیمیکل کی مدد سے لگائی گئی تھی جس نے پورے مکان کو بہت تیزی سے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اسے مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ مکان کا مالک تریم پاشا حادثے کے وقت گھر میں موجود نہیں تھا اور پولیس اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

”مرد میرا بٹلر اور عورت کک تھی۔“ تریم پاشا نے کہا۔ ”میں ایک کلب میں تھا۔ اتفاق سے ایک پرانا جاننے والا مل گیا اور میں اس سے ملاقات کے لیے رک گیا۔ میں نے بٹلر جوزف کو واپس بھیج دیا۔ اسرائیلی مکان کی نگرانی کر رہے تھے، وہ سمجھے کہ میں بھی واپس آ گیا ہوں اور انہوں نے اپنا کام کر دیا۔ اسی وجہ سے میں بچ گیا اور مجھے بھاگ نکلنے کا موقع ملا۔“

سلطان سوچ رہا تھا، اس نے تریم پاشا کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ تریم پاشا نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سامنے دور تک صوفیہ کا شہر پھیلا ہوا تھا۔ اس نے اچانک مڑ کر سلطان سے کہا۔ ”میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ مبین نے یہ لفظ کیوں ای میل کیا ہے۔“

www.paksociety.com

سلطان کھڑا ہو گیا۔ ”ہمارے پاس دو کلیو ہیں۔ ایک یہ لفظ اور دوسرا اسرائیلی۔۔۔ ہمیں ان کی مدد سے جاننے کی کوشش کرنا ہوگی۔“

”لیکن کیسے؟“

”میں ایک شخص کو جانتا ہوں، وہ شاید اس معمے کا کھوج لگانے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔ لیکن پہلے ہمیں یہ اطمینان کرنا اور یقینی بنانا ہوگا کہ ہمارے پیچھے تو کوئی نہیں ہے۔“

تریم پاشا نے اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ہمارے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ وہ شخص کہاں ہے؟“

”اسے تلاش کرنا پڑے گا۔“ سلطان نے کہا۔ ”یہ بات تو یقینی ہے کہ اس قتل و غارت کا مقصد اسرائیلیوں کی طرف سے کسی چیز کو چھپانا ہے۔ مبین کچھ جان گیا تھا اور اس نے تم سب کو خبردار کرنے کے لیے ایک ای میل کی۔ اس نے تمہیں کچھ بتانے کی کوشش کی ہے۔ اسرائیلی اسے چھپانا چاہتے ہیں اس لیے انہوں نے ان سب افراد کو قتل کر دیا جنہیں مبین نے ای میل کی تھی، سوائے تمہارے۔“

”صرف میں ہی نہیں بلکہ ہمارے وہ تمام ساتھی خطرے میں ہیں جو ایک زمانے میں مل کر کام کرتے تھے۔ ان میں تم بھی ہو اور دوسرے بھی ہیں۔ میں صرف تمہارے بارے میں جانتا ہوں اس لیے میں نے تمہیں خبردار کیا ہے۔ لیکن ہمیں باقی ساتھیوں کو بھی خبردار کرنا ہوگا۔“

سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔ ”صرف خبردار کرنے سے کچھ نہیں ہوگا کیونکہ اسرائیلی مسلسل ہمارا پیچھا کریں گے۔“

”تب کیا کیا جا سکتا ہے؟“

سلطان نے پُرخیال انداز میں تریم پاشا کی طرف دیکھا۔ ”یہ جاننا ہوگا کہ اسرائیلی اچانک اتنے پاگل کیوں ہو گئے ہیں۔ مبین نے ایسا کیا جان لیا تھا جو ان کے کسی مفاد کے لیے خطرہ بن گیا ہے۔“

☆☆☆

دو کمروں کا وہ چھوٹا سا گھر جس کے سامنے بڑا سا صحن تھا، ہمیشہ اس کی یادوں میں رہا۔ اسی گھر میں اس نے بچپن کے کھیل کھیلے اور ماں باپ کی محبت اور شفقت پائی تھی۔ یہ چھوٹا سا گھر جو بالکل سادہ تھا مگر اس کے لیے زمین پر جنت سے کم نہیں تھا۔

رضیہ اور احمد قدیر کی وہ ایک ہی اولاد تھا اور ان کی خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر کسی اعلیٰ مقام تک پہنچے۔ احمد قدیر ماسٹر تھے اس لیے انہوں نے اسی وقت سے اسے پڑھانا شروع کر دیا تھا جب اسے ٹھیک سے بولنا بھی نہیں آتا تھا۔ اس نے بولنا اور پڑھنا ایک ساتھ سیکھا تھا۔ وہ فطری طور پر ذہین تھا اس لیے ابھی تین سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ اسے اسکول میں داخلہ مل گیا۔ وہ تعلیم میں شروع سے آگے رہا اور جیسے جیسے اگلی کلاسز میں جاتا رہا، اس کی ذہانت کھل کر سامنے آتی رہی۔ میٹرک میں اس نے پورے بورڈ میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ اس پر اسے نہ صرف اسکالرشپ ملی بلکہ اسے صوبے کے ایک بہترین کالج میں داخلہ بھی مل گیا۔

کالج میں بھی اس نے اپنا معیار برقرار رکھا اور صرف اٹھارہ سال کی عمر میں گریجویشن کر لیا۔ اس نے اتنے اچھے نمبر لیے کہ اسے امریکا جانے کا موقع ملا۔ اس سے پہلے اس نے نہیں سوچا تھا کہ تعلیم کے لیے اسے باہر جانے کا موقع ملے گا۔ وہ بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے باپ کے لیے اتنا بھی ممکن نہیں تھا کہ اس کے لیے ٹکٹ کا انتظام کر سکتا، باہر پڑھانا تو دور کی بات تھی۔ لیکن اس وقت امریکا اس ملک پر مہربان تھا۔ امداد اور جنگی ساز و سامان کے ساتھ دوسرے شعبوں میں بھی فراخ دلی سے مدد دی جا رہی تھی۔ بے شمار طالب علموں کو اس دور میں امریکا جا کر تعلیم حاصل کرنے کے مواقع ملے۔ ان میں سے ایک وہ بھی تھا۔ اسے اسکالرشپ ملی تھی مگر اس کے جانے میں ایک رکاوٹ تھی۔ اس کی ماں انتہائی بیمار تھی۔ اسے ٹی بی کا مرض بہت پہلے سے تھا لیکن بے پروائی کے سبب وہ ناقابلِ علاج ہو گیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی ماں کا آخری وقت ہے اور وہ اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔

اس کے ماں باپ نے اسے مجبور کیا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے کیونکہ ایسے مواقع بار بار نہیں ملتے۔ ان کے مجبور کرنے پر وہ امریکا کے لیے روانہ ہوا اور اسے چھ مہینے بعد علم ہوا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا ہے اور احمد قدیر نے اس لیے اسے نہیں بتایا کہ اس کی تعلیم متاثر نہ ہو۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ وہ ماں کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکا اور نہ اس کے جنازے کو کندھا دے سکا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ احمد قدیر نے اس سے کہا کہ اس کے ماں باپ نے یہ قربانی اس لیے دی ہے کہ وہ اپنی تعلیم ادھوری نہ چھوڑے اس لیے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی پوری توجہ تعلیم پر دے۔ اس نے بھی یہی عزم کیا۔ اس نے امریکن یونیورسٹی میں ماسٹر کے لیے ماس کمیونیکیشن کا شعبہ منتخب کیا تھا۔ دو سال بعد اس نے بہت اعزاز سے اس میں کامیابی حاصل کی۔ یونیورسٹی نے اسے آگے پڑھنے کے لیے اسکالرشپ کی پیشکش کی لیکن وہ فی الحال واپس ملک جانا چاہتا تھا۔ اس نے دو سال سے باپ کو نہیں دیکھا تھا، وہ ماں کی قبر پر حاضر ہونا چاہتا تھا۔

دورانِ تعلیم اس کی ملاقات دنیا کے مختلف ممالک سے آئے افراد سے ہوئی اور ان میں خود بہ خود ایک گروپ بنتا چلا گیا۔ یہ سب مسلمان تھے۔ سب اپنے اپنے شعبوں میں ذہین ترین نوجوان تھے جو اپنے ملک اور قوم کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ وہ آپس میں اس معاملے میں بحث بھی کرتے تھے۔ رائے دیتے اور تجاویز بھی پیش کرتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ سب سے پہلے انہیں اپنی تعلیم مکمل کرنی چاہیے۔ اس کے بعد ہی وہ طے کر سکتے تھے کہ انہیں اپنی قوم کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ شاید اسی لیے وہ گروپ کی بحث میں زیادہ حصہ نہیں لیتا تھا۔ وہ ملک واپس آیا تو احمد قدیر ریٹائر ہو گئے تھے اور بیوی کے مرنے کے بعد اپنی بہن کے گھر رہ رہے تھے جہاں ان کی اچھی طرح دیکھ بھال ہو رہی تھی۔ مالی لحاظ سے مسئلہ نہیں تھا۔ مکان کا کرایہ آ رہا تھا اور احمد قدیر کی پنشن بھی تھی۔ پھر وہ جو ساتھ لایا تھا، اس نے وہ بھی باپ کے حوالے کر دیا۔ وہ لینے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن اس نے باپ سے کہا۔ ”اس رقم سے کچھ زمین لے کر خالہ کے بیٹوں کو کاشت کرنے کے لیے دے دیں، اس طرح ان کی مدد بھی ہو جائے گی۔“

احمد قدیر نے اس کی تجویز مان لی۔ انہوں نے چند ایکڑ زرعی زمین لے کر اپنے بھانجوں کو دے دی۔ وہ خود دوسروں کی زمین پر کام کرتے تھے۔ اپنی زمین ہوتی تو کہیں زیادہ کما سکتے تھے۔ باپ کی طرف سے اطمینان کے بعد وہ واپس آ گیا۔ اس نے ایم فل میں داخلہ لیا۔ اس کے گروپ کے نوجوان کچھ مزید تعلیم حاصل کر رہے تھے اور کچھ اپنے ملکوں کو لوٹ چکے تھے۔ وہیں رہ جانے والوں میں مبین، فہد، نعمانی، صادق، مصطفیٰ اور تریم پاشا شامل تھے۔ اس کے علاوہ کچھ اور مسلمان نوجوان تھے۔ واپس آتے ہی اسے تریم پاشا کی کال آئی۔ ”تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”کیا بات ہے؟“

”سنو، ہمیں ایک موقع ملا ہے۔“ تریم پاشا نے کہا۔ ”اس سے ہماری زندگیاں بن جائیں گی۔“

”ٹھیک ہے میں آتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید کوئی کاروباری آئیڈیا ہوگا۔ امریکا ویسے بھی آئیڈیاز کا ملک ہے اور یہاں آئیڈیا کامیاب ہو جائے تو انسان راتوں رات کروڑ پتی بن جاتا ہے۔ لیکن وہاں تو کہانی ہی کچھ اور تھی۔ تریم پاشا نے صرف اسے ہی نہیں بلکہ ان کے گروپ کے باقی دس افراد کو بھی بلا لیا تھا۔ اس نے انکشاف کیا کہ سی آئی اے کے ایک اعلیٰ افسر نے اس سے رابطہ کیا ہے۔ وہ حیران ہوئے۔ اس نے بے یقینی سے کہا۔ ”سی آئی اے کے اعلیٰ افسر نے؟“

تب تریم پاشا نے انہیں سی آئی اے کی جانب سے کی جانے والی پیش کش کے بارے میں بتایا۔ وہ دنگ رہ گئے۔ مصطفیٰ نے کہا۔ ”سوال یہ ہے کہ پیش کش ہمیں کیوں ہوئی ہے؟ ہم ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔“

تریم پاشا نے شانے اچکائے۔ ”انہیں نیا خون چاہیے اور کام بھی خطرے والا ہے۔ اس لیے معاوضہ بہت اچھا دیا جا رہا ہے اور ویسے بھی امریکا میں نئے خون کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے کیونکہ تبدیلی نوجوان ہی لاتے ہیں۔“

”لیکن یہ معاملہ مختلف ہے۔“ وہ بولا۔ ”ہم براہِ راست محاذ آرائی کی سیاست میں ملوث ہو جائیں گے۔“

”اس طرح بھی ہم اپنے ملک اور ملت کی خدمت کریں گے۔“ تریم پاشا نے کہا۔ ”آخر ہم یہی جذبہ لے کر اس دور دراز ملک آئے ہیں اور اب ہمیں ایک موقع مل رہا ہے تو ہم ہچکچا رہے ہیں۔ اس وقت ہمارا ایک مسلم برادر ملک دشمن کے قبضے میں ہے اور ہمیں اس کی مدد کرنے کا موقع مل رہا ہے۔“

”مجھے امریکیوں پر اعتبار نہیں ہے۔“ سلطان احمد نے کہا۔ ”میں نے ان کو جتنا جانا ہے، یہ انتہائی بے وفا قوم ہے اور اپنا مطلب نکل جانے کے بعد پلٹ کر بھی نہیں پوچھتی۔“ اس نے مزید کہا۔ ”ہمیں خوب غور و فکر کے بعد اس پیش کش کا جواب دینا ہوگا کیونکہ انکار کرنے کی صورت میں ہمیں شاید اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا۔ جیسے ہمارے ویزے منسوخ ہو سکتے ہیں۔“

”یہ بات یقینی ہے۔“ تریم پاشا نے سر ہلایا۔ ”تم لوگ یہ مت سمجھو کہ سی آئی اے صرف ہمیں پیش کش کر رہی ہے۔ آج کل بہت سارے لوگ اسی طرح بھرتی کیے جا رہے ہیں۔ سی آئی اے کو اپنا آپریشن وسیع کرنے کے لیے بہت سارے لوگوں کی ضرورت ہے۔“

”اور وہ اپنے خاص ایجنٹس اس مقصد کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہتی۔“ سلطان احمد نے کہا۔ ”کیونکہ اس طرح ان کی شناخت سامنے آنے کا خطرہ ہوگا اور ان کی جان کو خطرہ ہو جائے گا۔ اس لیے اسے کچھ قربانی کے بکروں کی ضرورت ہے جو اس کے لیے کام کریں اور اگر وہ دشمن کے

www.paksociety.com

ہاتھوں مارے جائیں تو اس سے سی آئی اے کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

اس تجزیے نے ان سب کی فکروں میں مزید اضافہ کر دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی دلدل میں قدم رکھتے جا رہے ہیں اور اس سے باہر آنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ لیکن اس دلدل میں اترنے سے انکار کرنا بھی ان کے بس میں نہیں تھا۔

☆☆☆

برسوں بعد وہ اپنے باپ کی قبر پر کھڑا تھا۔ احمد قدیر کی قبر ان کی بیوی کے ساتھ ہی بنائی گئی تھی۔ وہ سال بھر پہلے انتقال کر گئے تھے اور اس بار بھی اسے تاخیر سے پتا چلا۔ اس کے خالہ زاد بھائیوں کو علم ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ یہ اس کے کام کی مجبوری تھی۔ وہ اپنا کوئی مستقل پتا، ٹھکانا یا فون نمبر نہیں بنا سکتا تھا۔ چند مہینے پہلے یہ مجبوری ختم ہو گئی۔ اسے اور اس کے گروپ کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ ان کو واجبات کے ساتھ بونس بھی ملا تھا۔ اس نے رابطہ کیا تو اسے علم ہوا کہ اب اس کا باپ بھی دنیا میں نہیں ہے۔ وہ کچھ عرصے سے بیمار تھا اور ایک رات سویا تو اگلی صبح جاگا ہی نہیں۔ اپنے معاملات سمیٹ کر وطن آنے میں اسے کچھ مہینے اور لگ گئے۔ وہ آیا اور اب ماں باپ کی قبر پر موجود تھا۔

چند برسوں میں اس نے بہت کچھ جان لیا تھا۔ اسے بین الاقوامی سیاست کی گند کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور اسے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا تھا کہ بڑے ممالک اپنے مفاد کے لیے چھوٹے ملکوں کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرتے اور یہ ان کی پالیسی کا ایک حصہ تھا۔ اس کھیل میں وہ اکیلا نہیں تھا۔ دنیا کی تقریباً تمام اقوام کے سیکڑوں افراد اس میں شامل تھے اور ان میں سے بہت سارے کام کے دوران مارے گئے یا سرے سے غائب ہو گئے۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے ہی کسی انجام سے وہ کسی وقت بھی دوچار ہو سکتا ہے اور اگر اس نے اپنے تحفظ کے لیے خود کوشش نہیں کی تو اسے بچانے کوئی نہیں آئے گا۔

اس نے اپنے ساتھیوں سے بات کی اور انہیں بھی اپنا ہم خیال پایا۔ تب انہوں نے مل کر اپنے تحفظ کے لیے بعض ایسے اقدامات کیے جو ان کی ذمے داریوں سے ہٹ کر تھے۔ انہوں نے اپنے لیے خفیہ ٹھکانے بنائے۔ اپنا خاص مواصلاتی نظام قائم کیا اور جاسوسی کے لیے معلومات کی ترسیل کا طریقہ کار طے کیا۔ یہ سب انہوں نے سی آئی اے سے چھپ کر کیا۔

پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اچانک ان کو بتایا گیا کہ سی آئی اے کو ان کی مزید ضرورت نہیں ہے اس لیے وہ خود کو فارغ سمجھیں۔ ان کو معاوضہ اور بونس بھی ادا کر دیا گیا اور وہ تمام روابط اور نمبرز بند ہو گئے جن سے وہ سی آئی اے کے حکام سے رابطہ کرتے تھے۔ ان کو ڈھکے چھپے لفظوں میں مشورہ دیا گیا کہ اب وہ امریکا یا اس کے کسی مفاد والے علاقے میں نظر آنے سے گریز کریں ورنہ وہ کسی ایسی مشکل میں پڑ سکتے ہیں جس سے نکلنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ وہ سب ایک جگہ جمع ہوئے اور انہوں نے اپنے مستقبل کے لائحہ عمل پر غور کیا۔ وہ کل بارہ افراد تھے۔ اس سمیت پانچ افراد نے طے کیا کہ وہ ذاتی سطح پر اپنے تحفظ کا بندوبست کریں گے اور ہر شخص خود کو چھپا کر رکھے گا۔ تریم پاشا اور اس کے چھ ساتھیوں نے طے کیا کہ گروپ بنا کر رہیں گے اور اپنے تحفظ کے لیے وہ دشمن اور دوست دونوں پر نظر رکھیں گے۔

دونوں الگ ہو جانے والے گروپس میں رابطہ صرف تریم پاشا اور اس کے ذریعے ممکن تھا۔ یعنی اپنے گروپ کے بارے میں صرف تریم پاشا جانتا تھا اور سلطان اپنے گروپ کے لوگوں کے بارے میں جانتا تھا کہ وہ کہاں کہاں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک شخص اور تھا جسے سلطان نے اسی مقصد کے لیے رکھا تھا کہ وہ کسی خطرے کی صورت میں مخصوص طریقے سے انہیں خبردار کر دے۔ وہ جانتا تھا کہ سلطان اور اس کے ساتھی کہاں روپوش ہیں۔ شروع میں وہ بہت چوکنا اور اپنے سائے سے بھی بھڑکنے والے تھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے خدشات کم ہوتے گئے۔ انہیں کسی طرف سے نہ تو چھیڑا گیا اور نہ ہی ان کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ اس لیے رفتہ رفتہ وہ پُرسکون ہوتے گئے۔ ان کے پاس دولت تھی، ذرائع تھے اور سب سے بڑھ کر معلومات تھیں۔ اس لیے وہ خاموشی کے ساتھ دنیا کے مختلف ملکوں میں آباد ہو گئے۔ انہوں نے صرف ایک چیز کا خیال رکھا تھا کہ ان میں سے کوئی اپنے آبائی ملک میں آباد نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے دور دراز کے ملک منتخب کیے جہاں کوئی ان کے ہونے کے بارے میں آسانی سے نہ سوچ سکے اور اگر ان کو تلاش کرنا چاہے تو آسانی سے تلاش نہ کر سکے۔ اب تک یہ حکمتِ عملی کامیاب تھی۔

☆☆☆

اس کا خاندان ملک میں نہایت اعلیٰ مقام کا حامل تھا۔ اس کے اکثر لوگ بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہے اور لوگ اس خاندان کی عزت کرتے تھے۔ دولت اور سیاست ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ اس گھر کے ہر فرد کے لیے لازم تھا

کہ وہ کوئی منفرد مقام حاصل کرے۔ اس نے ہوش سنبھالتے ہی محسوس کر لیا تھا۔ بلیک سی کے کنارے ان کا عالی شان مینشن تھا۔ یہ کئی ہیکڑ رقبے پر پھیلا اور کئی عمارتوں پر مشتمل تھا۔ بچپن میں اسے جو سب سے پہلی بات سمجھائی گئی، وہ نسل کی اہمیت تھی۔ اسے بار بار بتایا جاتا تھا کہ وہ اعلیٰ نسل سے ہیں اور دوسری نسلوں پر انہیں ہر طرح کے حق حاصل ہیں۔ اس خاندان کے بچے عام بچوں کی طرح اسکول نہیں جاتے تھے بلکہ ان کو گھر میں ہی ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ انہیں مروجہ نصاب کے ساتھ کچھ چیزیں الگ سے پڑھائی اور سکھائی جاتی تھیں۔ اسے اس کا رشتے کا ایک چچا تعلیم دیتا تھا۔ اسے روزانہ کئی گھنٹے اپنے چچا سے پڑھنا پڑتا۔ اسے بعض چیزیں عجیب لگتی تھیں لیکن اسے پھر بھی پڑھنا پڑتی تھیں۔ ان میں بعض مذہبی کتابیں بھی تھیں۔ وہ الجھ جاتا کیونکہ بہ ظاہر ان کا مذہب وہ نہیں تھا جس کی کتابیں اسے پڑھائی جاتی تھیں اور جب وہ اس بارے میں سوال کرتا تو اس کا چچا اسے جواب دیتا۔ "جب تم ان کتابوں کی تعلیم مکمل کر لوگے تو تمہیں اس سوال کا جواب دیا جائے گا، اس سے پہلے کوئی سوال مت کرو۔"

تمام تعلیم اسے گھر پر ہی دی جا رہی تھی کیونکہ اسے گھر سے باہر جانے اور دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے اور گھلنے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ مینشن میں اس کے ہم عمر بچوں کی تعداد نصف درجن سے زیادہ تھی اور وہ سب آپس میں کھیلتے تھے۔ یہ سب آپس میں رشتے دار تھے کیونکہ اس خاندان میں صدیوں سے آپس میں شادی کرنے کا رواج تھا۔ یہاں کسی لڑکے یا لڑکی کے لیے خاندان سے باہر شادی کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ وہ یہ سب جانتا تھا، اس کے باوجود اسے کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ آخر اسے باہر جانے کی اجازت کیوں نہیں ہے؟ صرف اسے ہی نہیں بلکہ خاندان کے کسی بھی بارہ سال سے کم عمر بچے کو باہر جا کر کسی سے دوستی کرنے اور گھلنے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ دس سال کی عمر میں اس نے مروجہ نصاب کے ساتھ ان مخصوص مذہبی کتب کی تعلیم بھی مکمل کر لی، تب اس کے رشتے کے چچا نے اجازت دی کہ وہ اس بارے میں سوال کر سکتا ہے۔ اس نے پہلا سوال اس تعلیم کے بارے میں کیا جو اسے دی گئی تھی۔ "ہمارا مذہب کچھ اور ہے، تب آپ نے مجھے یہ کتابیں کیوں پڑھائی ہیں؟"

اگرچہ یہ خاندان مذہبی نہیں تھا اور اس نے گھر میں کبھی کسی مذہبی روایت، عبادت یا تہوار پر عمل ہوتے نہیں دیکھا تھا، اس کے باوجود اسے معلوم تھا کہ ان کا مذہب کیا ہے۔ اس لیے جب اس کے چچا نے بتایا کہ اصل میں وہ یہودی ہیں تو اسے شدید دھچکا لگا اور اس نے کہنا چاہا۔ "لیکن انکل ہم تو....."

"ہم بہ ظاہر اس مذہب پر ہیں۔" چچا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "لیکن ہمارا اصل مذہب یہودیت ہے اور یہ اب سے نہیں شروع سے ہے۔ تم بھی ایک یہودی ہو اور میں بھی ایک یہودی ہوں۔ اس خاندان کا ایک ایک فرد یہودی ہے۔"

"لیکن ایسا کیوں ہے؟"

"یہ ہماری بقا کا سوال ہے۔ اگر ہم بہ ظاہر دوسرا مذہب اختیار نہ کریں تو اس ملک میں ایک دن کے لیے بھی نہیں رہ سکتے۔ یہ عزت اور مقام حاصل کرنا تو ناممکن ہے۔"

شروع میں یہ بات اتنی اچھی طرح اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن رفتہ رفتہ وہ جان گیا۔ پھر سمجھ گیا اور پھر مان گیا۔ اب وہ بھی اپنے اہلِ خاندان کی طرح اندر سے کٹر یہودی تھا۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے صدیوں سے خاندان میں چلی آنے والی ہرن کی مقدس کھال پر بیٹھ کر اپنے خاندان کے مخصوص بزرگوں کے سامنے عہد کیا کہ وہ اپنی زندگی یہودیوں اور اسرائیل کے لیے وقف کرے گا۔ ان کی بقا کے لیے وہ کسی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا اور اگر ضرورت پڑی تو وہ اپنی جان بھی قربان کر دے گا۔ یہ عہد اس کے خاندان کا ہر فرد کرتا تھا اور اپنے عمل سے اس عہد کو نبھاتا بھی تھا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ پھر عملی زندگی میں قدم رکھا اور یہاں بھی کامیاب رہا۔ اس نے خاصی دولت کمائی۔ یہ دولت اس نے اپنے خاندان کی مدد حاصل کیے بغیر کمائی۔ اسے اس بات پر فخر تھا کہ اس نے اپنے خاندان اور اپنی قوم سے کچھ لیا نہیں تھا بلکہ ضرورت پڑنے پر وہ انہیں دے سکتا تھا۔ اس کے پاس اپنے ملک کے ساتھ ساتھ اسرائیل کی خفیہ شہریت بھی تھی اور وہ سال میں ایک بار وہاں جاتا تھا۔

سولہ سال پہلے جب وہ اسرائیل میں موجود تھا، غیر متوقع طور پر موساد کے ایک مقامی ایجنٹ نے اس سے ملاقات کی۔ اس نے اسے موساد کے سربراہ کا پیغام پہنچایا۔ وہ اس سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ جنرل بازک ایک کٹر صیہونی اور جنونی شخص تھا جس کی زندگی کا مقصد عظیم تر اسرائیل کے قیام کو جلد از جلد یقینی بنانا تھا۔ وہ اس سے گرم جوشی سے ملا اور جب جنرل بازک نے اسے بتایا کہ موساد کے پاس اس کا مکمل ریکارڈ ہے تو وہ حیران رہ گیا۔ "میں نے

www.paksociety.com

سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اتنا اہم ہوں گا کہ موساد میرے بارے میں مکمل معلومات رکھے گی۔“

”تم اور تمہارا خاندان دونوں اسرائیل کے لیے نہایت اہم ہو۔ درحقیقت تمہارے خاندان کی خدمات انمول ہیں۔ افسوس کہ ہم سرکاری سطح پر اس کا اعتراف بھی نہیں کرسکتے۔ تمہارے اور اسرائیل دونوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ تمہاری خدمات اس وقت تسلیم کی جائیں جب ہم اپنے تمام دشمنوں پر مکمل طور پر حاوی ہوجائیں۔ اس وقت تک ہمیں تمہاری ضرورت رہے گی۔“

”میں اور میرا خاندان عظیم اسرائیل کی ہر خدمت کے لیے تیار ہے۔“ اس نے خوش ہو کر کہا۔ جنرل بازک نے اسے بتایا کہ اسے اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنی ہے اور یہ ملازمت ایک مخصوص محکمے کی ہوگی اور وہ وہاں رہ کر وقت آنے پر اسرائیل کے لیے کام کرے گا۔ اس دوران میں وہ موساد کو اس ملک کے بارے میں خفیہ معلومات فراہم کرے گا جو اسرائیل کی بقا کے لیے ضروری ہوں۔ سرکاری ملازمت حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا کیونکہ اس کا خاندان بہت زیادہ اثر رسوخ رکھتا تھا۔ اس نے باقاعدہ موساد میں شمولیت اختیار کی۔ اسے ٹی ون کا کوڈ نیم دیا گیا۔ اس نے واپس جا کر کوشش کی اور اسے مطلوبہ محکمے میں درمیانے درجے کے افسر کی نوکری مل گئی مگر جوڑ توڑ کرکے اور خاندانی اثر رسوخ کی بدولت وہ جلد اوپری درجے کے افسران میں شامل ہوگیا۔ اس کے بعد اسے آگے بڑھنے سے کون روک سکتا تھا۔ سرکاری ملازم بن جانے کے بعد اسے بہت محتاط ہونا پڑا کیونکہ ترکی میں تبدیلی آرہی تھی اور اسرائیلیوں کو یہاں پہلے جیسی آزادی اور سہولتیں حاصل نہیں رہی تھیں۔ اس نے اپنی دُہری شناخت بنائی تھی اور یہی چیز آج اس کے کام آرہی تھی۔ اپنی پوزیشن کی وجہ سے وہ خفیہ ترین فائل اس کے علم میں آگئی اور اس نے فوراً تل ابیب کو خبردار کیا۔ اسے فوری طور پر طلب کرلیا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس سے مزید تفصیلات معلوم کرنے کے لیے بلایا گیا ہے لیکن یہاں وجہ کچھ اور تھی۔

”تمہیں خاص مقصد کے لیے یہاں بلایا گیا ہے۔“ جنرل بازک نے کہا۔ ”اصل بات کی طرف آنے سے پہلے میں تمہیں بتادوں کہ معاملہ بہت نازک اور حساس ہے اور اس کا پورا امکان ہے کہ کام کے دوران موت تمہیں دبوچ لے۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میں بہت پہلے ہی اپنے مذہب اور اسرائیل کے لیے ہر قربانی دینے کا عہد کرچکا ہوں۔“

”دوسرے یہ کہ تمہیں کوئی صلہ نہیں ملے گا۔ ممکن ہے آخر میں تم ایک مجرم اور قاتل کے طور پر دنیا کے سامنے آؤ۔“

”مجھے اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسرائیل کے لیے کام کرتے ہوئے اگر مجھے شیطان بھی کہا جائے تو مجھے تسلیم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔“

جنرل بازک نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ”ہمیں تمہارے جیسے شخص کی ہی تلاش تھی۔ اسرائیل پر بہت کڑا وقت آنے والا ہے اور اس وقت کے آنے سے پہلے ہم نے اگر کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا تو ہمیں بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔“

☆☆☆

10 اپریل، سراجیوو، بوسنیا

سلطان احمد بس سے اترا اور سراجیوو کے مرکزی بس ٹرمنل سے نکل کر باہر آیا۔ پندرہ سال پہلے یہ خوب صورت شہر ملبے کا ڈھیر بن گیا تھا۔ سربوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر کر کئی سال تک یہاں کے نہتے اور عام شہریوں پر بے پناہ گولہ باری کی تھی اور یورپ اور دنیا میں امن کا راگ الاپنے والے ممالک خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہے۔ کیونکہ بہنے والا خون مسلمانوں کا تھا جس کی قیمت ان کے نزدیک ایک بیئر کی بوتل سے بھی کم تھی۔ ہاں، جب بوسنیا کے مسلمانوں نے کسی حد تک ہتھیار اور تربیت حاصل کرکے جواب دینا شروع کیا تو دنیا کو فوراً امن یاد آگیا اور ایک معاہدے کے تحت بوسنیا کے دس حصے کرکے اسے ایک بے دست و پا ملک بنانے کی کوشش کی گئی لیکن یہاں کے بہادر لوگ بہت جلد اپنے ملک کو دوبارہ سے ترقی اور خوشحالی کی راہ پر لے آئے۔ جنگ کے نشانات تقریباً معدوم ہوگئے اور سراجیوو ایک خوب صورت اور بارونق شہر میں بدل گیا۔

وہ پیدل چلتا رہا اور بہ ظاہر شہر کی رونقوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ درحقیقت وہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ کوئی اس کا پیچھا تو نہیں کررہا۔ ایک جگہ رک کر اس نے اسٹال سے اخبار لیا۔ یہ ایک مقامی روزنامے کا انگریزی ایڈیشن تھا اور... بہ ظاہر اسے دیکھتے ہوئے اس نے سڑک کا جائزہ لیا۔ جیسے ہی ایک خالی ٹیکسی نظر آئی، اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک لیا اور اندر بیٹھتے ہی اسے امپیریل ہاؤس چلنے کو کہا۔ امپیریل ہاؤس پر اتر کر سلطان نے کچھ وقفے کے ساتھ دوسری ٹیکسی لی اور اسے سراجیوو کے ایک نواحی علاقے کا پتا بتایا۔ یہ ایک پہاڑی پر بنا ہوا جدید قصبہ تھا جسے جنگ کے

بعد تعمیر کیا گیا تھا۔ اس نے ایک بڑے سمر ہاؤس سے ذرا دور ٹیکسی رکوائی اور اسے ادائیگی کرکے اس وقت تک وہیں کھڑا رہا جب تک ٹیکسی پلٹ کر واپس نہیں چلی گئی۔ اس کے بعد وہ سمر ہاؤس تک آیا اور مین گیٹ کے پلر کے ساتھ نصب انٹر کام کا بٹن دبا کر انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک مردانہ آواز نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”ایک پرانا دوست۔“ سلطان نے نام لینے سے گریز کیا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر مرد نے مشکوک لہجے میں کہا۔ ”ایک منٹ رکو۔“

پھر خاموشی چھا گئی لیکن ...... بولنے والا خود گیٹ تک چلا آیا۔ اس نے چھوٹا دروازہ کھولا۔ سلطان کے سامنے وہیل چیئر پر ایک ادھیڑ عمر اور کسی قدر بھاری جسم والا شخص بیٹھا تھا۔ اس نے مسرت سے کہا۔

”سلطان... میرے خدا! کل نازنین سے تمہارے بارے میں بات کرتے ہوئے میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آج تم سے ملاقات ہوجائے گی۔ کم بخت کیمرا بھی آج ہی خراب ہوا ہے۔“

سلطان احمد جھک کر اس کے گلے لگا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے بھولے نہیں مراد بیگون؟“

”میں اور یہاں کے بہت سارے لوگ تمہیں کبھی نہیں بھول سکتے۔“ مراد نے اس کے عقب میں دیکھا۔ ”تم اکیلے آئے ہو یا کوئی اور بھی ہے؟“

”نہیں، میں اکیلا ہوں۔“ سلطان نے کہا۔ ”نازنین اور بچے کیسے ہیں؟“

”سب ٹھیک ہیں۔ نازنین ان دنوں اپنے میکے پاکستان گئی ہوئی ہے، بچے بھی اس کے ساتھ ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم گھر میں اکیلے ہو؟“ سلطان نے اس کے ساتھ اندر جاتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ مراد وہیل چیئر چلاتے ہوئے بولا۔ احاطے کے اندر خوب صورت سمر ہاؤس تھا۔ تعمیر میں شیشے اور لکڑی کا بڑا حسین امتزاج شامل تھا۔ مراد سلائڈنگ ڈور کھسکا کر اندر داخل ہوا۔ سلطان اس کے پیچھے تھا۔ یہ بڑی خوب صورت اور بہترین فرنیچر سے آراستہ نشست گاہ تھی۔ مراد نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سلطان ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

”یہ اچھی بات ہے کہ نازنین اور بچے گھر پر نہیں ہیں ورنہ مجھے بات کرنے میں دشواری ہوتی۔“

مراد نے سر ہلایا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں تمہیں پورے سولہ سال بعد دیکھ رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم یہاں کسی خاص کام سے آئے ہوگے؟“

”تم نے ٹھیک سمجھا۔“ سلطان نے سر ہلایا۔

مراد سنجیدہ ہوگیا۔ ”کیا آس پاس کوئی خطرہ ہے؟“

”ہوسکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم ایک منٹ رکو اور یہاں سے ہلنا مت۔“ مراد نے کہا اور وہیل چیئر چلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے زانو پر ایک ٹرے میں بھاپ اڑاتی کافی کے دو عدد مگ رکھے تھے۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ ”میں نے اپنے گھر کا حفاظتی سسٹم آن کردیا ہے، اب کوئی اندر آنے کی کوشش کرے گا تو مجھے پتا چل جائے گا۔“

سلطان نے کافی اٹھائی۔ ”تم شروع سے اس کام کے ماہر رہے ہو۔“

مراد نے وہیل چیئر پر ہاتھ مارا اور پھر سر کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس قید نے مجھے یہ استعمال کرنے پر مجبور کردیا۔“

”ایسا نہیں ہے۔ تم شروع سے ذہین رہے ہوگے۔ میرا خیال ہے کہ اب تم سمجھ گئے ہوگے کہ میں کیوں آیا ہوں۔“

”جب مجھے ان پانچوں کے مرنے کی اطلاع ملی، تب مجھے محسوس ہوا کہ تم مجھ سے ملنے آؤ گے۔“

سلطان چونکا۔ ”تم جانتے ہو؟“

مراد نے سر ہلایا۔ ”ہاں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس قتل و غارت گری کے پیچھے اسرائیلی ہیں۔“

”تمہارے خیال میں اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟“

”شاید اسرائیلی کچھ چھپانے کی کوشش کررہے ہیں۔ یا ان کا گروپ اسرائیلیوں کے کسی کام میں مزاحم ہوا ہے۔“

”گروپ۔“ سلطان پھر چونکا۔ ”یہ ماضی کے ساتھی تھے۔“

مراد نے اسے دیکھا۔ ”اس کا مطلب ہے تمہیں صحیح صورت حال کا علم نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں واقعات کا علم کیسے ہوا؟“

”تریم پاشا سے۔“ سلطان بولا۔ ”میں تو دنیا سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہ رہا ہوں۔“

”تریم پاشا نے تمہیں مکمل بات نہیں بتائی ہے۔ وہ لوگ اب بھی وہی کام کررہے تھے جو ماضی میں کرتے آئے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے وہ سی آئی اے کے لیے کام کرتے تھے اور اب رقم کے لیے کررہے ہیں۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

سلطان نے گہری سانس لی۔ ''تم نے درست تجزیہ کیا۔ میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ سکون سے زندگی گزار رہا ہوں اور اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ بات بالآخر میرے گھر تک پہنچ جائے گی تو میں یہاں آنے کے بجائے گھر واپس لوٹ گیا ہوتا۔''

مراد نے کھڑکی سے باہر اپنے سمر ہاؤس کے خوبصورت باغ کو دیکھا۔ سراجیوو میں بھی موسم بہار کا آغاز تھا اور برف پگھل رہی تھی۔ ''تم میری مدد چاہتے ہو؟''

''ہاں، میں تم سے کچھ کام کروانا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں ادائیگی کروں گا اور اگر تم چاہو تو تم کام کرنے سے انکار بھی کر سکتے ہو۔ مبین اور دوسرے لوگوں کا انجام دیکھتے ہوئے تمہیں بالکل بھی خوش فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اس کام میں خطرہ نہیں ہے۔''

''میں خطرہ سمجھ گیا ہوں۔ یہودیوں سے ڈرنا چاہیے کیونکہ یہ جنگل کے درندوں سے بھی بدتر قوم ہے۔'' مراد نے سوچ کر کہا۔ ''لیکن ہم مسلمان ہیں اور ہمارا تقدیر پر ایمان ہونا چاہیے۔ اگر اللہ نے میری اور میرے بیوی بچوں کی زندگی رکھی ہے تو کوئی ہمیں نہیں مار سکتا۔''

''تو تم میرے لیے کام کرنے کو تیار ہو؟''

''یقیناً سلطان... تمہیں کیسے انکار کر سکتا ہوں؟'' مراد نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''بولو کیا کام ہے؟''

سلطان احمد نے اسے تریم پاشا سے ملنے والی معلومات بتائیں۔ وہ غور سے سنتا رہا۔ آخر میں سلطان نے کہا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ لفظ حشاشین سے کیا مراد ہے؟ مبین نے مرنے سے چند منٹ پہلے یہ لفظ اپنے گروپ کو ای میل کیا تھا۔ ظاہر ہے وہ اس معاملے میں بہت سنجیدہ تھا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' مراد نے پوچھا۔

''میرا اندازہ ہے کہ اسرائیلی کسی منصوبے پر کام کر رہے ہیں جس میں اس لفظ کی کوئی اہمیت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرو۔''

مراد نے سر ہلایا اور بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

سلطان اس کے ساتھ ایک کمرے میں آیا جو مکمل طور پر کمپیوٹرز کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں چاروں طرف اسکرینز لگی ہوئی تھیں اور ایک عدد لیپ ٹاپ کے ساتھ ایک مین فریم کمپیوٹر بھی موجود تھا۔ یہ بہت تیز رفتار کمپیوٹر تھا اور ایک وقت میں بہت سارے کام کر سکتا تھا۔ مراد نے اسے ایک طرف پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود لیپ ٹاپ والی میز پر آگیا۔ اس نے کچھ دیر اس پر کام کیا۔

اپنے کام میں مگن رہنے کے بعد مراد نے سر اٹھایا اور پوچھا۔ ''تمہیں حشاشین کی تاریخ کا علم ہے؟''

''کسی حد تک۔'' سلطان نے کہا۔ ''حسن بن صباح نامی شخص نے قاتلوں کی ایک فوج تیار کی تھی جو حشاشین کہلاتے تھے۔ یہ قاتل حسن بن صباح کے حکم پر کسی بھی شخص کو اپنی جان کی پروا کیے بغیر قتل کر دیتے تھے۔''

''تم نے درست کہا۔ یہ صرف قتل ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے فوراً بعد اپنی جان بھی لے لیتے تھے کیونکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ مرتے ہی اس جنت میں پہنچ جائیں گے جس کی ایک جھلک حسن بن صباح انہیں بھنگ یا حشیش کے نشے کے زیر اثر دکھاتا تھا اور وہ اسے سچ سمجھتے تھے۔ ان میں سے بہت کم زندہ گرفتار ہوتے تھے۔'' مراد نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

سلطان نے سر ہلایا۔ ''بات سمجھ میں آرہی ہے۔ حسن بن صباح کا یہودیوں سے تعلق تھا۔''

''اگر اسرائیلی اپنے کسی منصوبے میں یہ لفظ استعمال کر رہے ہیں تو یہ نہایت تشویش ناک بات ہے۔'' مراد نے کہا اور رک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تم حشاشین کی ایک اور خصوصیت سے واقف ہو۔ وہ خصوصیت چھپ کر حملہ کرنے کی تھی۔ اکثر حملہ آور معتقد ہوتے تھے اور اسی وجہ سے نہایت آسانی سے اپنے شکار کو ختم کر دیا کرتے تھے۔''

''ہاں، یہ سب تاریخ کا ایک حصہ ہے۔''

''تاریخ خود کو دہراتی ہے میرے دوست۔'' مراد نے کہا۔ ''میں اس وقت موساد کے نیٹ ورک تک رسائی کی کوشش کر رہا ہوں۔''

سلطان نے سوچا اور بولا۔ ''کیا ضروری ہے کہ تم یہ کوشش یہاں سے کرو؟''

مراد اس کی طرف گھوما۔ ''کیا مطلب؟''

''مبین نے بھی ایک جگہ سے کوشش کی تھی اور بالآخر اسرائیلی اس تک پہنچ گئے۔ یقیناً موساد والوں نے اپنے نیٹ ورک کے ساتھ کچھ ایسی چیزیں لگا رکھی ہوں گی جو دراندازی کرنے والوں کی نشان دہی کر سکیں۔''

مراد سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''تب ہمیں یہ کام کہیں اور سے کرنا چاہیے۔''

''یہاں مجھے مین فریم کی سہولت ہے، کہیں اور سے کرنے کی صورت میں صرف لیپ ٹاپ استعمال کر سکوں گا اور اس سے کام کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔''

''وقت کا مسئلہ نہیں ہے۔ حفاظت زیادہ اہم ہے۔ اگر ہم زندہ رہے تب ہی کچھ کر سکیں گے۔'' سلطان نے کہا۔

دو گھنٹے بعد وہ مراد کی بڑی سی وین میں سراجیوو سے دور جا رہے تھے۔ ان کا رخ جنوب مغربی بوسنیا کی طرف تھا۔ وین کے عقبی حصے میں سونے اور آرام کرنے کے انتظامات کے ساتھ کمپیوٹر استعمال کرنے کی مکمل سہولت بھی تھی۔ مراد کے پاس سیٹلائٹ انٹرنیٹ کی سہولت بھی تھی اور اسے صرف وین کی چھت پر انٹینا لگانا پڑا۔ اب وہ انٹرنیٹ استعمال کر سکتا تھا۔ سلطان ڈرائیونگ کر رہا تھا جبکہ مراد عقب میں اپنے لیپ ٹاپ اور کچھ دوسرے آلات کے ساتھ مصروف تھا۔ راستے میں ایک ریستوران سے انہوں نے کھانے پینے کا کچھ سامان پیک کرا لیا۔ اس لیے فی الحال انہیں کہیں رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سلطان ہائی وے کے ساتھ کوئی ایسی جگہ تلاش کر رہا تھا جہاں وہ وین کو پارک کر سکے اور وہ کسی کی نظر میں بھی نہ آئیں۔ بالآخر اسے ایک کسی قدر ہموار چوٹی پر جگہ نظر آئی اور اس نے وین کا رخ اس طرف موڑ دیا۔ کچے راستے پر ڈگمگاتی وین چوٹی تک پہنچی تو سامنے نہایت شاندار منظر تھا۔ دور تک اونچے نیچے پہاڑوں پر گھنے جنگلات بکھرے ہوئے تھے۔ سلطان وین سے نیچے اتر آیا۔ اس نے مراد کو نہیں چھیڑا۔ اس نے اپنا اصل کام شروع نہیں کیا تھا بلکہ اس کے لیے تیاری کر رہا تھا۔

جب وہ بوسنیا جانے کے لیے نکل رہا تھا تو تریم پاشا نے اس کے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن سلطان نے انکار کر دیا تھا۔ اس نے اتنی رازداری سے کام لیا کہ تریم پاشا تک کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں اور کس سے ملنے گیا ہے۔ سلطان نے کھانے کے سامان میں سے کچھ سینڈوچز نکالے اور ان میں سے کچھ مراد کو کولڈ ڈرنک کے ایک ٹن کے ساتھ دے دیے۔ خود وہ کاغذی ٹرے سنبھال کر باہر آگیا۔ اسے شدت سے بھوک لگ رہی تھی۔ آج اسے گھر سے نکلے ہوئے ہفتے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آسیہ بچوں سمیت اس فلیٹ میں منتقل ہو گئی ہو گی جو اس نے ایک جعلی نام سے لے رکھا تھا۔ وہاں رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ سلطان سمجھتا تھا کہ کسی قسم کا رابطہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ دشمن اس کی اور اس کے باقی ساتھیوں کی تاک میں ہوں گے۔ ان کی طاقت اور اثر رسوخ کے معاملے میں کوئی شبہ نہیں تھا اس لیے زیادہ سے زیادہ احتیاط ضروری تھی۔ اسرائیلی جاسوسی کے ماہر ہیں اور موساد دنیا کی مستعد ترین جاسوس تنظیم ہے۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ دو گھنٹے بعد مراد نے وین سے جھانک کر اسے آواز دی۔ ''سلطان! اندر آؤ۔''

وہ اندر آیا۔ مراد نے اپنی تیاری مکمل کر لی تھی۔ اگرچہ اب وہ کسی مخصوص جگہ نہیں تھے، اس کے باوجود مراد نے خود کو بچانے کے تمام انتظامات کیے تھے۔ اس نے سلطان سے کہا۔ ''اب وہ کسی طرح بھی یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ ان کے سسٹم میں کہاں سے دخل اندازی ہو رہی ہے۔''

لیپ ٹاپ کی اسکرین پر ایک سیاہ حاشیے والے باکس میں کارروائی جاری تھی۔ یہ مخصوص اینیمیشن تھی جسے مراد سمجھ سکتا تھا کیونکہ یہ اس کی بنائی ہوئی تھی۔ سلطان نے پوچھا۔ ''تم نے فلٹر میں کون سا لفظ شامل کیا ہے؟''

مراد نے انٹر کا بٹن دبایا اور مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''حشاشین۔''

☆☆☆

14 اپریل، استنبول، ترکی

سلطان نے اپارٹمنٹ کی کال بیل دبانے سے پہلے آس پاس کا جائزہ لیا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس فلور پر کل دس اپارٹمنٹ تھے اور گیلری خالی تھی۔ وہ دو دن پہلے استنبول آیا تھا۔ مراد کے پاس سے روانہ ہو کر پہلے اس نے اٹلی کا رخ کیا اور پھر وہاں سے استنبول آیا۔ پہلے اس کا ارادہ یہاں آنے کا نہیں تھا لیکن مراد نے جو انکشاف کیا تھا، اس کے بعد ترکی آنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ شہر کے ایک پرانے لیکن پوش علاقے میں ایک خوب صورت عمارت کے دوسرے فلور پر اس نے اپارٹمنٹ نمبر تین سو سات کی کال بیل دبائی اور انتظار کرنے لگا۔ ایک منٹ بعد نسوانی آواز آئی۔ ''کون ہے؟''

''ایک دوست... نثار مرزا سے ملنا ہے۔''

''دوست کا کوئی نام ہے؟''

''اس سے کہو کہ اس کا سولہ سال پہلے والا دوست آیا ہے۔''

''پاپا کا کوئی دوست غائب نہیں ہوا، نام بتاؤ۔''

''فرید غازی۔'' سلطان نے وہ نام بتایا جو اس کے پاسپورٹ پر لکھا تھا۔ یہ روسی پاسپورٹ تھا اور نام کی اسپیلنگ ایسی تھی کہ اسے فریڈ گھازے پڑھا جاتا تھا۔ دروازہ ذرا سا کھلا اور اس سے ایک لڑکی نے باہر جھانکا۔

''میرے علم میں پاپا کا اس نام کا کوئی دوست نہیں ہے۔''

سلطان چونکا۔ اسے نثار مرزا کی دس سالہ بیٹی یاد آگئی

www.paksociety.com

جو بے پروا سے حلیے میں پھرتی تھی اور جس کے سنہری مائل بھورے بال ہمیشہ بکھرے رہتے تھے۔ نثار مرزا سے اس کے گھر جیسے تعلقات تھے۔ آسیہ بھی اسے جانتی تھی۔ درحقیقت آسیہ نے ہی اسے نثار سے متعارف کرایا تھا۔ ''تم ایمان ہو؟''

لڑکی اسے غور سے اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ چونکی۔ ''ہاں لیکن تم...''

اس بار اس نے درست تعارف کرایا۔ ''میں سلطان احمد ہوں، تمہارے پاپا کا ایک دوست۔''

لڑکی کی آنکھوں میں پہلے بے یقینی دکھائی دی پھر شناسائی کی چمک ابھری۔ ''سلطان احمد... میں نے پہچان لیا۔ آپ بالکل نہیں بدلے ہیں۔''

اس نے دروازہ کھول دیا اور سلطان اندر آگیا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''میں بدلا ہوں لیکن تم بالکل بدل گئی ہو۔ جب میں آخری بار یہاں آیا تھا تو تم بے پروا سی لڑکی تھیں اور پاجامے پر شاید اپنے پاپا کی شرٹ پہن کر گھوم رہی تھیں۔ تمہارے بال الجھے اور بکھرے ہوئے تھے۔ شاید تم نے ایک ہفتے سے کنگھی نہیں کی تھی۔ ویسے تمہارے پاپا کہاں ہیں؟''

''پاپا باتھ لے رہے ہیں، ویسے اب میں کیسی ہو گئی ہوں؟'' وہ شوخی سے بولی۔

''بہت پیاری سی لڑکی بن گئی ہو۔'' سلطان نے بے خیالی میں کہا۔ اس نے غور نہیں کیا کہ اس کی بات پر ایمان کے چہرے پر سرخ رنگ بکھر گیا تھا۔ وہ اسے لیونگ روم میں لے آئی جو امریکن انداز کے فرنیچر سے سجا ہوا تھا۔ ایمان نے کسی قدر لانگ اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کام پر جا رہی ہو۔ سلطان نے اس کی ماں کے بارے میں پوچھا تو وہ افسردہ ہو گئی۔ ''ماما تو دو سال پہلے کینسر کے مرض میں انتقال کر گئیں۔''

''اوہ... مجھے افسوس ہوا۔'' سلطان نے تعزیت کی۔ ایمان اس کے بارے میں پُرتجسس تھی کہ وہ اتنے عرصے کہاں رہا لیکن سلطان نے اسے ٹال دیا۔ نثار مرزا کا تعلق برصغیر سے تھا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس کے پردادا حسن مرزا کا تعلق برصغیر سے تھا۔ وہ مجاہدین کے ساتھ یہاں آیا تھا جو ترکی کی خلافت کو بچانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ ان میں سے بہت سارے اپنے مقصد پر قربان ہو گئے تھے اور باقی واپس چلے گئے۔ حسن مرزا ان چند لوگوں میں سے تھا جنہوں نے واپس جانے کے بجائے ترکی میں آباد ہونے کو ترجیح دی۔ ایمان کا دادا یہیں پیدا ہوا تھا اور اب ایمان ترکی میں اس خاندان کی چوتھی نسل تھی۔ اس کے دو بڑے بھائی شادی شدہ اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد نثار مرزا تیار ہو کر آیا تو سلطان کو دیکھ کر کچھ دیر کو دنگ رہ گیا پھر اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔

''مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ جب تمہارا خیال آتا تو میں یہی سوچتا کہ اب اس دنیا میں تم سے ملاقات نہیں ہو گی۔''

سلطان نے کچھ کہنے سے پہلے کن انکھیوں سے ایمان کی طرف دیکھا تو نثار نے جلدی سے کہا۔ ''سلطان! میری بیٹی بھی وزارتِ داخلہ کی ایک آفیسر ہے، بس اس کا سیکشن دوسرا ہے۔''

تقریباً پچپن سالہ لیکن صحت مند اور طویل قامت نثار مرزا ترک وزارتِ داخلہ میں اعلیٰ افسران میں سے تھا۔ جس زمانے میں سلطان اور اس کے ساتھی سی آئی اے کے لیے کام کرتے تھے، نثار مرزا ترک حکومت کی جانب سے رابطہ افسر تھا۔ اس کا کام سلطان اور اس کے گروپ کو ہر طرح کی سہولیات مہیا کرنا اور راستے میں آنے والی قانون اور ضابطے کی رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔ آسیہ اس کی جونیئر تھی اور اسی نے سلطان کو نثار مرزا سے ملوایا تھا۔ وہ بچپن سے اسے جانتی تھی کیونکہ وہ ایک ہی علاقے میں پلے بڑھے تھے اور آپس میں پڑوسی تھے۔ نثار مرزا اپنے پس منظر اور مذہبی رجحانات کی وجہ سے اعلیٰ افسران کی نظروں میں ناپسندیدہ فرد تھا۔ اس لیے نہایت قابل ہونے کے باوجود اسے زیادہ اوپر جانے کا موقع نہیں ملا مگر جب ترکی میں اسلام پسندوں کی حکومت آئی تو نثار مرزا اور اس جیسے معتوب افسران کی حالت بدل گئی۔ اب نثار اپنے محکمے میں نہایت اہم پوزیشن پر تھا۔ ایمان سلطان کے لیے ناشتا بنا کر لے آئی۔ دو عدد بوائل انڈوں کے ساتھ سادہ سلائس اور کافی تھی۔ سلطان کی خواہش تھی کہ وہ اکیلے میں نثار سے بات کرے۔ شاید ایمان نے یہ بات بھانپ لی تھی، اس لیے وہ دفتر کا کہہ کر رخصت ہو گئی۔

''ہاں دوست! اب ہم کھل کر بات کر سکتے ہیں۔'' نثار نے کہا۔ ''لیکن پہلے تم ناشتا کر لو۔''

نثار نے اپنے دفتر کال کر کے اطلاع دی کہ آج وہ ذرا دیر سے آئے گا اس لیے میٹنگ کا وقت آگے بڑھا دیا جائے۔ سیل فون بند کر کے اس نے سلطان کو بتایا۔ ''میٹنگ

اسی مہینے کی بیس تاریخ کو ایران کے صدر اور ترک وزیراعظم کی استنبول میں علاقائی ممالک کی کانفرنس کے بعد ملاقات کے سلسلے میں ہے۔" اس ملاقات میں دونوں ملکوں کے حوالے سے بہت سارے اہم فیصلے ہونے تھے اور اس کی اہمیت کے پیشِ نظر حفاظتی اقدامات وزارتِ داخلہ کی ذمے داری تھی۔ نثار مرزا حفاظتی پروٹوکول کا انچارج تھا۔ میٹنگ میں انتظامات کا جائزہ لیا جاتا تھا۔

سلطان نے کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے سر ہلایا۔ "اس کا مطلب ہے میں بالکل ٹھیک آدمی کے پاس آیا ہوں۔"

"سلطان! مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلے دو ہیں۔" سلطان نے سوچ کر کہا۔ "اصل مسئلہ تم لوگوں کا ہے اور اس سے جڑا دوسرا مسئلہ میرا ہے۔"

"ہمارا مسئلہ؟" نثار مرزا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"نثار! مجھے یقین ہے کہ میں تمہیں جو بتانے جا رہا ہوں وہ ہمارے درمیان محدود رہے گا۔ میں تمہاری مدد کروں گا اور مجھے تمہاری مدد درکار ہوگی۔ لیکن تم انکار کرتے ہو تو یہ بات یہیں ختم ہو جائے گی اور میں خاموشی سے واپس چلا جاؤں گا۔"

نثار مرزا نے سلطان کے الفاظ تولے۔ وہ اسی میدان کا کھلاڑی تھا اس لیے اسے سلطان کی بات کا مفہوم سمجھنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے سر ہلایا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ بات ہمارے درمیان رہے گی اور اگر ممکن ہوا تو میں تمہاری مکمل مدد کروں گا۔ ورنہ یہ بات یہیں ختم ہو جائے گی۔"

سلطان نے سر ہلایا اور پھر... بولنے لگا۔ نثار مرزا غور سے سن رہا تھا۔ جب تک سلطان بولتا رہا، اس نے ایک بار بھی درمیان میں مداخلت نہیں کی۔ سلطان خاموش ہوا تو نثار مرزا تب بھی چپ رہا۔ اس کی پیشانی کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ وہ غور و فکر میں ہے۔

"تمہیں یہ یقین ہے کہ اسرائیلی استنبول کانفرنس کے موقع پر وار کریں گے؟"

"ہاں... ان کا منصوبہ یہی بتاتا ہے۔"

"ممکن ہے یہ منصوبہ صرف ایک دھوکا ہو اور اسرائیلی اصل میں کہیں اور وار کرنا چاہتے ہوں۔"

"اصل بات یہ ہے کہ اسرائیلی ان دونوں مسلم راہنماؤں کے درپے ہیں۔ اگر یہ دھوکا ہے، تب بھی تم احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑو گے کیونکہ تمہاری اصل ذمے داری تو یہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" نثار مرزا نے گہری سانس لی۔ "میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم کہاں ٹھہرے ہو؟"

☆☆☆

وہ استنبول میں تھا جب اسے جنرل بازک کا پیغام ملا۔ اس کے ایک گھنٹے بعد وہ ائرپورٹ پر تھا اور اس نے اٹلی جانے والی ایک پرواز میں سیٹ حاصل کرلی۔ روم ائرپورٹ پر اترنے کے بعد اس نے اسرائیل جانے والی اولین پرواز سے سیٹ بک کرائی اور اس دوران میں بارہ گھنٹے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں گزارے۔ بارہ گھنٹے بعد وہ اسرائیل جانے والی پرواز میں تھا۔ یہ اسرائیلی ائرلائن کا طیارہ تھا۔ اس نے جان بوجھ کر اس کا انتخاب کیا تھا کیونکہ صرف اسرائیلی ائرلائن اسے سہولت فراہم کرتی تھی کہ وہ طیارے کے کپتان کو اپنی خفیہ شہریت کے کاغذات دکھائے تو اسے ائرپورٹ کے عام لاؤنج کے بجائے مخصوص شخصیات کے لیے استعمال ہونے والے لاؤنج سے جانے دیا جائے۔ پرواز کے فوراً بعد اس نے ایک اسٹیوارڈ کی مدد سے طیارے کے کپتان کو اپنے... کاغذات بھجوا دیے تھے۔ تین گھنٹے بعد جب وہ تل ابیب کے ائرپورٹ پر اترا تو اسے مخصوص لاؤنج سے باہر نکالا گیا۔ جنرل بازک تک اس کی آمد کی خبر پہنچ گئی تھی اس لیے ایک سرکاری گاڑی ڈرائیور سمیت اس کی منتظر تھی۔ اسے براہِ راست جنرل بازک کے پاس لے جایا گیا اور اس سے اسے اندازہ ہو گیا کہ معاملہ نہایت سنجیدگی کا حامل ہے۔ جنرل بازک اپنے دفتر میں اس کا منتظر تھا۔ وہاں صرف جنرل نہیں بلکہ اس کا نائب گلورمین اور موساد یورپ کا سربراہ ایشکوف بھی تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد جنرل بازک نے کہا۔ "میرے دوست! اب وقت آگیا ہے کہ تم اسرائیل کے لیے اپنے عہد کی پاسداری کرو۔"

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "تم لوگ یقین نہیں کرو گے، اگر میں یہ کہوں کہ میں گزشتہ چونتیس سال سے اس لمحے کا منتظر تھا۔"

"نہیں، ہم یقین کریں گے۔" گلورمین نے کہا۔ "کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تمہارا تعلق اس خاندان سے ہے جس نے یہودیت کے لیے بے مثال قربانی دی ہے۔ تم میں سے ایک ایک فرد ہمارے لیے مقدس ہے۔ اس کا کہا ہر لفظ ہمارے لیے مقدس ہے۔"

گلورمین کی جذباتی تقریر کا اثر ان سب کے چہروں پر نظر آنے لگا مگر جلد انہوں نے خود پر قابو پا لیا۔ جنرل بازک

ایک طرف دیوار کے ساتھ لگی بہت بڑی ڈیجیٹل اسکرین پر نظر آنے والے ایشیا کے نقشے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ترکی کے جزیرہ نما اور اس سے اوپر ایران کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ دو ملک اسرائیل کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔"

اس نے کسی قدر حیرت سے یہ بات سنی اور نقشے پر ایران کے مشرق میں واقع مسلم ملک کی طرف اشارہ کیا۔ "میں تو سمجھتا تھا کہ اسرائیل کا سب سے بڑا دشمن یہ مسلم ملک ہے۔"

"یہ بھی ہے لیکن فی الحال سرکاری سطح پر ہمیں ابھی اس ملک سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ترکی وہ ملک تھا جس کے اسرائیل سے تعلقات امریکا کے بعد سب سے اچھے تھے۔ لیکن پچھلے برسوں میں صورتِ حال بتدریج تبدیل ہوتی چلی گئی ہے۔ اب ترکی میں ہمارا سفارت خانہ نام نہاد کام کر رہا ہے۔" جنرل بازک بات کرتے ہوئے رکا اور پھر اس نے ایران کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے باوجود ہمارے لیے اصل خطرہ ایران ہے کیونکہ یہ نہایت تیزی سے ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے کام کر رہا ہے اور امکان ہے کہ چند سال بعد ایران ایٹم بم سے مسلح ہوگا۔"

"ہم مزید ایک مسلم ملک کے پاس ایٹمی ٹیکنالوجی برداشت نہیں کر سکتے۔" گلورمین بولا۔

جنرل بازک نے سر ہلا کر اپنے نائب کی بات کو سند بخشی اور بولا۔ "چند سال پہلے تک ترکی اور ایران کے تعلقات اچھے نہیں تھے مگر ترکی کے موجودہ وزیراعظم اور ایرانی صدر نے ان تعلقات کو تیزی سے آگے بڑھایا ہے۔ اب یہ دونوں ملک آپس میں بڑے تجارتی پارٹنر ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر اب یہ فوجی اتحاد کرنے جا رہے ہیں۔ دو مہینے بعد ایرانی صدر کا دورۂ ترکی ہے۔ خفیہ فوجی معاہدے کا ڈرافٹ تیار ہے، بس اس پر دستخط اور اعلان ہونا باقی ہے۔"

"یہ نہایت تشویشناک بات ہے۔" اس نے کہا۔

"تشویشناک سے بھی زیادہ ہے۔ یہ سارا چکر ایرانی صدر کا چلایا ہوا ہے۔ وہ اپنے ملک کی پارلیمنٹ اور شوریٰ کے علم میں لائے بغیر ترکی سے فوجی معاہدہ کر رہا ہے۔ صدر کو معلوم ہے کہ اسے ملک میں مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

گلورمین نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "یعنی اگر صدر اور وزیراعظم نہ رہیں تو یہ معاہدہ غیر موثر ہو جائے گا۔"

جنرل بازک نے اس کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے کہ اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ تمہیں یہاں ہنگامی طور پر کیوں طلب کیا گیا ہے؟"

ایشکوف نے سر ہلایا۔ "اس معاہدے کو ہر صورت ناکام ہونا چاہیے ورنہ یہ اسرائیل کی بقا کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہوگا۔"

"اسرائیل کے لیے خطرہ یہ دونوں ہیں۔" جنرل بازک نے اب اسکرین پر نقشے کی جگہ دکھائی دینے والے ایرانی صدر اور ترک وزیراعظم کی طرف اشارہ کیا۔ "ان دونوں کا اس دنیا سے رخصت ہو جانا نہایت ضروری ہے۔"

وہ سمجھ گیا کہ اسے کیوں بلایا گیا ہے اور اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے پختہ لہجے میں کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ اب مجھے صرف یہ بتایا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"یہ تمہیں ایشکوف بتائے گا۔" جنرل بازک نے جواب دیا۔

☆☆☆

سلطان استنبول کے پرانے علاقے کی چھوٹی گلیوں سے گزر رہا تھا۔ یہاں دو اور تین منزلہ پرانے طرز کے پتھر کے بنے مکانات تھے۔ گلیاں بھی پتھر کی بنی تھیں۔ ایک زمانے میں ان گلیوں میں کچرے کے ڈھیر ہوتے تھے لیکن اب یہاں صفائی نظر آ رہی تھی۔ البتہ ماحول وہی تھا۔ عورتیں کھڑکیوں سے جھانک کر باتیں کر رہی تھیں۔ بعض جگہوں پر گھر والوں نے میز کرسیاں باہر لگا رکھی تھیں اور نہایت بے تکلفی سے کھانا کھا رہے تھے۔

یہ جگہ بندرگاہ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ ایک بلند جگہ آیا، یہاں سے باسفورس کا نیلا پانی جھلک رہا تھا۔ سلطان تقریباً دو کلومیٹرز کا فاصلہ پیدل طے کرکے آیا تھا۔ وہ چاہتا تو ٹیکسی کرکے بھی آسکتا تھا لیکن اس طرح وہ اندازہ کرنا چاہ رہا تھا کہ اس کی نگرانی تو نہیں ہو رہی ہے۔ وہ دو دن سے ایک ہوٹل میں مقیم تھا اور اس دوران میں اس نے سوائے نثار مرزا کے کسی سے رابطے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آج وہ ناشتے کے بعد نکلا اور پرانے شہر میں گھومتا رہا۔ دوپہر کا کھانا اس نے ایک ریستوران میں کھایا۔ یہاں روایتی ترکی ڈشیں تھیں۔ کھانے کے بعد وہ کچھ دیر وہیں رہا اور پھر پیدل چل پڑا۔ اس کا انداز سیاح کا سا تھا جو چل پھر کر استنبول کے تاریخی شہر کو دیکھنا چاہتا ہو۔

سلطان جس مکان کے سامنے رکا، وہ چھوٹا سا لیکن کئی منزلہ تھا۔ باہر سے یہ تین منزلہ لگ رہا تھا لیکن سلطان جانتا تھا کہ اس کے سب سے اوپری حصے میں ایک کمرا اور بنا ہوا تھا۔ اس کا ارادہ یہاں آنے کا نہیں تھا لیکن آج صبح جب اس

www.paksociety.com

نے اخبار دیکھا تو یہاں آنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے ٹھوس لکڑی کا قدیم دروازہ بجایا تو اندر سے ایک نوجوان نکلا۔ اس نے سلطان کو غور سے دیکھا تو وہ آہستہ سے بولا۔
''قاسم بیگ... میرا نام سلطان احمد ہے۔''

نوجوان نے سر ہلایا اور اندر غائب ہو گیا۔ چند منٹ بعد وہ دوبارہ آیا۔ اس نے سلطان کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کی راہنمائی میں سلطان گول چکردار سیڑھیوں سے اوپر آیا۔ آخری فلور پر سیڑھیاں کھلے صحن میں نکلی تھیں اور سامنے ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ کمرے میں دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور دیواروں کے ساتھ تکیے لگے تھے۔ ایک طرف انگیٹھی پر رکھے قہوہ دان سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ سامنے ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے قاسم بیگ بیٹھا تھا۔ وہ تقریباً ساٹھ سال کا مختصر جسامت کا دبلا شخص تھا۔ چہرہ استخوانی لیکن آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بیمار رہا ہے کیونکہ وہ سلطان کو دیکھ کر بھی لیٹا رہا۔ البتہ اس نے ہاتھ پھیلا دیے۔ سلطان اس کے سینے سے لگا۔ وہ محبت سے بولا۔

''میرے بیٹے... میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی کے اس آخری دور میں ایک بار پھر تم سے ملاقات ہوگی۔''

''سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا لیکن حالات...''

''میں جانتا ہوں۔'' قاسم بیگ نے سر ہلایا۔ ''درندے رات کے آخری پہر زیادہ شکار کرتے ہیں کیونکہ اس کے بعد دن طلوع ہو جاتا ہے۔''

''یعنی آپ جانتے ہیں کہ اسرائیلی کوئی بڑی سازش کر رہے ہیں؟'' سلطان نے اسے غور سے دیکھا۔ پھر جیب سے ایک اخباری تراشہ نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ یہ ترکی سے شائع ہونے والا آج کا اخبار تھا۔ اس تراشے میں یوکرائن کے ایک ساحلی ریزورٹ سے چار سیاحوں کی ملنے والی لاشوں کا ذکر تھا۔ پولیس کے مطابق وہ تمام غیر ملکی تھے اور مختلف ملکوں سے آئے ہوئے تھے۔ انہیں سائلنسر لگے ہتھیاروں سے فائرنگ کر کے ہلاک کیا گیا تھا کیونکہ برابر کے کمروں میں موجود افراد نے فائرز کی آواز نہیں سنی تھی۔

''یہ میرے ساتھی تھے بدر، شہاب، جمال اور سمیر۔''

سلطان کی بات سن کر قاسم بیگ کی آنکھوں میں تحیر نظر آیا۔ ''میرے خدا... کیا وہ خط تم نے نہیں بھیجا تھا؟''

''کون سا خط؟''

''طے شدہ اشارہ جس کے آنے پر میں تمہارے ساتھیوں کو خبردار کرتا اور میں نے...''

سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے ایسا کوئی خط نہیں بھیجا۔''

قاسم بیگ بے چین ہو گیا۔ ''دھوکا... کوئی دشمن ہمارے راز اور طریقہ کار سے واقف ہو گیا ہے اور میں جان گیا ہوں وہ کون ہے۔''

قاسم بیگ کی بات ادھوری رہ گئی۔ دروازے کی طرف سے ایک خنجر اڑتا ہوا آیا اور ٹھیک اس کے دل کے مقام پر پیوست ہو گیا۔ قاسم نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک جھٹکا کھایا اور ساکت ہو گیا۔ اسے مرنے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگا۔ اس کے گرتے ہی سلطان کا جسم خودکار انداز میں حرکت میں آیا۔ اسی وجہ سے اس پر پھینکا جانے والا خنجر جو اس کی گردن میں اتر جاتا، اس کے شانے میں لگا۔ سلطان نے دروازے پر قاسم کے نوجوان ملازم کی جھلک دیکھ لی تھی۔ خنجر اسی نے پھینک کر مارے تھے۔ وہ نہایت مشاق تھا۔ ایک سیکنڈ کے وقفے سے اس نے دونوں خنجر پھینکے تھے اور نشانہ بے خطا تھا۔ خنجر دو انچ تک سلطان کے شانے میں اتر گیا تھا۔ یہ چھوٹا مخصوص ساخت کا خنجر تھا جو اصل میں پھینک کر مارنے کے لیے ہوتا ہے۔

سلطان نے خنجر کھینچ کر شانے سے نکالا اور خون بہنے کی پروا کیے بغیر صحن میں آیا تو نوجوان غائب تھا۔ وہ نہایت پھرتی سے نیچے اتر گیا تھا۔ پھر سلطان نے اس کی چیخ و پکار سن کر اوپر سے جھانکا تو وہ گلی میں کھڑا دہائیاں دیتا نظر آیا۔ آس پاس کے رہنے والے جمع ہو رہے تھے۔ اب سامنے سے نکلنا ممکن نہیں رہا تھا۔ سلطان پیچھے کی طرف آیا۔ یہ مکان بہت بڑا نہیں تھا۔ یہاں سارے مکان چھوٹے اور تین چار منزلہ تھے۔ سلطان کمرے کی چھت پر چڑھا اور پچھلی طرف جھانکا۔ یہ مکان دو منزلہ تھا اور اس کی چھت کوئی پندرہ فٹ نیچے تھی۔ وہ اتنی بلندی سے کود سکتا تھا لیکن اس مکان کے لوگ ہوشیار ہو جاتے۔ اس نے آس پاس دیکھا، صحن میں ایک رسی کپڑے باندھنے کے لیے لگی تھی۔ سلطان تیزی سے واپس آیا۔ اس نے خنجر سے رسی کاٹی اور اس کے ذریعے نیچے اتر گیا اور براہ راست گلی میں آ گیا۔ اس نے نیچے اترتے ہی اپنے زخم پر رومال رکھ لیا۔ خوش قسمتی سے کوٹ سیاہ رنگ کا تھا اس لیے اس پر خون کا داغ نمایاں نہیں تھا۔ وہ تیز قدموں سے بندرگاہ کی طرف جانے لگا۔ دس منٹ میں وہ اس جگہ سے بہت دور جا چکا تھا۔ دشمن اس کے اندازے سے زیادہ ہوشیار نکلے تھے۔ انہوں نے کامیاب سازش کر کے اس کے ساتھیوں کو بھی مار دیا تھا اور وہ قاسم بیگ پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے کیونکہ وہ درمیان کا آدمی تھا اور سلطان کے ساتھیوں کے بارے میں وہی جانتا تھا۔ انہوں نے اسے دھوکا دے کر سلطان کے ساتھیوں کو بلوایا اور ایک ساتھ ان کا صفایا کر دیا۔

☆☆☆

ایمان دفتر سے آنے کے بعد نہا کر نکلی تھی کہ کال بیل بجی۔ نثار مرزا ابھی تک نہیں آیا تھا۔ آج کل مصروفیات زیادہ تھیں اور وہ عام طور سے دیر سے گھر آتا تھا۔ ایمان کو اپنے باپ سے بے پناہ محبت تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد اس کے اکیلے رہنے کے خیال سے ایمان نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ وہ چھبیس برس کی دل کش اور متناسب جسامت رکھنے والی لڑکی تھی۔ اس کی طرف بڑھنے والوں کی کمی نہیں تھی لیکن کوئی اسے اچھا ہی نہیں لگا تھا۔ اس نے گیٹ آئی سے جھانک کر دیکھا تو سلطان نظر آیا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ سلطان نے جس طرح اپنا شانہ تھام رکھا تھا، ایمان کو گڑبڑ کا احساس ہو گیا۔ ''کیا ہوا ہے... کوئی چوٹ لگی ہے؟''

سلطان اندر آیا۔ خون خاصا بہہ گیا تھا اور وہ نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے کہا۔ ''نہیں، خنجر لگا ہے۔''

ایمان نے جلدی سے اس کا کوٹ اتارا اور پھر ایک کرسی پر بٹھا کر اس کی قمیص بھی اتار دی۔ شانے پر بندھا رومال پوری طرح خون سے بھیگ گیا تھا اور اب بھی ہلکا سا خون رس رہا تھا۔ وہ اندر سے میڈیکل کٹ نکال لائی۔ پہلے اس نے جراثیم کش محلول سے زخم اچھی طرح دھویا۔ اس کی تکلیف خنجر لگنے سے بھی زیادہ تھی لیکن اس نے زخم جلا کر خون روک دیا۔ شانے اور بازو کو اچھی طرح صاف کر کے ایمان نے زخم پر خشک کرنے والا پاؤڈر چھڑکا اور اوپر سے چکنی پٹی رکھ کر ٹیپ کر دیا۔ خون نے بنیان بھی خراب کر دی تھی۔ سلطان نے ایمان کے اصرار پر وہ بھی اتار دی۔ ایمان نے اسے نثار مرزا کا ایک ڈھیلا کرتہ لا دیا تھا۔ ایک گلاس دودھ کے ساتھ سلطان نے اینٹی بایوٹک اور پین کلر دوا لی۔ پھر ایمان اس کے اور اپنے لیے کافی لے آئی۔ اس نے اب تک کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

''حملہ کس نے اور کیوں کیا؟''

''میں اپنے ایک پرانے ساتھی سے ملنے گیا تھا۔ اس کے ملازم نے حملہ کر کے اسے مار دیا، خوش قسمتی سے میں بچ گیا۔ خنجر دو انچ اوپر ہوتا تو میری گردن میں اتر جاتا۔''

ایمان نے میز پر رکھے خنجر کی طرف دیکھا۔ ''مجھے لگ رہا ہے یہ مخصوص ساخت کا خنجر ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے پاپا کی لائبریری میں اس کی تصویر دیکھی ہے۔'' وہ بولی اور اٹھ کر اسٹڈی میں چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک پرانی کتاب تھی۔ ''یہ قدیم ہتھیاروں کے بارے میں ہے۔''

وہ صفحے پلٹنے لگی۔ ''ہاں یہ رہا... تقریباً یہی ہے۔''

سلطان نے آگے ہو کر دیکھا۔ واقعی یہ تصویر اسی خنجر کی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ جدید اسٹیل کا بنا ہوا تھا جبکہ تصویر والا خنجر لوہے کا تھا۔ تصویر کے نیچے وضاحت تھی کہ اس قسم کے خنجر حسن بن صباح کے فدائی استعمال کرتے تھے۔ وہ خنجر زنی کے ساتھ خنجر پھینک کر مارنے کے ماہر بھی ہوتے تھے۔ سلطان نے خنجر مارنے والے نوجوان کے بارے میں سوچا۔ وہ مضبوط جسامت کا اور صورت سے سخت نظر آنے والا شخص تھا۔ وہ قاسم بیگ کے پاس ملازم تھا اور یقیناً خاصے عرصے سے ملازم تھا۔ اس نے قاسم بیگ کا اعتماد بھی حاصل کر لیا ہوگا۔ قاسم بیگ ایسا شخص نہیں تھا جو اتنی آسانی سے کسی پر اعتماد کر لیتا۔ مگر وہ قاسم بیگ کا نگران تھا اور جیسے ہی اس نے محسوس کیا کہ وہ خطرہ بن گیا ہے، اس نے قاسم بیگ کا خاتمہ کر دیا اور اسے بھی مارنے کی کوشش کی۔ وہ کوئی فدائی تھا لیکن کس کا...؟ حسن بن صباح کا تو دور ہزار سال پہلے ختم ہو گیا تھا۔ سلطان نے ایمان کو قاسم بیگ کے بارے میں بتایا۔ ''تم اس کے بارے میں معلوم کر سکتی ہو۔ معاملہ اب تک پولیس کے ہاتھ میں جا چکا ہوگا۔''

ایمان نے اس علاقے کے پولیس اسٹیشن کال کی اور رپورٹ لی۔ دس منٹ بعد اس نے ریسیور رکھ کر سلطان سے کہا۔ ''پولیس کو مکان سے صرف ایک بوڑھے کی لاش ملی ہے جسے مقامی لوگ قاسم بیگ کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اس کے ملازم نے شور مچا کر لوگوں کو جمع کیا تھا لیکن پولیس کی آمد سے پہلے وہ خود پراسرار طور پر غائب ہو گیا۔ آس پاس رہنے والوں کے مطابق اس نے بتایا کہ ایک شخص جو مہمان بن کر آیا تھا، اس نے اس کے آقا کو قتل کر دیا ہے۔''

یہ سن کر سلطان کو غصہ آ گیا۔ ''بکواس کرتا ہے وہ...''

''میں جانتی ہوں۔'' ایمان نے نرمی سے کہا۔ ''میں تو پولیس رپورٹ بتا رہی ہوں۔''

''اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دشمن کتنا تیز جا رہا ہے۔'' سلطان نے خود سے کہا۔

''مسٹر سلطان!'' ایمان نے اچانک لہجہ بدل کر کہا۔

www.paksociety.com

"آپ چاہیں تو مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ میں نثار مرزا کی بیٹی ہی نہیں ہوں بلکہ وزارتِ داخلہ کی ایک ذمے دار افسر بھی ہوں۔"

"کیا نثار مرزا نے تمھیں کچھ بتایا ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ہاں، پاپا مجھ سے کچھ نہیں چھپاتے۔ میں تو یہ بھی جانتی ہوں کہ ایک زمانے میں آپ اور آپ کے ساتھی کیا کرتے رہے اور پھر کیوں روپوش ہونے پر مجبور ہوئے۔"

سلطان احمد نے گہری سانس لی۔ "تم قاسم بیگ کے بارے میں جانتی ہو؟"

"نہیں، پاپا نے اس کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔"

"یہ ایک زمانے میں ہمارا ساتھی تھا۔ ایک ایسا ساتھی جس کے بارے میں ہمارے اوپر والے بھی نہیں جانتے تھے۔ یوں سمجھ لو کہ ہم نے اپنی آسانی کے لیے اسے ہائر کیا تھا۔ پھر جب ہم منتشر ہوئے تو قاسم بیگ درمیان کا آدمی بن گیا۔ صرف وہی جانتا تھا کہ میں اور میرے ساتھی کہاں ہیں اور ہم سے کس طرح رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی نے اسے استعمال کیا اور میرے ساتھیوں کو دھوکے سے یوکرائن بلوا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

ایمان چونک گئی۔ "وہ تمہارے ساتھی ہیں جن کے بارے میں آج صبح کے اخبارات میں..."

سلطان نے سر ہلایا۔ وہ مغموم نظر آرہا تھا۔ "ہاں، ہم نے بہت سارا وقت ساتھ گزارا اور ہمارا ایک مشن تھا۔ وہ میرے دوست تھے۔ ہم اپنی سلامتی کی خاطر روپوش ہونے پر مجبور ہوئے تھے۔ دشمنوں نے قاسم کو میری طرف سے خط بھیجا اور وہ اسے سچ سمجھا۔ اس نے میرے ساتھیوں کو مخصوص اشارہ بھیج دیا اور وہ مجھ سے ملاقات کے لیے اپنے محفوظ ٹھکانوں سے باہر نکل آئے۔ دشمن قاسم سے واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ ہمارے لیے کام کر رہا ہے۔"

ایمان سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس نے سلطان کی طرف دیکھا۔ "میں وزارتِ داخلہ کی وی آئی پی سیکیورٹی ٹیم میں ہوں۔ کچھ دن بعد استنبول میں ہونے والی سربراہی کانفرنس اور اس کے بعد ایران اور ترکی کے سربراہوں کی ملاقات کی سیکیورٹی کی ذمے داری ہمارے سپرد ہے۔ اگر تمہاری بات درست ہے تو اسرائیلی اس موقع پر حملہ کریں گے۔"

"یہ بات سو فیصد درست ہے۔" سلطان نے برہمی سے کہا۔ "موساد نے ایسے ہی میرے پورے گروپ کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا ہے۔"

"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے، میں مانتی ہوں کہ آپ درست کہہ رہے ہیں۔" ایمان ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "آپ کا کیا خیال ہے، اسرائیلی کس طرح سے حملہ کریں گے؟"

"اب تک جو سامنے آیا ہے، اس سے لگتا ہے کہ اسرائیلی کسی ایسے طریقے پر عمل کریں گے جو حسن بن صباح کے فدائی استعمال کرتے تھے۔ فدائیوں کا سب سے بڑا حربہ حیرانگی تھا یعنی وہ ایسے طریقے سے حملہ کرتے تھے جو حفاظت کرنے والوں کو ذہن میں نہیں آتا تھا۔ اس منصوبے میں انہوں نے کچھ ایسا ہی طریقہ سوچا ہے۔ یہ بات تو اسرائیلی بھی جانتے ہوں گے کہ اس موقع پر حفاظتی انتظامات اتنے سخت ہوں گے کہ کسی عام طریقے سے کسی حملہ آور کا ان شخصیات تک پہنچنا ناممکن ہوگا۔ حملہ آور بہت پہلے پکڑ لیا جائے گا یا مارا جائے گا۔"

"حیرانگی کا عنصر۔" ایمان نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "کیا وہ اندر کے کسی آدمی سے کام لیں گے؟"

"ایسا ہونا بالکل ممکن ہے۔ اگر سیکیورٹی پر مامور فرد خود حملہ آور ہو تو اسے روکنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ حسن بن صباح کے اکثر فدائی حملہ آور ان شخصیات کے محافظ یا معتمد ہوتے تھے جنہیں وہ اشارہ ملتے پر قتل کر دیتے تھے۔ ممکن ہے موساد نے ایسے ہی افراد ترکی کی سیکیورٹی میں پہلے سے داخل کر رکھے ہوں۔"

"ہو سکتا ہے۔" ایمان نے سر ہلایا۔ "لیکن وی آئی پی سیکیورٹی بہت چھان بین کر رکھی جاتی ہے۔"

رات کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ ایمان کچن میں آئی، اس نے فریج سے گوشت اور دوسرا سامان نکالا اور کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ کچن لاؤنج کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ سلطان اسے کھانا بناتے دیکھتا رہا۔ اس وقت اسے آسیہ یاد آرہی تھی۔ اچانک ایمان کی آواز نے اسے چونکایا۔ "آپ نے اپنے ساتھی کا ذکر کیا تھا، وہ موساد کے حملے سے بچ گیا تھا؟"

"تریم پاشا... وہ ترک ہے لیکن اس کا بزنس برطانیہ میں ہے اس لیے وہ وہیں رہتا ہے۔ موساد نے وہیں حملہ کر کے اس کے مکان کو آگ لگا دی۔ اس کا بٹلر اور کک مارے گئے لیکن وہ باہر ہونے کی وجہ سے بچ گیا۔"

"تریم پاشا کیسا آدمی ہے؟"

"سخت جان، محبِ وطن اور اپنے مقصد کے لیے آخری لمحے تک کوشش کرنے والا آدمی ہے۔"

"اس نے آپ کو خبردار کیا تھا؟ وہ بھی اسرائیلیوں کے منصوبے کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا ہوگا۔"

"جب مجھے ملا تھا، تب اتنا نہیں جانتا تھا لیکن ہو سکتا ہے اب جان گیا ہو۔ یقیناً وہ بھی اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا ہوگا۔"

"آپ اس سے رابطہ کر سکتے ہیں؟"

"کوشش کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے اس نے حفاظت کی وجہ سے طے شدہ چینل بند کر دیے ہوں۔"

ایمان چولھے کی آنچ دھیمی کر کے اس کے پاس آئی۔ "ہمارے لیے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ موجودہ حکومت اور موجودہ وزیرِاعظم نے ترکی کو دنیا میں ایک شناخت دی ہے۔ ایک زمانے میں وہ استنبول کا میئر تھا اور اس نے یہاں سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس نے ہر مرحلے پر کام کر کے دکھایا۔ آج وہ ترکی کی امید ہے۔"

"صرف ترکی نہیں، عالمِ اسلام کی بھی امید ہے۔" سلطان نے اضافہ کیا۔ "اس نے اسرائیل کے خلاف جرأت مندانہ موقف اختیار کیا اور مظلوم فلسطینیوں کی مدد کی کوشش کی۔"

سلطان نے اسی بنا پر واپسی کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ موساد والے مسلسل اس کے پیچھے لگے رہیں گے اور بالآخر اسے تلاش کر کے مار دیں گے۔ اس لیے میدان کھلا چھوڑنے کے بجائے ان کا مقابلہ کرنا زیادہ بہتر تھا۔ کچھ دیر بعد نثار مرزا آگیا۔ آج حفاظتی انتظامات کو حتمی صورت دی گئی تھی۔ کھانے کی میز پر اس نے سلطان سے پوچھا۔ "اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"پہلے میں نے سوچا تھا کہ تمہیں اطلاع دے کر اور اسرائیلیوں کے عزائم سے آگاہ کر کے میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ لیکن موساد کے درندوں نے جس طرح میرے بے گناہ ساتھیوں کو ہلاک کیا ہے، اب مجھ پر فرض ہو گیا ہے کہ میں ان کا بدلہ لوں اور اسرائیلیوں کو ناکام بنانے میں اپنا عملی کردار ادا کروں۔"

"تم کیا کر سکتے ہو؟" نثار مرزا نے نفی میں سر ہلایا۔ سلطان پر حملے کا سن کر وہ فکرمند ہو گیا تھا۔ "تم خود مرتے مرتے بچے ہو۔"

"پاپا! یہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" ایمان جلدی سے بولی۔ "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں؟"

"کس حیثیت سے؟"

"موساد کے ماہر کی حیثیت سے۔ ہمارے پاس ایسا کوئی آدمی نہیں ہے جو موساد کے ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف ہو۔"

نثار مرزا سوچ میں پڑ گیا، کھانا لگ گیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ لاؤنج میں آئے تو سلطان نے اپنے اوپر ہونے والے حملے کی تفصیل سنائی۔ "اس کا مطلب ہے کہ موساد والے یہاں سرگرم ہیں۔"

"یہ اس کھلی چھوٹ کا نتیجہ ہے جو سابقہ حکمرانوں نے اسرائیل کو دی تھی۔" ایمان نے کہا۔

"میں نے ترکی کی تاریخ پڑھی ہے۔" سلطان بولا۔ "تم لوگ ایک چیز نظرانداز کر رہے ہو۔ ترکی کے سیکولر حکمرانوں کا تعلق اصل میں یہودیوں سے بہت گہرا رہا ہے اور یہ بات مشہور ہے کہ کئی مشہور افراد جو بہ ظاہر مسلمان تھے، اندر سے یہودی تھے۔ یہی بات کئی خاندانوں کے لیے مشہور ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" نثار مرزا نے سنجیدگی سے کہا۔ "ان گھرانوں کا بہت زیادہ اثر رسوخ ہے لیکن اب ان کا اثر کم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہم نے خاصی حد تک چھانٹی کی ہے اور آگے بھی جاری ہے۔ فوج اور سول بیوروکریسی کا بہت بڑا حلقہ انہی لوگوں پر مشتمل تھا لیکن اب مخلص لوگوں کو آگے لایا جارہا ہے۔ اس کام میں ابھی دس پندرہ سال اور لگیں گے، اگر موجودہ حکمرانوں کو کام کرنے کا موقع ملا۔"

"اور لگ ایسا رہا ہے کہ اسرائیلیوں نے یہ موقع چھین لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" ایمان بولی۔

"یہ ان کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔" سلطان بولا۔ "اسرائیلی ذرا سے خطرے کو بھی یوں محسوس کرتے ہیں کہ اگر وہ باقی رہا تو اسرائیل باقی نہیں رہے گا۔"

"اسی لیے وہ انتہا تک چلے جاتے ہیں۔" نثار مرزا نے کہا پھر اس نے سلطان کی طرف دیکھا۔ "تمہیں نہایت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تم پر ایک قاتلانہ حملہ ناکام ہوا ہے لیکن وہ دوبارہ کوشش کریں گے۔"

"مجھے اپنی حفاظت کرنا آتی ہے لیکن میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔"

"میں کل ہی آپ کے لیے بات کرتی ہوں۔ اگر میرا باس مان گیا تو کوئی ہتھیار لینا مسئلہ نہیں ہوگا۔" ایمان بولی۔ وہ سلطان سے احترام آمیز انداز میں بات کرتی تھی لیکن وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

اسے انکل یا اس قسم کے کسی رشتے سے نہیں پکارتی تھی۔

سلطان نے دنیا دیکھی تھی اور اسے محسوس ہوا تھا کہ ایمان اس میں کسی اور طرح کی دلچسپی لے رہی ہے۔ جب وہ کافی بنانے گئی تو سلطان نے نثار کو خنجر کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی سن کر فکرمند ہو گیا۔

"ان لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ صدیوں پہلے ختم ہو گئے تھے۔"

"لیکن یہ خنجر اور حملہ کرنے کا انداز بتا رہا ہے کہ فدائی آج بھی موجود ہیں اور اپنی جان پر کھیل کر اپنے آقاؤں کے حکم کی تکمیل کرتے ہیں۔"

"قاسم بیگ کے قتل کی رپورٹ نامعلوم آدمی کے خلاف لکھی گئی ہے کیونکہ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ گویا استنبول کی پولیس کو تمہاری تلاش ہو گی۔"

"کیا پولیس اس نوجوان کو تلاش نہیں کر رہی جو قاسم بیگ کے گھر میں ملازم تھا؟"

"پولیس اسے بھی تلاش کر رہی ہے لیکن قتل کا شبہ اس پر نہیں ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ قاتل یا قاتلوں نے اسے بھی غائب کر دیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم واپس ہوٹل جانے کے بجائے یہیں رک جاؤ۔ ہوٹل میں تم نے اپنا نام کیا لکھوایا تھا اور وہاں کوئی چیز ہے؟"

"میں نے اپنا نام اکبر دانیال لکھوایا تھا اور ہوٹل میں میری کوئی چیز نہیں ہے۔"

"بس تو واپس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی تمہیں آرام اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔"

سلطان کو گیسٹ ہاؤس کا کمرا ملا تھا وہ سکون سے سویا۔ اس کے خیال میں معاملات ٹھیک جا رہے تھے۔ اگلی صبح وہ اٹھا تو نثار دفتر جا چکا تھا۔ اسے ایمان نے اٹھایا۔ "بس اب اٹھ بھی جائیں... ہمیں تیار ہو کر جانا بھی ہے۔"

سلطان منہ ہاتھ دھو کر ناشتے کی میز پر آیا۔ ایمان پوری طرح تیار تھی۔ آج اس نے پینٹ کے ساتھ کسی قدر چست شرٹ پہن رکھی تھی جس میں اس کا سراپا نمایاں تھا۔ سلطان جانتا تھا کہ وہ اپنے آبائی ملک میں ہوتی تو شاید اس قسم کی ڈریسنگ نہ کرتی لیکن ترکی میں دفتروں میں کام کرنے والی خواتین عام طور سے مغربی لباس ہی پہنتی ہیں۔ ناشتے کے دوران سلطان نے کہا۔ "تم مجھے انکل یا اسی قسم کے کسی رشتے سے کیوں نہیں پکارتی ہو؟"

"کیونکہ میں آپ کو اپنا دوست سمجھتی ہوں۔"

سلطان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس لڑکی کی بے تکلفی پر کیا طرزِ عمل اختیار کرے جو عمر میں اس سے انیس برس چھوٹی تھی اور ساتھ ہی اس کے ایک بہت اچھے دوست کی بیٹی بھی تھی۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "شاید نثار کو یہ بات اچھی نہ لگے۔"

ایمان نے اسے چمکتی آنکھوں سے دیکھا۔ "آپ پاپا کی فکر نہ کریں، اپنے بارے میں بتائیں... آسیہ کیسی ہے اور بچے؟"

سلطان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ آسیہ اور بچوں کے بارے میں بتانے لگا۔ اسے دنیا میں ان سے زیادہ کسی اور سے محبت نہیں تھی۔ ایمان توجہ سے سنتی رہی۔ ناشتے کے بعد اس نے تنقیدی نظروں سے سلطان کو دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنا حلیہ بدلنا ہو گا۔"

"میں بھی اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں کیونکہ اسرائیلی میری راہ پر ہیں اور وہ مجھے صورت سے پہچانتے ہیں۔ مگر یہ کام کیسے ہو گا؟ شاید مجھے کسی ماہر کی مدد کی ضرورت پڑے۔"

"ماہر موجود ہے۔" ایمان مسکرائی اور اپنی طرف اشارہ کیا۔ ناشتے کے بعد وہ اسے اپنے کمرے میں لائی۔ پہلے اس نے سلطان کے بالوں کی کٹنگ کی۔ اس نے سلطان کو اعتراض کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے لمبے بال مختصر کر کے انہیں کریو کٹ کیا پھر انہیں اسپرے کلر کی مدد سے لائٹ براؤن کیا۔ سلطان کی شیو بڑھ گئی تھی۔ ایمان نے اسے شیو برقرار رکھنے کو کہا اور اس کی آنکھوں میں ہلکے سرمئی مائل نیلگوں رنگ کے لینس لگا دیے۔ اب وہ خاصا مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ سلطان سمجھ رہا تھا کہ یہ موقع کی ضرورت ہے لیکن ساتھ ہی وہ ایمان کی بے تکلفی سے پریشان بھی تھا۔ وہ اسے چھو رہی تھی اور کام کے دوران اکثر اس کے اتنے پاس آ جاتی کہ اس کے بدن سے اٹھتی مسحور کن خوشبو سلطان کو پریشان کرنے لگتی۔ میک اپ مکمل ہوا اور اس نے سلطان کے زخم کی نئی ڈریسنگ کی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ پین کلر اور اینٹی بائیوٹک لینے سے درد بہت کم رہ گیا تھا اور زخم بھرنے کی حالت میں آ گیا تھا۔ ایک مسئلہ تھا کہ اس کے پاس کپڑے نہیں تھے۔ ایک جوڑے کے ساتھ اس کا بیگ ہوٹل میں تھا۔ ایمان نے کہا۔ "ہم جاتے ہوئے کسی اسٹور سے کپڑے لے سکتے ہیں۔"

ایمان کے پاس ٹویوٹا اسپورٹس کار تھی۔ اس نے سلطان کو بتایا کہ اس کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ اس کار کو خرید سکتی۔ یہ اس کے باپ نے تحفتاً دی تھی۔ راستے میں اس نے ایک گارمنٹ سپر اسٹور پر کار روکی۔ یہاں سے سلطان نے اپنے لیے ایک مکمل سوٹ اور ایک پینٹ شرٹ لی۔ پھر اس نے ایمان کے مشورے سے ایک نائٹ سوٹ بھی لے لیا۔

استنبول میں آبنائے باسفورس سے کچھ دور ایک خوب صورت عمارت میں وزارتِ داخلہ کا مقامی آفس تھا۔ نثار کا دفتر بھی اسی عمارت میں تھا لیکن وہ ٹاپ فلور پر تھا۔ ایمان کا دفتر تیسرے فلور پر تھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے انہیں مکمل سیکیورٹی سے گزرنا پڑا۔ سلطان کسی صورت اندر نہیں جا سکتا تھا، اگر اس کے ساتھ ایمان نہ ہوتی۔ وہ اپنی ذمے داری پر اسے اندر لے گئی۔ ایمان کا شعبہ زیادہ بڑا نہیں تھا اور اس میں سارے اسپیشل ایجنٹ تھے۔ ایمان کا باس روش پاشا ایک پچاس سال کا کسی قدر پستہ قد لیکن چاق و چوبند شخص تھا۔ ایمان سلطان کو سیدھی اس کے پاس لے گئی کیونکہ روش پاشا ہی سلطان کو کام کرنے کی اجازت دے سکتا تھا اس لیے اسے کسی قدر تفصیل سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ ایمان نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ اسے کیا بتانا ہے کیونکہ سلطان کی ضمانت نثار مرزا تھا۔ اس لیے سب بتانا ضروری نہیں تھا۔ موساد کے منصوبے کی خبر یقیناً وزارتِ داخلہ کے اعلیٰ حکام تک پہنچ گئی تھی اس لیے سلطان کا تعارف موساد کے ماہر کی حیثیت سے درست رہا۔ روش پاشا اس سے گرم جوشی سے ملا مگر ساتھ ہی کسی قدر طنز سے کہا۔

"میں پہلی بار کسی ایسے مسلمان سے مل رہا ہوں جو خود کو موساد کا ماہر کہتا ہے۔"

"میں نے یہ تجربہ اپنے دس عزیز ساتھیوں کو کھو کر حاصل کیا ہے۔" سلطان نے جواب دیا تو روش پاشا سنجیدہ ہو گیا۔

"سوری۔"

اس نے سلطان کا مختصر سا انٹرویو لیا۔ شاید وہ اس کی صلاحیت جانچنا چاہ رہا تھا۔ پھر ایمان اسے اپنے کیبن میں چھوڑ کر دوبارہ روش پاشا کے پاس گئی، غالباً وہ اس بارے میں فیصلہ کر رہے تھے۔ روش پاشا نے نثار مرزا سے بھی رابطہ کیا۔ ایک گھنٹے کی میٹنگ کے بعد سلطان کے کردار کا تعین ہو گیا۔ اسے شعبے میں عارضی اپائنٹ کیا جا رہا تھا اور وہ... بہ حیثیت رضا کار کام کرتا۔ اس کی ضمانت نثار مرزا نے دی تھی جو وزارتِ داخلہ کے چند اعلیٰ ترین افسران میں سے ایک تھا۔ ایمان خود روش پاشا کے شعبے سے تھی اور سلطان اس کے ساتھ کام کرتا۔ ایک گھنٹے کے اندر سلطان کا کارڈ بن گیا اور دوسرے تمام مراحل بھی طے کر لیے گئے..... سلطان نے اس سے کہا۔

"مجھے ایک اچھی کار اور ایک عدد پستول کی ضرورت ہے۔"

"گاڑی خریدنی پڑے گی البتہ پستول یہاں سے مل جائے گا لیکن پہلے ہم کسی اچھی سی جگہ لنچ کریں گے۔"

لنچ کے بعد ایمان اسے ایک کار ڈیلر کے پاس لے گئی۔

☆☆☆

وسطی پولینڈ کے اس چھوٹے سے قصبے کاسک میں ہائی وے کے انڈسٹریل ایریا کے ساتھ ایک چھوٹی سی عمارت پر ایک فرم کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ درحقیقت یہ عمارت یورپ میں موساد کا ہیڈ کوارٹر تھی۔ اوپر سے معمولی نظر آنے والی اس عمارت کا بیس منٹ بہت وسیع تھا اور اصل کام وہیں ہوتا تھا۔ اوپر تو بس معمولی سے دفتر نما کمرے تھے۔ بیس منٹ کے ایک چھوٹے سے ہال میں وہ ایشکوف کے ساتھ موجود تھا۔ وہ چند گھنٹے پہلے ہی یہاں پہنچا تھا اور تین گھنٹے بعد اس کی واپسی کی فلائٹ تھی۔ ایشکوف اسے بیس منٹ میں لایا۔ اسے بھی وقت کی کمی کا احساس تھا اس لیے وہ فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔ ہال کے وسط میں میز پر ایک عام... گھڑی رکھی تھی۔ یہ بڑے سائز کے ڈائل والی قیمتی گھڑی تھی۔ ایشکوف نے گھڑی اٹھا کر اسے دکھائی اور پھر کلائی پر پہن لی۔

"تمہارا اصل ہتھیار یہ گھڑی ہے۔ اسے دیکھو... بہ ظاہر یہ عام سی گھڑی ہے۔ اس میں عام گھڑی کی چابی ہے۔ میں اس کی چابی کھینچتا ہوں تو یہ دیکھو جہاں تاریخ آ رہی ہے، یہاں سے سبز روشنی جھلکنے لگی ہے۔ اب میں چابی اندر کرتا ہوں تو روشنی غائب ہو جاتی ہے۔ میں دوبارہ چابی کھینچتا ہوں تو اس بار سرخ روشنی جھلک رہی ہے۔ اب میں چابی اندر کرتا ہوں تو تم دیکھو گے کہ کیا ہوتا ہے۔"

جب وہ اس ہال میں آئے تو ایک طرف ایک صحت مند کتا بھی موجود تھا۔ اس کا پٹا دیوار سے بندھا تھا اور وہ خاموش بیٹھا تھا، اس نے توجہ نہیں دی تھی۔ جب ایشکوف نے گھڑی کے ڈائل کے اوپری حصے کا رخ کتے کی طرف کر کے چابی اندر کی تو کتے کے حلق سے ایک ہلکی سی آواز نکلی اور وہ جس طرح بیٹھا تھا، اسی طرح سر قالین پر رکھ کر ساکت ہو گیا۔ وہ حیران ہوا۔ "کتے کو کیا ہوا ہے؟"

"یہ مر چکا ہے۔" ایشکوف نے سرد لہجے میں کہا۔ "سائنائڈ میں بجھی سوئی نے اسے ایک لمحے میں موت کی

آغوش میں دھکیل دیا ہے۔ یہ سوئی اس گھڑی سے نکلی ہے۔''

وہ دہل گیا۔ بہ ظاہر عام سی نظر آنے والی گھڑی اتنا مہلک ہتھیار ہوگی، اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ایشکوف نے فخریہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''اسرائیل کے ماہر ایسی چیزیں ایجاد کر رہے ہیں جنہیں لوگ ابھی فلموں میں دیکھتے ہیں۔''

''یہ چیک نہیں ہو سکتی؟''

''نہیں، اس کا مکینزم ایسا ہے کہ ایکسرے سے دیکھنے پر بھی یہ گھڑی کا حصہ لگتا ہے۔ سوئیاں صرف ایک ملی میٹر لمبی ہوتی ہیں اور انہیں مشین اتنے پریشر سے پھینکتی ہے کہ یہ دس فٹ کے فاصلے سے بھی جسم میں گھس جاتی ہیں۔ گھڑی میں ایسی چار سوئیاں لوڈ ہو سکتی ہیں۔ آؤ میں تمہیں اس کا طریقہ کار بتاتا ہوں۔''

ایک گھنٹے میں وہ اس گھڑی نما ہتھیار کے فنکشن کو پوری طرح سیکھ چکا تھا۔ ایشکوف نے گھڑی کے ساتھ اسے سوئیوں کا اضافی سیٹ بھی دیا۔ یہ سیٹ بہ ظاہر ایک بال پین کی طرح تھا۔ دو گھنٹے بعد وہ دوبارہ ترکی کی طرف محو پرواز تھا۔ اس نے طیارے کے باہر اڑتے آوارہ بادلوں کو دیکھ کر سوچا کہ وقت آگیا ہے وہ اپنے عہد کی پاسداری کرے۔

☆☆☆

سلطان نے اعشاریہ تین آٹھ کے اس مختصر لیکن مہلک پستول کو دیکھا۔ جب وہ سی آئی اے کے لیے کام کر رہا تھا تو یہ اس کا پسندیدہ ہتھیار تھا۔ ایمان کی مدد سے اس نے دو سال پرانی لیکن تقریباً نئی جیسی فراری خریدی تھی۔ پرانی ہونے کے باوجود یہ اسے پچاس ہزار امریکی ڈالرز کی پڑی تھی۔ ایمان کا خیال تھا کہ وہ کوئی مناسب لیکن کم قیمت کار خریدے گا۔ ایمان نے حیرت سے کہا۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنے دولت مند ہیں۔''

سلطان نے اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ''تم نے ہتھیار دینے کا کہا تھا۔''

ایمان اسے اپنے شعبے اسلحہ کے انچارج کے پاس لائی۔ اس نے سلطان کے سامنے ایک الماری کھول دی جس میں ہر طرح کا چھوٹا اسلحہ سجا ہوا تھا۔ ''اس میں سے جو چاہے، پسند کرلو۔''

سلطان نے اعشاریہ تین آٹھ کا پستول پسند کیا۔

انچارج نے ایک بک اس کی طرف بڑھائی۔ سلطان نے سائن کر کے واپس کردی۔

ایمان اسے اپنے دفتر میں لائی۔ ''فی الحال آپ یہاں بیٹھیں جلد...''

''میں بیٹھنے نہیں آیا ہوں۔'' سلطان نے کہا۔ ''وقت کم ہے، صرف چار دن رہ گئے ہیں۔ تم مجھے وہ جگہ دکھاؤ جہاں دونوں ملکوں کے سربراہ ملاقات کریں گے۔''

''یہ کام کل نہ...''

''میں نے کہا نا وقت نہیں ہے۔'' سلطان نے اس کی بات کاٹی۔ ''اب تو ویسے بھی چھٹی کا وقت ہو گیا ہے۔''

وہ آگے پیچھے روانہ ہوئے۔ استنبول کے بحیرۂ اسود والے ساحل پر کنونشن سینٹر کی خوب صورت عمارت تھی۔ سربراہی کانفرنس اسی کنونشن سینٹر میں تھی۔ کانفرنس کے بعد ایران اور ترکی کے سربراہان کے درمیان ملاقات بھی یہیں ہونا تھی اور کام کے لیے کنونشن سینٹر کا چوتھا فلور مخصوص تھا۔ یہ اصل میں وی آئی پی فلور تھا اور باقی کنونشن سینٹر سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہاں آمد و رفت کے راستے بھی بالکل الگ تھے۔ ایمان اپنی گاڑی باہر پارکنگ میں روکنے کے بجائے اندر لے گئی۔ مجبوراً سلطان نے بھی اس کی تقلید کی ورنہ وہ پہلے باہر کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اندر وی آئی پی پارکنگ تھی۔ ایمان نے گاڑی وہیں روکی۔ سلطان کو حیرت ہوئی۔ کسی نے انہیں اندر آنے سے نہیں روکا۔ ایمان اور وہ سیڑھیوں سے اوپر آئے۔ چوتھا فلور بہت بڑا تھا۔ یہ دو بڑے ہال اور ایک چھوٹے میٹنگ روم پر مشتمل تھا۔

''صرف یہی ہال استعمال ہوگا؟''

''ہاں... بڑا ہال اور میٹنگ روم اس دوران میں بند ہوں گے۔''

''سیکیورٹی پلان کیا ہے؟''

''کنونشن سینٹر کو تقریباً ایک ہزار فیڈرل گارڈز اپنے گھیرے میں لے کر رکھیں گے۔ وہ صرف باہر نہیں بلکہ تمام فلورز پر ہوں گے اور ان کے ہوتے ہوئے عملاً کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔''

''زینوں، فلور اور لفٹس کی حفاظت کس کی ذمے داری ہے؟''

''یہ ذمے داری میرے شعبے کی ہے۔ اندر کا پورا کنٹرول ہمارے پاس ہوگا۔''

''الیکٹرانک سیکیورٹی کی کیا پوزیشن ہے؟''

''اس میٹنگ سے پہلے پورے کنونشن سینٹر کو چیک کیا جائے گا۔ دو مختلف ادارے کلیئرنس دیں گے اس کے بعد ہی میٹنگ ہوگی۔ یہاں کسی قسم کے آتش گیر مواد یا کیمیکل کی موجودگی ممکن نہیں ہے۔''

''کھلے حملے کے خلاف کیا سیکیورٹی ہے؟''

''فول پروف... زمین سے حملہ ناممکن ہے اور فضا میں مستقل چار جنگی طیارے اور چار ہی گن شپ ہیلی کاپٹرز موجود ہوں گے۔ ان کا رابطہ مستقل نیچے کی سیکیورٹی سے ہوگا۔''

''خودکش حملہ آور؟''

''وہ کنونشن سینٹر کے پاس بھی نہیں آسکے گا۔ آس پاس کی عمارتوں پر سو کے قریب اسنائپر ہوں گے جو حکم ملتے ہی مشتبہ شخص کو ہلاک کر دیں گے۔''

سلطان نے گھوم پھر کر پورے فلور کا معائنہ کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ عام طریقے سے یہاں حملہ کرنا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن حد تک مشکل ہے پھر اس کا خیال لفظ ''حشاشین'' کی طرف گیا۔ اسرائیلی منصوبہ حسن بن صباح کے طرز کا تھا۔ یعنی اندر کا آدمی اچانک حملہ کرے گا اور سیکیورٹی کے ہوشیار ہونے سے پہلے اپنا کام کر جائے گا۔ اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد وہ یا تو مارا جائے گا یا خودکشی کر لے گا زندہ گرفتار نہیں ہوگا جیسے حسن بن صباح کے فدائی زندہ گرفتار نہیں ہوتے تھے۔ سلطان نے ایمان سے پوچھا۔ ''سیکیورٹی کا لے آؤٹ پلان کہاں ہے؟''

''ظاہر ہے میرے دفتر میں... لیکن آپ نے کچھ پوچھنا ہے تو مجھ سے پوچھ سکتے ہیں؟''

''تقریب کتنی دیر کی ہے؟''

''تقریباً دو گھنٹے کی... اس میں ڈیڑھ گھنٹے کی ون ٹو ون ملاقات ہے جو اسی درمیانی ہال میں ہوگی اور اس دوران میں دونوں سربراہان کے ساتھ صرف انتہائی قریبی دو معاون ہوں گے۔'' ایمان نے بتایا۔

''ملاقات کا ایجنڈا کیا ہے؟''

''ترکی اور ایران ایک دفاعی نوعیت کے معاہدے پر عمل کرنے جا رہے ہیں۔ اس کی مکمل تفصیلات تو اعلیٰ سرکاری حکام کے علم میں بھی نہیں ہیں لیکن کہا یہ جا رہا ہے کہ ایران اور ترکی کسی غیر ملکی جارحیت کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔''

سلطان نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ایران اس وقت مغرب کا سب سے پسندیدہ ہدف تھا اور اسرائیل کسی بھی صورت ایران پر حملے کے لیے بے تاب تھا لیکن ہوشیار ایرانی قیادت نے فی الحال اسرائیل کا یہ خواب پورا نہیں ہونے دیا تھا۔

سلطان، ایمان کے ساتھ دو گھنٹے یہاں رہا۔ اس نے کنونشن سینٹر کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ واپسی میں اس نے ایمان سے دفتر چلنے کو کہا۔ ''میں سیکیورٹی پلان دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''وہ آپ کل بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس وقت مجھے زور کی بھوک لگی ہے اور ہم ڈنر کرنے جا رہے ہیں۔''

ایمان اسے سی فوڈ ریسٹوران میں لائی۔ یہ بھی بحیرۂ اسود کے کنارے تھا۔ اس نے سلطان سے کہا۔ ''یہاں کا سی فوڈ مشہور ہے۔''

''مجھے جھینگا پلاؤ اچھا لگتا ہے۔'' سلطان نے کہا تو ایمان نے جھینگا پلاؤ اور مچھلی کباب کا آرڈر دیا۔ سلطان نے پلاؤ کے ساتھ فرائی مچھلی منگوائی۔ کھانے کے دوران ایمان نے اچانک کہا۔ ''کیا خیال ہے، موساد والے قاسم تک کیسے پہنچے؟''

''میرا خیال ہے کہ انہوں نے قاسم کو پہلے ہی اپنی لسٹ پر رکھ لیا تھا اور اس کے ساتھ اس نوجوان کو لگا دیا تھا۔''

ایمان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نوجوان جس کا نام ترگت رحمانی ہے، صرف دو مہینے پہلے قاسم کے پاس ملازم آیا تھا۔ وہ کہاں رہتا ہے اور کس کے ریفرنس سے آیا، یہ کسی کو نہیں معلوم۔ قاسم کے ملنے والوں نے اسے دو مہینے پہلے دیکھا تھا۔ اس کی کوئی چیز یا شناختی کاغذات قاسم کے گھر سے نہیں ملے اور نہ ہی کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔''

سلطان سوچ میں پڑ گیا۔ ''قاسم ہوشیار آدمی تھا۔ وہ آسانی سے کسی پر اعتبار کرنے والا نہیں تھا۔ یقیناً ملازم کو کسی اعتماد کے آدمی نے بھیجا ہوگا۔''

''اس صورت میں وہ آدمی ہی اصل مجرم ہے۔'' ایمان بولی۔ ''مجھے تو یہ سارا معاملہ مشکوک لگ رہا ہے۔ کوئی ایسا فرد جو تم لوگوں سے اچھی طرح واقف ہے، وہ اسرائیلیوں سے مل گیا ہے۔''

''مگر قسمت تھی جو میں بچ گیا۔'' سلطان نے ڈنر ختم کر کے نیپکن سے منہ صاف کیا۔ ''لیکن ہم اس وقت بے احتیاطی کر رہے ہیں، یوں کھلے عام گھوم پھر کر۔ موساد والے میری تلاش میں ہیں اور انہوں نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو تم بھی خطرے میں پڑ جاؤ گی۔''

''آپ کا حلیہ بدلا ہوا ہے۔''

''اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ مجھے کہیں اور ٹھکانا بنانا چاہیے اور تمہارے ساتھ یوں گھومنا نہیں چاہیے۔ میں تو واپس چلا جاؤں گا لیکن تمہیں یہیں رہنا ہے۔''

ایمان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں خطرے سے نمٹنا جانتی ہوں۔''

www.paksociety.com

ابھی ایمان کے الفاظ پورے بھی نہ ہوئے تھے کہ اس کے سامنے رکھا شیشے کا گلاس چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ سلطان نے بروقت اسے کرسی سے دھکیل دیا ورنہ اگلی گولی جو سامنے سے آتے ویٹر کے سینے میں لگی تھی، یقیناً ایمان کو ختم کر دیتی۔ خود سلطان بھی فرش پر گر گیا تھا۔ فائر بے آواز تھے لیکن ویٹر گرا اور لوگوں نے اس کے سینے سے خون فوارے کی طرح نکلتے دیکھا تو چیختے چلاتے ہوئے دیوانہ وار کونے کھدروں کی طرف بھاگے۔ سلطان نے میز سامنے کر لی تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ فائرنگ ریستوران کے سامنے سڑک پار سے کی جا رہی ہے۔ اس طرف کچھ نہیں تھا، بس گاڑیاں پارک تھیں۔ اس نے ایمان سے پوچھا۔ ''تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں...'' وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ''میرے خدا! خطرہ اتنی جلدی سامنے آجائے گا، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

''پولیس کو کال کرو۔'' سلطان نے کہا اور فرش پر رینگتا ہوا کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اس نے باہر جھانکا۔ ایک بڑی سیاہ گاڑی کی چھت سے نکلا ہوا مسلح شخص بے آواز مشین گن سے رہ رہ کر ریستوران کی طرف برسٹ مار رہا تھا اور اسے قطعی پروا نہیں تھی کہ اس کی گولیوں کا نشانہ عام لوگ بن رہے ہیں۔ سلطان دوسری کھڑکی تک آیا اور یہاں سے اس نے مسلح شخص کا نشانہ لے کر اس پر پورا میگزین خالی کر دیا۔ کوئی گولی کارگر ٹھہری کیونکہ وہ جھٹکے سے پیچھے ہوا اور پھر گاڑی میں گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی حرکت میں آئی۔ ریورس ہوتے ہوئے اس نے ایک چھوٹی کار کو ٹکر ماری اور پھر سڑک پر آتے ہی تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گئی۔ سلطان اتنی دیر میں پستول کا میگزین بدلتا رہ گیا۔ وہ تیزی سے ایمان کی طرف آیا اور اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے اسے ریستوران سے باہر لایا۔ ان دونوں کی گاڑیاں موجود تھیں لیکن سلطان نے اپنی گاڑی کو ترجیح دی۔ اس نے ایمان سے کہا۔

''ڈرائیو تم کرو گی۔''

''میں نے پولیس کو کال کر دی ہے۔'' ایمان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''وہ کس طرف گئے ہیں؟''

''سیدھی نکلو۔'' سلطان اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''سیاہ رنگ کی بڑی گاڑی ہے۔ میں نے نشانچی کو مار گرایا ہے۔''

''آپ کا نشانہ اچھا ہے۔'' ایمان بولی اور گیئر بدل کر فراری کا ایکسلریٹر دبایا۔ کار نے جست لگائی اور چند سیکنڈ میں رفتار تقریباً اسّی کلومیٹر فی گھنٹا ہو گئی۔ ایک منٹ سے بھی پہلے انہوں نے سیاہ گاڑی کو دیکھ لیا تھا۔ ایمان اس کے قریب جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اپنے موبائل پر پولیس سے رابطہ کر لیا تھا۔ اب وہ بتا رہی تھی کہ سیاہ گاڑی کس طرف جا رہی ہے اور وہ اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس نے مخصوص کوڈز بتائے جس کے بعد پولیس کا حرکت میں آجانا لازمی تھا۔ شہر کے اوپر پرواز کرنے والا ایک پولیس ہیلی کاپٹر فوراً اس علاقے میں آگیا اور اس نے سیاہ گاڑی کو دیکھ لیا۔ ایمان نے حکم دیا کہ سیاہ گاڑی کو گھیر لیا جائے اور اس میں موجود افراد کو زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے۔ ابھی تک وہ ایک ایسی سڑک پر تھے جہاں بہت رش تھا لیکن سیاہ گاڑی والوں کو تعاقب کا احساس ہو گیا تھا اور انہوں نے اچانک ہی گاڑی ساحلی سڑک پر گھما دی جو آگے جا کر ویران ہو رہی تھی۔ فراری اس سے کوئی سو فٹ پیچھے تھی۔

''رفتار بڑھاؤ۔'' سلطان نے کہا اور کار کی چھت کھول کر باہر نکلا۔ اس نے توازن برقرار رکھتے ہوئے سیاہ گاڑی کے ٹائروں کا نشانہ لیا اور ایک بار پھر لگاتار فائرنگ کی۔ اسی لمحے سیاہ گاڑی کا عقبی شیشہ ٹوٹا اور اس سے رائفل کی نال باہر آئی مگر اس سے پہلے کہ اس سے فائرنگ ہوتی، سلطان کی چلائی ہوئی ایک گولی نے گاڑی کا دایاں ٹائر پھاڑ دیا۔ دھماکے کے ساتھ سیاہ گاڑی بری طرح لہرائی اور تقریباً سو کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے اچانک گھوم کر الٹ گئی۔ گاڑی نے رکنے سے پہلے متعدد قلابازیاں کھائی تھیں مگر اس میں آگ نہیں لگی۔ وہ پہلو کے بل گر کر ساکت ہو گئی۔ ایمان نے اس کے متوازی کار روکی اور دونوں باہر نکل آئے۔ گاڑی کے حشر سے ظاہر تھا کہ اندر موجود افراد اب کسی قابل نہیں رہے تھے۔ سلطان آگے آیا۔ اس نے ایمان کے روکنے کے باوجود ونڈ شیلڈ کے خلا سے اندر جھانکا۔ ڈرائیور اپنی سیٹ پر جھول رہا تھا اس کا چہرہ خون سے تربتر تھا لیکن وہ مرا نہیں تھا۔ البتہ اس کے ساتھ پڑا شخص یقیناً مر گیا تھا۔ یہ وہی تھا جسے سلطان نے ریستوران کے سامنے نشانہ بنایا تھا۔ ایک آدمی عقبی نشست پر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ زندہ تھا یا نہیں، اس کا پتا نہیں تھا۔ دس منٹ میں وہاں پولیس اور ایمبولینس پہنچ گئیں۔ طبی عملے نے پہلے مرنے والے اور دونوں زخمیوں کو نکالا۔ پولیس نے گاڑی اور اس سے ملنے والا اسلحہ قبضے میں کر لیا تھا۔ گاڑی یا افراد کے پاس سے کسی قسم کی کوئی شناختی دستاویزات نہیں ملی تھیں۔ سلطان ایمبولینس کی طرف آیا۔ اس نے طبی عملے سے کہا۔ ''ان کے جوتے اتار کر دے دو۔''

انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انہوں نے مرنے والے اور زخمیوں کے جوتے اتار کر سلطان کے حوالے کر دیے۔ ایمان جو پولیس والوں کو بریف کر رہی تھی، اس کی طرف آئی۔ ''یہ کیا کر رہے ہیں؟''

''دیکھتی رہو، تمہارے پاس کوئی تیز دھار چاقو یا بلیڈ ہے۔''

ایمان کے پاس نہیں تھا لیکن اس نے پولیس والوں سے ایک چاقو لا دیا۔ سلطان نے ایک جوتے کو کاٹا اور جب اس کا دہرا تلا الگ کیا تو اس کے درمیان سے ایک پتلا سا کارڈ نکل آیا اور یہ کارڈ ظاہر کر رہا تھا کہ مرنے والا موساد کا ایجنٹ ہے۔ دوسرے جوتوں سے بھی ایسے ہی کارڈز نکلے۔ سلطان نے تینوں کارڈ ایمان کو تھما دیے۔ ''اب تمہارے پاس ثبوت ہے کہ ان کا تعلق موساد سے ہے۔''

ایمان پُرجوش ہو گئی۔ ''تم دیکھنا، ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔''

''ان کی بہت حفاظت کرنا ورنہ اسرائیلی انہیں مروا دیں گے۔''

''ایک منٹ، میں انہیں بریف کر کے آتی ہوں۔'' ایمان نے کہا لیکن جب وہ واپس آئی تو سلطان اور اس کی گاڑی وہاں نہیں تھے۔

☆☆☆

سلطان اس جگہ سے کوئی تیس کلومیٹر دور استنبول کے ایک بدنام علاقے میں تھا۔ یہ جگہ منشیات، کال گرلز اور جرائم کے حوالے سے بدنام تھی۔ سلطان نے فراری اس علاقے سے کچھ پہلے چھوڑ دی تھی اور باقی راستہ ایک ٹیکسی میں طے کیا تھا۔ اس نے ٹیکسی ایک نائٹ کلب کے سامنے رکوائی۔ کرایہ دے کر وہ کلب کے دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ ایک تنومند افریقی نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ غرایا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

سلطان نے زبان کے بجائے ہاتھ سے جواب دیا اور اس کا گھٹنا پوری قوت سے افریقی کے زیرِ ناف لگا۔ وہ کراہ کر جھکا تو یہی گھٹنا نیچے ہو کر اس کے منہ پر لگا اور وہ الٹ کر گرا۔ سلطان اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے پاس سے گزرتا ہوا کلب میں داخل ہو گیا۔ اندر کا ماحول ویسا ہی تھا جیسا ایک نائٹ کلب کا ہوتا ہے۔ شراب، منشیات کا دھواں اور اس میں چکراتی برائے نام لباس میں ملبوس لڑکیاں۔ سلطان سب کو نظر انداز کرتا ہوا بارٹینڈر کی طرف بڑھا۔

''یسی کہاں ہے؟''

بارٹینڈر نے بھویں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ ''کیا کام ہے؟''

''اس سے کہو سلطان آیا ہے۔''

بارٹینڈر کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر اس نے ایک واکی ٹاکی نما آلہ اٹھا کر کہا۔ ''باس! کوئی سلطان آیا ہے۔'' دوسری طرف سے بات سن کر اس نے سلطان سے کہا۔ ''سامنے دیکھو... اس طرف... ٹھیک ہے، میرے ساتھ آؤ۔''

سلطان کو کسی کیمرے کی مدد سے دیکھا گیا تھا۔ بارٹینڈر اسے ایک کمرے تک لایا۔ اس کے اندر آتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔ اس کے پیچھے ایک لفنگا ٹائپ نوجوان ایک خوفناک پستول اٹھائے کھڑا تھا اور یسی سامنے میز کے پیچھے کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ''تو تم سلطان احمد ہو؟''

''ہاں... میرا حلیہ بدلا ہوا ہے۔'' سلطان نے کہا۔

''حلیہ کیوں بدلا ہے؟'' یسی کا لہجہ مزید طنزیہ ہو گیا۔ وہ تقریباً چالیس سال کا تنومند شخص تھا۔ اس نے لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی۔

''دشمن میرے پیچھے ہیں۔''

''اس لیے تم مرنے کے لیے یہاں چلے آئے۔''

''میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔'' سلطان نے سرد لہجے میں کہا اور پستول والے کی طرف دیکھا۔ ''اس سے کہو یہاں سے باہر چلا جائے، اپنے پیروں پر چل کر۔''

نوجوان کا چہرہ بگڑ گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی ردِعمل دکھاتا، باہر مار کھانے والا بدمعاش اندر گھس آیا۔ اس نے سلطان کی طرف دیکھا اور چیخ چیخ کر یسی کو بتانے لگا کہ اس نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ یسی کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے کرسی سے اٹھ کر کہا۔ ''اچھا، اس نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے... میرا خیال ہے کم کیا ہے۔ تم اس سے بھی زیادہ کے مستحق ہو۔'' یسی نے کہتے ہوئے اسے دو ہاتھ مارے اور پھر لات مار کر کمرے سے نکال دیا۔ وہ نوجوان کی طرف دیکھ کر دھاڑا۔ ''دفع ہو جاؤ... سب ایک جیسے حرام خور ہو۔'' دروازہ بند کرتے ہی اس نے مسکرا کر سلطان کی طرف دیکھا اور ہاتھ بڑھایا۔ ''معاف کرنا، مجھے پہچاننے میں کچھ وقت لگا۔''

سلطان نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''تم جس دھندے میں ہو اس میں دوست دشمن کی پہچان صرف ایک لمحے میں ہونی چاہیے ورنہ تم خود نہیں رہو گے۔''

www.paksociety.com

یسی کھسیا گیا۔ ”تم نے بھیس بھی کمال کا بدلا ہے اور پھر تمہیں سترہ سال بعد دیکھ رہا ہوں۔۔۔ کہو کیسے آنا ہوا؟“

”مجھے اسلحہ اور کچھ چیزیں درکار ہیں اور دو آدمی بھی جو مرنے مارنے والے ہوں اور کسی مرحلے پر پیچھے نہ ہٹیں۔“

”اسلحہ اور جو کہو گے وہ مل جائے گا لیکن آدمی مشکل ہیں میرے سارے آدمی جانے پہچانے ہیں اور میں کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتا۔“

”ٹھیک ہے، میں آدمی تلاش کرلوں گا۔“

یسی نے اٹھ کر عقبی دیوار کے ساتھ نہ جانے کیا کیا کہ دیوار ایک طرف سرک گئی اور پیچھے ایک راہداری نمودار ہوئی۔ یسی نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بلاہچکچاہٹ اس کے ساتھ اندر داخل ہوگیا البتہ اس کا ہاتھ پستول والی جیب کے پاس ہی تھا۔ جب وہ کام کے سلسلے میں استنبول میں تھا تو اس کا واسطہ زیرِ زمین دنیا کے لوگوں سے بھی پڑتا تھا۔ ان میں یسی بھی تھا جو ان دنوں معمولی درجے کا بدمعاش تھا اور اوپری درجے کا بدمعاش بننے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ سلطان کو وہ کام کا آدمی لگا تھا اس لیے اس نے یسی کو ایک ٹھیکا دے دیا اور اس نے اس ٹھیکے میں اتنی دولت کمائی کہ اپنا نائٹ کلب اور بار کھول لیا۔ وہ سلطان کا احسان مند تھا۔ سلطان اس امید پر اس کے پاس آیا تھا کہ یسی نے اس کے احسان کو یاد رکھا ہو گا۔ اس کے باوجود وہ پوری طرح محتاط تھا۔ یسی اسے ایک کمرے میں لایا جہاں چاروں طرف لوہے کی الماریاں تھیں۔ اس نے پوچھا۔ ”کس قسم کا اسلحہ چاہیے؟“

”تین یسی آٹومیٹک سائلنسر لگی رائفلیں، تین عدد سائلنسر لگے پستول، گیس بم، ہینڈ گرینیڈ اور آگ لگانے والے بم۔“ سلطان نے کہا۔ ”میں سب کی ادائیگی کروں گا۔“

یسی نے الماری سے تین عدد یوزی گنیں نکالیں، ان پر سائلنسر بھی لگتے تھے۔ دوسری الماری سے اس نے بریٹا نکالے۔ یہ سارا اسلحہ چیکوسلواکیہ کا بنا ہوا تھا اور نہایت بیش قیمت تھا۔ پھر اس نے ایک ڈبا نکالا جس میں ٹینس بال سائز کے چھ عدد جدید ہینڈ گرینیڈ تھے۔

دوسرے ڈبے میں گیس بم تھے۔ یہ تیس سیکنڈ میں ایک ہزار مربع فٹ جگہ کو گیس سے بھر سکتے تھے۔ آگ لگانے والے بم سادہ بھی تھے اور ٹائم سرکٹ کے ساتھ بھی تھے۔ سلطان نے ٹائم سرکٹ بم کو ترجیح دی۔ ان کے ساتھ اس نے گیس ماسک، نائٹ ویژن دوربین اور چشمے، مختصر سے کان سے لگ جانے والے واکی ٹاکی سیٹ اور ایک اسپائی گاڑی بھی حاصل کی۔ انچ بھر لمبی اور چوڑی اس گاڑی میں مختصر سا کیمرا لگا ہوا تھا اور یہ ریموٹ سے چلتی تھی۔ اونچی نیچی جگہوں سے بھی آسانی سے گزر جاتی تھی۔ یسی نے ساری چیزیں ایک لیدر بیگ میں ڈال کر سلطان کے حوالے کر دیں۔ وہ اس خفیہ جگہ سے باہر آئے تو سلطان نے قیمت کا پوچھا۔ ”کچھ نہیں۔“ یسی مسکرایا۔ ”میری طرف سے تحفہ سمجھ لو۔۔۔ لیکن ایک مہربانی کرنا، اگر پکڑے جاؤ تو میرا نام مت لینا ورنہ مجھے انکار کرنا پڑے گا۔“

”اس کی تم فکر مت کرو۔ ہم جیسے لوگ پکڑے جانے کے قائل نہیں ہوتے۔ میرے گروپ کے دس افراد مارے جا چکے ہیں، ایک بھی زندہ دشمنوں کے ہاتھ نہیں آیا۔“ سلطان نے کہا اور بیگ شانے پر لٹکا لیا۔ یسی نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ ”ایک نمبر ہے اس پر کال کرلینا۔ دو بھائی ہیں رابین اور مارشل۔۔۔ ممکن ہے وہ تمہارے کام کے ہوں۔ میرا حوالہ مت دینا۔“

سلطان نے ایک پبلک بوتھ سے ان دونوں بھائیوں کو کال کی۔ رابین لائن پر آیا۔ ”کون ہے؟“

”مجھے تم سے کام ہے۔ میں اچھی ادائیگی کروں گا۔“

”کام کیا ہے؟“

”فون پر نہیں بتا سکتا لیکن تم لوگ جو کرتے ہو، اس سے ہٹ کر نہیں ہے۔“

رابین نے ملاقات کے لیے ایک بار کا پتا بتایا لیکن سلطان ان سے کسی عوامی جگہ نہیں ملنا چاہتا تھا۔ اس نے توپ کاپی کے سامنے والا میدان تجویز کیا اور رابین مان گیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ آمنے سامنے تھے۔ سلطان نے بلاتمہید کہا۔ ”مرنے مارنے کا کام ہے۔ مجھے اپنے دشمنوں پر حملہ کرنا ہے اور انہیں تباہ کرنا ہے۔“

”خطرہ کیا ہے؟“

”وہ بہت خطرناک اور قاتل لوگ ہیں۔ تعداد نامعلوم ہے۔ جگہ کی سیکیورٹی ہائی ہوگی۔“

”تب ہم تین افراد کیا کرسکیں گے؟“

”میرے پاس ایک پلان ہے، اگر تم دونوں تیار ہو؟“

رابین بات کر رہا تھا۔ اس نے مارشل کی طرف دیکھا تو اس نے سر ہلایا۔ رابین بولا۔ ”ٹھیک ہے، اگر تم ہمیں دو ہزار امریکی ڈالرز دو تو ہم تمہارے ساتھ جہنم میں بھی کودنے کے لیے تیار ہیں۔“

”منظور ہے، ایک ہزار ڈالرز کام سے پہلے اور ایک بعد میں۔“ سلطان نے کہا۔ ”لیکن خیال رکھنا، مجھے کسی نے

ریفر کیا ہے اور اگر تم لوگوں نے دھوکا کیا تو وہ شخص تمہیں نہیں چھوڑے گا۔“

”ہم زبان دے کر نبھانا جانتے ہیں۔“ مارشل پہلی بار بولا۔ ”اسلحہ ہے؟“

”میرے ساتھ آؤ۔“ سلطان نے کہا اور فراری میں بیٹھ کر استنبول سے باہر جانے والی ایک ہائی وے کی طرف روانہ ہوگیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہائی وے سے ہٹ کر ایک ویرانے میں موجود تھے، یہ جنگل تھا۔ اس نے بیگ سے اسلحہ نکالا اور دونوں بھائیوں سے کہا۔ ”یہاں ہم ان ہتھیاروں کی جانچ کریں گے۔“

ہتھیار دیکھ کر ان کے چہرے کھل اٹھے۔ یہ ان کے لیے کھلونے تھے۔ انہوں نے سلطان کے ساتھ مل کر ہتھیاروں کی آزمائش کی۔ تمام ہتھیار بہترین حالت میں تھے۔ اس کام سے نمٹ کر وہ واپس روانہ ہوئے تو سلطان کا رخ استنبول کی بندرگاہ کے پرانے حصے کی طرف تھا۔ رابین نے سلطان کے کہنے پر ایک کشتی کا بندوبست کیا اور وہ اپنے سامان سمیت اس میں سوار ہوگئے۔ کشتی میں چھوٹا سا انجن بھی تھا لیکن سلطان نے کشتی کے مالک کو انجن چلانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ چپوؤں سے کشتی چلا رہا تھا۔

”ہمیں کہاں جانا ہے؟“ مارشل نے پوچھا تو سلطان نے بندرگاہ کے آخری حصے میں واقع ایک تین منزلہ عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہمیں اس عمارت کو تباہ کرنا ہے، اس میں موجود کوئی فرد بچ کر نہ جانے پائے۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ رابین نے جوش سے کہا۔

بہ ظاہر یہ تین منزلہ عمارت سال خوردہ اور خاموش تھی لیکن سلطان جانتا تھا کہ یہاں نگرانی اور جاسوسی کا جدید ترین سسٹم کام کر رہا ہوگا کیونکہ یہ ترکی میں موساد کے قاتلوں کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ جب مراد اس کے لیے اسرائیلی نیٹ ورک میں گھس کر جاسوسی کر رہا تھا تو اس نے بہت ساری دوسری معلومات بھی حاصل کی تھیں۔ اس جگہ کا سراغ بھی مراد نے لگایا تھا۔ سلطان نے استنبول آتے ہی اس جگہ کا جائزہ لیا تھا لیکن اس وقت اس کا مقصد صرف معائنہ تھا۔ آج کے حملے نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ دشمنوں کو ان کے سکوں میں ادائیگی کرے۔ عمارت کی چھت پر کئی طرح کے انٹینا اور چاروں طرف لگے سیکیورٹی کیمرے بتا رہے تھے کہ یہاں معمول سے ہٹ کر کچھ ہوتا ہے۔ ویسے بھی یہ جگہ بندرگاہ کی دوسری تنصیبات سے کچھ ہٹ کر تھی۔ رابین اور مارشل اس کی بات غور سے سن رہے تھے۔ پلان ان کی سمجھ میں آگیا پھر رابین تین فائر بم لے کر خاموشی سے پانی میں اتر گیا۔ اسے غوطہ خوری آتی تھی۔ آبنائے کا پانی خاصا سرد تھا مگر قابلِ برداشت تھا۔

وہاں پہنچ کر۔۔۔۔۔ سلطان نے بیگ سے ریموٹ کنٹرول گاڑی نکالی اور اسے آن کر کے چھوڑ دیا۔ اس کے ریموٹ پر اسکرین بنی تھی اور اسے چند بٹنوں اور جوائے اسٹک کی مدد سے قابو کیا جاتا تھا۔ کیمرا بلیک اینڈ وائٹ لیکن بہت صاف تصویر دکھا رہا تھا۔ ننھی سی چھوٹی گاڑی بے آواز چلنے لگی اور سلطان اسکرین پر دیکھ رہا تھا۔ مارشل ایک اور جگہ سے عمارت کا نائٹ ویژن سے جائزہ لے رہا تھا۔ مارشل اور وہ واکی ٹاکی سے رابطے میں تھے۔ رابین پانی میں تھا اس لیے فی الحال اس سے رابطہ ممکن نہیں تھا۔ گاڑی چلتی ہوئی عمارت کے پاس آئی اور سلطان اسے دیوار کے ساتھ ساتھ چلانے لگا۔ وہ گھوم کر جیٹی والے حصے میں آئی تو اسکرین پر دو مسلح افراد دکھائی دیے جو وہاں کھڑی جدید ترین موٹر بوٹس کی نگرانی کر رہے تھے۔ عمارت کا داخلی دروازہ پیچھے کی طرف تھا اور وہ بند تھا۔ گاڑی ان مسلح افراد کے پاس آئی تو وہ آپس میں عبرانی زبان میں بات کر رہے تھے۔ سلطان کسی حد تک عبرانی سمجھتا تھا۔ ان دونوں کا موضوعِ گفتگو وہ خود تھا اور وہ ناکام حملے کی بات کر رہے تھے جس میں ایک آدمی مارا گیا تھا اور اس سے زیادہ تشویشناک بات دو کی زندہ گرفتاری تھی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ جس کے بارے میں بات کر رہے ہیں، وہ ان کے پاس ہی ہے۔ رابین کو دس منٹ میں اپنا کام ختم کر کے واپس آجانا تھا لیکن اس کی واپسی میں بیس منٹ لگے۔ اس نے کپڑوں سے پانی جھاڑتے ہوئے کہا۔

”وہاں دو مسلح پہرے دار ہیں۔ بڑی مشکل سے میں نے دونوں موٹر بوٹس میں بم لگائے ہیں۔ تیسرا بم جیٹی کے ساتھ رکھے ایندھن کے ذخیرے میں لگایا ہے۔“

”گڈ۔“ سلطان نے کہا۔ وہ گاڑی کو عمارت کے سامنے والے حصے کی طرف لا رہا تھا۔ ”وقت کتنا ہے؟“

رابین نے اپنی گھڑی دیکھی۔ ”پانچ منٹ باقی ہیں۔“

سلطان کے خیال میں کام ٹھیک ہوگیا تھا اور اب آتش گیر بموں کی تباہی ہی کافی ہوتی۔ اس کے بعد عمارت کو از خود آگ لگ جاتی۔ موٹر بوٹس کی تباہی کے بعد عمارت میں موجود افراد یقیناً جیٹی کی طرف سے نکلنے کی کوشش کرتے اور وہ ان کے استقبال کے لیے تیار تھے۔ وہ تینوں مختلف جگہوں

www.paksociety.com

پر چھپ گئے تاکہ عمارت سے نکلنے والا کوئی فرد ان کی نظروں سے اوجھل نہ رہے۔ پانچ منٹ پورے ہوتے ہی موٹر بوٹس اور عمارت کے ساتھ رکھے ایندھن کے ذخیرے میں دھماکے سے آگ لگ گئی۔ پھر ڈیزل کے ڈرم دھماکوں سے پھٹنے لگے۔ دونوں گارڈز بدحواسی میں عمارت کی طرف سے نمودار ہوئے۔ وہ نہ بھاگتے تو آگ کا نشانہ بن جاتے لیکن یہاں بھی ان کے لیے موت تھی۔ سلطان نے ان کا نشانہ لیا اور دونوں کو چھلنی کر دیا۔

سامنے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر آیا، وہ مارشل کا نشانہ بنا۔ اس دوران میں عمارت کا سمندر کی طرف والا حصہ آگ کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ تیسرے آدمی کے گرتے ہی عمارت کی طرف سے کم سے کم دو خودکار رائفلیں گرجنے لگیں لیکن وہ آڑ میں محفوظ تھے۔ رابین سب سے آگے تھا۔ اس نے عمارت کی طرف ایک ہینڈ گرینیڈ اچھال دیا۔ دھماکے سے سامنے والے حصے میں آگ لگ گئی اور اس طرف کی دیوار منہدم ہو گئی۔ دوسرے گرینیڈ نے عمارت کے اس حصے کو گرا دیا۔ ایک رائفل خاموش ہو گئی تھی۔ البتہ اوپری منزل سے مزید ایک رائفل گولیاں برسانے لگی۔ یہ تو طے تھا کہ موساد والوں کے پاس اسلحے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ شعلوں اور اس سے اٹھنے والے دھوئیں کی وجہ سے آس پاس ماحول دھندلا رہا تھا۔ سلطان نے دونوں بھائیوں کو گیس ماسک پہننے کو کہا اور ایک گیس بم عمارت کے سامنے اچھال دیا۔ ذرا سی دیر میں ماحول اس طرح دھواں دھار ہو گیا تھا کہ چند فٹ کے بعد بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سلطان اٹھ کر تیزی سے دوڑا۔ اس نے دونوں بھائیوں کو بتا دیا تھا۔ رابین اضطراب سے بولا۔

''باس! یہ خطرناک ہے۔ اوپر سے بے پناہ فائرنگ ہو رہی ہے۔ یہاں تو آڑ سے نکلنا مشکل ہے۔''

لیکن اتنی دیر میں سلطان عمارت کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس کے آس پاس سے گولیاں گزر رہی تھیں مگر ان میں سے کوئی اس کے نام کی نہیں تھی۔ عمارت کے منہدم حصے کے پاس پہنچ کر اس نے یکے بعد دیگرے دو دستی بم اندر اچھالے اور انہوں نے عمارت کے وسطی حصے کو بھی بٹھا دیا۔ اوپر سے ہونے والی فائرنگ یک لخت رک گئی۔ اوپر سے تین آدمی جیٹی پر کودے اور اس سے پہلے کہ وہ پانی میں کودتے سلطان نے انہیں چھلنی کر دیا۔

''باس! نکل چلو، مجھے پولیس کا سائرن سنائی دے رہا ہے۔''

پولیس دور تھی لیکن رابین کے تیز کانوں نے سچ مچ سائرن سن لیا تھا۔ وہ اس جگہ پہنچے جہاں کشتی والا ان کے انتظار میں پریشان تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ دھماکے اور شور کیسا تھا؟ کیا کہیں آگ لگ گئی ہے؟''

رابین نے جواب دیا۔ ''ہاں، کسی جگہ ایندھن کے ذخیرے میں آگ لگی ہے۔ دھماکے ڈرم پھٹنے کے تھے۔ اب یہاں سے نکلو۔''

اس بار کشتی کا انجن استعمال ہوا اس لیے وہ چند منٹ میں وہاں سے دور نکل آئے۔ پارکنگ تک آ کر سلطان نے دونوں بھائیوں کو طے شدہ دو ہزار امریکی ڈالرز کے مساوی ترک لیرے دیے اور پھر اتنی ہی رقم اور دی۔ ''یہ بونس ہے۔''

''شکریہ باس۔'' رابین نے خوش ہو کر کہا۔

''تمہارے پاس ہمارا نمبر ہے۔ جب ضرورت ہو تو ہمیں کال کر لینا۔'' مارشل نے کہا اور دونوں رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

ایمان دفتر پہنچی تو سلطان اس کی میز پر بیٹھا تھا۔ ایمان نے ترکش ٹائمز کا تازہ شمارہ اس کے سامنے پٹخ دیا۔ اس میں فرنٹ پیج پر کل رات ہونے والے ہنگامے کی خبر مع تصویروں کے تھی۔ سلطان نے سرسری نظروں سے خبر دیکھی۔ اسے یہ سب پہلے ہی معلوم تھا لیکن اس نے انجان بن کر پوچھا۔ ''کوئی خاص بات ہے اس خبر میں؟''

''نہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ ''کل رات آپ کہاں تھے؟''

''میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔''

''آپ مجھے بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ کل بندرگاہ میں جو ہوا اس سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے؟''

''میرا تعلق ہے یا نہیں اسے چھوڑو... یہ بتاؤ کہ پولیس نے کیا معلوم کیا ہے؟''

ایمان اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ''پولیس کو وہاں خاصی تعداد میں اسلحہ اور دس افراد کی لاشیں ملی ہیں۔ جلے ہوئے مواصلاتی آلات اور بعض چیزوں سے شبہ ہوتا ہے کہ یہاں موساد کا ہیڈ کوارٹر تھا۔''

''اگر یہ سچ ہے تو تمہارے ملک کی سیکیورٹی ایجنسیوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ موساد والے تمہاری ناک کے عین نیچے بیٹھے کام کر رہے ہیں۔''

''ایسا نہیں ہے۔ ہم ان کی چھانٹی کرنے میں لگے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہی ان سے نجات ملے گی۔'' ایمان نے کہا۔ ''پولیس کا کہنا ہے کہ حملہ آور نہایت منظم اور بڑی تعداد میں

تھے۔ انہوں نے اپنی آمد کا کوئی نشان نہیں چھوڑا اور اپنا کام کر کے کامیابی سے فرار ہو گئے۔''

سلطان مسکرایا۔ ''تم جانتی ہو، میں اکیلا آدمی ہوں اور اکیلا آدمی یہ سب نہیں کر سکتا۔''

''مجھے پاپا نے بتایا ہے، جب آپ یہاں ہوتے تھے تو آپ کا حلقۂ احباب کتنا وسیع تھا اور یقیناً ان میں سے بہت سے آج بھی آپ کے کام آتے ہوں گے۔''

''چھوڑو ان باتوں کو... جس نے بھی کیا ہے، اچھا کیا ہے۔ اب موساد والوں کو اپنے مشن سے پہلے ہی شدید دھچکا لگا ہے۔''

''اندر کی خبر یہ ہے کہ موساد نے ترکی سے اپنے تمام ایجنٹس واپس بلا لیے ہیں اور یہاں تمام کام روک دیے ہیں۔''

''یہ دھوکا ہو گا۔ موساد والے اتنے کم ہمت نہیں ہیں کہ اپنے دس ایجنٹس مرنے اور ایک آفس تباہ ہونے سے اپنے تمام آپریشنز بند کر دیں جبکہ وہ یہاں اہم ترین مشن انجام دینے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ سچ بھی ہو سکتا ہے۔''

ایمان نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ''ابھی کہہ رہے تھے کہ یہ سچ نہیں ہے اور اب...''

''تم ان کے بارے میں نہیں جانتیں، یہ نہایت عیار قوم ہے۔ میرا ان سے واسطہ پڑتا رہا ہے اور اپنے تجربے کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ دکھاوے کے لیے موساد اپنے آپریشنز بند کر دے اور اپنا عملہ واپس بلا لے تاکہ بعد میں کہہ سکے کہ کسی واقعے میں اس کا ہاتھ نہیں ہے۔ دوسری طرف مشن اتنے اونچے درجے کا ہے کہ اس میں مقامی ایجنٹوں کے ملوث ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ اس معاملے میں اصل اہمیت رازداری کی ہے اور صرف راز چھپانے کے لیے انہوں نے میرے دس ساتھیوں کو مار ڈالا۔''

''آپ سیکیورٹی پلان دیکھنا چاہتے تھے۔'' ایمان نے کہا۔

''بالکل، اب وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ ہمیں سیکیورٹی پلان میں وہ رخنہ تلاش کرنا ہے جس سے حملہ آور فائدہ اٹھا سکتا ہے۔''

ایمان نے غور سے اسے دیکھا۔ ''واقعی یہ حملہ ایک فرد کی مدد سے کیا جائے گا؟''

''یہ فیصلہ یقین سے ہے کیونکہ میں نے کل بھی محسوس کیا تھا کہ تم لوگوں کا سیکیورٹی پلان مکمل ہے اور اس میں کسی کے لیے گنجائش نہیں ہے۔ پھر بھی میں ایک نظر سیکیورٹی پلان دیکھنا چاہوں گا۔''

ایمان اسے ایک کمرے میں لائی جہاں چاروں طرف اسکرینیں لگی تھیں اور اس کے شعبے کے آئی ٹی ماہرین موجود تھے۔ ایمان نے ایک آدمی سے کہا۔ ''کنونشن سینٹر وی آئی پی سیکیورٹی پلان کی فائل کھولو۔''

کمپیوٹر میں یہ فائل تھری ڈی اینیمیشن کی مدد سے بنائی گئی تھی۔ یہ کنونشن سینٹر کا مکمل خاکہ تھا۔ اس میں نشانات کی مدد سے سیکیورٹی گارڈز کی پوزیشن واضح کی گئی تھی۔

''گارڈز کی تعداد کیا ہے؟''

''پارکنگ سے لے کر اوپری فلور تک کُل پچاس گارڈز اور ان کے چار سپروائزر جبکہ ایک نگران ہو گا۔ یہ آرمی کرنل ہے اور گزشتہ دس سال سے وی آئی پی سیکیورٹی کا انچارج یہی شخص ہے۔''

''یعنی معتمد ہے؟'' سلطان نے معنی خیز انداز میں کہا۔

ایمان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ شبہے سے بالاتر ہے۔ یہ غازی انور پاشا کا پڑپوتا ہے اور اس خاندان نے ہمیشہ ترکی کے لیے قربانیاں دی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، باقی سیکیورٹی گارڈز کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''یہ سب بھی منتخب اور پرانے لوگ ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی پانچ سال سے کم پرانا نہیں ہے اور ان کا بیک گراؤنڈ بھی صاف ہے۔''

سلطان نے سر ہلایا۔ ''اب ہم آتے ہیں ان سویلین کی طرف جو ان دونوں سربراہان کے ساتھ ہوں گے۔''

ایمان کے اشارے پر کمپیوٹر آپریٹر نے ان افراد کی فہرست نکالی۔ یہ فہرست تصویر اور مکمل تعارف کے ساتھ تھی۔ ایرانی صدر کے ساتھ وزیرِ دفاع اور وزیرِ تجارت سمیت دس افراد تھے۔ یہ سب..... منتخب اور پرانے لوگ تھے۔ ان پر شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ترک وزیرِ اعظم کے ساتھ پندرہ افراد ہوتے۔ سلطان اور ایمان باری باری ان کا تعارف دیکھ رہے تھے۔ لیکن فی الحال انہوں نے تبصرے سے گریز کیا تھا۔ یہ برسوں سے اپنے عہدوں پر کام کرنے والے بااعتماد لوگ تھے۔ ان میں سیکریٹری دفاع سلمان آسکر بھی تھا۔ سلطان اس کی تصویر دیکھ کر چونکا۔ وہ لمبے سیاہ گھنگرالے بالوں اور

گول عینک کے ساتھ کسی قدر لمبے چہرے، سرخ و سفید اور کھڑے نقوش والا شخص تھا۔ سلطان کو اس کی شکل جانی پہچانی لگی لیکن فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ اس نے اسے کہاں دیکھا ہے۔ اسے یاد نہیں آیا تھا اس لیے اس نے ایمان سے ذکر بھی نہیں کیا لیکن وہ اس کی دلچسپی محسوس کر چکی تھی۔ سلطان کے کہنے پر اس نے وزیر اعظم کے وفد کے تعارف کا پرنٹ آؤٹ نکلوالیا۔

"آپ سیکریٹری دفاع کو دیکھ کر کیوں چونکے تھے؟" ایمان نے اپنی میز پر واپس آتے ہی سوال کیا۔

"تم نے نوٹ کرلیا تھا؟" سلطان نے کہا۔ "یہ شخص مجھے جانا پہچانا لگ رہا ہے۔"

"ممکن ہے، ترکی میں قیام کے دوران آپ کا اس سے واسطہ پڑا ہو۔"

"شاید۔" سلطان نے سوچتے ہوئے کہا۔ جس وقت وہ سی آئی اے ایجنٹ کی حیثیت سے یہاں مقیم تھا، اس کا متعدد ترک حکام سے واسطہ پڑا تھا ہوسکتا تھا کہ سلمان آسکر بھی ان میں سے ایک ہو۔ اس نے گزشتہ دن پکڑے جانے والے موساد کے ایجنٹوں کے بارے میں پوچھا۔ ایمان نے گہری سانس لی وہ اب تک اس بارے میں بات کرنے سے گریز کر رہی تھی۔

"وہ مارے گئے۔"

سلطان اچھل پڑا۔ "مارے گئے... کیسے؟"

"پولیس نے انہیں آرمی انٹیلی جنس کے حوالے کر دیا تھا اور وہ انہیں لے کر جا رہے تھے کہ راستے میں اس گاڑی کو بم سے اڑا دیا گیا۔ دونوں ایجنٹوں کے ساتھ تین آرمی اہلکار بھی مارے گئے۔ واقعہ شہر سے باہر پیش آیا اس لیے اخباروں میں اس کا ذکر نہیں آیا ہے۔"

"مجھے یہی خدشہ تھا۔" سلطان نے سرد آہ بھری۔ سلطان سوچنے لگا پھر اس نے کہا۔ "اپنی سیکیورٹی ٹیم کے بارے میں بتاؤ۔"

ایمان نے کمپیوٹر پر اپنی ٹیم کی فائل کھولی۔ "میٹنگ ہال اور اس کے آس پاس کی حفاظت کی ذمے داری میری ٹیم کے پندرہ افراد کی ہوگی، ان میں میں اور روش پاشا بھی شامل ہیں۔ روش پاشا عام میٹنگ میں لازمی ہال کے اندر ہو گا لیکن جب دونوں سربراہان ون ٹو ون ملاقات کریں گے تو صرف دو معاونین ان کے ساتھ ہوں گے اور کوئی آدمی اندر نہیں جاسکے گا۔"

"یعنی اس وقت ان کے ساتھ کوئی سیکیورٹی نہیں ہوگی؟"

"نہیں، اس وقت وہاں سوائے ان چار افراد کے اور کوئی نہیں ہوگا۔" ایمان نے کہا۔ "لیکن میٹنگ ہال کے چاروں طرف سخت ترین سیکیورٹی ہوگی اور ایک چوہا بھی نظروں سے بچ کر اندر نہیں جاسکے گا۔"

"کیا میں بھی تمہاری ٹیم میں شامل ہوں گا؟"

ایمان سوچ میں پڑ گئی۔ "ٹیم ایک مہینا پہلے طے ہوگئی تھی اور ظاہر ہے اس میں آپ کا نام نہیں ہے۔"

"کیا شامل بھی نہیں کیا جاسکتا؟"

"مجھے روش پاشا سے بات کرنا ہوگی۔"

لیکن روش پاشا نے اس کی بات سنتے ہی انکار کر دیا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے کہ سیکیورٹی ٹیم بن چکی ہے اور اوپر سے اس کی منظوری بھی آگئی ہے۔ اب اس میں تبدیلی ناممکن ہے۔"

ایمان واپس آئی تو سلطان اس کے تاثرات سے سمجھ گیا۔ "انکار ہوگیا؟"

"ہاں لیکن میں پاپا سے بات کرتی ہوں۔"

"میرا خیال ہے نثار مرزا بھی اس معاملے میں کچھ نہیں کرسکے گا۔ ہاں، تم ایک کوشش کرو۔ کنونشن سینٹر میں میری موجودگی کا کوئی جواز حاصل کرلو۔"

"یہ بھی پاپا بتاسکیں گے۔ آپ رات کو کہاں رہے؟"

"ایک جگہ رہا۔" سلطان نے مبہم انداز میں کہا۔ درحقیقت اس نے رات ایک جگہ پارکنگ میں گزاری تھی اور صبح ایک ریستوران میں ناشتا کرکے اور تیار ہوکر آیا تھا۔ اس نے گزشتہ روز جو کپڑے لیے تھے، وہ گاڑی میں ہی موجود تھے۔ اس کے خیال میں اس کا نقلی پاسپورٹ بھی مشکوک ہوگیا تھا۔ موساد اس کے پیچھے لگ گئی تھی اور وہ اسے پاسپورٹ کی مدد سے بھی تلاش کرسکتے تھے۔ اس لیے اس کا ایسی جگہوں سے دور رہنا بہتر تھا جہاں اسے پاسپورٹ دکھانا پڑے۔ اس کی کار بھی نظروں میں آگئی تھی لیکن وہ اسے خود سے نہیں بیچ سکتا تھا۔ کار ایمان نے خریدی تھی اور وہی بیچ سکتی تھی۔ اس نے سلطان کی بات سن کر کہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں اس ڈیلر کو کال کر دیتی ہوں، وہ مجھے اور پاپا کو جانتا ہے، آپ جا کر تبدیل کرالیں۔"

سلطان بہت محتاط تھا۔ اس نے گزشتہ رات جو اسلحہ لیا تھا سوائے ایک رائفل کے باقی اسلحہ اس نے آبنائے باسفورس کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ رائفل بھی اس نے فراری کی ڈکی میں چھپا رکھی تھی۔ اس نے ایمان سے کہا۔ "نیچے تک

چلو، ایک چیز تمہاری کار کی ڈکی میں رکھنی ہے۔"

ایمان اس کے ساتھ نیچے آئی۔ کپڑے میں لپٹی رائفل دیکھ کر اس نے کوئی سوال نہیں کیا جس پر سلطان کو خاصی حیرت ہوئی۔ وہ کار ڈیلر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کے پاس ایمان کا فون آگیا تھا اور اس نے خاصی گرم جوشی سے سلطان کا استقبال کیا۔ اس کا خیال تھا کہ سلطان اس سے کوئی دوسری کار لے گا اس لیے اس نے ہنسی خوشی فراری ایک ہزار ڈالرز کم پر لے لی۔ رقم وصول کرکے سلطان نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے روانہ ہوا تو ڈیلر خاصا مایوس ہوا۔

☆☆☆

جنرل بازک کا غصے سے بُرا حال تھا۔ اس کے سامنے ترکی سے واپس آنے والا موساد کا گروپ تھا۔ پچیس افراد میں سے بارہ واپس آئے تھے اور تیرہ وہیں مارے گئے تھے۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے میز کی دراز سے شیشی نکالی اس میں سے ایک گولی نکال کر پانی کے ساتھ لی اور ہاتھ کے اشارے سے بارہ افراد کو دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ اس علاقے میں موساد کو کبھی اس قسم کا نقصان اٹھانا نہیں پڑا تھا۔ لیکن اب صرف چند گھنٹوں میں وہ ایک درجن سے زیادہ بہترین ایجنٹس سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ استنبول میں ایلیٹ دستے کا ہیڈکوارٹر تباہ ہوگیا تھا۔ اسی ایلیٹ دستے نے کیرج میں سلطان کے ساتھیوں کو قتل کیا تھا۔ یہ واضح طور پر اس کا جواب تھا لیکن ابھی تک کوئی ثبوت یا گواہی سامنے نہیں آئی تھی کہ یہ کن لوگوں کا کام ہے۔ استنبول ہیڈکوارٹر پر حملہ نہایت منظم اور تیز تھا۔ چند منٹوں میں سب ہوگیا تھا۔ جنرل نے اپنے نائب کلورمین سے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ یہ اسی شخص کی طرف سے جواب ہے۔"

کلورمین متذبذب تھا۔ "لیکن جناب ایک شخص ہمارے اتنے تربیت یافتہ افراد کو کس طرح اتنی آسانی سے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے؟ میرا تو خیال ہے اس میں ترک حکومت بھی ملوث ہے۔ اس نے اپنے خفیہ ایجنٹوں سے یہ حملہ کرایا ہے تاکہ موساد وہاں اپنا آپریشن بند کرنے پر مجبور ہوجائے۔"

"ترک حکومت ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔ اسے معلوم ہے، یہ بات چھپی نہیں رہے گی اور وہ مشکل میں پڑ جائے گی۔ اس کے بجائے زیادہ آسان کام یہ ہوتا کہ انہیں جاسوسی کے الزام میں گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا جاتا۔ اس سے ان کا مقصد بھی پورا ہوجاتا اور اسرائیل کے حصے میں بدنامی آتی۔"

"اس کے باوجود سلطان احمد صرف ایک فرد ہے جناب۔" کلورمین نے اصرار کیا۔ "ہمارے ایجنٹوں نے اس پر حملہ کیا تھا اور بعد میں بھی اس کی تلاش میں تھے، وہ تو چھپتا پھر رہا ہوگا۔"

"وہاں اس کی مدد کرنے والے بہت ہیں۔" جنرل بازک نے ٹہلتے ہوئے کہا۔ گولی کھانے کے بعد وہ رفتہ رفتہ پُرسکون ہوتا جا رہا تھا۔ "اس موقع پر جب ہم اپنی تاریخ کا سب سے اہم مشن انجام دینے جا رہے ہیں، یہ بہت بڑا نقصان ہے۔"

"لیکن ٹی ون کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور اگر اسے ضرورت پڑتی تو اس کی کوئی مدد بھی نہیں کرسکتے تھے۔"

"درست ہے لیکن اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دوسرے کام بھی کیے جاسکتے تھے۔ مسئلہ صرف ان دونوں کا نہیں ہے۔ ان کے پیچھے اور بھی لوگ ہیں۔ تبدیلی اکیلے آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی ہے۔" جنرل بازک کے لہجے میں تشویش آگئی۔ "ہمیں وقت سے پہلے ان لوگوں کا سراغ لگا کر ان سے نمٹنا ہوگا۔ جیسے سانپ کے بچے کو بچپن میں مار دینا چاہیے ورنہ بڑا ہوکر وہ خطرناک ہوجاتا ہے۔"

"کیا آپ کو ٹی ون کے مشن کی فکر ہو رہی ہے؟"

جنرل نے اپنے نائب کی طرف دیکھا۔ "کیا نہیں ہونی چاہیے؟ ہمارے مستقبل کا دارومدار بڑی حد تک اس مشن کی کامیابی یا ناکامی پر ہے۔"

"اور یہ مشن ایک فردِ واحد کے سپرد ہے۔" کلورمین نے کسی قدر بدلے ہوئے انداز میں کہا۔ جنرل بازک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا مطلب؟"

"سر! موساد ہمیشہ گروپ کی صورت میں منظم ہوکر کام کرتی آئی ہے۔ ہم نے اگر فردِ واحد پر انحصار کیا، تب بھی اس کے پیچھے ہماری ساری مشینری موجود رہی۔ یہاں صرف ایک فرد ہے جس کے بارے میں ہم تین افراد جانتے ہیں۔ اگر اس کا مشن ناکام رہتا ہے اور وہ پکڑا جاتا ہے تو جنرل سر..." کلورمین کہتے کہتے رکا پھر اس نے جملہ مکمل کیا۔ "اس کا ذمے دار کون ہوگا؟"

☆☆☆

ایمان بہت بے چین تھی۔ سلطان دفتر سے جانے کے

بعد دوبارہ واپس نہیں آیا تھا۔ سلطان کے پاس کوئی موبائل بھی نہیں تھا۔ عجیب بات تھی کہ اس نے موبائل رکھا ہی نہیں تھا۔ دوپہر میں اس کا فون آیا۔ ”میں فی الحال دفتر نہیں آؤں گا اور تم بھی محتاط رہو۔ زخم کھا کر بھیڑیے زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں۔ نثار مرزا کو بھی کہہ دو۔“

”ٹھیک ہے۔“ ایمان نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا دفتر نہیں آئیں گے؟“

”شاید نہیں کیونکہ اب میرا روپوش ہونا ہی ٹھیک ہے لیکن میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔ اپنا موبائل نمبر دے دو۔“

ایمان نے اسے اپنا موبائل نمبر دیا اور پھر دھیمی جذباتی آواز میں بولی۔ ”پلیز! اپنا خیال رکھیے گا۔“

سلطان چند لمحے کے لیے خاموش رہا پھر اس نے کال منقطع کر دی۔ ایمان نے گہرا سانس لے کر فون رکھ دیا۔ مصروفیات بہت زیادہ ہو گئی تھیں۔ اسے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بیس اپریل کی صبح میٹنگ سے چھ گھنٹے پہلے کنونشن سینٹر میں اپنی ڈیوٹی سنبھالنی تھی۔ اس نے سلطان کے لیے نیچے پارکنگ میں موجود رہنے کا اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا۔ سلطان کی کال پر وہ اتنی جذباتی ہوئی کہ اسے یہ بات بتانا بھول گئی۔ اب وہ اسے کال کرتا تب ہی وہ اسے بتا سکتی تھی۔ اس نے خود کو کوسا کہ وہ یہ اہم بات کیسے بھول گئی۔ اسے کیا ہو گیا تھا؟ کبھی کسی مرد نے اسے یوں متاثر نہیں کیا تھا بلکہ سرے سے متاثر ہی نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ وہ دفتر سے نکل رہی تھی کہ اسے نثار مرزا کی کال آ گئی۔

”ایمان! سلطان کہاں ہے؟“

”پتا نہیں، کہیں باہر ہیں۔ فون آیا تھا کہ فی الحال وہ اس طرف نہیں آئیں گے۔“

”میرے دفتر میں آؤ۔“ نثار مرزا نے حکم دیا۔ ایمان لفٹ سے اوپر آئی۔ نثار مرزا اپنے دفتر میں کسی قدر فکرمندی سے ٹہل رہا تھا۔ ایمان نے اس کا موڈ دیکھتے ہوئے کہا۔

”یس سر!“

”اسرائیلی حکومت نے ہم سے احتجاج کیا ہے کہ ہم سلطان احمد نامی ایک دہشت گرد کی مدد کر رہے ہیں جس نے موساد کے دفتر پر حملہ کر کے اس کے دس کارکنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔“

ایمان مسکرائی۔ ”ہماری حکومت نے سوال نہیں کیا کہ موساد والے یہاں کیا کر رہے تھے؟“

”ہم یہ سوال نہیں کر سکتے کیونکہ ماضی میں کیے گئے ایک معاہدے کے تحت ہم نے ہی انہیں یہاں دفتر قائم کرنے کی اجازت دی تھی۔ اسرائیلیوں نے اس معاہدے کا حوالہ دیا ہے۔“

”حکومت نے کیا جواب دیا ہے؟“

”فی الحال کوئی جواب نہیں دیا ہے۔“

”سلطان احمد کی موجودگی کا اعتراف کیا جائے گا؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ نثار مرزا نے کہا۔ ”اس پر کوئی الزام بھی نہیں۔ اسرائیلیوں کے بکواس کرنے سے ہم کسی پر فردِ جرم عائد نہیں کر سکتے۔ پھر بھی تم سلطان سے کہہ دو، وہ محتاط رہے۔“

”میں کہہ دوں گی۔“ ایمان نے جواب دیا۔ ”میں نے ان کے لیے کنونشن سینٹر کا پاس بنوالیا ہے۔“

”اسے ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہیے۔“ نثار مرزا نے کہا۔ ”اسے چاہیے جلد از جلد واپس چلا جائے۔“

”وہ آپ کے دوست ہیں لیکن جہاں تک میں نے انہیں جانا ہے، وہ واپس نہیں جائیں گے۔“

نثار مرزا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”وہ ایسا ہی ہے نہ ڈرنے والا، نہ جھکنے والا... ورنہ اس جیسے کتنے ہی آج یورپ امریکا میں عیش کی زندگی گزار رہے ہیں۔“

☆☆☆

سلطان استنبول سے چالیس میل مشرق میں ہائی وے کے ایک چھوٹے سے موٹیل میں مقیم تھا۔ یہاں اس نے اپنا نام پتا غلط لکھوایا تھا۔ اس قسم کے موٹیلز میں کوئی کاغذات کا پوچھتا بھی نہیں ہے۔ اس نے خود کو ترک ظاہر کیا تھا۔ اٹھارہ اپریل کی رات تھی۔ وہ چھوٹے سے ٹی وی پر مقامی نیوز چینل دیکھ رہا تھا جس میں علاقائی سربراہی کانفرنس کی کوریج کی جا رہی تھی۔

اگلے دن صبح کانفرنس کا اختتامی سیشن تھا جس کے بعد مشترکہ اعلامیہ جاری کیا جاتا۔ اسی رات ایرانی سربراہ کے اعزاز میں ڈنر ہوتا اور اگلے دن وہ میٹنگ تھی جس نے اسرائیلیوں کی نیندیں پیشگی حرام کر دی تھیں۔ سلطان جانتا تھا کہ ان مسلم ملکوں میں ہونے والا معاہدہ کسی طرح اسرائیل کے لیے خطرہ نہیں تھا۔ یہ اسرائیل کی بدمعاشی تھی۔ وہ اپنے دشمن کو دیوار سے لگانے نہیں بلکہ روند دینے کے قائل ہیں۔ اس کا ثبوت بارہا نہتے فلسطینیوں کے خلاف جنگی جارحیت سے دے چکے تھے۔

سلطان کو آسیہ اور بچوں کا خیال آ رہا تھا۔ اگرچہ اس

نے اپنے طور پر پوری حفاظتی تدبیر کی تھی لیکن اس کے اندر ایک خوف سا تھا کہ جب اسرائیلی اس کی شناخت معلوم کر سکتے ہیں تو ان کے لیے یہ معلوم کرنا کون سا مشکل کام ہو گا کہ وہ کہاں آباد تھا۔ وہ یقیناً بحیرۂ کیسپین کے کنارے اس کے فارم ہاؤس تک پہنچ گئے ہوں گے۔ اطمینان کی بس ایک ہی بات تھی کہ اس نے فلیٹ کو ممکن حد تک خفیہ رکھا تھا۔ وہ ترکمانستان کے دارالحکومت کے ایک بہت بڑے کمپلیکس میں تھا۔

سلطان نے اپنی نوّے فیصد دولت سونے میں بدل کر ایک جگہ چھپا دی تھی۔ اس کا دس فیصد بھی کافی سے زیادہ تھا۔ اس میں سے بھی بہت ساری رقم بچی ہوئی تھی جو چرمی بیگ میں تھی اور آسیہ اپنے ساتھ لے گئی ہو گی۔ وہ اس چکر سے نکل جاتا تو سونا نکال کر نئے سرے سے کسی دوسری جگہ جا کر آباد ہو سکتا تھا۔

مسلسل اینٹی بایوٹک کھانے سے اس کا زخم تقریباً بھر گیا تھا۔ اگلی صبح وہ استنبول کی طرف روانہ ہوا لیکن چند میل کا فاصلہ طے کر کے ایک اور چھوٹے موٹیل میں رک گیا۔ اس موٹیل میں زیادہ تر ترکی سے یورپ کی طرف سامان لے جانے والے ڈرائیور اور سیاح ٹھہرتے تھے۔ اس نے کمرا لیا اور اندر جا کر کھڑکیوں کے پردے بھی برابر کر لیے۔ اسے معلوم تھا صرف احتیاط ہی اسے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ رات کا کھانا جلد کھا کر وہ سو گیا۔ صبح چار بجے الارم نے اسے بیدار کیا۔ اس نے سرد پانی سے غسل کر کے دوسرا سوٹ پہنا اور باہر نکل آیا۔ ادائیگی وہ پیشگی کر چکا تھا۔ راستے میں ایک فون بوتھ سے اس نے ایمان کو کال کی۔ اس وقت پانچ بج رہے تھے اور وہ بھی جاگ چکی تھی۔ سلطان نے اسے آگاہ کیا۔ ”میں کنونشن سینٹر کی طرف جا رہا ہوں۔ میرا پاس بن گیا ہے؟“

”ہاں، میں بتانا بھول گئی تھی۔ میں ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔“

☆☆☆

وہ الارم کی آواز سن کر بیدار ہوا۔ کچھ دیر ساکت لیٹا رہا، وہ نیند میں بھی نہیں بھولا تھا۔ آج اس کی زندگی کا سب سے اہم اور شاید آخری دن بھی تھا۔ وہ اٹھا اور واش روم میں آیا۔ اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اسے چہرہ عجیب سا لگا۔ شاید یہ اس کے خیالات کا عکس تھا جو اس کے چہرے پر آ رہا تھا۔ اس نے شیو کی اور پھر غسل کیا۔ تیار ہو کر وہ اپنے عالی شان مکان کے کچن میں آیا۔ وہ یہاں اکیلا رہتا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ حالانکہ اس کے خاندان کی کئی لڑکیاں اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں مگر وہ خود کو کسی پابندی میں الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی چھٹی حس اس معاملے میں ہمیشہ اسے خبردار کرتی تھی کہ وہ شادی کرنے اور خاندان بنانے سے گریز کرے تاکہ کسی کو پیچھے چھوڑ کر جانے کا دکھ نہ ہو۔ سولہ سال کی عمر میں جب اس نے ہرن کی مقدس کھال پر بیٹھ کر عہد کیا تھا، تب ہی اس کے ذہن میں آ گیا تھا کہ زندگی کے کسی مرحلے میں اسے یہ عہد نبھانا پڑے گا۔ آج وہ دن آ گیا تھا۔ اس نے اپنے لیے کافی تیار کی اور ایک بوائل انڈا لیا۔ اس کا مزید کچھ کھانے کا موڈ نہیں تھا۔

ناشتے کے بعد اس نے برتن دھو کر رکھے اور پھر... بیڈروم میں آیا۔ اس نے اپنا بریف کیس لیا اور پھر ڈریسنگ ٹیبل سے وہ گھڑی اٹھائی جو اسے ایشکوف نے دی تھی۔ اس میں ہلاکت خیز سائنائڈ میں بجھی سوئیاں تھیں۔ وہ کچھ دیر گھڑی دیکھتا رہا پھر اس نے اسے کلائی پر باندھ لیا۔ وہ دروازے لاک کر کے مکان سے باہر آیا اور ڈرائیو وے میں کھڑی تقریباً نئے ماڈل کی کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے دفتر میں تھا۔ یہاں وہ صرف ایک فائل لینے آیا تھا۔ پھر اسے کنونشن سینٹر جانا تھا۔ گھر سے وہ پستول ساتھ لے کر آیا تھا لیکن اسے اس نے دفتر میں چھوڑ دیا۔ اسے معلوم تھا کہ پستول لے کر اندر جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

☆☆☆

ایمان اس وقت اپنی ٹیم کے مخصوص یونیفارم میں تھی۔ گھر سے روانہ ہوتے ہوئے اس نے روش پاشا کو کال کی۔ ”میں کنونشن سینٹر جا رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے میں ذرا دیر سے آؤں گا۔“ روش پاشا نے کہا۔ ”تم سیکیورٹی کو آخری بار چیک کر لینا۔“

اسے سلطان سے بات کیے ہوئے آدھ گھنٹا ہونے والا تھا، ابھی صبح کی روشنی نہیں ہوئی تھی۔ سورج سوا چھ بجے طلوع ہوتا اور وہ چھ بجے کنونشن سینٹر پہنچ گئی تھی۔ اس نے اپنی گاڑی باہر والی پارکنگ میں روکی۔ سلطان کنونشن سینٹر کے گیٹ پر اس کا منتظر تھا۔ اس کا پاس دکھا کر وہ اسے اندر لائی اور پاس سلطان کو تھما دیا۔ ”اسے سامنے لگا لیں تاکہ کہیں روکا نہ جائے۔“

”میں میٹنگ والے فلور پر آ سکتا ہوں؟“

”نہیں، اس کے لیے بہت اوپر سے اجازت لینا پڑتی اور اب اجازت دینے کا مطلب ہوتا سیکیورٹی پلان

میں تبدیلی۔ اتنے کم وقت میں آپ کی کلیئرنس ملنا ناممکن ہوتی۔ اس کا بھی امکان تھا کہ سرے سے منع کر دیا جاتا اس لیے میں نے کنونشن سینٹر کی حد تک پاس جاری کرالیا ہے۔"

سلطان فکر مند تھا کیونکہ جو ہونا تھا، وہ چوتھے فلور پر ہونا تھا۔ نیچے رہ کر وہ اسے روکنے کے لیے کیا کر سکتا تھا۔ بہر حال، یہ بھی غنیمت تھا کہ اسے یہاں ہونے کی اجازت مل گئی تھی۔ ایمان اسے نیچے چھوڑ کر خود اوپر روانہ ہوگئی۔ سلطان وی آئی پی پارکنگ میں تھا۔ یہاں کئی درجن گاڑیاں پارک کرنے کی گنجائش تھی اور گاڑیوں کی نگرانی اور حفاظت کے لیے یہاں وی آئی پی سیکیورٹی گارڈز تھے، ان کی تعداد بیس تھی۔ ہر دس قدم کے فاصلے پر ایک مستعد گارڈ موجود تھا۔ ایک گارڈ سیڑھیوں کے سامنے اور ایک لفٹس کے سامنے موجود تھا۔ ان کی مرضی کے بغیر کوئی چوتھے فلور پر نہیں جا سکتا تھا۔ سلطان ایک ستون کے ساتھ کھڑا ہوگیا جہاں سے وہ پوری پارکنگ اور اوپر جانے والے راستے پر نظر رکھ سکتا تھا۔

ایمان کی ٹیم کے علاوہ جس میں ایمان اور روش پاشا سمیت پندرہ افراد تھے، دونوں سربراہان سمیت پچیس افراد چوتھے فلور پر موجود ہوتے۔ یعنی کُل چالیس افراد تھے اور ان میں سے کوئی ایک یا دو قاتل ہو سکتے تھے۔ سلطان کے پاس وہ فائل تھی جو ایمان نے اسے پرنٹ آؤٹ کرا کے دی تھی اور اس میں ان تمام افراد کے کوائف مع تصاویر موجود تھے جو اس میٹنگ میں شریک ہوتے۔ راستے میں وہ ان کے بارے میں سوچتا رہا تھا کہ ان میں سے کوئی مشکوک قاتل ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ سب پرانے اور ذمے دار لوگ تھے لیکن معاملہ موساد کا تھا جس میں اسرائیل کے ذہین ترین افراد موجود تھے۔ ان کا سربراہ جنرل بازک ایک کٹر جنونی صیہونی تھا لیکن اس کی شیطانی ذہانت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اپنی اسی ذہانت کی وجہ سے وہ بیس برس سے موساد کا چیف چلا آرہا تھا۔

دو گھنٹے بعد ایمان نیچے آئی۔ "ناشتا کیا ہے؟"

"نہیں۔" سلطان نے کہا۔ "سنو اگر تم سے رابطہ کرنا ہو تو میں کیا کروں؟"

"میں ایک واکی ٹاکی سیٹ دوں گی۔" ایمان نے کہا اور اسے وی آئی پی پارکنگ کے دفتر میں لائی۔ یہاں فی الحال وی آئی پی سیکیورٹی کا دفتر تھا اور کرنل رحیم پاشا اس کا سربراہ تھا۔ اس نے سلطان کے بارے میں پوچھا تو ایمان نے اس کا تعارف کرایا۔ کرنل نے پُرخیال انداز میں سلطان کی طرف دیکھا۔

"تم موساد کے ماہر ہو اور تمہارے یہاں آتے ہی موساد پر بُرا وقت آگیا۔"

"یہ بُرے وقت سے ڈرنے والے لوگ نہیں ہیں۔" سلطان نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ اس وقت بھی پلٹ کر جوابی حملے کی تیاری کر رہے ہوں گے۔"

"تم واقعی موساد کے ماہر ہو۔" کرنل نے سر ہلایا۔

کچھ دیر میں ناشتا آگیا اور ناشتے کے بعد ایمان اوپر چلی گئی۔ اس نے کرنل سے درخواست کی۔ "میں چاہتی ہوں کہ سلطان آپ کے ساتھ رہیں۔"

"میں خود یہی کہنے والا تھا لڑکی۔" کرنل نے مسکرا کر کہا۔ "تم بے فکر ہو کر اپنا کام کرو۔ میں اور سلطان گپ شپ لگاتے ہیں۔"

سلطان کا اندازہ تھا کہ کرنل اس سے اکیلے میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ جیسے ہی ایمان شیشے کے دروازے کو بند کر کے رخصت ہوئی، کرنل نے کہا۔ "یہ درست ہے کہ موساد اس میٹنگ کو نشانہ بنانا چاہتی ہے؟"

"میٹنگ نہیں دونوں سربراہوں کو۔" سلطان نے تصحیح کی۔

"ایک ہی بات ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے حملہ کس انداز میں کیا جا سکتا ہے؟"

"امکان ہے حملہ اندر سے ہوگا اور کوئی معتمد کرے گا۔" سلطان نے کہا۔ کرنل رحیم اس بارے میں جانتا تھا۔ یعنی وزارتِ داخلہ نے اسے بریف کر دیا تھا لیکن سلطان نے زیادہ بہتر انداز میں اسے اسرائیلی منصوبے کے بارے میں بتایا۔ کرنل کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوگئیں۔

"دوست! تم جو بتا رہے ہو اس سے تو خطرہ اس سے کہیں زیادہ لگ رہا ہے جتنا کہ میں نے محسوس کیا تھا۔"

"اسرائیلی اور موساد والے نہایت سفاک ہیں لیکن انہوں نے اپنی پوری تاریخ میں شاید ہی کبھی اتنے کم وقت میں اور دنیا کے مختلف حصوں میں اتنی قتل و غارت گری کی ہو۔ آخر انہیں میرے اور تریم پاشا کے گروپ سے کیا خطرہ ہو سکتا تھا؟ وہ اتنے پاگل ہو رہے ہیں کہ انہوں نے ان خاص لوگوں کے ساتھ موقع پر موجود ہر فرد کو قتل کر دیا۔ ظاہر ہے وہ کوئی بہت بڑی بات چھپانا چاہتے تھے۔ میں نے جہاں تک معلوم کیا اور مجھے اس پر پورا یقین ہے، اسرائیلی ان دو مسلم سربراہوں کو بہر صورت ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں اسرائیل کے لیے خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔"

"میں تم سے سو فیصد متفق ہوں لیکن یہی میٹنگ

کیوں؟ وہ یہ کام الگ الگ اور زیادہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ یہاں سیکیورٹی غیر معمولی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ اس طرح پیغام دینا چاہتے ہیں کہ وہ ہر چیز سے باخبر ہیں اور دوسرے وہ کسی سے کسی بھی جگہ نمٹ سکتے ہیں۔ یہ پیغام براہِ راست مسلم ممالک کے سربراہوں کو ہوگا کہ وہ اسرائیل کے مقابل آنے کی کوشش نہ کریں۔"

کرنل نے سر ہلایا۔ "اسرائیلی تکبر میں ڈوبی قوم ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کو دبانے کی کوشش میں رہتی ہے۔ بہر حال ہمیں ان کو ناکام بنانا ہے۔"

"اوپری فلور پر کُل چالیس افراد ہوں گے۔" سلطان نے کہا۔ "اگر حملہ اندر سے ہوا تو لازمی ان میں سے کوئی ایک تو قاتل ہوگا۔"

"یہ سب پرانے اور معتمد لوگ ہیں۔"

"کرنل! میں نے آپ کو بتایا ہے کہ حملہ حسن بن صباح کے فدائیوں کے انداز میں ہوگا۔ فدائی ہمیشہ معتمد ہوتے تھے، اکثر تو خود محافظ اور برسوں پرانے ہوتے تھے۔ جب ان کو اشارہ ملتا، یہ اپنے آقا کو قتل کر دیتے اور پھر خودکشی کر لیتے یا لڑتے ہوئے مارے جاتے تھے لیکن زندہ گرفتار نہیں ہوتے تھے۔"

"تمہارا مطلب ہے، ان میں بھی کوئی ایسا فدائی موجود ہے جو برسوں سے معتمد ہے۔"

"ایسا ہونا بالکل ممکن ہے کرنل... جب واسطہ ان لوگوں سے ہو جو حسن بن صباح کے بھی استاد ہیں پھر تمہارے ملک میں ان کا اثر بہت زیادہ رہا ہے، میں ماضی کی بات کر رہا ہوں۔ یہ لوگ کلیدی عہدوں پر رہے ہیں۔ ممکن ہے اب بھی اعلیٰ عہدوں پر ان کے ایجنٹ موجود ہوں۔"

"موجود ہیں۔" کرنل نے تصحیح کی۔ "لیکن وہ ہماری نظر میں ہیں۔"

"کوئی ایسا فرد بھی ہو سکتا ہے جس کے بارے میں تم لوگ بھی نہ جانتے ہو۔"

کرنل سوچ میں پڑ گیا۔ سلطان نے اپنے اور کرنل کے لیے مزید کافی نکالی۔ سربراہان بارہ بجے پہنچ جاتے۔ ایک بجے ون ٹو ون ملاقات شروع ہوتی جو دو بجے کے بعد کسی وقت ختم ہو جاتی۔ سلطان نے گھڑی دیکھی، ابھی نو بجے تھے۔ سلطان نے پوچھا۔ "میٹنگ ہال میں پچیس سویلین افراد کے علاوہ کتنے گارڈز ہوں گے؟"

"اندر صرف دو مسلح افراد ہوں گے، ایک روش پاشا

خدارا ◉ خدارا

شوگر کے مریض

ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبۂ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوا لیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0308-6627979
0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں

شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

اور دوسرا اس کا نائب حسان کریم۔ ان کے علاوہ کسی کو اسلحہ لے جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔"

"اسلحہ کیسے چیک کیا جائے گا؟ ان حضرات کی تلاشی تو نہیں لی جاسکتی۔"

"الیکٹرانک آلات کی مدد سے ہم مکمل چیک کرسکتے ہیں۔ ان آلات کو کوئی دھوکا بھی نہیں دے سکتا۔"

سلطان نے تسلیم کیا کہ اس قدر چیکنگ کے بعد کوئی شخص کسی قسم کا اسلحہ چھپا کر اندر نہیں لے جاسکتا۔ اس معاملے میں کوئی بات سلطان کے ذہن میں کھٹک رہی تھی لیکن وہ واضح نہیں ہو پا رہی تھی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ کرنل اپنے کام میں لگ گیا۔ گیارہ بجے ایمان دوبارہ وہاں آئی اور اس نے ایک واکی ٹاکی سلطان کے حوالے کیا۔

"اب میں نیچے نہیں آؤں گی۔ میری ڈیوٹی شروع ہو گئی ہے۔"

سلطان کرنل کا شکریہ ادا کرکے باہر آگیا کیونکہ وہ باقاعدہ سیکیورٹی کا حصہ نہیں تھا اس لیے اسے ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں ملی تھی اور جب وہ اندر آرہا تھا تو اس کی مکمل تلاشی لی گئی تھی۔ گارڈز الرٹ ہوگئے تھے کیونکہ سربراہی قافلہ کنونشن سینٹر آنے کے لیے چل نکلا تھا۔ کرنل اپنے دفتر میں موجود تھا اور قواعد کے مطابق اس وقت وہاں کوئی غیر متعلقہ فرد نہیں آسکتا تھا اس لیے سلطان باہر نکل آیا۔ گاڑیوں کی آمد بارہ بجے سے پہلے شروع ہوگئی تھی۔ میٹنگ کے شرکاء مختلف گاڑیوں میں آرہے تھے۔ سربراہان کی آمد سے پہلے آخر... میں اعلیٰ سطح کے حکام آئے تھے جن میں سلمان آسکر بھی شامل تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر اس کے ساتھی نے اسے کچھ کہا تو وہ چونکا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ سلطان نے غور سے اسے دیکھا اور یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس نے پہلے اسے کہاں دیکھا ہے۔ اس کا ذہن الجھ رہا تھا لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ سب سے آخر میں سربراہان کا قافلہ آیا اور دونوں سربراہ اترے۔ کرنل خود وہاں موجود تھا، وہ اپنے ساتھ دونوں کو لفٹ تک لے کر گیا اور انہیں چوتھے فلور کی طرف روانہ کردیا۔ وہاں روش پاشا انہیں ریسیو کرتا۔ آج کے دن لفٹ صرف ان کے لیے مخصوص تھی اور باقی افراد سیڑھیوں سے اوپر گئے تھے۔

☆☆☆

وہ مضطرب تھا، اسے اپنی زندگی کی فکر نہیں تھی۔ وہ اس فکر کو گھر چھوڑ کر آیا تھا۔ اس نے خود کو سو فیصد تیار کرلیا تھا کہ آج اس کی زندگی کا آخری دن ہے۔ وہ اپنے مشن کے لیے پریشان تھا۔ سیکیورٹی معمول کے مطابق تھی۔ اس کے اضطراب کی اصل وجہ وہاں سلطان کی موجودگی تھی۔ یہ واحد فرد تھا جو اب تک اسرائیلیوں کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوا تھا۔ وہ اسے چبانے کی کوشش میں اپنے کئی دانت تڑوا چکے تھے اور اسی بنا پر سلطان کو کنونشن سینٹر میں دیکھ کر اسے فکر لاحق ہوگئی تھی۔ وہ اوپر آیا، کچھ دیر بعد سربراہان بھی آگئے۔ وہ لفٹ کے پاس استقبالیہ میں شامل تھا۔ دونوں سربراہان مسکراتے ہوئے لفٹ سے باہر آئے تو اس نے سوچا کہ آج وہ آخری بار مسکرا رہے ہیں، جلد وہ دنیا سے رخصت ہو جاتے۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنی گھڑی پر ہاتھ رکھا۔ کچھ دیر بعد وہ سب میٹنگ ہال میں تھے اور میٹنگ کا آغاز ہوگیا تھا۔ یہاں معاہدوں پر دستخط ہونے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی ان دونوں کا کام تمام کردے تاکہ دفاعی معاہدے پر دستخط ہونے کی نوبت ہی نہ آئے مگر پھر اس نے خود کو سمجھایا کہ عجلت کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے موقع ملے گا جب وہ آرام سے ان دونوں کو ختم کرسکے گا۔ اس کے بعد وہ خود بھی خودکشی کرلے گا۔ لیکن اس سے اس کے خاندان پر کوئی الزام نہیں آئے گا کیونکہ اس نام کا اصل آدمی موجود تھا۔ وہ ملک سے باہر تھا اور اگر کوئی اس کا نام اور شخصیت اختیار کرکے حکومت کو دھوکا دے رہا تھا تو اس کی ذمے داری حکومت پر جاتی۔ مرنے کے بعد اس کی جو شخصیت سامنے آتی، اس سے اس کے خاندان کی ازخود صفائی پیش ہو جاتی کیونکہ اس شخصیت کا خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

☆☆☆

سلطان بے چین تھا۔ اس کی چھٹی حس اشارہ کررہی تھی کہ بہ ظاہر سب ٹھیک ہوتے ہوئے کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہے۔ اس نے کوئی چیز محسوس کی تھی لیکن اسے سمجھ نہیں پایا تھا۔ 'شاید میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔' اس نے سوچا ورنہ ایک زمانے میں اس کا ذہن ایسی باتوں کو فوراً محسوس کرلیتا تھا اور ان کا تجزیہ بھی کرلیتا تھا۔ مگر مدت سے گھریلو زندگی گزار کر وہ شاید اب عادی نہیں رہا تھا۔ صرف ایک کھٹک تھی۔ ایک بج گیا تھا، یعنی ون ٹو ون ملاقات کسی وقت بھی شروع ہوسکتی تھی۔ وہ کرنل رحیم کے پاس آیا۔ وہ اس کے اشارے پر باہر آیا اور کسی قدر سرد لہجے میں بولا۔ "میں اس وقت مصروف ہوں۔"

"میں جانتا ہوں کرنل... لیکن کیا تم ایک وضاحت کرسکتے ہو؟"

"پوچھو؟"

"ون ٹو ون ملاقات میں سربراہان کے ساتھ کون ہوگا؟"

"دونوں طرف کے سیکریٹری دفاع ہوں گے۔" کرنل نے جواب دیا اور واپس جانے کے لیے مڑا۔

"سلمان آسکر۔" سلطان نے مضطرب لہجے میں کہا۔ اسی لمحے اسے یاد آیا کہ کون سی بات اس کے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ جب سلمان آسکر گاڑی سے اترا تو وہ بے خیالی میں ایک خاص حرکت کررہا تھا۔ اس نے کرنل کا بازو تھام لیا۔ "تمہیں یقین ہے کہ یہ سلمان آسکر ہی ہے؟"

"تمہارا دماغ درست ہے؟" کرنل نے خفگی سے کہا اور اپنا بازو چھڑا لیا۔ "یہ لغو خیال تمہارے ذہن میں کیسے آیا؟"

"سنو کرنل... وہ سلمان آسکر نہیں ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں اور اب مجھے یقین ہورہا ہے کہ وہی متوقع قاتل ہے۔"

کرنل اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے سلطان کا دماغ چل گیا ہو۔ اس نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اب اگر تم نے اس قسم کی کوئی بات کی تو میں تمہیں یہاں سے نکلوا دوں گا۔ کسی اور کو پتا چلا تو وہ تمہیں پاگل خانے بھجوا دے گا۔" کرنل بات مکمل کرتے ہی اندر چلا گیا۔ سلطان اس کے ردعمل کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے بات ہی ایسی کی تھی کہ کوئی اس پر یقین نہ کرتا۔ اس نے سوچا اور واکی ٹاکی پر ایمان سے رابطہ کیا۔ "ایمان! تم کہاں ہو؟"

"میں میٹنگ ہال کے باہر گیلری میں ہوں۔"

"ایمان! میری بات غور سے سنو۔ میں نے ممکنہ قاتل کا پتا چلا لیا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ قاتل سلمان آسکر کے روپ میں ہے۔"

"کیا مطلب... وہ سلمان آسکر نہیں ہے؟"

"میں یہ نہیں جانتا لیکن قاتل وہی ہوسکتا ہے۔ کیا دونوں سربراہ ون ٹو ون ملاقات کے لیے جاچکے ہیں؟"

"ہاں، ایک منٹ پہلے ہی گئے ہیں۔ باقی لوگ باہر گیلری میں آگئے ہیں۔ سلمان آسکر بھی میٹنگ میں ہے۔"

"ایمان! کچھ کرو ورنہ وہ اپنا کام کر جائے گا۔ وہ موساد کا ایجنٹ ہے۔"

"میں کوشش کرتی ہوں لیکن یہ بات کوئی ماننے گا نہیں۔"

"کیا میں اوپر آسکتا ہوں؟"

ایمان بُری طرح پریشان ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ "میں روش پاشا سے بات

کرتی ہوں۔"

سلطان کے خیال میں وقت تیزی سے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ قاتل کسی لمحے بھی اپنا کام کرسکتا تھا۔ اچانک اسے ایک خیال آیا۔ اگر ایسا ہوا تو شاید وہ بھی لپیٹ میں آجائے۔ اسے قاتل کا ساتھی قرار دیا جائے اور یہ اسے کسی صورت منظور نہیں تھا۔ وہ چند لمحے کے لیے سوچتا رہا پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ وہاں موجود گارڈ نے اسے روک لیا۔ "تم اوپر نہیں جاسکتے۔"

"مجھے اوپر بلایا گیا ہے... روش پاشا نے طلب کیا ہے۔" سلطان نے اس کے برابر سے گزرتے ہوئے سیڑھیوں پر پیش قدمی جاری رکھی۔ گارڈ اس کے پیچھے آیا۔ وہ سلطان کو روکنے کی کوشش کررہا تھا۔ اچانک سلطان نے مڑ کر کہنی اس کی کنپٹی پر ماری اور وہ ایک لمحے میں بے ہوش ہوگیا۔

☆☆☆

میٹنگ روم میں اب صرف دونوں سربراہ اور دونوں ملکوں کے سیکریٹری دفاع تھے۔ سلمان آسکر نے اپنے ایرانی ہم منصب کے ہمراہ اس خفیہ دفاعی معاہدے کی فائلیں سنبھال رکھی تھیں جن پر بعض امور طے کرنے کے بعد حتمی دستخط ہونا باقی تھے اور یہ امور دونوں سربراہانِ مملکت طے کرنے کے لیے میٹنگ ہال کے بعید کونے میں چلے گئے تھے جہاں وہ بغیر کسی کی مداخلت کے بات کرسکتے تھے۔ سلمان اپنے ہم منصب کے ساتھ ایک طرف موجود تھا۔ وہ رہ رہ کر اپنے گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا یا اس پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ آنے والے وقت کے خیال سے اس کے جسم میں خون کی گردش تیز ہورہی تھی۔ دور سے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ سربراہان آپس میں کیا بات کررہے ہیں لیکن ان کی مسکراہٹیں بتا رہی تھیں کہ گفتگو نہایت خوشگوار ماحول میں ہو رہی ہے اور امور طے کیے جارہے ہیں۔ بالآخر ان کی گفتگو ختم ہوئی اور پہلے ایرانی سربراہ نے اپنے سیکریٹری دفاع کو فائل سمیت طلب کیا جس پر دستخط ہونے تھے۔ وہ فوراً فائل لے کر پہنچ گیا۔ پروٹوکول کے تحت مہمان کو اولیت حاصل تھی، اس کا نمبر بعد میں آتا۔ جب پہلی فائل پر دستخط ہوگئے تو اس کی باری آئی اور وہ دھڑکتے دل کے ساتھ فائل لیے ہوئے آگے بڑھا۔ اس نے فائل دونوں سربراہوں کے سامنے موجود میز پر رکھی اور پھر اس کا وہ صفحہ کھول کر پیچھے ہٹ گیا جس پر دستخط ہونے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے غیر محسوس انداز میں گھڑی کی چابی کھینچ لی۔

☆☆☆

www.paksociety.com

ایمان، روش پاشا کے پاس آئی۔ ''سر! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔''

روش پاشا نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کیا بات ہے، تم پریشان لگ رہی ہو؟''

''سر! سلطان کا کہنا ہے کہ اندر ہال میں موجود سلمان آسگر ممکنہ قاتل ہے۔''

روش پاشا چونکا۔ ''اس کا دماغ درست ہے؟'' اس نے کرنل کی بات دُہرائی۔ ''ایسا کیسے ممکن ہے؟''

''میں نہیں جانتی سر... لیکن وہ شروع سے کہتا آیا ہے کہ قاتل وہی ہوگا جو معتمد ہوگا اور جس پر کسی کا شبہ نہیں جاسکتا۔''

''وہ کس وجہ سے یہ بات کہہ رہا ہے؟''

نثار مرزا بھی وہاں موجود تھا کیونکہ داخلی معاملات سے متعلق بعض چیزیں میٹنگ کا ایجنڈا تھیں اس لیے وہ بھی آیا تھا۔ اس نے ایمان اور روش پاشا کو گفتگو کرتے دیکھا اور ان کے تاثرات سے بھانپ گیا، وہ تیزی سے ان کی طرف آیا۔ ''کیا ہوا کوئی مسئلہ ہے؟''

روش پاشا نے ایمان کی بات دُہرائی۔ ''آپ بتائیں جناب یہ کیسے ممکن ہے؟''

''سب ممکن ہے۔'' ایمان بولی۔ ''اگر ہم سلمان آسگر کو ایک بار پھر چیک کریں...''

''یہ ناممکن ہے، اس وقت کوئی شخص میٹنگ ہال میں نہیں جاسکتا۔''

''ہم کوئی بہانہ کرسکتے ہیں۔ کسی طرح سلمان آسگر کو باہر بلاسکتے ہیں جیسے اس کے گھر میں کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔''

''وہ اکیلا رہتا ہے۔'' روش پاشا نے کہا۔

''اس کے گھر میں آگ لگ سکتی ہے، یہاں کال آئی ہے۔'' ایمان کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ''وہ تصدیق کے لیے تو باہر آئے گا، اس کی جگہ کوئی دوسرا شخص اندر معاونت کرسکتا ہے۔''

کوئی اور ماتحت ہوتا تو اب تک روش پاشا سے جھاڑ کھا کر سیدھا ہو چکا ہوتا لیکن وہ ایمان تھی، نثار مرزا کی بیٹی... اور خود نثار مرزا بھی موجود تھا۔ روش پاشا نے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ کیا کہتے ہیں... سر؟''

نثار مرزا ہچکچایا پھر بولا۔ ''میرا خیال ہے کرکے دیکھ لیتے ہیں۔ اگر کچھ نہ کیا اور نقصان ہوگیا تو وہ ناقابلِ تلافی ہوگا۔''

اسی لمحے ایمان کی نظر اوپر نمودار ہونے والے سلطان پر پڑی۔ ''میرے خدا! یہ کیسے اوپر آئے؟''

وہ تیزی سے سلطان کی طرف آئی۔ اس دوران میں دوسرے گارڈ نے اسے روک لیا تھا لیکن ایمان نے مداخلت کی اور سلطان کو ایک طرف لے آئی۔ ''آپ اوپر کیسے آئے؟''

''تمہارے گارڈ کو بے ہوش کرکے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ایمان! مسئلہ بہت گمبھیر ہے اگر خدانخواستہ قاتل کامیاب رہا تو میں بھی پھنس جاؤں گا۔''

ایمان پریشان ہوگئی۔ ''یہ آپ نے اچھا نہیں کیا... ہم مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''وقت نہیں ہے، جو کرنا ہے جلدی کرو۔ کہیں قاتل اپنا کام نہ کر جائے۔'' سلطان نے کہا اور تیزی سے نثار مرزا کی طرف آیا۔ ''تم نے ابھی تک کچھ نہیں کیا؟''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔'' نثار مرزا نے جواب دیا۔ ''ہمیں بعد میں جواب دینا ہوگا۔''

''نثار مرزا! جواب دینا آسان ہے لیکن اگر کچھ ہوگیا تو پھر ساری عمر کا پچھتاوا ہوگا۔ میں ساری ذمے داری قبول کرتا ہوں۔ تم سلمان آسگر کو روکو اور ہوسکے تو اس گرفتار کرلو۔ وہ بے گناہ ثابت ہوا تو پھندا میرے گلے میں فٹ کردینا۔''

نثار مرزا کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر سر ہلا کر میٹنگ ہال کی طرف بڑھا۔ سلطان اس کے پیچھے جانے لگا تو روش پاشا نے ایک بار پھر اس کی تلاشی لی۔ وہ اپنے فرائض سے بے خبر نہیں تھا۔ سلطان نے کوٹ اتار دیا اور واکی ٹاکی بھی اس کے حوالے کردیا۔ اتنی دیر میں نثار مرزا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوچکا تھا۔

☆☆☆

اس کی نظریں گھڑی کے ڈائل پر مرکوز تھیں۔ اس کی تاریخ والے خانے میں سبز روشنی جل اٹھی تھی۔ اس نے پھر غیر محسوس انداز میں چابی کو اندر دبا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے دوبارہ باہر کھینچتا، اچانک اور غیر متوقع طور پر میٹنگ ہال کا دروازہ کھلا۔ سب نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ نثار مرزا اندر آرہا تھا۔ ترک وزیرِاعظم کے چہرے پر برہمی نمودار ہوئی۔ یہ عین موقع پر مداخلت والی بات تھی لیکن نثار مرزا نے ہاتھ اوپر کرکے ایک مخصوص اشارہ کیا تو وہ چوکنا ہوگیا۔ نثار مرزا نے قریب آتے ہوئے سلمان آسگر سے کہا۔ ''دونوں ہاتھ اوپر کرلو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے کوٹ سے پستول نکال کر اس پر تان لیا تھا۔ سلمان آسگر کے چہرے پر تناؤ آگیا لیکن اس نے ہاتھ بلند نہیں کیے اور پُرسکون لہجے میں بولا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟''

اس دوران میں نثار مرزا کے پیچھے روش پاشا اور سلطان بھی اندر آگئے۔ نثار مرزا کی دیکھا دیکھی روش پاشا نے بھی سلمان آسگر پر ہتھیار تان لیا تھا۔ سلطان غور سے سلمان آسگر کا جائزہ لے رہا تھا اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے دونوں ہاتھ قریب ہیں اور وہ ابھی تک ہاتھ اوپر کرنے کے موڈ میں نہیں۔ ترک وزیرِاعظم نے نثار مرزا کا اشارہ پاتے ہی ایرانی سربراہ کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا اور وہ پیچھے ہو گئے۔ سلطان نے کہا۔

''دیکھو، اس کے ہاتھ میں کچھ ہے... ہوشیار رہو۔''

نثار مرزا نے اسے دوبارہ خبردار کیا۔ ''اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو۔ یہ آخری وارننگ ہے۔''

اس نے گہری سانس لی۔ اس کا مشن ناکام ہوگیا تھا۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ کسی ایک فرد پر سوئی فائر کرسکتا تھا، اس کے بعد اسے دوسرا موقع نہیں ملتا... اس نے سوچا کہ یہ ایک فرد کون ہوسکتا ہے؟ اس نے سلطان کو دیکھا، اس شخص نے اسے ناکام کردیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ ناکامی کی سزا کیا ہوتی ہے۔ اس کا بس چلتا تو وہ سلطان کو قتل کردیتا لیکن وہ اس سے دور تھا۔ دونوں سربراہ بھی اس سے خاصے دور چلے گئے تھے اور وہ اپنی جگہ سے حرکت کرتا تو مارا جاتا۔ اس نے ہاتھ دھیرے دھیرے اوپر کیے اور پھر گھڑی کی چابی اندر دبا دی، اس وقت ڈائل کا رخ اس کے چہرے کی طرف تھا۔ وہ اچانک نیچے گرا تو روش پاشا نے اسے للکارا۔ ''خبردار، خبردار... کوئی حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا۔''

''آپ صوفوں کے پیچھے ہوجائیں۔'' نثار مرزا نے وزیرِاعظم اور صدر سے کہا مگر وہ دونوں اس کی ہدایت نظر انداز کرکے کھڑے رہے۔ سلطان بہ غور سلمان آسگر کو دیکھ رہا تھا، اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''خطرے کی کوئی بات نہیں ہے، یہ مرچکا ہے۔''

''تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' روش پاشا نے تیز لہجے میں کہا تو سلطان نپے تلے قدموں سے سلمان آسگر کے پاس پہنچا اور جھک کر گردن پر اس کی نبض چیک کی۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی، اس کا نیلا ہوجانے والا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مرچکا ہے۔ قریب سے دیکھنے پر سلطان کا شبہ درست ثابت ہوا۔

☆☆☆

دو دن بعد ایمان سوتے سے موبائل کی بیل سن کر نیند سے بیدار ہوئی۔ ایک اجنبی نمبر سے کال آرہی تھی۔ لیکن دوسری طرف سے سلطان کی آواز سن کر اس کی نیند اڑ گئی۔

''سلطان! آپ کہاں غائب ہوگئے تھے؟''

''میں جس کام سے آیا تھا، وہ ہوگیا تھا اور اب یہاں میری ضرورت نہیں رہی تھی اس لیے میں نے مناسب سمجھا وقت ضائع کرنے کے بجائے روانہ ہوجاؤں۔ ابھی مجھے اپنے خاندان کو محفوظ کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔'' سلطان نے کہا۔ وہ کنونشن سینٹر سے نکلتے ہی غائب ہوگیا تھا۔ اس نے ایمان یا نثار مرزا کو بھی نہیں بتایا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ رکا رہا تو جلد ایک لمبی چوڑی تفتیش کی لپیٹ میں آجائے گا اور اسے جلد چھٹکارا نصیب نہیں ہوگا۔ ''یہ بتاؤ کہ کیا سامنے آیا؟''

''یہ بتائیں کہ آپ کو سلمان آسگر کے بارے میں کیسے پتا چلا؟''

''میں بتادوں گا لیکن پہلے تم مجھے رپورٹ دو۔''

ایمان مجبور ہوگئی۔ سلمان آسگر کی موت سائنائڈ کی وجہ سے ہوئی تھی اور باریک بینی سے کیے گئے طبی معائنے سے پتا چلا کہ اَن دیکھی سوئی اس کی گردن میں اتر گئی تھی۔ سوئی پھینکنے کا میکنزم اس کی گھڑی میں تھا۔ سنسنی اس وقت پھیلی جب وگ اترنے کے بعد سلمان آسگر کی بالکل نئی شخصیت سامنے آئی۔ آسگر خاندان نے اسے سلمان آسگر ماننے سے انکار کردیا اور بتایا کہ سلمان آسگر تو جرمنی میں بزنس کرتا ہے۔ مارے جانے والے شخص کا جو پندرہ سال سے ترکی کا اہم ترین محکمے میں اہم ترین پوسٹوں پر کام کرتا رہا تھا اور اب سیکریٹری دفاع بن چکا تھا، آسگر خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

''یہ جھوٹ ہے، وہ اسی خاندان کا فرد ہے۔'' سلطان نے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، ہم یہ بات جان چکے ہیں۔ سلمان آسگر کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔ ڈی این اے ٹیسٹ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس نام کا ایک فرد سچ مچ اس خاندان کا حصہ ہے۔ حالانکہ جب وہ ملازمت میں آیا تو آسگر خاندان نے اپنا اثر رسوخ استعمال کیا تھا۔''

''یہ اس خاندان کی خاص بات ہے۔ اس کا ریکارڈ کہیں نہیں ہے اس لیے جو چاہے کہہ سکتے ہیں۔''

''افسوس اس نے خودکشی کرلی ورنہ وہ بہت کچھ بتاتا۔''

''جو وہ تمہیں بتاتا، وہ تم مجھ سے پوچھ لو۔''

ایمان اچھل پڑی۔ ''آپ اس کے بارے میں کیا جانتے ہیں۔''

''تم شاید یقین نہیں کروگی، وہ تریم پاشا تھا۔''

ایمان ایک بار پھر اچھل پڑی۔ ''تریم پاشا... ناقابلِ یقین۔''

''میں نے کہا تھا نا۔'' سلطان ہنسا۔ ''لیکن اسی وجہ

www.paksociety.com

سے مجھے شک بھی ہوا۔ اس نے اپنا حلیہ بالکل بدلا ہوا تھا اور یقیناً اس کے لیے اس نے بڑی محنت کی تھی پھر اس کے خاندانی اثر رسوخ نے بھی کام کیا اور اس نے نہایت کامیابی سے اپنے دو کردار برقرار رکھے۔ ایک طرف وہ محکمۂ دفاع کا اہم افسر تھا اور دوسری طرف وہ اپنے گروپ کے لوگوں کے لیے تریم پاشا بنا ہوا تھا۔ اس کی یہ شناخت بھی جعلی اور بنائی ہوئی تھی۔ مجھے اس کی شکل دیکھ کر شبہ ہوا تھا لیکن یہ تو میرے ذہن میں بھی نہیں آیا کہ وہ تریم پاشا ہو سکتا ہے۔"

"پھر آپ نے اسے کیسے شناخت کیا؟"

"تریم پاشا کی عادت تھی کہ وہ پریشان یا فکرمند ہوتا تھا تو اپنے دائیں کان کی لو مسلتا تھا۔ سلمان آسکر نے بھی یہی حرکت کی تھی جب وہ وی آئی پی پارکنگ میں اترا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا آخری دن تھا اس لیے ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود وہ پریشان تھا۔ یہ طے ہے کہ وہ کامیاب ہوتا یا ناکام، وہ اپنی جان لازمی لے لیتا۔ زندہ گرفتاری اس کے لیے ممکن نہیں تھی۔ لیکن جب تک میں نے اسے قریب سے نہیں دیکھا تھا، مجھے اس کے تریم پاشا ہونے کا مکمل یقین نہیں آیا تھا۔ باقی میرا اندازہ تھا کہ سلمان آسکر ہی حملہ آور ہو سکتا ہے۔"

"کیا تریم پاشا کے ساتھی بھی اس کی اصلیت نہیں جانتے تھے؟"

"نہیں اور پھر وہ ان سے الگ ہو گیا تھا۔ درحقیقت وہ ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ انہیں موساد نے تلاش کر کے مارا۔ مجھے یقین دلانے کے لیے اس نے مجھے ایک جھوٹا اخباری تراشہ دکھایا جس میں لندن کے ایک مکان میں آتشزدگی ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے شبہ نہیں ہوا حالانکہ اس نے ایک غلطی کر دی تھی۔ اس نے مجھے مبین کی جوابی میل دکھائی تھی، اس پر ریسیونگ کا وقت لندن نہیں بلکہ استنبول کے وقت کے حساب سے تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ ایتھنز اور استنبول ایک ہی ٹائم زون میں ہیں جبکہ لندن کا وقت پیچھے ہوتا ہے۔ میں نے یہ بات دیکھی اور بھول گیا مگر ذہن میں کہیں کھٹکتی رہی تھی۔ پھر استنبول میں قاسم کے گھر مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اس وقت قاسم مجھے شاید تریم پاشا کی اصلیت بتانے جا رہا تھا لیکن تریم پاشا کی طرف سے مقرر کیے ہوئے قاسم کے نوجوان ملازم نے اسے قتل کر دیا اور مجھے بھی مارنے کی کوشش کی۔ اس وقت بھی میرا ذہن تریم پاشا کی طرف نہیں گیا حالانکہ وہی ایک شخص تھا جو قاسم کے وجود سے واقف تھا اور شاید کسی طرح اسے پتا چل گیا تھا کہ قاسم میرے اور میرے ساتھیوں کے درمیان رابطہ کار ہے۔

اس نے میری طرف سے جھوٹا خط بھیج کر قاسم کو مجبور کیا کہ وہ میرے ساتھیوں کو ایک جگہ بلا لے اور جب قاسم نے یہ کام کر دیا تو موساد کے ایجنٹوں نے ان چاروں کو بے رحمی سے قتل کر دیا۔ بندرگاہ والی کارروائی اسی کے جواب میں تھی۔"

"میرے خدا! یہ انکشاف تو تہلکہ مچا دے گا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا کیونکہ تریم پاشا کی حیثیت سے سلمان آسکر نے کہیں اپنا سراغ نہیں چھوڑا ہوگا۔ اس کی دونوں حیثیتوں کو جوڑتے ہوئے تمہیں دانتوں.... پسینا آجائے گا۔ میں نے سوچا جانے سے پہلے آخری بار تم سے رابطہ کر کے تمہیں یہ سب بتا دوں۔"

"آخری بار کیوں؟" ایمان نے بے قرار ہو کر کہا۔ "اب تو خطرہ نہیں ہے۔"

"خطرہ پہلے سے بڑھ گیا ہے۔ اسرائیلی معاف کرنے یا بھول جانے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ میرا پیچھا کریں گے۔"

"یعنی آپ مجھ سے دوبارہ نہیں ملیں گے؟" ایمان کا لہجہ ڈوبنے والا تھا۔ "سلطان! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" سلطان نے آہستہ سے کہا۔ "میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ خوش رہو۔"

ایمان نے گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے، میں نہیں کہتی لیکن آپ مجھے یاد رکھیں گے؟"

"میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ شاید کبھی اللہ موقع دے تو میں آسیہ اور بچوں کے ساتھ ملنے آؤں گا۔"

"میں انتظار کروں گی۔" ایمان نے صبر و ضبط سے کہا۔

"اللہ حافظ۔" سلطان نے کہا اور کال منقطع کر کے موبائل فون بند کر کے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ وہ اس وقت ٹرین میں سفر کر رہا تھا اور ٹرین سینٹ پیٹرز برگ سے ماسکو کی طرف جا رہی تھی۔ سلطان نے اسٹیشن پر ایک شخص سے منہ مانگے داموں یہ موبائل فون لیا تھا اور استعمال کر کے پھینک دیا۔ اس کی مدد سے اس کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ وہ گزشتہ رات ہی بحیرۂ اسود کے راستے غیر قانونی طور پر روس میں داخل ہوا تھا اور اس وقت مشرق کی طرف سفر کر رہا تھا۔

تین دن بعد وہ اس فلیٹ کے سامنے کھڑا تھا جہاں اس نے آسیہ اور بچوں کو جانے کا کہا تھا۔ اس نے خود کو ہر ممکنہ صورت کے لیے تیار کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ کال بیل بجائی۔ پھر دروازہ کھلا اور آسیہ و بچوں کی صورت دکھائی دی تو کب سے دبی سانس کے ساتھ بے ساختہ دل سے اللہ کا شکر بھی نکلا۔

www.paksociety.com

کھوج

تنویر ریاض

بعض اوقات تصویر سے زیادہ اس کا فریم اس قدر نفیس اور خوبصورتی کا مظہر ہوتا ہے کہ توجہ کسی اور جانب مبذول نہیں ہوتی... ایک ایسی ہی کہانی کا پُرفریب منظر... جس نے پس منظر کو آنکھوں سے اوجھل کر دیا تھا...!

ایک سراغ رساں کا امتحان جس نے پس نقاب ایک جرم کا کھوج لگا لیا تھا

لیفٹیننٹ لیری نے اپنی کار مکان نمبر 1228 کے قریب کھڑی کی۔ گو کہ وہ اس وقت ڈیوٹی پر نہیں تھا اور اس نے سادہ لباس پہن رکھا تھا تاہم یہ سرگرمی بھی اس کے فرائض کا حصہ تھی اور وہ اس حوالے سے اپنے آپ کو ڈیوٹی پر ہی تصور کر رہا تھا اور اسے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ اس کے افسران کیا کہیں گے۔ وہ مجرموں کی کھوج میں تھا۔ اس کا کام انہیں تلاش کرنا، ان کے خلاف ثبوت جمع کرنا اور انہیں پکڑنا تھا۔ یہ ڈیوٹی اس کے معمول کا حصہ تھی۔ وہ اور اس کے ماتحت ...... اکثر شام کی شفٹ میں بھی کام کیا کرتے تھے بلکہ

یوں کہنا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ہر وقت ڈیوٹی پر ہی سمجھتے تھے۔

اس علاقے میں متوسط طبقے کے لوگ رہائش پذیر تھے اور وہاں موجودہ دور کی آسائشیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ یہ علاقہ 80ء کی دہائی میں آباد ہوا تھا تاہم یہ مکانات قدیم طرزِ تعمیر کے حامل ہونے کے باوجود آرام دہ اور تمام تر سہولیات سے مزین تھے۔ یہ سارے مکانات قریب قریب بنے ہوئے تھے اور ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ اس علاقے کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ یہ شہر کے مرکز سے قریب تھا اور اس کے ساتھ ہی وہاں سے ملک کے مختلف حصوں کو جانے کے لیے سڑکیں بھی گزرتی تھیں۔ اس لحاظ سے یہ جگہ ان مجرموں کے چھپنے کے لیے بہت مناسب تھی جن کی تلاش میں لیری سرگرداں تھا۔

اس کی اطلاع کے مطابق کم از کم دو مجرم یہاں رہتے تھے۔ ان میں سے ایک مکان نمبر 1228 میں اور دوسرا چند گھر چھوڑ کر مقیم تھا۔ لیری کی فہرست میں ایسے پانچ مجرموں کے نام شامل تھے۔ فی الحال انہیں مشتبہ سمجھا جا رہا تھا لیکن ان پر ذاتی مفادات کو ترجیح دینے، جھوٹ بولنے اور عوام کو دھوکا دینے کے الزامات تھے اور لیری کی نظر میں ان کی حیثیت مجرموں جیسی تھی۔

وہ اپنی کار سے باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے بچانے کے لیے اس نے سر پر ٹوپی اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیا اور آگے بڑھ کر دروازے پر لگی گھنٹی بجا دی۔ دروازہ کھولنے والی ایک نوجوان عورت تھی۔ اس نے خوب صورت اور دیدہ زیب لباس زیبِ تن کیا ہوا تھا۔ دیکھنے میں وہ خاصی خوب صورت اور روایتی قسم کی عورت لگ رہی تھی۔ گو کہ اس نے کبھی بیری ہیلر سے ذاتی معاملات پر گفتگو نہیں کی تھی لیکن اس عورت پر نظر پڑتے ہی لیری کو اندازہ ہو گیا تھا کہ بیری ہیلر عورتوں کے معاملے میں خاصا روایت پسند تھا اور ایسے لوگوں کے نزدیک عورت کا کام صرف گھر سنبھالنا، بچے پیدا کرنا اور نئے فیشن کے کپڑے بنانا تھا۔ اس کے خیال میں یہ بھی ایک ایسی ہی عورت تھی جسے گھر میں قید کر دیا گیا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ بھی اس طرزِ زندگی سے اکتاہٹ محسوس کر رہی ہوگی۔

اس عورت نے دروازہ پوری طرح نہیں کھولا بلکہ ایک طرح سے اس نے اندر رہتے ہوئے جھانکنے پر ہی اکتفا کیا۔ یہ اس کی احتیاط پسندی تھی اور ممکن ہے کہ اس نے اپنے دفاع کے لیے مارشل آرٹس کی تربیت لے رکھی ہو یا اس کے ہاتھ میں پستول ہو جو لیری نہیں دیکھ پا رہا ہو۔

"ہائے مادام۔" اس نے کہا۔ "میں بیری ہیلر کے لیے ایک خط لے کر آیا ہوں اور مجھے اس کے دستخط چاہئیں۔"

عورت نے ناگواری سے اسے دیکھا اور بولی۔ "میں اس کی بیوی ہوں۔ مجھے بتاؤ کہاں دستخط کرنا ہیں۔"

"کاش میں ایسا کر سکتا۔" وہ انتہائی مؤدبانہ انداز میں بولا۔ "دراصل یہ خط صرف مسٹر ہیلر ہی وصول کر سکتے ہیں اور اس کے لیے مجھے ان کے دستخط درکار ہیں۔"

"لیکن وہ تو اس وقت گھر پر نہیں ہے۔"

"کیا ان کے جلدی آنے کی کوئی امید ہے؟" لیری نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"یقین سے نہیں کہہ سکتی۔"

"میں انتظار کر سکتا ہوں۔ میرا مطلب ہے اپنی گاڑی میں یا کچھ دیر بعد بھی آسکتا ہوں۔"

"ممکن ہے کہ اسے آنے میں دیر ہو جائے۔" عورت نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ "وہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ گیا ہے۔"

"اس وقت وہ کہاں جا سکتا ہے؟" لیری نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو میں بھی نہیں جانتی کہ وہ کہاں گیا ہے۔"

اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بات کو ختم کرنا چاہ رہی ہے لیکن لیری اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ اس کی نظریں مسلسل اس عورت پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ بھی دوسرے لوگوں کو متاثر کرنے کا ایک انداز تھا۔ وہ عورت بھی اس کی نظروں کی تپش کی تاب نہ لا سکی اور جب اس نے دیکھا کہ لیری کسی طرح بھی جانے پر آمادہ نہیں ہے تو اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

"یہ بات صرف میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ دراصل ہرن کے شکار کا سیزن شروع ہو گیا ہے اور آج اس کا پہلا دن ہے۔"

"اوہ۔" لیری نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اس نے آج دفتر سے چھٹی لی ہے اور کچھ دوستوں کے ساتھ ہنٹنگ کا ونٹی گیا ہے۔"

"میں سمجھ گیا میڈم۔" لیری اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا اور اس نے یہ ساری گفتگو ایک جدید ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کر لی تھی جو اس نے اپنی آستین میں چھپا رکھا تھا۔ "ٹھیک ہے پھر تم ہی یہ خط وصول کر کے دستخط کر دو۔ میں چلا[...] کی عدم موجودگی کی وجہ اپنی باس کو بتا دوں گا۔"

☆☆☆

جس باس کی جانب لیری نے اشارہ کیا تھا، وہ حقیقت میں اس کی باس نہیں تھی لیکن اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتی تھی۔ کیرول فلیٹ ووڈ، انڈیانا پولیس میٹروپولیٹن ڈپارٹمنٹ میں پولیس مین کے طور پر کام کرتی تھی۔ ایک مہم کے دوران کمر میں گولی لگنے کی وجہ سے اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو چکا تھا اور وہ فیلڈ ڈیوٹی کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ صحت یاب ہونے کے بعد اس نے پولیس میں ہی ملازمت جاری رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اسے ہیومن ریسورس ڈپارٹمنٹ میں کھپا دیا گیا جہاں اس نے تیزی سے ترقی کی۔ پالیسیاں بنانے والے سینئر افسران تھے لیکن ان پر عمل کرانا اسی کی ذمے داری تھی اور پھر ایک ایسا وقت بھی آیا جب وہ اس شعبے کے لیے ناگزیر سمجھی جانے لگی اور اس کے بغیر وہاں کسی کام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

کافی عرصہ پہلے لیری کو اس کے ساتھ گم شدہ افراد کے شعبے میں کام کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس زمانے میں ان دونوں کے درمیان خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی اور اب وہ پرانی بات ہو گئی تھی۔ کیرول کو ایک سخت مزاج آفیسر سمجھا جاتا تھا لیکن لیری کے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ تھا۔ اسی لیے جب وہ دستک دیے بغیر اس کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے اس کا بالکل برا نہیں منایا اور بولی۔ "ایسی کیا خاص بات ہے جو تم مجھے سنانے چلے آئے؟ حالانکہ تم مجھے پوسٹ کارڈ بھی بھیج سکتے تھے۔"

"پوسٹ کارڈ کا زمانہ گیا میڈم! یہ ای میل کا دور ہے۔"

"میں محاورتاً بول رہی ہوں۔"

"پہلے مجھے بھی نئی ایجادات کے استعمال میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی لیکن اب میں جان گیا ہوں کہ ان کی مدد سے ہم بہت سے ایسے کام کر سکتے ہیں جو پرانے زمانے میں ناممکن سمجھے جاتے تھے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے وہ چھوٹا سا طاقت ور ٹیپ ریکارڈر نکالا جس میں بیری ہیلر کی بیوی سے ہونے والی گفتگو محفوظ تھی اور اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ کیرول نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی اور نہ ہی یہ پوچھا کہ وہ اسے کیا سنانا چاہ رہا ہے۔ لیری نے ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا اور دوبارہ ٹیپ ریکارڈر کی جانب دیکھنے لگا۔

"کیا تمہاری کوئی چیز گم ہو گئی ہے؟" کیرول نے پوچھا۔

"میں دیکھ رہا تھا کہ شاید اس کمرے میں کوئی اور وہیل چیئر موجود ہو جس پر بیٹھ کر مہمان برابری کی بنیاد پر تم سے بات کر سکے۔"

"میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔" کیرول نے ہنستے ہوئے کہا۔

لیری کے چہرے پر کھسیانی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ قریب پڑی ہوئی ایک کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔

"جسمانی طور پر تو تم مجھے ٹھیک نظر آرہے ہو لیکن یہ نہیں جانتی کہ تمہارے دماغ میں جو فتور ہے، اس کے علاج کے لیے کوئی دوا ایجاد ہوئی ہے یا نہیں۔"

"سچی بات تو یہ ہے کہ تم آج بھی ہمیشہ کی طرح اچھی لگ رہی ہو۔" لیری نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

اس نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ "تمہیں اس پر حیرت نہیں ہوتی کہ تمہارا کیریئر اوپر جانے کے بجائے ایک جگہ کیوں رک گیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اگر اسی طرح تم سے ملتا رہا تو ایک دن تم مجھے چیف بنا دو گی۔" حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کیرول نے آج تک کسی کے لیے کچھ نہیں کیا جبکہ وہ اس پوزیشن میں تھی کہ کسی کو رکھنے یا نکالنے کے حوالے سے اس کی سفارشات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"اگر تم ترقی کرنے کے اتنے ہی خواہش مند ہو تو شیرف کے لیے کوشش کیوں نہیں کرتے؟" کیرول نے اسے چھیڑا۔

"چیف بن کر میں زیادہ بہتر طریقے سے لوگوں کے کام آسکوں گا۔" لیری نے کہا۔ "اور کچھ نہیں تو اس محکمے کے لیے کچھ اچھے پولیس والے ہی تیار کر سکوں گا۔"

"خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ اس وقت کیسے آنا ہوا؟" کیرول نے پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اسے سن لو۔" یہ کہہ کر لیری نے ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔ وہ دونوں خاموشی سے ریکارڈنگ سننے لگے۔ مسز بیری ہیلر کا یہ جملہ سنائی دیا۔ "یہ بات صرف میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ دراصل ہرن کے شکار کا سیزن شروع ہو گیا ہے اور آج اس کا پہلا دن ہے۔"

یہ سنتے ہی کیرول کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ بولی۔ "اس کا مطلب ہے کہ وہ دفتر سے چھٹی کر کے دوستوں کے ساتھ ہنٹنگ کا ونٹی گیا ہے؟"

www.paksociety.com

''اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔'' لیری نے ٹیپ ریکارڈر بند کرتے ہوئے کہا۔ ''جبکہ ہیلر نے فون پر اطلاع دی تھی کہ اسے فلو ہو گیا ہے۔''

''اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' کیرول نے پوچھا۔

''یہی کہ تم اس سے باز پرس کرو۔ اس لیے نہیں کہ وہ کوئی بُرا آدمی ہے بلکہ اس کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو بھی شہ ملتی ہے۔ جب بھی ہر سال ہرن کے شکار کا موسم شروع ہوتا ہے تو ہمارے ڈپارٹمنٹ کے لوگ بیمار ہونا شروع ہو جاتے ہیں کیونکہ ہرن کا شکار ایک منافع بخش کاروبار ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور کیرول کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اس میں تمام تفصیلات درج ہیں۔ بڑے پیمانے پر غیر حاضری کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمیں ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو اوور ٹائم پر روک کر کام کروانا پڑتا ہے اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو محکمے کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔''

کیرول نے اس بھاری بھرکم لفافے کی ضخامت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی اور بولی۔ ''اس ریکارڈنگ کا کیا کروں؟''

''اسے اپنے پاس رکھو۔ یہ ایک اہم ثبوت ہے۔ ویسے تو اس کے علاوہ مزید چار بندے آج غیر حاضر ہیں لیکن میں صرف ہیلر کے خلاف ہی ثبوت حاصل کر سکا ہوں۔''

''اس کی عدالت کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔'' کیرول نے کہا۔ ''یہ محض ایک عورت کی گفتگو کا چھوٹا سا حصہ ہے جو اس نے بے دھیانی میں تم سے کی ہے۔''

''میں کوشش کروں گا کہ تمہیں ان کے کیے ہوئے شکار کی تصویریں دے سکوں۔ میں نے گزشتہ سال بھی کوشش کی تھی لیکن وہ خالی ہاتھ ہی گھر آئے تھے۔ شاید انہوں نے شکار کسی اور جگہ چھوڑ دیا تھا۔''

''ممکن ہے کہ شکار سے واپسی پر وہ سیدھے خریداروں کے پاس چلے گئے ہوں۔'' کیرول نے خیال ظاہر کیا۔

''یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو؟''

''اس لیے کہ میرا باپ بھی شکاری تھا۔ میں ان لوگوں کے طور طریقوں سے واقف ہوں۔''

☆☆☆

دو دن بعد لیری کو ایک اور واردات کے سلسلے میں جانا پڑا جو بظاہر ڈاکا زنی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ آدھی رات کے قریب اپنے گھر جا رہا تھا جب اسے اس واقعے کی اطلاع ملی۔ یہ اسٹور شہر کے مشرق میں 56 ویں اسٹریٹ پر واقع تھا۔ لیری اطلاع ملتے ہی پانچ منٹ کے اندر وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور پولیس کار بھی وہاں آ کر رکی اور اس میں سے سین فورڈ بلنگ برآمد ہوا۔ لیری لپک کر اس کے پاس پہنچا اور بولا۔ ''تم نے کچھ دیکھا؟''

''سامنے سے تو کچھ نظر نہیں آ رہا۔ یہاں بالکل اندھیرا ہے۔'' بلنگ نے جواب دیا۔

''میں عمارت کی پچھلی طرف جا رہا ہوں۔'' لیری نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں سامنے کی طرف رہ کر نگرانی کروں گا۔ امید ہے کہ جلد ہی ہمارے ایک دو ساتھی اور آ جائیں گے۔''

لیری نے ایک ہاتھ میں ٹارچ پکڑی اور عقب کی جانب چل دیا۔ وہاں بھی ایک چھوٹا سا پارکنگ لاٹ تھا لیکن کوئی گاڑی کھڑی ہوئی نظر نہیں آئی۔ اس پارکنگ لاٹ کے کنارے پر درختوں کی ایک قطار تھی جس کے عقب میں کچھ مکانات بنے ہوئے تھے۔ ممکن ہے کہ جس شخص نے واردات کی اطلاع دی تھی، وہ انہی میں سے کسی ایک مکان میں رہتا ہو۔ اس نے بڑی احتیاط سے پارکنگ لاٹ کا جائزہ لیا کہ کہیں کوئی شخص تاریکی میں نہ چھپا بیٹھا ہو پھر اس نے آہستہ آہستہ عمارت کے عقبی حصے کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔

ٹارچ کی روشنی میں اس نے وہاں گتے کے خالی ڈبے اور کچرے کے ڈرم دیکھے۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد اسے عمارت کا عقبی دروازہ نظر آیا۔ اس نے ہلکا سا دھکا دیا تو وہ کھل گیا۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھا، وہاں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے ریڈیو پر پہلے ہی سب لوگوں کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے اور یہ کہ عمارت میں داخل ہونے سے پہلے وہ مدد کا انتظار کرے گا۔

اس نے ٹارچ بجھا کر کھلے دروازے سے دیوار کا جائزہ لیا۔ وہاں چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی جس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر وہاں کوئی موجود ہے تو وہ اندر ہی ہوگا۔ اس نے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی۔ البتہ کبھی کبھی سڑک پر سے کسی گاڑی کے گزرنے کی آواز ضرور سنائی دیتی تھی۔ پھر اس نے کسی کے قدموں کی چاپ سنی۔ کوئی اسی کی طرف آ رہا تھا۔ اس کا خیال فوراً ہی بلنگ کی طرف گیا، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بلنگ کے بجائے ہیری ہیلر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کی یہاں موجودگی کا کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ اس کی ڈیوٹی یہاں سے کئی میل دور مغرب میں تھی۔

www.paksociety.com

لیری اس کے قریب ہوتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ ''میں نے عمارت کے اندر سے کوئی آواز نہیں سنی اور نہ ہی باہر کوئی گاڑی نظر آ رہی ہے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ واردات ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے۔''

ہیلر نے تائید میں سر ہلایا۔ ان دونوں نے اپنے ہتھیار نکال لیے۔ اس کے علاوہ ہیلر کے ہاتھ میں بھی ٹارچ نظر آ رہی تھی۔ لیری نے اپنی ٹارچ روشن کی اور اندھیری جگہ کی طرف بڑھتے ہوئے زور سے بولا۔ ''پولیس... اندر جو کوئی بھی ہے، اپنی جگہ سے نہ ہلے۔'' وہ جھکتے ہوئے ایک طرف کو مڑا اور ٹارچ کی روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ہیلر نے دوسری جانب کا رخ کیا۔ وہ بھی کسی خطرے کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ان دونوں کو وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر ہیلر کی نگاہ دیوار پر لگے ہوئے سوئچ بورڈ پر گئی اور اس نے ایک ساتھ ہی تینوں سوئچ آن کر دیے۔

کمرا روشنی سے نہا گیا۔ وہ ایک بڑا اسٹور روم تھا جس میں ایک میز، کمپیوٹر اور فائل کیبنٹ رکھا ہوا تھا اور وہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ پھر وہ دونوں اسٹور کے اس حصے کی جانب بڑھے جو گاہکوں کے لیے مخصوص تھا۔ انہوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس جگہ کی تلاشی لی لیکن وہاں بھی انہیں کوئی نظر نہیں آیا۔ لیری مرکزی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ دروازہ کھول کر باہر کھڑے ہوئے پولیس آفیسرز کو اندر آنے دے۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولتا، ہیلر نے اسے آواز دی اور بولا۔ ''پہلے میری بات سن لو۔''

''کیا؟''

''میں ریڈیو پر تمہارا پیغام سن کر مدد کے لیے آ گیا تھا لیکن لگتا ہے کہ تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟''

''میری بیوی کا پیچھا چھوڑ دو۔''

لیری کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ اس کی بات کا کیا جواب دے۔ ہیلر چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر تیزی سے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

☆☆☆

''تمہارا اس طرح بار بار میرے پاس آنا ٹھیک نہیں۔'' کیرول نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ لیری نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور مسکراتے ہوئے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میں بلا ضرورت کسی کے پاس نہیں جاتا۔''

''ٹھیک ہے، جو کہنا ہے جلدی کہہ ڈالو۔ میں تمہیں صرف دو منٹ دے سکتی ہوں۔''

لیری نے مختصراً اسے رات والا واقعہ سنایا اور بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آیا، اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں اس کے گھر گیا تھا ورنہ وہ یہ نہیں کہتا کہ میری بیوی کا پیچھا چھوڑ دو۔''

''گویا تم اس کی بیوی سے ملتے رہتے ہو۔'' کیرول نے اسے چھیڑا۔

''احمقانہ باتیں مت کرو۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ہیلر کو یہ کیسے معلوم ہوا، وہ میں ہی تھا جسے اس کی بیوی نے بتایا کہ وہ ہرن کا شکار کھیلنے گیا ہے جبکہ میں اس کی بیوی سے پہلے کبھی نہیں ملا اور نہ ہی اس وقت وردی میں تھا۔''

''ممکن ہے کہ اس نے تفصیل سے تمہارا حلیہ بیان کر دیا ہو۔''

''مجھ میں ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے کہ کوئی مجھ پر دوسری نظر ڈالنا گوارا کرے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ وردی

SOLE DISTRIBUTOR
of U. A. E
WELCOME BOOK SHOP
JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
P.O.Box 27869 Karama,Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
Best Export From, Pakistan
WELCOME BOOK PORT
Publisher , Exporter , Distributor
All kinds of Magazines, General Books
and Educational Books
Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

کے بغیر میں ایک عام سا شخص نظر آتا ہوں۔ میں زیادہ دیر وہاں نہیں رکا اور نہ ہی اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ اس لیے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اسے میرا حلیہ یاد رہ گیا ہو۔"

"تم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔"

"میں یہی پوچھنے کے لیے آیا ہوں کہ کہیں اس دفتر کے کسی آدمی نے تو نہیں بتا دیا کہ میں نے اس کی غیر حاضری کی رپورٹ کی تھی؟"

"کیا تم مجھے الزام دے رہے ہو؟" کیرول غصے سے بولی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہارے دفتر کے کسی اور فرد نے وہ رپورٹ دیکھ لی ہو جو میں تمہیں دے کر گیا تھا۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ کسی نے وہ رپورٹ نہیں دیکھی اور نہ ہی اس بارے میں ہیلر کو کچھ بتایا۔"

لیری نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے، تم کہتی ہو تو یقین کر لیتا ہوں۔"

☆☆☆

گھر آنے کے بعد بھی لیری مسلسل اسی بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی سمجھ میں یہ معما نہیں آ رہا تھا کہ ہیلر کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ وہ اس کے گھر گیا تھا۔ اگر کیرول کے دفتر کے کسی آدمی نے اسے نہیں بتایا تو اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟ حالانکہ لیری نے اپنی رپورٹ میں عام رویے کی نشان دہی کی تھی۔ اس نے کسی خاص شخصیت کو نشانہ نہیں بنایا تھا اور اگر ہیلر نے وہ رپورٹ نہیں پڑھی تو اس نے لیری کے ساتھ یہ رویّہ کیوں اختیار کیا؟ یہی وہ سوال تھا جس کا جواب جاننے میں لیری کو دشواری ہو رہی تھی۔

اس شام لیری نے خاص طور پر ہیلر کی سرگرمیوں پر نظر رکھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی فہرست میں شامل دیگر تین پولیس والوں لینڈرک، ویز اور دوبنسکی کو بھی واچ کرتا رہا جبکہ پانچواں پولیس آفیسر کونک، اسپتال میں داخل تھا۔ ان میں سے ویز، ہیلر کا پڑوسی تھا۔ یہ دونوں ماضی میں کبھی بھی اچھے دوست نہیں رہے تھے اور اب بھی وہ ایک میز پر نہیں بیٹھتے تھے۔ لیری یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کیا شکار پر وہ دونوں ساتھ گئے تھے یا نہیں؟ جب اس نے ویز کے دروازے کی گھنٹی بجائی تو گھر کے اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اسی طرح اسے لینڈرک اور دوبنسکی کے سلسلے میں بھی ناکامی ہوئی اور ان کے گھروں سے بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ لیری کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس معاملے کو کس طرح آگے بڑھائے۔

وہ اسی گتھی کو سلجھانے میں مصروف تھا کہ اسے براڈ ینل کے شمال میں واقع ایک کالج کی عقبی بلڈنگ میں رہنے والی کسی عورت کی کال موصول ہوئی۔ اس نے اپنے گھر سے متصل راہداری میں ایک مشکوک شخص کو دیکھا تھا اور اس بارے میں پریشان لگ رہی تھی۔ گشت پر موجود پولیس آفیسر وبلیری منٹز نے یہ کال وصول کی اور موقعِ واردات پہنچ گئی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی لیری بھی اس کی مدد کے لیے وہاں موجود تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی دیکھنا چاہ رہا تھا کہ وبلیری اس صورتِ حال سے کس طرح نمٹتی ہے۔ اس کا شمار ان خاتون آفیسرز میں ہوتا تھا جو اس طرح کی نامانوس فون کالز پر کام کرنے میں آسانی محسوس کرتی ہیں.... جس میں کسی شخص کو تلاش کرنے یا اس کا پیچھا کرنے کی ضرورت پیش آئے لیکن پبلک ڈیلنگ کے حوالے سے ان کا ریکارڈ متاثر کن نہیں تھا۔ لیری بھی دیکھنا چاہ رہا تھا کہ اس کیس میں وبلیری کس حد تک صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتی ہے۔

ٹیلی فون کرنے والی عورت مسز جیکولین فریڈرک کی عمر ستر برس سے کچھ زائد تھی اور وہ بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ گفتگو کرتی تھی۔ وبلیری نے پہلا سوال اس سے یہی کیا۔ "ہاں تو مسز فریڈرک! اچھی طرح سوچ کر بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا؟"

"میں نے کچھ دیکھا نہیں بلکہ سنا تھا۔" وہ عورت بولی۔ "وہ ایک مرد تھا جو اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی آواز بہت نیچی تھی اور وہ ایسی باتیں کر رہا تھا جن کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ میں اس عمارت میں رہنے والے ہر شخص کو جانتی ہوں اور ان کی آوازیں پہچان سکتی ہوں۔ وہ آواز یہاں رہنے والے کسی فرد کی نہیں تھی اور نہ ہی وہ کوئی مہمان ہو سکتا ہے کیونکہ میں نے وزیٹرز ایریا میں کوئی کار نہیں دیکھی۔ مجھے اپنے لیونگ روم کی کھڑکی سے وہاں کا منظر صاف نظر آتا ہے۔"

"گویا تم نے کسی کو نہیں دیکھا؟" وبلیری نے اپنا سوال دہرایا۔

مسز فریڈرک کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے اور وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ "میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میں نے کچھ دیکھا نہیں بلکہ سنا تھا۔"

"تم نے سیکیورٹی والوں کو اس بارے میں بتایا جو اس عمارت کی حفاظت پر مامور ہیں؟"

"انہیں بتانے کا کیا فائدہ؟ وہ تو ساری رات تاش کھیلتے رہتے ہیں۔"

"گویا تم نے اس واقعے کی اطلاع انہیں نہیں دی؟"

"میں نے انہیں بتایا تھا۔ جس شخص سے میری بات ہوئی اس کا کہنا تھا کہ مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، وہ خیال رکھیں گے لیکن میں اپنے کچن کی کھڑکی سے دیکھ رہی ہوں کہ ان میں سے کوئی بھی دفتر سے باہر نہیں آیا۔"

"اور اس واقعے کو کتنی دیر ہو گئی؟"

"پینتالیس منٹ تو ہو گئے ہوں گے۔" اس عورت نے بیزاری سے وبلیری کو دیکھا پھر بولی۔ "تم یونہی سوال جواب کرتی رہو گی یا اس شخص کو تلاش بھی کرو گی؟"

"میں جب اس عمارت میں داخل ہوئی تو میں نے بھی کسی مشتبہ شخص کو نہیں دیکھا۔" وبلیری نے کہا پھر وہ لیری کی جانب مڑی اور بولی۔ "سر! کیا آپ نے کسی کو دیکھا؟"

"نہیں۔" لیری نے جواب دیا۔

وبلیری نے مسز فریڈرک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ اس سلسلے میں کیا کارروائی کی جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم کسی شخص کو تمہارے اپارٹمنٹ کی نگرانی پر مقرر کر دیں۔"

"نہیں بلکہ میں چاہتی ہوں کہ تم اس عمارت کی تلاشی لو اور اس شخص کو پکڑ و۔"

"یہ مناسب نہیں ہو گا کیونکہ تم نے کسی کو دیکھا نہیں ہے۔ تاہم یہاں سے جاتے وقت ہم گرد و پیش کا جائزہ ضرور لیں گے۔"

"میں سمجھتی ہوں کہ تم خاصی غیر ذمے داری کا مظاہرہ کر رہی ہو۔"

"تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" وبلیری کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے۔

"اس وقت تمہیں کیسا محسوس ہو گا جب یہاں سے جانے کے ایک گھنٹے بعد تمہیں یہ اطلاع ملے گی کہ اس عمارت میں کسی کو لوٹ لیا گیا یا اس کا قتل ہو گیا؟" بوڑھی عورت نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وبلیری نے لمحے بھر توقف کیا پھر بولی۔ "یقیناً میں پریشان ہو جاؤں گی لیکن میڈم! تم نے صرف ایک اجنبی آواز سنی ہے جو پڑوس میں چلنے والے کسی کے ریڈیو یا ٹیلی ویژن کی بھی ہو سکتی ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ میں کسی سائے کے تعاقب میں کتنا وقت ضائع کر سکتی ہوں۔ تمہارے اپنے سیکیورٹی کے لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ وہ اپنا کام صحیح طرح نہیں کر رہے تو ان کی شکایت کر سکتی ہو۔ ہم تمہاری مدد کے لیے موجود ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ صرف اس لیے فورس طلب کر لیں کہ تم نے ایک نامانوس آواز سنی ہے۔"

مسز فریڈرک کا پارا چڑھ گیا اور وہ غصے سے بولی۔ "مجھ سے زندگی میں کسی نے اس طرح بات نہیں کی۔"

"میرا مقصد تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔" وبلیری بولی۔ "لیکن اس سے پہلے اگر تم نے اس انداز میں نہیں سنا تو یہ تمہاری خوش قسمتی ہے۔"

لیری نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے مداخلت کی اور بولا۔ "مسز فریڈرک! مجھے افسوس ہے کہ ہماری آفیسر بداخلاقی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔"

"مجھے تو تم پر بھی حیرت ہو رہی ہے۔ تم اتنی دیر سے خاموش تماشائی بنے یہ سب کچھ سن رہے ہو۔ جانتے ہو کہ ہمارے ٹیکسوں سے ہی تمہیں تنخواہ ملتی ہے۔"

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم اس سلسلے میں ضروری کارروائی کریں گے۔ اس آفیسر کو تربیت دی جائے گی کہ مستقبل میں لوگوں سے کس طرح نرمی سے پیش آتا ہے۔"

یہ سن کر مسز فریڈرک کچھ نرم پڑ گئی اور بولی۔ "ٹھیک ہے۔"

"جانے سے پہلے ہم اس عمارت کا معائنہ کریں گے اور اگر کوئی نئی بات معلوم ہوئی تو تمہیں بھی اس بارے میں ضرور بتائیں گے۔"

"بہت بہت شکریہ آفیسر..."

"لیفٹیننٹ لیری۔" اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے اسے کارڈ تھما دیا اور بولا۔ "آئندہ بھی ایسی کوئی بات ہو تو فون کرنے میں جھجک محسوس نہ کرنا۔ ہم چند ہی منٹوں میں تمہارے دروازے پر پہنچ جائیں گے۔"

جب وہ دونوں ہال سے باہر آئے تو وبلیری بولی۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم اس بوڑھی عورت کے سامنے اس طرح جھک سکتے ہو جو محض ہمارا وقت ضائع کر رہی تھی۔"

"مت بھولو کہ اسی عورت کے ادا کردہ ٹیکس سے ہمیں تنخواہ، پنشن اور دوسری مراعات ملتی ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہم سائے کا تعاقب تو نہیں کر سکتے۔"

"تم نے ایک بنیادی غلطی کی ہے وبلیری۔"

"وہ کیا؟"

"تم اس عمارت میں داخل ہوئیں اور سیدھی اس

عورت کے اپارٹمنٹ میں چلی گئیں۔ راستے میں تم نے کسی شخص کو باہر جاتے نہیں دیکھا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم نے عمارت کی تلاشی لے لی۔"

"تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ وہ شخص اسی عمارت میں موجود ہے؟"

"ہاں کیونکہ کسی نے اسے نیچے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ کسی اپارٹمنٹ میں بھی نہیں جا سکتا کیونکہ اس عمارت میں نہیں رہتا۔"

"پھر وہ کہاں جا سکتا ہے؟" دلبیری کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"چھت پر... ہمیں وہاں جا کر دیکھنا چاہیے۔"

لیری کا اندازہ درست نکلا۔ چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کے اختتام پر ہی انہیں وہ شخص نظر آ گیا۔ وہ گہری نیند میں تھا اور اس کے قریب ہی شراب کی خالی بوتل پڑی ہوئی تھی۔ اس لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ اس عمارت میں کیوں داخل ہوا اور چھت پر کیا کرنے آیا تھا؟

"تم ایمبولینس کے آنے تک اس کے پاس ہی ٹھہرو۔" لیری نے دلبیری سے کہا۔ "اسے روانہ کرنے کے بعد تم مسز فریڈرک کو ساری صورتِ حال بتا دینا اور اس سے معذرت بھی کر لینا۔ میں کل صبح آ کر اس سے پوچھوں گا کہ اس کے ساتھ تمہارا رویّہ کیسا تھا۔"

دلبیری خاموشی سے اس کی ہدایات سنتی رہی۔

"اس کے بعد تم اسپتال جاؤ گی اور اس شخص کے جاگنے تک وہیں رہو گی۔ تمہیں اس سے یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ عمارت میں کیسے داخل ہوا اور وہاں کس مقصد سے آیا تھا۔ یہ سیکیورٹی کا مسئلہ ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

☆☆☆

دوسرے روز وہ سہ پہر کے وقت مسز فریڈرک کے پاس گیا اور اس سے دلبیری کے بارے میں دریافت کیا۔

"ہاں، وہ لڑکی صبح آئی تھی اور کافی پریشان لگ رہی تھی۔"

"غالباً اپنے رویّے پر پشیمان ہو رہی ہو گی۔" لیری نے کہا۔

"میں نے اسے کافی کی پیشکش کی اور یہ بھی کہا کہ وہ کچھ دیر آرام کرے لیکن وہ زیادہ دیر نہیں رکی اور مجھ سے معافی مانگ کر فوراً ہی چلی گئی۔"

"ہاں کیونکہ اسے رات کو دوبارہ ڈیوٹی کرنی ہو گی۔ کیا اس نے تمہیں اس مشکوک شخص کے بارے میں کچھ بتایا؟"

"اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ وہ خود نہیں جانتا کہ کہاں سے آیا ہے اور اس عمارت میں کیوں داخل ہوا۔ اس کی جیب سے ایک کارڈ برآمد ہوا جس پر ایک دماغی اسپتال کا نمبر درج تھا۔ وہ لوگ خود اس بارے میں پریشان تھے کہ یہ شخص وہاں سے کس طرح نکل آیا۔ تمہاری آفیسر سوچ رہی ہو گی کہ وہ کہیں دوبارہ یہاں کا رخ نہ کرے لیکن ایسا لگتا نہیں ہے۔"

لیری نے سر ہلایا اور اسے اطمینان ہو گیا کہ دلبیری نے اس کی ہدایات پر عمل کیا تھا۔

"کیا تم ایک کپ کافی لینا پسند کرو گے؟" بوڑھی عورت نے پوچھا لیکن لیری نے معذرت کر لی۔ ابھی اسے بیری ہیلر کے گھر بھی جانا تھا۔

گو کہ اس وقت وہ وردی میں تھا لیکن اس نے سر پر ٹوپی پہن لی اور ہاتھ میں گتا بھی پکڑ لیا تاکہ مسز ہیلر دروازہ کھولے تو یہ دونوں چیزیں دیکھ کر اسے یاد آ جائے کہ وہ پہلے بھی آ چکا ہے۔ دھوپ کا چشمہ البتہ اس نے کار کی سیٹ پر چھوڑ دیا۔ گھنٹی بجانے پر مسز ہیلر نے ہی دروازہ کھولا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس بار اس کی آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ چڑھا ہوا تھا جس کے شیشے خاصے بڑے تھے۔

"اوہ۔" لیری نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"تم؟" مسز ہیلر کے لہجے میں بھی حیرت نمایاں تھی۔

"گویا تم نے مجھے پہچان لیا؟"

"میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں..." وہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہی تھی لیکن اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور بات کا رخ بدلتے ہوئے بولی۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ تم دوبارہ یہاں آؤ گے۔"

"کیوں؟ تم نے ایسا کیوں سوچا؟"

وہ تیوری چڑھاتے ہوئے بولی۔ "بس یونہی۔"

اس نے نیلے اور سفید رنگ کا لباس پہن رکھا تھا لیکن اس کے چہرے پر چمک اور تازگی کا احساس نہیں تھا۔ اس کے لاتعلقی کے انداز کو دیکھتے ہوئے لیری کی ہمت نہ پڑی کہ وہ اس کے حسن یا لباس کی تعریف کرے تاہم اس کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ اپنا چشمہ اتار دے تاکہ وہ اس کے چہرے پر ایک بھرپور نگاہ ڈال سکے۔ بالآخر اس نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔

"مسز ہیلر! کیا تم میری خاطر یہ دھوپ کا چشمہ اتار سکتی ہو؟"

"نہیں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں؟" لیری نے پوچھا۔

"میری آنکھوں میں تکلیف ہے۔"

"کیا واقعی؟" لیری نے سوچا کیا وہ اس سے نظریں نہیں ملانا چاہ رہی۔ بہر حال، اسے کوشش تو کرنی ہی چاہیے کیونکہ جب تک وہ کچھ پوچھے گا نہیں، اسے جواب کیسے مل سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اسے کریدنے کی خاطر کہا۔

"ابھی تم نے کہا تھا کہ بے وقوف نہیں ہو۔ یہ گمان کیوں ہوا کہ لوگ تمہیں ایسا سمجھتے ہیں؟"

اس بار مسز ہیلر اپنے ایجنڈے سے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس نے تلخی سے کہا۔ "لیفٹیننٹ! تم کیا چاہتے ہو؟ اگر کوئی اور خط لے کر آئے ہو تو اس کے لیے تمہیں انتظار کرنا پڑے گا، چاہے صبح ہی کیوں نہ ہو جائے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ گزشتہ بار میں نے تمہارے ساتھ عیاری سے کام لیا تھا۔" لیری مہذبانہ انداز میں بولا۔ "آج میں بیری ہیلر سے باتیں کرنے آیا ہوں کیونکہ پولیس اسٹیشن پر دوسرے لوگوں کی موجودگی میں یہ گفتگو نہیں ہو سکتی۔"

"وہ گھر پر نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں، میں کچھ دیر انتظار کر لیتا ہوں۔"

"آج اس کی رات کی ڈیوٹی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ ڈیوٹی پر جانے سے پہلے گھر آئے گا یا سیدھا کام پر چلا جائے گا۔"

"تمہیں یہ تو معلوم ہو گا کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔"

"وہ بتائے بغیر چلا جاتا ہے... تمہیں برا نہیں لگتا؟"

"میں عادی ہو چکی ہوں۔"

"مسز ہیلر! جب میں گزشتہ بار یہاں آیا تھا تو مجھے شبہ تھا کہ ہیلر بھی ان چار آفیسرز میں شامل ہے جو شکار پر جانے کے لیے بہانہ کر کے چھٹیاں کرتے ہیں لیکن اب میرا شک دور ہو گیا ہے اور میں اس سے معذرت کرنے آیا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، اگر تم کوئی پیغام دینا چاہو تو میں اسے بتا دوں گی۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے محکمے کے کچھ لوگ شکار کے شوقین ہیں اور وہ عموماً سیزن کے پہلے روز ہی شکار پر جانا پسند کرتے ہیں۔ گو کہ ہیلر نے بھی اس روز چھٹی کی تھی لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ شکار پر نہیں گیا تھا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اس کا جواب بھی مل جائے گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ ہیلر کبھی اپنے ساتھ شکار لے کر گھر آیا؟"

"نہیں کیونکہ میں اپنے گھر کے اندر یا باہر مردہ جانور نہیں دیکھ سکتی۔"

"شاید تمہیں معلوم نہیں کہ انڈیانا میں جتنے بھی ہرن شکار کیے جاتے ہیں، ان کا چیک پوسٹ پر اندراج کیا جاتا ہے۔"

"میرے تو سر میں درد ہونے لگا ہے۔ نہ جانے تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔" وہ اپنا سر پکڑتے ہوئے بولی۔

"میں نے تمام چیک پوسٹوں سے رابطہ کیا ہے اور ان کے ریکارڈ کے مطابق ہیلر نے کبھی کسی ہرن کا شکار نہیں کیا۔"

"تم یہ سب باتیں مجھے کیوں بتا رہے ہو؟" مسز ہیلر جھلّاتے ہوئے بولی۔

"کیونکہ اس نے تم سے بھی جھوٹ بولا ہے۔" لیری نے اس کے چہرے پر سے نگاہیں ہٹائیں۔ دروازے کی چوکھٹ کے اوپر بنا ہوا ایک سوراخ اس کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ اس نے اس سوراخ کی طرف منہ کر کے بولنا شروع کیا۔ "مسز ہیلر! تمہارا شوہر کبھی شکار پر نہیں گیا۔ اس نے ہرن تو کیا، کسی دوسرے جانور کا شکار بھی نہیں کیا۔"

"کیا؟" مسز ہیلر بے یقینی کے انداز میں بولی۔

"تم یہ سب باتیں سن رہے ہو نا ہیلر۔" لیری نے کیمرے کی طرف براہِ راست مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "اگر تم کچھ بھول بھی گئے تو آج رات پولیس اسٹیشن میں یہ سب باتیں دوبارہ دُہرا دیں گے۔ ممکن ہے کہ ہم دونوں کو پھر ..... ایک ساتھ گشت پر جانا پڑے۔ دیکھتے ہیں کہ ایک دوسرے کی مدد کر کے ہم کیا نتیجہ حاصل کر سکتے ہیں۔"

☆☆☆

"میں سمجھتا ہوں کہ بعض اوقات اعداد و شمار بھی ساتھ نہیں دیتے اور ان سے کچھ ثابت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔" لیری نے کیرول کے دفتر میں اس کے سامنے والی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اب کیا ہوا؟" کیرول نے بیزاری سے کہا۔

"ہیلر کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ ہر تین ہفتے بعد پیر والے دن ڈیوٹی سے غائب ہو جاتا ہے اور اپنی شفٹ میں سے کسی ایک کو اپنی جگہ کام پر بھیج دیتا ہے۔ یہ سلسلہ گزشتہ ڈھائی سال سے جاری ہے۔ اس بار اتفاق یہ ہوا کہ پیر کے دن سے ہی ہرن کے شکار کا سیزن شروع ہوا۔ اس لیے زیادہ تر لوگ پہلے روز ہی شکار پر چلے گئے اور ہیلر کو اپنے مقصد کے لیے کوئی شخص نہ مل سکا۔ اس کے پاس کوئی چھٹی بھی نہیں تھی لہٰذا مجبور ہو کر اسے بیماری کا بہانہ بنانا پڑا۔"

www.paksociety.com

"کیا وہ خود شکار پر نہیں گیا تھا؟"

"یہ کہانی اس نے اپنی بیوی کے لیے گھڑی تھی جسے غالباً وہ مارتا بھی رہتا ہے لیکن ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں۔"

"کیا اس کی بیوی نے کوئی شکایت کی ہے؟"

"نہیں۔" لیری نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ "پہلے میرا خیال تھا کہ وہ پیر کا دن اپنی کسی ذاتی مصروفیت میں گزارتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس کا کسی دوسری عورت کے ساتھ کوئی افیئر چل رہا ہے لیکن بعد میں یہ تھیوری مجھے غلط نظر آئی۔ ملاقات کے لیے پیر کا دن ہی کیوں منتخب کیا گیا، وہ بھی ہر تین ہفتے بعد؟ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی عورت اتنا لمبا وقفہ برداشت نہیں کر سکتی۔ تم اس بارے میں کیا کہتی ہو؟"

کیرول کچھ نہ بولی۔ بس خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"تم بہت ذہین ہو۔ اپنی رائے کبھی نہیں دو گی۔ خیر، جانے دو۔ دوسری بات جو مجھے پریشان کر رہی تھی، وہ یہ کہ ہیلر کو کیسے معلوم ہوا کہ میں اس کے گھر گیا تھا۔ پہلے مجھے شک گزرا کہ شاید تمہارے دفتر کے کسی آدمی نے اسے بتا دیا ہو لیکن جب میں دوسری بار اس کے گھر گیا تو مجھے حقیقت معلوم ہو گئی۔ دراصل اس نے اپنے گھر کے دروازے پر ایک خفیہ کیمرا نصب کیا ہوا ہے۔"

"کس لیے؟"

"یہی سوال اہم ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہو گا کہ اس کی غیر موجودگی میں کون اس کے گھر آتا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ میں اس کی تلاش میں اس کے گھر تک چلا گیا اور اسے یہ بات معلوم ہو گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس مقصد کے تحت ہر تین ہفتے بعد پیر والے روز غائب ہو جاتا ہے اور اس نے اپنے گھر پر غیر معمولی حفاظت کا بندوبست کیوں کر رکھا ہے جو ایک عام سے علاقے میں واقع ہے؟"

اتنا کہہ کر لیری خاموش ہو گیا۔ شاید چاہ رہا تھا کہ کیرول بھی اس بارے میں کچھ قیاس آرائی کرے۔

کیرول نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا اور بولی۔ "پہیلیاں مت بجھواؤ۔ جو کہنا ہے جلدی کہہ ڈالو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"میں ہیلر کی مصروفیت جان گیا ہوں۔ وہ ہر تین ہفتے بعد پیر کے روز مال کی ڈیلیوری کے لیے جاتا ہے۔ کچھ علاقوں میں کوکین کی کاشت ہو رہی ہے۔ اس کے لیے زمین یا کھیت کی ضرورت نہیں بلکہ گھروں کے اندر ہی پانی میں یہ پودے اگائے جاتے ہیں۔ پولیس نے آج اس گودام پر چھاپا مارا ہے جہاں ان کی کاشت کی جاتی ہے۔ شام تک یہ خبر ٹی وی پر آ جائے گی۔ بیری ہیلر کا بھائی ان پودوں کی کاشت کرتا تھا جبکہ ہیلر اس کے مال کو گاہکوں تک پہنچاتا تھا۔ اس طرح اس غیر قانونی کاروبار کو پولیس کا تحفظ حاصل ہو گیا تھا۔"

لیری ایک لمحے کے لیے رکا پھر اس نے کہنا شروع کیا۔ "تمہیں اس پر حیرت نہیں ہوئی کہ اب ہم اس معاملے میں خود کفیل ہو گئے ہیں جبکہ پہلے یہ مال دوسرے ملکوں سے اسمگل ہو کر آتا تھا؟"

"میں اس سلسلے میں متعلقہ حکام کو خط لکھوں گی کہ اس غیر قانونی کاروبار کی کڑی نگرانی کی جائے۔"

"بہرحال، اب ہمیں مسز ہیلر کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسے اپنے شوہر کے تشدد سے نجات مل جائے گی کیونکہ بیری ہیلر کی بقیہ زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرے گی اور دوسرے لوگوں کو بھی اس واقعے سے سبق مل جائے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟" کیرول نے پوچھا۔

"مرد اور عورت میں یہی فرق ہوتا ہے۔ پوری کہانی سنا دی، اس کے بعد بھی پوچھ رہی ہو کہ مجھے ان باتوں کا علم کیسے ہوا؟ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ بہت سی باتوں کا ریکارڈ سے علم نہیں ہوتا، ان کی کھوج میں جانا پڑتا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"میری کوشش ہو گی کہ اپنے آفیسرز کو اچھا پولیس مین بننے میں مدد دوں لیکن اس سے مجھے بھی ایک سبق ملا ہے کہ آپ اسی شخص کو اچھا پولیس مین بنا سکتے ہیں جو پہلے ایک اچھا انسان بھی ہو۔"

"اس میں کوئی شک نہیں۔" کیرول نے اس کی تائید کی۔

لیری اپنی جگہ سے اٹھا اور کہنے لگا۔ "مجھے امید ہے کہ تم نے بھی اس واقعے سے سبق سیکھا ہو گا اور تم ایک اچھی انتظامی افسر بننے کی کوشش کرو گی کیونکہ تم نے کبھی بھی ان لوگوں کے خلاف ایکشن نہیں لیا جو اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر رہتے ہیں۔ مجھے ایک موقع دو تا کہ ان کا حاضری ریکارڈ دیکھ سکوں اور اس کے لیے تمہیں میری آمد کو برداشت کرنا پڑے گا۔"

اس کے جانے کے بعد کیرول سوچ میں پڑ گئی کہ کیا وہ واقعی ایسے انسان کو برداشت کر سکتی ہے؟

ہر شخص کتابوں اور رسالوں سے دوستی نہیں رکھتا... مگر یہ حقیقت ہے کہ علمی ماحول اس کے جمالیاتی احساس اور صلاحیتوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے... ایک لائبریری سے شروع ہونے والی لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی کہانی... جہاں کے پرسکون و پر آہنگ در و دیوار میں اچانک ہی خون کی بو پھیل گئی۔

انمول سے بے مول ٹھیکروں میں بدل جانے والے خواہشوں کے سوداگر

سیرینا راض

قیمتِ خواہش

"تم جاسوسی کہانیاں لکھتے ہو؟" پولیس افسر نے اس کی طرف دیکھا اور پھر خود ہی نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دینے لگا۔ "نہیں... تم کیسے یہ سب کچھ لکھ سکتے ہو؟" اس کا رویہ مشتعل کر دینے والا تھا۔

"یہ درست ہے۔ میں جاسوسی ناول نگار ہوں۔" لیوپڈ خود کو پُرسکون رکھتے ہوئے پولیس افسر کے ہر سوال کا جواب دیے جا رہا تھا مگر وہ اس کی ہر بات کی نفی کر رہا تھا۔ حسبِ عادت اس نے جب ایک بار پھر اس کی نفی کی تو اُسے بھی طیش آ گیا۔

www.paksociety.com

اس وقت وہ کالج لائبریری کے ٹاپ فلور پر بیٹھے تھے اور شیشے کی دیوار کے پار کا منظر لیوپڈ کو صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دوسری طرف درجن بھر سے زائد باوردی پولیس والے تن دہی سے تلاشی میں مصروف تھے۔ قالین، صوفے کے کور، کرسیوں کے کشن اور بک شیلف کی تفصیلی تلاشی لی جارہی تھی۔ بے شمار کتابیں زمین پر ڈھیر تھیں۔

سامنے کی طرف تین دروازے تھے۔ ایک دروازہ اس اسٹرانگ روم کا تھا جس کے اندر بیش قیمت مخطوطات محفوظ تھے۔ اس کے ایک طرف لائبریری ڈائریکٹر اور دوسری جانب کلیکشن یونٹ کی سربراہ پروفیسر ایڈرا روزیٹی کے دفتر کا دروازہ تھا۔ یہ دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کے اندر کئی پولیس والے موجود تھے۔ پروفیسر روزیٹی کی لاش وہیں پائی گئی تھی۔

"مسٹر لیوپڈ۔" لیفٹیننٹ اسٹین بوک نے ایک بار پھر اس کا نام پکارا۔ "مجھے امید ہے کہ تم ان مصنفین میں سے نہیں ہوگے جو جرم کے حل کے لیے پولیس کی مدد سے گریز کرتے ہیں؟" لیفٹیننٹ اسٹین نے سرد لہجے میں کہا۔

"میں نے جرم اور سراغ رسانی کے موضوعات پر صرف من گھڑت کہانیاں لکھی ہیں۔ حقیقی زندگی میں کبھی کسی جرم کا سراغ نہیں لگایا۔"

"بہت خوب!" یہ کہتے ہوئے اسٹین نے اپنی نوٹ بک کھولی۔ "میرا صرف ایک سوال نہیں ہے، امید ہے آپ سب سوالوں کے جوابات دیں گے اور بالکل بُرا نہیں منائیں گے۔"

"معاف کیجیے، وہاں کارنر پر میرے درجنوں ناول ڈیسک پر رکھے ہوئے تھے۔" لیوپڈ نے انگلی سے شیشے کے پار والے حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مگر اب وہ نظر نہیں آرہے ہیں۔ کس نے اٹھائی ہیں وہ کتابیں؟" اس کے لہجے سے تشویش صاف ظاہر تھی۔

یہ سنتے ہی اسٹین اٹھا اور آگے بڑھ کر اس طرف دیکھنے لگا جس طرف لیوپڈ نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اسٹین کھڑا کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے۔ وہ پلٹا اور لیوپڈ سے مخاطب ہوا۔ "اس ڈیسک پر کیا رکھا تھا؟"

"بارہ مجلد ناول... میرے لکھے ہوئے ناولوں کی ایک ایک جلد، وہ پہلے ایڈیشن کے۔" اس نے الفاظ چبا چبا کر جواب دیا۔

یہ سن کر اسٹین کچھ کہے بنا دروازے سے دوسری طرف نکل گیا اور وہاں تلاشی لینے والے ایک پولیس والے سے بات کرنے لگا۔

لیوپڈ کی نظریں اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔ "لگتا ہے کہ یہ پوری رات یہیں پر ضائع کرنے والے ہیں۔" وہ بڑبڑایا۔

کچھ دیر بعد اسٹین واپس پلٹا اور لیوپڈ کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "کتابیں تلاش کی جارہی ہیں۔ کہیں نہیں جائیں گی، یہیں ہوں گی۔ ابھی مل جاتی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا، ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی اور نوٹ بک کھول کر گھٹنوں پر رکھی۔ "تو اب کچھ سوال و جواب کرلیں؟" اس نے استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"واقعی...؟" اس کے لہجے اور آنکھوں میں حیرانی تھی۔

"کیا مطلب...؟" اسٹین نے سوالیہ نظروں سے اسے گھورا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں جاسوسی ناول نگار ہوں اور جو بات تم نے کہی، کہانی میں یہ موڑ درمیان میں آتا ہے اور تم ابھی سے سوال و جواب..." لیوپڈ نے مسکراتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

یہ سن کر اسٹین سٹپٹا گیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر فوراً ہی بند کرلیا۔ شاید وہ لیوپڈ جیسے بڑے ادیب کی بات کا جواب دینے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کررہا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔" لیوپڈ اس کی شرمندگی کو بھانپ گیا۔ "ٹھیک ہے، ہم شروع کرتے ہیں۔ تو سب سے پہلے تم میرے بارے میں جاننا چاہو گے اور ساتھ یہ بھی کہ اس لائبریری میں میرا کیا کام ہے۔"

اسٹین نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"تو بات یہ ہے کہ آج سے دو سال پہلے مجھے کالون فیلڈ کا ایک خط ملا..."

"لائبریرین؟" اسٹین نے قطع کلامی کی۔ اس نے مستعدی سے نوٹ بک تھام رکھی تھی۔

"نہیں..." لیوپڈ نے فوراً نفی میں سر ہلایا اور کہنے لگا۔ "کالون فیلڈ، ڈائریکٹر کالج لائبریری۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور لمحہ بھر کے لیے اسٹین کی طرف دیکھا۔ "سمجھ گئے؟"

"جی ہاں، آگے بتائیے۔"

"ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ دو سال پہلے میرے ایک ناول کو ایوارڈ ملا تھا جس پر کالون فیلڈ نے مجھے مبارک باد کا خط لکھا۔" لیوپڈ نے کہنا شروع کیا۔ "میں اس کالج کا سابق طالب علم بھی ہوں۔ اس نے کالج میں میرے پرستاروں کی جانب سے مبارک باد کا یہ خط لکھا تھا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان کئی ای میلز کا تبادلہ ہوا اور پھر اس نے مجھے یہاں

آنے کی دعوت دی۔ وہ میرے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور میرے مستقبل کا منصوبہ اپنی بیش قیمت کتابوں اور دستاویز کو محفوظ ہاتھوں میں دینا تھا۔"

☆☆☆

"کیا مطلب تمہارا کہ میں بنا شوز کے ہوں۔" لیوپڈ نے نظریں گھماتے ہوئے کہا اور کارپٹ پر دونوں پاؤں آگے بڑھائے اور نظر بھر کر دیکھا۔ "میں نے تو شوز پہنے ہوئے ہیں۔" اس کے لہجے سے ناراضی جھلک رہی تھی۔ اس وقت وہ کالون فیلڈ سے فون پر بات کررہا تھا۔

"شوز نہیں، ایشوز۔ میں نے کہا تھا تمہارے تو کوئی مسائل بھی نہیں ہیں تو پھر یہاں آنے میں کیا قباحت ہے۔" اس نے وضاحت کی۔

"معاف کرنا، ان دنوں مجھے کئی مسائل کا سامنا ہے۔" اس کی آواز اونچی مگر شائستہ تھی۔

"ویسے یہ بات مجھے حیران کن لگی۔" کالون نے کہنا شروع کیا۔ "تمہارے تو بچے بھی نہیں ہیں پھر بھی اپنی کتابوں اور دستاویزات کو گھر سے نکالنا چاہتے ہو؟"

"غلط... میں چاہتا ہوں کہ یہ ایسی جگہ رکھی جائیں، جہاں مستقبل کے محققین اس تک بہ آسانی رسائی حاصل کرسکیں۔"

"یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔" کالون نے کہا۔ "تم یہاں آؤ، کچھ دستاویزات، کتابیں وغیرہ بھی لیتے آؤ۔ جیسا انتظام تم چاہتے ہو، وہ یہاں ہوجائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے لیوپڈ سے جلد پہنچنے کی درخواست کی اور مزید دو چار باتیں کرکے فون بند کردیا۔

کالون کافی عرصے سے اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ وہ کالج کا دورہ کرنے کے لیے آئے۔ اس نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ اور ہوٹل کے اخراجات ادا کرنے کی بھی یقین دہانی کرائی تھی۔ وہ کالون کی پیشکش پر کب کا وہاں پہنچ چکا ہوتا لیکن اس کی بیوی کورا کا کہنا تھا کہ جانے سے پہلے وہ اپنی تمام بیش قیمت کتابوں اور دستاویزات کو محفوظ بنانے کا انتظام کرے۔ ہوسکے تو کالج انتظامیہ کی اجازت سے ان کی لائبریری میں ہی رکھوا دے۔ یہ اور بات ہے کہ لیوپڈ یہ بات کالون سے کہتے ہوئے کترا رہا تھا۔

کورا نفاست پسند خاتون تھی۔ اسے گھر میں کاغذوں اور کتابوں کا انبار پسند نہیں تھا، چاہے وہ شوہر کی اسٹڈی میں ہی کیوں نہ ہوں۔ ایک طرف وہ ان سے پیچھا چھڑانا چاہ رہی تھی تو دوسری طرف شوہر کو یہ باور کروا رہی تھی کہ گھر کے بجائے قلمی مسودے اور دیگر دستاویزات و کتابیں لائبریری جیسی جگہ پر ہی محفوظ رہ سکتے ہیں۔ وہ دلیل دیتی تھی کہ یہ چیزیں موت کے بعد اسے زندہ رکھنے والے محققین کے لیے آکسیجن کا کام دیں گی۔ لیوپڈ بھی اب اس سے اتفاق کرنے لگا تھا۔ اس نے کالون کے اصرار پر یہ بات اسے بھی بتادی۔ کالون نے اسے فوراً یقین دہانی تو نہیں کروائی تاہم وہ سمجھ گیا کہ اگر اس کے آنے میں صرف ایک یہی رکاوٹ ہے تو وہ اسے چٹکی بجاتے حل کرسکتا ہے۔

☆☆☆

"تو تم یہاں اپنی دستاویزات اور کتابیں رکھوانے کے لیے آئے ہو؟" لیفٹیننٹ اسٹین نے پوری بات سن کر کہا۔ اس کا انداز سوالیہ تھا۔

"خیر، تمام دستاویزات تو شاید میری موت کے بعد ہی یہاں پہنچ پائیں گی۔" لیوپڈ نے گہری سانس لی۔ "فی الحال تو مجھے انتظامیہ نے دعوت دی تھی کہ یہاں آکر رسمی معاہدے پر دستخط کرنے کے علاوہ ایک لیکچر دوں۔ انہوں نے میرے لکھے درجن بھر ناولز خرید کر یہاں ایک کارنر بھی بنادیا ہے میرے اعزاز میں۔ ویسے میں کچھ کتابیں لایا ہوں جسے میں نے کالون کے حوالے کردیا ہے۔"

"مسٹر کالون نے تمہیں آگاہ کیا تھا کہ تمہاری دستاویزات یہاں کس کی نگرانی میں ہوں گی؟" اسٹین نے سوال کیا۔

"فی الحال نہیں، میں آج صبح ہی کیمپس پہنچا ہوں۔" لیوپڈ نے کہا۔

"تو تم یہ بات نہیں جانتے تھے کہ تمہاری ناپسندیدہ شخصیت ہی تمہاری علمی اور ادبی دستاویزات کی نگراں ہوگی؟" اسٹین نے استفساریہ لہجے میں کہا۔

"معاف کیجیے گا۔" یہ سنتے ہی لیوپڈ نے فوراً کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ ڈاکٹر روزیٹی میری دشمن تھیں۔" وہ سوچ رہا تھا کہ یہ افسر تو نہایت چالاک ہے۔ اتنی جلدی اس نے یہ بھی پتا چلالیا کہ میں روزیٹی کو کتنا سخت ناپسند کرتا تھا۔

"تم ان کے بارے میں کیا کہنا چاہو گے؟" اسٹین نے سوال کیا۔

"ایک سابق پروفیسر... تخلیقی تحریروں میں یقیناً اس نے بہت سوں کو دلبرداشتہ کیا... خیر چھوڑو اس بات کو۔" یہ کہہ کر اس نے پولیس افسر کو چند لمحے تک غور سے دیکھا۔ "یہ بتاؤ، اسے کس طرح قتل کیا گیا ہے؟"

"اس کے حلق میں پیپر کٹر گھونپا گیا ہے۔" اسٹین نے

www.paksociety.com

کہا۔ ”تم یہ بتاؤ کہ یہاں تمہاری دستاویزات اگر اس کی نگرانی میں رہتیں تو تم کیسا محسوس کرتے؟“

”حیران کن۔“ لیوپڈ نے لمحہ بھر کی تاخیر کے بنا کہا۔ ”میں نے لگ بھگ تیس برس پہلے یہاں سے گریجویشن کیا اور بہت جلد وہ مقام حاصل کرلیا جو میرے ہم عصر پروفیسرز نے اب جا کر پایا ہے۔ کم از کم فلوریڈا کی حد تک تو ایسا ہی ہے۔ ڈاکٹر روزیٹی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا... افسوس کہ وہ پروفیسر سے کیوریٹر بن گئی۔“

☆☆☆

”ڈاکٹر روزیٹی کا کہنا تھا کہ ان کے لیے یہاں کی برف باری مناسب ہوگی۔“ کالون فیلڈ نے وضاحت کی۔ لیوپڈ اور کورا کچھ دیر پہلے ہی کیمپس کا چکر لگا کر واپس پہنچے تھے اور اب ڈائریکٹر کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ کورا نے بہت زیادہ سردی کی شکایت کی تو وہ کہنے لگا۔

لیوپڈ بظاہر یہ سب کچھ سن رہا تھا مگر وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ ”مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی ہے کہ وہ یہاں کام کرتی ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں وہ لائبریرین تو نہیں۔“ اس نے کالون کو مخاطب کر کے کہا۔

”نہیں نہیں...“ یہ سنتے ہی کالون نے کہا۔ ”دراصل مسز روزیٹی نے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ کی ہے اور نادر کتب جمع کرنا ان کا مشغلہ رہا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ نادر کتب جمع کرنے میں صرف کیا ہے۔“

”جانتا ہوں۔“ لیوپڈ نے ہنکارا بھر کر کہا۔

”اور پھر سب کی سب لائبریری کو عطیہ کردی ہیں۔“ کورا نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

”بالکل۔“ کالون نے فوراً جواب دیا۔ ”مگر سب کی سب نہیں، ان میں سے کچھ کتابیں۔“

لیوپڈ سوچ رہا تھا کہ اگر روزیٹی کو اس کے نادر مخطوطات و دستاویزات کا نگراں ہونا ہے تو انہیں ان کے پاس رکھوائے یا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ روزیٹی قدیم مخطوطات اور نادر کتب کی لالچی ہے۔ کہیں اگر اُس نے اس کی دستاویزات پر بھی ہاتھ صاف کردیا تو؟ یہ تو وہ جان چکا تھا کہ اس کا یہ شوق اب بھی برقرار ہے اور اس کے پاس بڑی تعداد میں ایسی کتابیں موجود ہیں جو نادر و نایاب ہیں۔

”ہیلو مسٹر لیوپڈ...“ اسی دوران میں ایک نوجوان عورت اندر داخل ہوئی اور پُرجوش انداز میں اسے مخاطب کیا۔ ”آخر آج آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو ہی گیا۔ کافی عرصے پہلے میں نے مسٹری کنونشن میں آپ کو خطاب کرتے سنا تھا۔“ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اچانک ملاقات کے باعث خاصی خوش ہے۔ ”میں ڈیانا ہوں اور یہاں انگریزی ادب کے شعبے میں مسٹری پڑھاتی ہوں۔“ اس نے لیوپڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر تعارف کرایا۔

”مسٹر کالون نے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔“ لیوپڈ نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

ڈیانا ہاتھ ملا کر ذرا کھسک کر ایک طرف ہوئی تو لیوپڈ کی نظر اس پر پڑی۔ وہاں ایک اور شخص کھڑا تھا۔ ڈیانا کے ہٹتے ہی وہ آگے بڑھا اور مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”رچرڈٹون...“

”یہ ہمارے ڈپارٹمنٹ کے سربراہ ہیں۔“ ڈیانا نے لقمہ دیا۔

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ لیوپڈ نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

لیوپڈ ان دونوں سے رسمی گفتگو کررہا تھا۔ اس دوران میں کالون کسی کا فون سننے میں مصروف تھا۔ کورا خاموش کھڑی رسمی انداز میں مسکرا رہی تھی۔

”معاف کیجیے گا۔“ فون رکھتے ہی کالون نے نام لیے بغیر کمرے میں موجود لوگوں کو مخاطب کیا۔ ”ہمارے کالج کے محترم صدر صاحب کچھ دیگر مہمانوں کو کلیکشن یونٹ دکھانے کے لیے لارہے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ ان کی آمد پر ہم سب ان کا استقبال لابی میں کریں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلا تاکہ مہمانوں کا استقبال کرسکے۔ باقی چاروں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ اسی دوران میں ایک اسسٹنٹ بھی آگے بڑھا اور ڈائریکٹر کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ انگریزی ڈپارٹمنٹ کے دونوں پروفیسر بھی دھیمی آواز میں باتیں کرتے ہوئے چل رہے تھے۔

”تمہارے خیال میں یہ دورہ اتفاقی ہے؟“ پروفیسر رچرڈ کی بات سنتے ہی لیوپڈ نے اپنے کان ان کی گفتگو پر لگادیے۔

”نہیں۔“ ڈیانا نے مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ ڈیانا کے ساتھ چلتی ہوئی کورا نے یہ سنتے ہی چونک کر پوچھا۔

”بات یہ ہے مسز کورا لیوپڈ...“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”ہمارے صدر صاحب کی یہ عادت ہے کہ جب بھی کوئی بڑی شخصیت ہمارے درمیان موجود ہو، وہ کسی نہ کسی ایسے شخص کو ضرور دورے پر مدعو کرلیتے ہیں جسے وہ مرعوب کر کے چندہ حاصل کرسکیں۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ”بس، اس بار

تھوڑی سی تبدیلی ہوئی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”جو دو مہمان آرہے ہیں، انہیں چند گھنٹوں پہلے ہی صدر صاحب کی سفارش پر اعزازی ڈگری عطا کی گئی ہے۔“

”ارے سنو! کیا لائبریری کا انتظام روزیٹی چلاتی ہے؟“ کورا نے استفساریہ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں، اس کی ایسی کوئی خواہش نہیں...“ رچرڈ نے سر ہلایا۔ ”اسے صرف کلیکشن یونٹ سے غرض ہے جسے وہ اپنی جاگیر سمجھتی ہے۔“

”اوہ... تو صدر یونٹ کے نام پر چندے جمع کرتا ہے۔“ کورا نے آہستہ سے کہا۔

”وہ کسی بھی نام پر چندہ مانگ سکتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ”روزیٹی بھی میری باس تھی۔ میری شادی کی پچاسویں سالگرہ آنے والی تھی جس کے لیے میں نے کچھ پیسے جمع کیے لیکن پھر سالگرہ مؤخر کی اور ان پیسوں سے پرانی شیمپین کی ایک بوتل خریدی۔ جس دن میرے ڈپارٹمنٹ سے روزیٹی ریٹائر ہوئی، اس دن میں نے بوتل کا کارک کھولا تھا۔“

”تمہاری بیوی اس حرکت پر لڑی نہیں؟“ کورا نے مسکرا کر پوچھا۔

”ارے نہیں...“ رچرڈ نے پھر قہقہہ لگایا۔ ”یہ تو اس کا ہی آئیڈیا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ جس دن روزیٹی ریٹائر ہوئی، اس کے بعد ہماری شادی کی کئی اور سالگرہیں خود بخود بڑھ جائیں گی۔ وہ بھی اس سے سخت نالاں تھی۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ جب وہ میرے ڈپارٹمنٹ کی سربراہ تھی تو کس طرح بات بے بات مجھے پریشان کرتی تھی... کٹ کھنی بڑھیا۔“

وہ فرسٹ فلور پر لفٹ کے باہر کھڑے مہمانوں کی آمد کے منتظر تھے۔ اس وقت کالون زیادہ تر اپنے اسسٹنٹ سے ڈنر کی تیاریوں کے بارے میں بات کرتا رہا۔ کالون کی باتیں سن سن کر لیوپڈ سخت حیران تھا کہ ایک لائبریرین کس طرح رسمی اور پُرتکلف ڈنر کے انتظامات کے لیے موزوں شخص ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

”تو اس طرح تمہاری کالون فیلڈ کے علاوہ دوسرے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔“ اسٹین نے میز کو انگلی سے بجاتے ہوئے کہا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ وہ ہر سوال انگلی سے میز بجا کر کرتا تھا۔

”بالکل درست کہا تم نے۔“ لیوپڈ نے جواب دیا۔ ”مہمان آئے اور پھر ہم کلیکشن یونٹ گئے۔ کالج کے صدر وارن کے ساتھ مسٹر گرے جانسن اور مسز ویلما پریز بھی موجود تھیں۔ یہ دونوں وہاں تقریر کرنے نہیں بلکہ اعزازی ڈگری وصول کرنے کی سادہ سی تقریب میں شرکت کے بعد یہاں پہنچے تھے۔“

”انہیں کس مضمون میں ڈگری دی جارہی تھی؟“ اسٹین نے سوال کیا۔

”اعزازی ڈگری علم کی بنیاد پر نہیں بلکہ کسی اچیومنٹ پر دی جاتی ہے۔“ لیوپڈ نے وضاحت کی۔

”تو اُن دونوں نے کون سا ایسا کارنامہ انجام دیا تھا کہ جس کے اعتراف میں اعزازی ڈگری پیش کی جارہی تھی؟“

”جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، وہ ہے پیسا۔“ لیوپڈ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ یہ سن کر اسٹین اس کا منہ تکنے لگا۔

☆☆☆

مسز ویلما پریز کی عمر ساٹھ سال کے قریب ہوگی۔ اس کے سر کے سارے بال سفید تھے۔ بظاہر وہ کنفیوز نظر آرہی تھی۔ لیوپڈ بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

رچرڈ نے لیوپڈ کو بتایا کہ مسز ویلما کی قابلیت یہ ہے کہ ان کا شوہر اپنی بیوہ کے لیے ترکے میں ایک پرائیویٹ اسکول اور ڈھیروں نایاب کتابیں اور قلمی مخطوطات....... چھوڑ کر مرا تھا۔ مسٹر وارن کے لیے اس کا دولت مند، جبکہ روزیٹی کے نزدیک نایاب کتابوں کا مالک ہونا، اعزازی ڈگری دینے کے لیے سب سے بڑی قابلیت تھی۔

کالج کے صدر موصوف مسز ویلما کے آگے بچھے جارہے تھے۔ عمر کی پانچویں دہائی میں ناکام سیاست کے بعد کالج کا رخ کرنے والے وارن نے خوشامدانہ انداز میں اسے بتایا کہ کالج کے رسالے میں بھی اس بات کا اعلان کیا جاچکا ہے کہ انہیں اعزازی ڈگری دی جارہی ہے۔ ”میرے خیال میں آپ کو رسالہ مل تو گیا ہوگا؟“ اس نے یہ کہہ کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں ہاں... شاید۔“ مسز ویلما نے وارن کی بات سن کر ایسے جواب دیا جیسے بے یقینی کی حالت میں ہو۔ ”مل گیا ہے، مل جائے گا۔“

اعزازی ڈگری کے دوسرے کامیاب امیدوار گرے جانسن نے اسی کالج سے تعلیم حاصل کی اور پھر بہت پیسا کمایا۔ جب اس نے کچھ عرصہ پہلے وارن سے ایک ملاقات میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ چاہتا ہے کہ جب تک زندہ ہے، کالج کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا رہے، تب انہوں نے فوراً ایک منصوبہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ گرے جانسن نے

www.paksociety.com

فوراً کالج کے لیے ایک نئے جم کی تعمیر پر ہامی بھرلی۔ وہ اب مکمل ہونے والا تھا۔ اعزازی ڈگری دینے کے بعد وارن ایک اور منصوبہ اس کے سامنے پیش کرنے والا تھا۔ ویسے بھی تو گرے جانسن کی یہی خواہش تھی کہ وہ جب تک زندہ ہے کالج کے لیے کچھ نہ کچھ...

''بات سمجھ گئے نا؟'' یہ سب کچھ بتا کر رچرڈ نے لیوپڈ کو معنی خیز انداز میں آنکھ مارتے ہوئے کہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا، تب ہی فوراً مسکرادیا۔

''مگر یہ جم ہی کیوں بنوایا آپ نے؟'' کورا نے باتوں باتوں میں گرے جانسن سے آخر پوچھ ہی لیا۔ ''کچھ اور بھی تو...''

''نوجوان لائبریری سے زیادہ جم اور گراؤنڈ میں فٹ بال کو لاتیں مارنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔'' گرے جانسن نے کورا کی قطع کلامی کی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نوجوانی کے ایام میں نے یہیں گزارے ہیں۔ نوجوانوں کے جذبات کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اب سمجھ گئیں کہ جم کیوں بنوایا ہے؟'' اس نے یہ کہہ کر قہقہہ لگایا۔ ''شکر ہے خدا کا، میں کبھی کتابی کیڑا نہیں رہا۔ جوانی اور کتابیں... اوہ...... گاڈ..... پریشان کرنے کے لیے نصابی کتابیں کم ہوتی ہیں جو اوپر سے لائبریری جاؤ۔''

''تو پھر دولت کیسے کمائی؟'' کورا نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

''اس کے کئی طریقے ہیں۔'' گرے مسکرایا۔ ''فنانسنگ، جوا، تجارت، خرید وفروخت... ان سب کاموں سے پیسا کمایا... اور اس کمائی کے لیے لائبریری میں جاکر ریسرچ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے کورا کو غور سے دیکھنے کے بعد کہنے لگا۔ ''مجھے فلوریڈا کے، سال کے تین بہترین بزنس مین میں سے ایک منتخب کیا گیا ہے۔''

کورا سمجھ گئی کہ گرے جانسن کیا باور کروانا چاہتا ہے۔ اب لیوپڈ کو بھی ساری بات بہت اچھی طرح سمجھ آچکی تھی۔

☆☆☆

''تو جب تم لوگ کلیکشن یونٹ میں تھے، تب مسز روز یٹی بھی وہیں تھیں؟''

''بالکل ٹھیک کہا۔'' لیوپڈ نے سر ہلا کر اسٹین کی تائید کی۔

''ان کا رویّہ کیسا تھا؟''

''وہ زیادہ تر وقت مسز ویٹما کے ساتھ باتیں کرتی رہیں۔'' لیوپڈ نے کہنا شروع کیا۔ ''یہ باتیں کلیکشن یونٹ کے بجائے زیادہ تر ان نادر کتابوں کے بارے میں تھیں جنھیں اس کا شوہر جمع کرتے کرتے مرگیا تھا۔''

''کلیکشن یونٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اسٹین نے سوال کیا۔

''بہت اچھا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔ ''بڑی نایاب کتابیں ہیں یونٹ میں۔ زیادہ تر امریکی ادب کے اوائلی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ میرے خیال میں تو وہ نہایت بیش قیمت اور نایاب کتابیں ہیں۔''

''تو جو کچھ آپ وہاں رکھوانے آئے تھے، یونٹ دیکھنے کے بعد آپ کا ان کتابوں یا دستاویزات کے بارے میں کیا تاثر تھا؟'' اسٹین نے ایک بار پھر میز کو انگلی سے بجاتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں...'' لیوپڈ نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان قیمتی دستاویزات اور کتب کے درمیان میرے اثاثے کی شاید بہت زیادہ تاریخی اہمیت نہیں ہوگی۔''

☆☆☆

لیوپڈ اور کورا صبح سویرے ہی کالج پہنچے تھے۔ سارا دن وہ بہت مصروف رہے اور شام کو جب وہ کلیکشن یونٹ میں ادبی گفتگو کررہے تھے تو اس دوران میں کئی بار روز یٹی کا بھی... تذکرہ ہوا۔ وہ خود بھی ڈاکٹر روز یٹی کا شاگرد رہ چکا تھا۔ وہ روز یٹی کی تدریس کے ابتدائی سال تھے۔ لیوپڈ کی اس کی ذات سے تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ ایک بار اس نے تخلیقی تحریر کے مضمون میں اسے ڈی گریڈ دیا تھا۔ یہ بات دونوں کو یاد تھی اور وہاں موجود کئی دوسرے لوگ بھی یہ بات جانتے تھے۔

''کتنا عجیب اتفاق ہے کہ جس مضمون میں تمہیں ڈی گریڈ ملا تھا، آج تم اسی مضمون کے ماہر ہو۔'' رچرڈ نے بات چھیڑی۔ روز یٹی بھی سن رہی تھی۔ ''آج تو تم اپنے استادوں سے بھی آگے نکل گئے ہو۔'' اس نے لیوپڈ کی طرف دیکھتے ہوئے ستائشی انداز میں کہا۔

''ضروری نہیں ہے کہ شاگرد استاد سے پیچھے ہی رہے۔'' روز یٹی نے مداخلت کی۔ ''ہر انسان محنت کرتا ہے اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔'' وہ رچرڈ سے مخاطب تھی۔ لیوپڈ غور سے روز یٹی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

آج بھی اس کے بال ویسے ہی بکھرے تھے جیسے لیوپڈ کے زمانہ طالب علمی میں رہتے تھے۔ اب بھی وہ ویسی ہی

نحیف ونزار تھی۔ بس ایک تبدیلی آئی تھی۔ اس کے سنہری بال سفید ہوچکے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ گزرے ماہ وسال نے پروفیسر ڈاکٹر روز یٹی کی شخصیت پر کچھ اثر نہیں ڈالا تھا۔ اب بھی اس کے بال آئن اسٹائن کی طرح، لباس نہایت بے ترتیب، بے ڈھنگا اور بالکل قدیم یونانی فلسفیوں کی طرح تھا۔ رہا لہجہ تو وہ بالکل میکسیکو کی تیکھی ہری مرچ جیسا تھا۔ اگرچہ اس وقت بظاہر وہ لیوپڈ کی طرف داری کررہی تھی مگر وہ جانتا تھا کہ اس کے الفاظ صرف نمائشی ہیں۔ وہ اب تک یہ بات یاد رکھے ہوئے تھا کہ اس نے ہمیشہ دل شکنی ہی کی تھی۔ کبھی ڈی گریڈ دے کر تو کبھی اس کے آئیڈیے کو مسترد کرکے۔

''میرا تو خیال ہے کہ ہم کالج میں لیوپڈ شینکس اسٹڈی سینٹر قائم کریں۔'' دورانِ گفتگو ڈیانا نے پرجوش انداز میں تجویز پیش کی۔ اس وقت روز یٹی، گرے جانسن سے بات کررہی تھی۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔'' رچرڈ نے فوراً تائید کی۔

اس سے پہلے کہ اس موضوع پر بات آگے بڑھتی، کمرے میں روز یٹی کی پاٹ دار آواز گونجی۔ ''پلیز توجہ کیجیے...'' یہ سنتے ہی سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''ڈنر کا وقت ہوچکا ہے۔ اب ہم ڈنر کے لیے ہال کی طرف جائیں گے۔ مہمانوں کے لیے ہال میں جبکہ کالج ٹرسٹیز کے لیے علیحدہ انتظام کیا گیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کالون کی طرف مڑی۔ ''پلیز... مہمانوں کو ہال میں لے کر جائیے۔''

یہ سنتے ہی کالون فیلڈ تیزی سے آگے بڑھا۔ کچھ دیر بعد ہم سب ڈنر کے لیے ریڈنگ ہال جانے کے لیے باہر نکل رہے تھے۔

''لائبریری میں ڈنر...'' چلتے چلتے کورا نے آہستہ سے کہا۔

''نیا اور شاندار تجربہ رہے گا۔'' لیوپڈ نے مسکرا کر فوراً جواب دیا۔

☆☆☆

''تو آپ سب لوگ کالون کی معیت میں کلیکشن یونٹ سے بڑے کمرے کی طرف ڈنر کے لیے چلے؟'' اسٹین نے سوال کیا۔

''کمرے کی طرف نہیں۔'' لیوپڈ نے تصحیح کی۔ ''وہ لائبریری کا مرکزی ہال تھا جس کی چھت فرش سے لگ بھگ بائیس فٹ اونچی تھی اور وہاں مطالعے کی میزوں پر سفید چادریں بچھا کر انہیں عارضی ڈائننگ ٹیبل بنایا گیا تھا۔''

''تو آپ سب لوگ اکٹھے کلیکشن یونٹ سے نکلے تھے؟'' اسٹین نے پھر میز کو انگلی سے بجاتے ہوئے کہا۔

''تقریباً ہم سب گروپ کی صورت، آگے پیچھے ہی باہر نکلے تھے۔''

''کوئی وہاں رہ تو نہیں گیا تھا؟'' اسٹین نے سوال کیا۔ ''ذرا ذہن پر زور ڈال کر سوچیں۔''

''اچھی طرح یاد ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہی کلیکشن یونٹ سے باہر نکلے تھے۔'' لیوپڈ نے کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا۔

''آپ کو کچھ یاد ہے، سب سے آخر میں کون باہر نکلا تھا؟'' اسٹین نے ایک بار پھر نیا سوال کردیا۔

''میرا خیال ہے کہ سب سے آخر میں پروفیسر روز یٹی باہر آئی تھیں۔''

''تو آپ کلیکشن یونٹ سے نکل کر سیدھے ڈائننگ ہال میں پہنچے تھے؟''

''نہیں۔'' لیوپڈ نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''ہال میں پہنچنے سے پہلے کالج کے صدر وارن ہمیں لابی میں لے کر ٹھہر گئے اور دیوار پر لگی پینٹنگز، فارغ التحصیل گریجویٹس کی تصاویر وغیرہ دکھاتے رہے۔ اس دوران میں وہ بڑی تفصیل سے یہ بھی بتاتے رہے کہ ان کی صدارت کے دوران کالج نے کتنی زیادہ ترقی کی ہے۔''

''تو کلیکشن یونٹ سے نکلنے کے بعد آپ اس ہال میں کتنی دیر بعد پہنچے، جہاں کھانے کا اہتمام تھا؟'' اسٹین نے اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھنے کے بعد سوال کیا۔

''تقریباً بیس منٹ کے بعد۔'' لیوپڈ نے جواب دیا۔ ''ویسے وارن ہے بڑا چرب زبان۔ اس کی گفتگو نے احساس ہی نہ ہونے دیا کہ ہم نے بیس منٹ لابی میں گزار دیے تھے۔''

☆☆☆

''تم بڑھاپے میں بہت بگڑ رہے ہو؟'' کھانے سے پہلے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کورا نے لیوپڈ کو سرزنش کی۔ ''میں دیکھ رہی تھی کہ تم ڈیانا کو کس پینٹنگ کے بارے میں نہایت تفصیل سے سمجھانے کی کوشش کررہے تھے۔''

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔'' لیوپڈ یہ سن کر جھینپ گیا مگر اس سے پہلے کہ کچھ کہتا، اس کی نظر سامنے پڑی۔ پروفیسر روز یٹی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ان کی طرف آرہی تھی۔

''سنو... تم میں سے کسی نے میری چابیاں دیکھی

ہیں؟'' اس نے بنا کسی کا نام لیے کہا۔ ''میں نے کلیکشن یونٹ کا تالا لگا کر چابیاں پتلون کی جیب میں ڈالی تھیں مگر اب وہ نہیں مل رہی ہیں۔ نہ جانے کہاں گر گئی ہیں۔'' وہ خاصی پریشان نظر آرہی تھی۔

''پروفیسر...'' لیوپڈ نے اسے پکارا۔ ''تم نے چابیاں کوٹ کی جیب میں ڈالی تھیں، پتلون میں نہیں۔''

''ہرگز نہیں۔'' یہ سنتے ہی اس نے جواب دیا۔ ''چابیاں پتلون کی ہی جیب میں ڈالی تھیں۔''

''بہتر ہے کہ کوٹ کی جیبیں چیک کرلیجیے۔'' لیوپڈ نے مشورہ دیا۔

''سٹھیا گئی ہے۔'' کچھ دیر بعد جب روزیٹی واپس جارہی تھی، تب کورا نے کہا۔ ''کیا یہ شروع سے ہی ایسی ہے یا پھر عمر کا تقاضا ہے؟''

''نہیں... یہ ہمیشہ سے ہی ایسی بھلکڑ اور اپنی بات پر ڈٹ جانے والی عورت ہے اور شاید مرتے دم تک رہے گی۔'' لیوپڈ یہ کہہ کر مسکرایا۔

''ارے چھوڑو اسے۔'' کورا نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''ہاں تو اس سے پہلے ہم کیا بات کررہے تھے؟''

''لینڈ اسکیپ کی۔''

''ارے ہاں... بہت خوبصورت انداز میں پینٹ کیا گیا ہے۔'' کورا نے کہا تو لیوپڈ دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی بھی صدا کی بھلکڑ ہے، ورنہ تو وہ بات کررہی تھی ڈیانا کی۔ اگر روزیٹی بیچ میں نہ آتی تو اب تک اس کا ہی قصہ چل رہا ہوتا اور وہ مسلسل اس پر طنز کے تیر برسا رہی ہوتی۔

☆☆☆

''تو اسے کوٹ کی جیب سے چابیاں مل گئیں؟'' اسٹین نے سوال کیا۔

''میرے خیال میں تو مل ہی گئی ہوں گی اسی لیے پھر روزیٹی پلٹ کر دوبارہ نہیں آئی۔''

''اس کے بعد کیا ہوا؟'' اسٹین نے سوال کیا۔

''ایک ویٹر نے لابی میں آکر کہا کہ کھانا لگ چکا ہے اور ہم سب اپنے اپنے گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ہال کے اندر چلے آئے۔''

''کھانے پر وہ سب لوگ موجود تھے جو کلیکشن یونٹ میں بھی تھے؟'' اسٹین نے پوچھا۔

''تقریباً سب... سوائے مسٹر وارن کے۔ وہ دوسری طرف کالج کے ٹرسٹیز کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ ہاں، یاد آیا۔ چابیوں کی تلاش کے بعد روزیٹی بھی وہاں نہیں آئی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر پیشانی پر بل ڈال کر اسٹین کو گھورا۔ ''معاف کیجیے گا، کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ صرف ہمارے گروپ میں اتنی زیادہ دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟''

اسٹین نے اس کا سوال نظر انداز کردیا۔ ''یہ بتاؤ، ڈائننگ ٹیبل پر سب سے آخر میں کون پہنچا تھا؟''

''مسٹر گرے جانسن اور پروفیسر ڈیانا... وہ دونوں آرٹ پر گفتگو کرتے ہوئے اکٹھے پہنچے، کھانے کے دوران میں بھی اُن کی گفتگو جاری رہی تھی۔''

''کھانے کے دوران کوئی مہمان اٹھ کر ہال سے باہر گیا تھا؟''

''میرے خیال میں تو کوئی نہیں۔'' لیوپڈ نے فوراً کہا۔ ''کھانے کے فوراً بعد مسٹر وارن آئے اور انہوں نے مختصر سی تقریر کی۔ اس کے بعد کالون اٹھ کر گیا۔ شاید وہ روزیٹی کی طرف گیا ہوگا۔ ویسے یہ میرا ذاتی خیال ہے، وہ بھی اس لیے کہ میں نے مختصر سے وقت میں ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ خود کو ضرورت سے زیادہ روزیٹی کا فرماں بردار ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا۔''

☆☆☆

ڈنر کا اہتمام بہت قرینے سے کیا گیا۔ لیوپڈ کو خوشی تھی کہ کالج کا رکھ رکھاؤ اب تک برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کھانے کے اختتام پر مسٹر وارن آئے۔ ان کے لیے روسٹرم رکھ دیا گیا تھا۔ ان کا خطاب مختصر اور رسمی تھا۔ وہ مہمانوں کا تہِ دل سے شکریہ ادا کررہے تھے۔

''حیرت ہے کہ ڈائریکٹر ہونے کے باوجود پروفیسر روزیٹی نہ تو ہمارے ساتھ ڈنر میں شریک ہوئی اور نہ ہی وہ کالج کے صدر کا خطاب سننے کے لیے آئی۔'' مسٹر وارن کا خطاب جاری تھا، جب کورا نے لیوپڈ سے سرگوشی کی۔

''تم نے سنا نہیں تھا، وہ تو ہم سے پہلے ہی معذرت کرکے چلی گئی تھی۔''

''مگر یہ اچھی بات نہیں۔'' کورا نے پھر سرگوشی کی۔

''خاموش ہوجاؤ، وہ ایسی ہی ہے ہمیشہ سے۔ اب چھوڑو اس کی باتیں پھر کرلینا۔'' لیوپڈ نے تنبیہ کی اور پھر وہ بھی پوری توجہ سے خطاب سننے لگا۔

وارن نے اپنی تقریر ختم ہی کی تھی کہ ایک پولیس افسر ہال میں نمودار ہوا اور تیز تیز چلتا ہوا روسٹرم تک پہنچ گیا۔ یہ لیفٹیننٹ اسٹین بوک تھا۔ ''خواتین و حضرات! توجہ چاہتا

ہوں۔'' اس نے اونچی آواز میں مہمانوں کو مخاطب کیا۔ یہ سنتے ہی سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کچھ توقف کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ ''میرے پاس آپ کے لیے ایک بری خبر ہے۔'' اس کی بات سنتے ہی لیوپڈ اور کورا کا دل دھک کرکے رہ گیا۔

''خدا خیر کرے، نہ جانے یہ کیا کہنے والا ہے۔'' کورا نے شوہر سے سرگوشی میں کہا۔ اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی پوری توجہ اسٹین پر مرکوز تھی۔

اسٹین بوک نے مہمانوں سے جو کچھ کہا، اسے سن کر وہ سب دہل گئے..... کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔ روزیٹی کا قتل ہوچکا تھا۔ پولیس پہنچ چکی تھی اور یوں خوبصورت شام کا خونی اختتام ہورہا تھا۔

☆☆☆

اس سے پہلے کہ اسٹین کوئی اور سوال کرتا، دروازے پر نوجوان پولیس کانسٹیبل نمودار ہوا اور وہیں کھڑا ہوگیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ اٹھا اور اس کی طرف چل دیا۔ دونوں کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر اسٹین مسکراتا ہوا پلٹا۔ ''اچھی خبر ہے، آپ کی کتابیں مل گئی ہیں۔''

''کہاں تھیں وہ؟'' لیوپڈ نے تجسس سے سوال کیا۔

''پروفیسر روزیٹی نے اسے ٹرالی میں بھر کر کیٹلاگ کے لیے بھجوایا تھا۔'' اسٹین نے دوبارہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

لیوپڈ نے شیشے کے پار نظر ڈالی۔ جس ڈیسک پر شام کو اس کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں، اب وہاں دو چھوٹی ٹرالیاں کھڑی تھیں جس میں بھری ہوئی کتابیں نظر آرہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید موت سے پہلے یہ آخری کام ہوگا جو اس نے کیا تھا۔ ''شکریہ..... کتابوں کی برآمدگی کا۔'' اس نے آہستہ سے کہا مگر لہجہ تشکر کے جذبے سے خالی تھا۔ یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر ٹرالیوں کو دیکھنے لگا۔

''سنو...'' اس نے اسٹین کو مخاطب کیا۔ ''ان ٹرالیوں پر لیبل لگے نظر آرہے ہیں۔ کیا لکھا ہے اُن پر؟'' لیوپڈ نے چشمہ اتارتے ہوئے پوچھا۔

یہ سن کر اسٹین نے شیشے کی دیوار کے پار جھانکا اور غور سے ٹرالیوں پر لگے لیبل پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''ایک پر لکھا ہے... برائے کلیکشن یونٹ اور دوسرے پر تاریخ سیکشن کے لیے''۔ اس نے کچھ دیر بعد گردن موڑ کر اسے دیکھتے ہوئے بتایا۔

''یہ غلط ہے۔'' لیوپڈ نے یہ سنتے ہی کہا۔ ''دوبارہ پڑھو۔'' اس نے پولیس افسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ روزیٹی میری کتابوں کو ادبی سیکشن کے لیے نہیں بھیج سکتی اور تاریخ سیکشن کے لیے وہ مناسب نہیں۔''

''دیکھیے سر!'' اسٹین نے کہا۔ ''میں سیدھا سادہ پولیس افسر ہوں۔ یہ نہیں جانتا کہ جاسوسی ناول ادب کا حصہ ہیں یا نہیں۔''

''میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' یہ سن کر لیوپڈ نے کہا۔ ''البتہ ایک بات بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور وہ یہ کہ روزیٹی جاسوسی ناولوں کو ادب میں شمار نہیں کرتی تھی بلکہ وہ اسے ادب کی ذیلی شاخ قرار دیتی تھی۔ مجھے حیرت ہے کہ اس نے میری کتابوں کو تاریخی ادب اور کلیکشن یونٹ کے لیے کس طرح منتخب کرلیا۔ یہ غیر معمولی بات ہے۔'' اس کے لہجے سے تشویش ظاہر ہورہی تھی۔ ''اگر وہ میری کتابیں کہیں اور بھجوانا چاہتی تو وہ ہوسکتی ہے شعبۂ ادب کی ریفرنس لائبریری۔''

اس کی بات سن کر اسٹین نے پھر شیشے کے پار نظر ڈالی۔ ''کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے ایسا نہیں کرسکتی۔''

لیوپڈ کی بات سن کر اسٹین کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ ''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ کسی نے ڈاکٹر روزیٹی کو اس لیے قتل کیا ہے کہ تمہاری کتابوں کو ادب کے شعبے میں شامل کرواسکے؟''

''یقیناً... لیکن میں یہ نہیں کہہ رہا۔'' لیوپڈ نے تڑپ کر کہا۔ ''میرے کچھ پرستار اس کالج میں ضرور ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے جاسوسی ناولوں کو ادب قرار دلوانے کے لیے وہ اس حد تک آگے جائیں کہ اس بات کی مخالف پروفیسر روزیٹی کو موت کے گھاٹ اتار دیں۔'' اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''تو پھر سوال یہ ہے کہ قاتل کو اس بات کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ روزیٹی کی جان لینے کے بعد اس نے دو ٹرالیوں میں تمہاری کتابیں ڈالیں اور ان پر لیبل بھی لگا دیے۔'' یہ کہہ کر اسٹین لمحہ بھر کو رکا۔ ''اگر ایسا پروفیسر روزیٹی نے نہیں کیا تو کسی اور کو یا پھر قاتل کو یہ سب کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''بہت عمدہ سوال اٹھایا ہے آفیسر تم نے۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''جی ہاں...'' لیفٹیننٹ اسٹین نے اس کے لہجے میں چھپے طنز کو صاف نظر انداز کردیا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں قاتل

www.paksociety.com

تک پہنچ گیا ہوں۔"

یہ سن کر لیوپڈ نے سر اٹھایا اور سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"تم ہمیشہ سے اسے ناپسند کرتے تھے۔ وہ تمہیں ادیب نہیں صرف جاسوسی کہانی کار مانتی تھی۔" اسٹین نے کہنا شروع کیا۔ لیوپڈ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ شیشے کی دیوار کے پار دیکھ رہا تھا جہاں کئی پولیس والے مصروف تھے۔ "بات یہ ہے مسٹر لیوپڈ! تم اس کالج کے پرانے طالب علم ہو۔ تم یہاں کی لائبریریوں کے ادبی سیکشن میں اپنی کتابوں کو دیکھنے کے خواہاں تھے۔ اسی لیے تم دستاویزات اور نادر کتب رکھوانے کا بہانہ تراش کر یہاں پہنچے۔ تم نے پروفیسر روزیٹی کو کلیکشن یونٹ کی چابیاں جیب میں ڈالتے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے یہ کوٹ کلیکشن یونٹ کے باہر اسٹینڈ پر ٹانگ دیا تھا۔ تم ڈنر کے لیے باہر نکلے اور جب سب لابی میں باتیں کر رہے تھے، تم واپس آئے... کلیکشن یونٹ کا تالا کھولا اور کیٹلاگ کے لیے خود اپنی کتابوں کی ٹرالی پر ٹیگ لگائے مگر اس سے پہلے کہ تم اپنی کارروائی کرکے نکل جاتے، اچانک روزیٹی پہنچ گئی اور تم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ تمہارے پاس بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اس لیے اس بوڑھی عورت کو آسانی سے قتل کیا اور پھر قتل سے پہلے یا بعد میں، اپنا کام مکمل کرکے چلتے بنے۔"

"کہانی اچھی ہے۔" اسٹین کی بات سن کر لیوپڈ نے کہا۔ "مگر افسوس کہ جو کہانی تم نے بنائی ہے وہ بالکل لغو اور فضول ہے۔" یہ کہہ کر لیوپڈ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر کہنے لگا۔ "تم غور کرو تو کچھ اور بھی سمجھ سکتے ہو۔"

"کیا مطلب؟" اسٹین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"سوچو... میری کتابیں پہلے ڈیسک پر رکھی ہوئی تھیں۔"

"ہاں... یاد آیا، تم نے یہی بتایا تھا۔" اسٹین نے قطع کلامی کی۔

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔" لیوپڈ نے فوراً تائید کی۔ "میرے مطابق جن ٹرالیوں میں اس وقت میری کتابیں رکھی ہوئی ہیں، پہلے اس میں کچھ دوسری کتابیں رکھی تھیں جن میں سے ایک دو یا ساری کتابیں اٹھا کر کسی نے غائب کیں اور ان کی جگہ میری کتابیں ڈیسک سے اٹھا کر بھر دیں۔" اسٹین غور سے اس کی بات سن رہا تھا۔ "یہ شک اس لیے بھی مضبوط ہے کہ روزیٹی میرے ناولوں کو ادب میں نہیں، ذیلی ادب میں شمار کرتی تھی اور دوسری بات یہ کہ ناول کا تاریخ کے شعبے میں کیا کام... یہ کام یقیناً مجرم نے کیا ہے۔"

"یعنی قاتل۔" اسٹین نے لقمہ دیا۔

"ممکن ہے۔" لیوپڈ نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے مفروضہ بیان کیا ہے اور تم بھی مفروضے پر بات کر رہے ہو۔"

"تمہارے خیال میں وہ کس قسم کی کتابیں ہو سکتی ہیں جن کے بارے میں تم اپنا مفروضہ بیان کر رہے ہو؟" اسٹین نے سوال کیا۔

"یہ میں نہیں جانتا۔" اس نے فوراً کہا۔ "میرا مشورہ ہے کہ ذرا اس زاویے پر غور کرو کہ مسز ویلما پریز اپنے شوہر کی چھوڑی ہوئی کچھ نادر کتابیں کلیکشن یونٹ کو عطیہ کرنے کے لیے ساتھ لائی تھیں جنہیں پروفیسر روزیٹی کے حوالے کر دیا گیا اور یہ ابھی گھنٹا بھر پہلے کی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کا ابھی تک کمپیوٹر ریکارڈ میں اندراج بھی نہیں ہوا ہوگا۔ ویسے بھی ہم سب لوگوں کی وجہ سے پروفیسر روزیٹی کو اس کام کے لیے وقت ہی نہیں مل سکا ہوگا۔"

یہ سنتے ہی اسٹین اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کی بڑھا۔ "زیمن..." یہ سنتے ہی ایک پولیس والا اس کی طرف بڑھا۔

"سر!"

"جلدی سے جاؤ اور لائبریری ڈائریکٹر کالون فیلڈ سے کہو کہ مسز ویلما پریز نے آج شام جو کتابیں کلیکشن یونٹ کو عطیہ کی تھیں، فوری طور پر ان کی فہرست ہمیں دے دیں۔" اس نے ہدایت کی۔

"او کے سر!" اس نے مستعدی سے جواب دیا اور پلٹ کر چل دیا۔

اسٹین بھی اس کے جاتے ہی اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔

"مجھے تو بڑی حیرت ہو رہی ہے۔" لیوپڈ نے اسٹین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا میں اپنی کتابیں چیک کر سکتا ہوں؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے لیفٹیننٹ اسٹین کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کس لیے؟" اس نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا۔

"میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ قاتل نے میری کتابوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ ممکن ہے کہ میری کتابوں میں سے بھی کوئی ایک آدھ کتاب غائب ہو۔"

"میں معذرت خواہ ہوں مسٹر لیوپڈ۔" اسٹین نے کہنا شروع کیا۔ "میں نہیں چاہتا کہ دورانِ تفتیش کرائم سین پر مزید چھیڑ چھاڑ ہو۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے، انہیں سکون سے اپنا کام کرنے دیں اور خود بھی سکون سے بیٹھے رہیں۔" اس نے شیشے کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔ پولیس والے ابھی تک سرگرمی سے شواہد تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ ان کے ساتھ فرانزک ماہرین بھی نظر آ رہے تھے۔

"مگر..." لیوپڈ نے کچھ کہنا چاہا مگر اسٹین نے بات کاٹ دی۔

"پلیز... اپنے کام سے کام رکھیے۔"

"معاف کیجیے گا..." ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کے دوران میں کسی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور نرم آواز میں کہا۔ یہ کالون فیلڈ تھا۔ اس کے ساتھ کالج کا صدر وارن بھی تھا۔ چہرے سے وہ سخت پریشان نظر آ رہا تھا۔

"مسٹر سراغ رساں..." کالون نے اسٹین سے کہنا شروع کیا۔ "آپ ہمارے معزز مہمان کو کیوں پریشان کر رہے ہیں؟" اس نے لیوپڈ کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ وارن نے بھی سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

"پریشان..." یہ سنتے ہی اسٹین نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ جیسے اسے کالون کی بات سن کر حیرت ہوئی ہے۔ "میں تو صرف یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ یہاں کس لیے آئے تھے۔" یہ کہہ کر وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "یہاں ایک قتل ہوا ہے اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مسئلہ کتنا سنگین ہے، ہمیں تفتیش تو کرنی ہی ہوگی نا۔"

"مجھے یقین ہے کہ مسٹر لیوپڈ، آفیسر کی ذمے داریوں اور مجبوریوں کو سمجھ رہے ہوں گے، حالانکہ اکثر لوگ ایسا نہیں کرتے۔" اسٹین کی بات سن کر وارن نے کالون سے کہا اور لیوپڈ کی طرف دیکھا۔ "ان کی بات اور ہے۔ یہ اس طرح کے معاملات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہاں آپ کی مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں..."

"بہت دیر ہو چکی۔" وارن نے گھڑی پر نظر ڈالی اور اسٹین کو مخاطب کیا۔ "اس سے پہلے کہ آپ ہم سب کی رات تھانے میں بسر کروائیں، میں اپنے معزز مہمانوں کو رات گزارنے کے لیے موٹیل بھجوا رہا ہوں۔"

یہ سن کر اسٹین کچھ دیر سوچتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا ہے کہ انہیں جانے کی اجازت دے یا نہیں۔ کچھ دیر کے بعد اس نے سر اٹھایا اور دروازے پر کھڑے پولیس والے کو مخاطب کیا۔ "زیمن... کیا ہم نے تمام شاملِ تفتیش لوگوں کی انگلیوں کے نشانات لے لیے ہیں؟"

"سوائے پروفیسر ڈیانا کے۔" زیمن نے وہیں کھڑے کھڑے اونچی آواز میں جواب دیا۔ "وہ کہتی ہیں کہ یہ سول رائٹس کی خلاف ورزی ہے کہ زبردستی ان کی انگلیوں کے نشانات لیے جائیں۔"

لیوپڈ سوچ رہا تھا کہ اتنا سنگین معاملہ ہے اور اس کی پرستار پروفیسر قانون کی مدد کرنے کے بجائے مسئلہ کیوں کھڑا کر رہی ہے۔

"پروفیسر ڈیانا کیمپس کی ہیومن رائٹس ٹاسک فورس کی سربراہ ہیں۔" کالون نے اسٹین کے سامنے وضاحت پیش کی۔

اسی دوران میں وہاں کورا بھی پہنچ گئی۔ اس نے بھی کالون کی بات سن لی تھی۔ "اس سے پہلے میں نے کبھی انگلیوں کے نشانات کے پرنٹس نہیں دیے مگر یہ عمل اتنا مشکل نہیں جتنا کہ میں سوچ رہی تھی۔" اس کا مخاطب تو بظاہر لیوپڈ تھا لیکن سن سب رہے تھے۔

"تو اب ہم سب یہاں سے چلتے ہیں۔" مسٹر وارن کی آواز گونجی۔ کالون نے یہ سن کر اسٹین کی طرف فاتحانہ نظروں سے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، لو ہم جا رہے ہیں، روک سکو تو روک لو۔

"پولیس سے تعاون کے لیے آپ سب لوگوں کا شکریہ۔" وہ جانے کے لیے بڑھے تو اسٹین بھی کھڑا ہوا اور کسی کا نام لیے بغیر شکریہ ادا کیا۔

سب آگے بڑھے لیکن لیوپڈ وہیں کھڑا رہا۔ "سنو..." اس نے اسٹین کو مخاطب کرکے سرگوشی میں کہا۔ "ہماری میز پر ڈیانا واحد فرد تھی جس نے گلاس کے بجائے کین سے سوڈا پیا ہے۔ اگر ڈائننگ میز اب تک صاف نہیں کی گئی ہے تو تم وہاں سے وہ کین لے کر اس کی انگلیوں کے نشانات لے سکتے ہو۔"

"بہت بہت شکریہ۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "ایک بار پھر مدد کا شکریہ۔ آپ جا سکتے ہیں، ہمیں اب آپ لوگوں کے مزید تعاون کی ضرورت نہیں۔" اس بار اس کی آواز کچھ اونچی تھی۔ لگ رہا تھا کہ وہ سب کو سنانا چاہتا تھا۔

"اس پولیس والے کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟" کورا نے لیوپڈ سے کہا۔ وہ نیچے پورچ میں کھڑے موٹیل جانے کے لیے کار کے منتظر تھے۔ "میں نے محسوس کیا ہے، وہ تمہیں کچھ زیادہ ہی مشتبہ سمجھ رہا تھا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" لیوپڈ نے آہستہ سے جواب

www.paksociety.com

دیا۔ ''جب میں اس سے ملا، تب وہ زیادہ ہی مشتعل نظر آرہا تھا مگر میں نے بھی اس کے سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے کوشش کی کہ اسے مزید بھڑکنے کا موقع نہ مل سکے۔''

''کتنا عجیب اتفاق ہے، جاسوسی ناول نگار کو خود پولیس کی تفتیش کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔'' کورا نے مسکرا کر کہا۔ اسی دوران میں کار آگئی اور وہ سب روانہ ہوگئے۔

موٹیل پہنچے تو وہ دونوں سخت تھک چکے تھے۔ لیوپڈ کو یقین نہیں تھا کہ دن بھر کی اتنی مصروفیت اور اختتام پر پیش آنے والے ناخوشگوار واقعے کے بعد وہ سکون کی نیند سو پائے گا مگر بستر پر لیٹتے ہی وہ خراٹے لینے لگا۔

☆☆☆

خلاف توقع لیوپڈ کی آنکھ جلدی کھل گئی۔ اس نے... کروٹ لے کر دیکھا، کورا گہری نیند میں تھی۔ لیوپڈ اٹھا، نہا دھو کر کپڑے تبدیل کیے اور کافی کا آرڈر دے کر لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا۔ کالج میں آج اسے ایک تقریر کرنا تھی۔ اس وقت وہ اپنی تقریر پر تنقیدی نظر ڈال رہا تھا۔ اسی دوران میں کورا بھی اٹھ گئی۔ دونوں نے کافی پی اور وہ نہانے چل دی۔ لیوپڈ ایک بار پھر اپنی تقریر کا جائزہ لینے لگا۔ ابھی پانچ سات منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ... دروازہ کھلا ہے۔'' لیوپڈ نے بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ وہ سمجھا کہ شاید ویٹر ہوگا۔ اگلے لمحے دروازہ کھلا۔ لیفٹیننٹ اسٹین سامنے کھڑا تھا۔

''آپ تو تیار بیٹھے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''فرمائیے!''

''میرے خیال میں نیچے چل کر کافی پیتے ہیں۔''

''وہ تو ہم یہیں...''

''نہیں... وہیں بیٹھ کر پیتے ہیں، باتیں بھی کرلیں گے۔'' اسٹین نے اس کی پیشکش مسترد کرتے ہوئے کہا۔

''اوکے... ایک منٹ ٹھہرو۔ میں ذرا اپنی بیوی کے لیے نوٹ لکھ دوں۔'' یہ کہہ کر اس نے نوٹ بک اٹھائی۔ جلدی سے کچھ لکھا اور صفحہ علیحدہ کرکے لیپ ٹاپ پر رکھ دیا۔ ''چلیے۔'' اس نے آگے بڑھتے ہوئے اسٹین سے کہا۔

وہ دونوں کافی شاپ میں بیٹھے تھے۔ اسٹین نے اب تک کوئی بات شروع نہیں کی تھی۔ لیوپڈ سوچ رہا تھا کہ وہ نہ جانے کیا کہنے آیا ہے مگر وہ از خود پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔ کافی آئی اور جب لیوپڈ کافی میں چینی ملا رہا تھا، تب اس نے آخر زبان کھول دی۔

''میں آپ سے معذرت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔'' اسٹین نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''کس بات کی؟'' یہ سنتے ہی لیوپڈ نے اس کی طرف دیکھا۔ ''میرے خیال میں تم نے ایسا کچھ نہیں کیا جس کے لیے مجھ سے معذرت کرنا پڑے۔''

''کل رات آپ سے میرا رویہ تلخ تھا۔''

''نہیں... تم نے جو کچھ کیا، وہ تمہارے فرض کا حصہ ہے۔'' لیوپڈ نے شائستہ انداز میں مسکرا کر جواب دیا۔

اسٹین کچھ دیر تک خاموش رہ کر اسے دیکھتا رہا اور پھر اچانک اس کی نگاہوں میں وحشت اتر آئی۔ اس نے غیظ و غضب سے اس کی طرف دیکھا۔ ''پلیز مسٹر لیوپڈ... مجھے معاف کردیا ہے آپ نے۔'' اس کا لہجہ درشت تھا۔

''کیا تمہیں معذرت کرنے کے لیے مسٹر وارن نے حکم دیا ہے؟'' لیوپڈ نے اس کا بدلتا رویہ دیکھ کر پوچھا۔

''کالج کا صدر مجھے یہ نہیں کہہ سکتا کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔'' اس کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔

''میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔'' لیوپڈ نے بات بنائی۔

''پروفیسر ڈیانا نے میئر سے بات کی، اس نے پولیس چیف سے اور چیف نے مجھے حکم دیا کہ...'' اس نے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے ادھوری بات کہی مگر لیوپڈ ساری بات سمجھ گیا۔

''معاف کیجیے گا۔'' لیوپڈ نے کپ میز پر رکھ کر اسے دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''کالج کے صدر کے ساتھ کل رات تمہارا رویہ دیکھ کر میرے ذہن میں ایک فرض شناس پولیس افسر کا تصور قائم ہوا تھا مگر اب تم اس سے گلے مل کر اپنی ترقی پکی کرنا چاہتے ہو۔'' اس کے الفاظ نہیں طنز کے تیر تھے جو اسٹین کے دل پر لگ رہے تھے۔

''بات یہ ہے مسٹر لیوپڈ...'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اسٹین نے تڑپ کر کہا۔ ''یہاں میرے کئی مخالف ہیں اور میں اب مزید مخالفت مول نہیں لینا چاہتا، اس لیے برائے مہربانی کل رات جو کچھ ہوا، وہ میری غلطی تھی۔ پلیز، مجھے معاف کردیجیے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

''دیکھو اسٹین...'' یہ سن کر لیوپڈ نے نرم لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ فرض شناسوں کو کتنے مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔ کل رات جو کچھ ہوا، اسے بھول جاؤ۔''

''شکریہ...'' اس نے گہری سانس لی۔

''میرے خیال میں ہم دونوں اب اچھے دوست بن

www.paksociety.com

سکتے ہیں۔'' لیوپڈ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''واقعی...'' اس نے حیرت سے پلکیں جھپکتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں...'' لیوپڈ نے مسکرا کر کہا۔ ''ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کافی کا گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔

اسٹین نے استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''تم روزی کے قتل کی ساری تفتیش کا رخ کلیکشن یونٹ میں موجود گروپ کے گرد گھما رہے ہو۔ ممکن ہے کہ قاتل ان میں سے نہیں، وہ باہر کا کوئی فرد ہو۔ اس جگہ تو کوئی بھی آجاسکتا ہے۔''

''تمہاری ڈائننگ میز پر صدارتی نشان والے نیپکن پڑے تھے۔ کل رات تم نے یہ بات محسوس کی تھی؟'' اسٹین نے الٹا سوال کردیا۔

یہ سن کر لیوپڈ نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''ہمیں کلیکشن یونٹ سے ویسا ہی ایک نیپکن ملا ہے جس سے قاتل نے پیپر کٹر صاف کیا تھا جس کا نشان واضح طور پر نظر آرہا تھا۔'' اسٹین نے بتایا۔

''ممکن ہے، یہ قاتل نے اس وقت اٹھالیا ہو، جب مہمان لابی میں تھے۔ ضروری تو نہیں کہ مہمانوں میں سے کسی ایک نے وہ نیپکن اٹھایا ہو۔ میں تو تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ لائبریری اور اس عارضی ڈائننگ ہال میں مہمانوں کے سوا کوئی اور بھی آجاسکتا تھا۔'' لیوپڈ نے اس کا نکتہ مسترد کرتے ہوئے اپنی رائے کی مزید وضاحت کی۔

''تم سمجھتے ہو کہ وہاں سے کوئی نیپکن غائب تھا؟'' اسٹین نے پوچھا۔

''میرے خیال میں تو نہیں۔'' لیوپڈ نے کندھے اچکائے۔ ''وہاں تو کئی اضافی نیپکن موجود تھے اور سب پر کالج کے صدر کا مخصوص نشان بنا ہوا تھا۔''

''خیر... ایک اور اچھی خبر!''

''وہ کیا ہے؟'' لیوپڈ نے بے صبری سے پوچھا۔

''گمشدہ کتابیں مل گئی ہیں۔'' اسٹین نے جواب دیا۔

''تصدیق کرلی ہے کہ یہ وہی کتابیں ہیں جو مسز ویلما پریز نے عطیہ کی تھیں؟'' لیوپڈ نے وضاحت چاہی۔

''جی ہاں... اس بات کی تصدیق ہوچکی ہے۔''

''یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ ویسے کہاں تھیں وہ کتابیں؟''

''کلیکشن یونٹ سے بہت دور نہیں۔'' اسٹین نے مسکرا کر کہا۔ ''کتابوں سے بھری ٹرالیوں کے پیچھے والے شیلف میں دوسری کتابوں کے ڈھیر کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔''

''ان کتابوں پر انگلیوں کے نشانات ہیں؟'' لیوپڈ نے سوال کیا۔

''جی ہاں... مگر ایک عجیب بات ہوئی؟''

''اب وہ کیا ہے؟'' لیوپڈ نے سوالیہ نگاہوں سے اسے گھورا۔

''مسز ویلما والی کتابوں پر تو انگلیوں کے نشانات ملے ہیں لیکن تمہاری کتابوں پر کسی قسم کا کوئی نشان موجود نہیں۔ لگتا ہے کہ اسے چھونے والے نے بعد میں نہایت احتیاط سے انہیں صاف کردیا تھا۔'' اسٹین نے جواب دیا۔

''یہ تو بہت دلچسپ بات ہے۔'' یہ کہتے ہوئے لیوپڈ نے آنکھیں موند لیں اور کچھ توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''مجرم نے سب سے پہلے روزی کی چابیاں چرائیں۔ کلیکشن یونٹ گیا۔ پیپر کٹر سے کارٹن میں بڑا سوراخ کیا۔ مطلب کی نادر کتابیں نکال کر انہیں بک شیلف میں رکھی دوسری کتابوں کے ڈھیر میں رکھ دیا تاکہ کسی کی توجہ نہ پڑے۔ پھر اس نے کتاب کی چوری کو چھپانے کے لیے کارٹن کے سوراخ سے میری کچھ کتابیں اندر رکھنے کی کوشش کی۔ اسی دوران میں پروفیسر روزی بھی کلیکشن یونٹ پہنچ گئی۔ مجرم نے ان کو ٹھکانے لگانے کے بعد سوچا کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں، اس نے ہر اُس جگہ سے انگلیوں کے نشانات صاف کرنا شروع کیے، جہاں جہاں اس کے ہاتھ پڑے تھے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور آنکھیں کھول کر اسٹین کو تکنے لگا۔ وہ دم سادھے بیٹھا تھا۔

''ایسا ہوا ہے یا نہیں، یہ اور بات ہے... پر ایک چیز میری سمجھ نہیں آرہی۔'' یہ کہتے ہوئے اسٹین کے چہرے پر تشویش نظر آرہی تھی۔

''وہ کیا؟''

''مجرم نے جو کتابیں چرا کر شیلف میں رکھی دوسری کتابوں میں چھپائی تھیں، اس پر بھی تو انگلیوں کے نشان ہوسکتے تھے... انہیں کیوں نہیں صاف کیا گیا؟'' اسٹین نے استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''سیدھی سی بات ہے۔'' یہ سنتے ہی لیوپڈ نے کہا۔ ''وہ جانتا تھا کہ روزی کا قتل بہت دیر تک پوشیدہ نہیں رہے گا اور اس دوران میں بک شیلف پر کسی کی نظر نہیں پڑے گی۔ بس! موقع ملتے ہی وہ کتابیں لے اڑے گا۔ ممکن ہے کہ وہ ڈنر کے فوراً بعد ہی ایسا کرنے والا تھا۔''

''اوکے...'' اسٹین نے لیوپڈ کے مفروضے کو سننے کے بعد کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہ بتائیں کہ بک شیلف سے جو کتابیں ملی ہیں، ان پر کس کے فنگر پرنٹس ہوں گے؟''

"یہ تو بہت ہی آسان بات ہے۔" لیوپڈ نے کافی کا گھونٹ بھرا اور کہنے لگا۔ "مسز ویلما کی انگلیوں کے نشانات... وہی کتابیں لائی تھیں اور پروفیسر روزیٹی کے... اس نے کتابیں وصول کی تھیں۔ اب ان کے سوا اور کس کس کے نشانات ہو سکتے ہیں، یہ میں نہیں جانتا۔" کچھ توقف کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ان کے علاوہ کالون اور رچرڈ کے نشان بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں اس وقت مسز ویلما کے ساتھ تھے جب انہوں نے کلیکشن یونٹ میں روزیٹی کے حوالے کتابیں کی تھیں۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ "ان سب کے علاوہ مسز ویلما اور میں بھی تمہاری فہرست میں مشتبہ ہیں۔"

"سب سے بڑا مشتبہ !" اسٹین نے مسکرا کر کہا۔ "خیر، یہ تمہاری کہانیاں ہیں اور جب تک اصل مجرم گرفتار نہیں ہوتا، یہ کہانیاں ہی رہیں گی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے تمہاری اب تک کی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تم کچھ بتانے کی کوشش کر رہے ہو۔ سیدھے سادے لفظوں میں کھل کر کہو تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"معذرت چاہتا ہوں۔" لیوپڈ نے کھنکھار کر گلا صاف کرنے کے بعد کہا اور مسکرا دیا۔ "میں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ مسز ویلما پریز قاتل ہے۔"

"کیا...؟" یہ سنتے ہی اس نے حیرت سے کہا۔ "تم یہ دعویٰ کس بنیاد پر کر رہے ہو؟"

"واقعات اور حقائق کی بنیاد پر۔"

"مگر کیسے؟"

"وہ اس لیے کہ کالون فیلڈ یہ کام نہیں کر سکتا۔" لیوپڈ نے کہا۔ "وہ ڈائریکٹر ہے، اس کے پاس تمام چابیاں ہوتی ہیں۔ وہ کسی بھی وقت وہاں آجا سکتا ہے... خود سوچو، ایک شخص جس کی رسائی ہو، وہ کیوں روزیٹی کی چابیاں چرائے گا اور کیوں اس عمل سے خود کو مشتبہ بنائے گا؟" یہ کہہ کر اس نے اسٹین کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اور وہ قتل بھی نہیں کر سکتا۔" اسٹین نے لقمہ دیا۔

"کیوں نہیں، کر بھی سکتا ہے مگر جو صورتِ حال تھی، ایسے میں کالون فیلڈ جیسے شخص کو چند کتابیں چرانے کے لیے کسی کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو جب چاہتا، بڑی آسانی سے کتابیں پار کر سکتا تھا۔"

"تو پھر یقینی قاتل کا تعین کیسے ہوگا؟"

"غور سے سنو، ہم سب دروازہ کھلا چھوڑ کر باہر نکلے تھے۔" لیوپڈ نے کہنا شروع کیا۔ "میں نے روزیٹی کو چابی گھماتے دیکھا تھا مگر قسم کھا کر نہیں کہہ سکتا کہ اس نے درست طریقے سے دروازہ لاک کیا بھی تھا یا نہیں۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو، یہ تو میں نہیں سمجھ سکا البتہ انگریزی ڈپارٹمنٹ کے سربراہ رچرڈ کے بارے میں تم کیا کہو گے؟"

"رچرڈ کا تو قد ہی بمشکل پانچ فٹ ہوگا۔" لیوپڈ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں نے وہ بک شیلف دیکھا ہے جہاں سے تمہارے کہنے کے مطابق گمشدہ کتابیں برآمد ہوئی ہیں۔ وہ بہت اونچا ہے۔ یہ اس کے بس کی بات نہیں کہ ایڑیوں کے بل بھی کھڑا ہو کر وہاں کتابیں چھپا سکے۔ اگر وہ کرسی پر بھی کھڑا ہو کر کوشش کرے تو مشکل ہوگا۔ ویسے وہاں صرف کرسیاں تھیں، سیڑھی نہیں۔"

"ایک منٹ... مسز ویلما نے کتابیں عطیہ کی تھیں، تمہارے مطابق اگر وہ قاتل ہے تو پھر وہ اپنی ہی عطیہ کردہ کتابیں چرانے کی کوشش کیوں کرے گی؟"

"تمہارا نکتہ بھی مناسب ہے۔" لیوپڈ نے مسکرا کر کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ کتابیں اس کی نہیں، اس کے مرحوم شوہر کی ملکیت تھیں اور میرے اندازے کے مطابق وہی ان کی اصل قدر و قیمت سے واقف ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ مسز ویلما کیوں چرائے گی؟ تو اس کا سیدھا سا جواب ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ان کتابوں کی اہمیت سے آگاہ نہ ہو اور جب اس نے روزیٹی کے حوالے وہ کتابیں کیں اور اس نے انہیں اچھی طرح دیکھ کر قدر و قیمت کے بارے میں بتانا شروع کیا تو ہو سکتا ہے اس وقت مسز ویلما کو اپنی حماقت کا احساس ہو گیا ہو اور وہ اپنے عطیے کو واپس لینے پر تل گئی ہو۔ دی ہوئی چیز مانگنا اس کی شان کے مطابق نہیں تھا، اس لیے چوری کرنے کا سوچا۔ ویسے ڈنر سے پہلے اس نے کئی گلاس چڑھا لیے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ نشے کی حالت میں اس نے چوری کرنے کا سوچا اور فوراً عمل کر دیا۔ ویسے بھی بعد میں تو شاید اسے یہ ہاتھ دکھانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

جواب میں اسٹین نے ہنکارا بھرا۔ اس کے ماتھے کے بل اور تنی ہوئی بھویں بتا رہی تھیں کہ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔

"میرے خیال میں اگر ایسا ہی ہوا ہے، جیسا میں نے کہا تو وہ پھر سوچا سمجھا منصوبہ نہیں۔" لیوپڈ نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ "بہت ممکن ہے کہ یہ صرف لمحاتی فیصلہ ہو جس نے قتل جیسے سنگین جرم کو جنم دیا۔"

اس بار بھی وہ سر جھکائے سوچتا رہا۔ لیوپڈ اس کے کچھ کہنے کا منتظر تھا مگر اس نے کچھ دیر کے بعد اپنا موبائل فون نکالا اور کال ملانے لگا۔ "ہاں زیمن... میں بول رہا ہوں۔ سنو پریز کی بیوی سے کون تفتیش کر رہا ہے... شاباش... اسے کہو کہ وہ

اس کے مالی حالات کے بارے میں بھی پوچھے اور یہ بھی سوال کرے کہ اس نے لائبریری کو اپنے شوہر کی جو نادر و نایاب کتابیں عطیہ کی ہیں، ان کی نوادرات کی مارکیٹ میں مالیت کیا بنتی تھی... ٹھیک ہے، جیسے ہی کچھ پتا چلے، فوراً مجھے بتانا... بائے۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر کے واپس جیب میں رکھ لیا۔

"کیا ہوا؟"

"مسز ویلما کالج میں مدعو ہے، مسز وارن نے وہیں دوپہر کے کھانے پر میرے انچارج کو بھی بلایا ہے۔" اسٹین نے جواب دیا۔

"وارن واقعی بہت چالاک آدمی ہے۔ ان دونوں کا یوں اکٹھے ہونا خاص اشارہ ہے... سمجھے؟" اس نے اسٹین کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہت کچھ۔" اس نے جلدی جلدی کافی کے گھونٹ بھرے۔ "میرے خیال میں اگلی کافی تو اب پریس کانفرنس کے بعد ہی نصیب ہوگی۔" وہ خاصا پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ "میں تمہارا ایک بار پھر شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔"

"رہنے دو..." لیوپڈ نے شانِ بے نیازی سے کہا۔ "بس! ایک مہربانی کرنا۔"

"وہ کیا؟" لیوپڈ نے نوٹ بک سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"روزیٹی کا قاتل پکڑنے کی پریس کانفرنس میں میرا نام مت لینا۔"

"مگر کیوں...؟" اس نے چونکتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو سنا ہے کہ لکھنے والے تو شہرت کے پیچھے بھاگتے ہیں مگر..."

"میں ایسا نہیں ہوں۔" لیوپڈ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "ویسے بھی پولیس کی زبان سے نام نکل کر اخبارات میں آئے تو اس سے شہرت نہیں بدنامی ہوتی ہے۔" لیوپڈ نے شرارت سے مسکرا کر جواب دیا۔

"خیر، اب جو بھی کہو، میں اس بات کا ذکر ضرور کروں گا کہ اس کیس کو حل کرنے میں میری مدد تم نے کی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے گھڑی دیکھی۔ "ابھی میں ذرا جلدی میں ہوں پھر ملتے ہیں۔ مسز ویلما کو لنچ کالج میں نہیں تھانے میں کرنا ہوگا... بائے۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

سہ پہر کو کالج میں لیوپڈ کا لیکچر تھا۔ اسٹین کے جاتے ہی وہ بھی اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ کورا ناشتے کے لیے اس کی منتظر تھی۔

"میں تو سمجھی تم نکل گئے کالج۔" کورا نے اسے دیکھتے ہی مسکرا کر کہا۔

"تمہارے بغیر جانے کا تو سوچ بھی نہیں سکتا۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ناشتے کا آرڈر کرو۔"

☆☆☆

لیوپڈ کا پروگرام تھا کہ لنچ کے بعد کالج کے لیے روانہ ہوگا۔ ابھی وہ دونوں میاں بیوی لنچ سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ لیفٹیننٹ اسٹین پہنچ گیا۔

"تم نے تو بلا کا زرخیز پولیس والا دماغ پایا ہے۔" کمرے میں پہنچتے ہی اس نے بے تکلفی سے لیوپڈ کو پکار کر کہا۔

"کیا ہوا؟" لیوپڈ سمجھ گیا تھا کہ وہ کیوں اتنا خوش ہو رہا ہے مگر پھر بھی اس نے حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"مسز ویلما پریز ہی قاتل نکلی۔"

"اوہ میرے خدا...!" یہ سنتے ہی کورا نے سر پکڑ لیا۔

"ویسے وہ تنہا نہیں تھی۔"

"کیا مطلب؟" لیوپڈ نے چونک کر کہا۔

"مسٹر وارن بھی اس سے ملا ہوا تھا۔ دونوں نے مل کر واردات کی اور اب دونوں حوالات میں لنچ کریں گے... مگر علیحدہ علیحدہ۔" اسٹین نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مسز ویلما کے اعتراف کے بعد اسے بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

"ذرا کھل کر بتاؤ، یہ سب کیسے ہوا تھا؟"

"بات یہ ہے کہ..." اسٹین نے کہنا شروع کیا۔

مسز ویلما کو پولیس نے ابتدائی تفتیش کے بعد اس کے گھر سے ہی گرفتار کر لیا تھا۔ تھانے میں تھوڑے سے دباؤ پر ہی وہ ریت کے قلعے کی طرح ڈھیر ہو گئی۔ اس نے پولیس کو بتایا کہ اسکول کئی مہینوں سے خسارے میں چل رہا تھا۔ خراب مالی حالات کے باعث اس نے اپنے گھر کا ایک حصہ کرائے پر اٹھانے کا فیصلہ کیا مگر مشکل یہ تھی کہ جس حصے کو وہ کرائے پر دینا چاہتی تھی، وہاں اس کے شوہر کی کتابیں اور دوسری چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ اسے کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لیے اس نے مختلف تعلیمی اداروں کو کتابیں عطیہ کرنا شروع کر دیں تاکہ ان سے جان چھوٹ جائے۔ شومئی قسمت کہ جب اس نے روزیٹی کے حوالے کتابیں کیں تو اس نے انہیں دیکھنے کے بعد کہا کہ ان کی مارکیٹ ویلیو تو لاکھوں ڈالرز میں ہے۔ یہ سنتے ہی اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس وقت وارن بھی اس کے قریب تھا۔ وہ بھانپ گیا۔ جب وہ لابی میں آئے تو وارن نے باتوں باتوں میں اس سے کہا کہ تم نے بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔ اگر ان کتابوں کو بیچ ڈالتیں تو بہت سارا پیسا کما سکتی تھیں۔ اس نے یہ سن کر اقرار میں سر ہلایا تو وارن کی ہمت بندھی۔ اس نے کہا کہ تم یہ کتابیں اب بھی واپس حاصل کر سکتی ہو۔ جب تک ان پہ ٹیگ نہیں لگتا، تب تک انہیں

www.paksociety.com

دوبارہ حاصل کرنا مشکل نہیں مگر روزیٹی اگلے چند گھنٹوں میں ہی اسے ٹیگ لگا کر ریکارڈ کا حصہ بنا دے گی جس کے بعد انہیں پار کرنا ناممکن ہوگا۔

''مسز ویلما کا کہنا تھا کہ مسٹر وارن نے ہی اسے مشورہ دیا کہ وہ کالون فیلڈ کی چابیوں کے گچھے میں سے کلیکشن یونٹ کی چابی نکال کر دروازہ کھول سکتا ہے مگر اس کے عوض اس نے کتابوں کی فروخت سے حاصل آمدنی کا آدھا حصہ طلب کیا۔ وہ تیار ہوگئی مگر جس وقت وہ کارروائی ختم کرنے والے ہی تھے تو روزیٹی اندر داخل ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں چابیاں تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر پاتی، وارن نے اس بوڑھی عورت کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیا اور ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کر دیا۔ پھر وارن نے ویلما سے کہا کہ جس پیپر کٹر سے انہوں نے کارٹن کاٹا تھا، وہ اس کے حلق میں گھونپ دے۔ ویلما نے ایسا ہی کیا۔ اب یہ اتفاق ہے کہ قتل کے باوجود ان کے ہاتھوں یا لباس پر لہو کی ایک بوند بھی نہ تھی۔ جس کی وجہ وہ نیپکن تھا جو انگلیوں کے نشانات صاف کرنے کے لیے وارن پہلے ہی لے کر آیا تھا۔ انہوں نے نیپکن گلے پر رکھ کر کٹر گھونپا تھا۔ اس کے بعد دونوں نے دوسرے نیپکن سے انگلیوں کے نشانات صاف کیے اور باہر نکل آئے۔ انہوں نے غسل خانے کا رخ کیا۔ منہ ہاتھ دھوئے، بال ٹھیک کیے اور خون آلود نیپکن ٹکڑے ٹکڑے کر کے فلیش میں بہا دیا اور پھر ڈنر میں شریک ہوگئے۔''

''چلو جی قصہ پاک ہوا۔'' جیسے ہی اسٹین خاموش ہوا، لیوپڈ نے آہستہ سے کہا۔

☆☆☆

لیکچر ہال طالب علموں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لیکچر کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر شام ساڑھے پانچ بجے تک یہ سوال و جواب چلتے رہے۔ چائے کے موقع پر بھی طالب علم اسے گھیرے رہے۔

''معاف کیجیے گا۔'' لیوپڈ ایک طالب کے سوال کا جواب دے رہا تھا کہ سفید بالوں والا ایک شخص آیا اور لیوپڈ سے کہا۔ ''میں ایڈورڈ تھامپسن ہوں... کالج کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا ممبر۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' لیوپڈ نے اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ ممکن ہے کہ چائے کے بعد ہم ذرا تنہائی میں کچھ بات چیت کر سکیں؟ بورڈ کے کچھ اور ڈائریکٹرز بھی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' اس کے لہجے سے عاجزی جھلک رہی تھی۔

''کیوں نہیں۔'' لیوپڈ نے کہا۔ ''بس چائے پی لوں تو چلتے ہیں۔''

''بہت بہتر۔''

گھنٹا بھر بعد جب بورڈ آف ڈائریکٹرز سے ملاقات کے بعد وہ باہر نکلا تو کلیکشن یونٹ کا انچارج بن چکا تھا۔ بورڈ کے زور دینے پر لیوپڈ نے عہدہ سنبھالنے کی ہامی بھر لی تھی۔ بورڈ کے تمام ڈائریکٹرز اسے موٹیل روانہ ہونے کے لیے کار تک چھوڑنے آئے تھے۔

''یہ تو تمہارے لیے بڑا مناسب عہدہ ہے۔'' گاڑی کی طرف چلتے ہوئے کورا نے کہا۔ وہ بہت خوش تھی۔ ''اب تو مسئلہ ہی حل ہوگیا۔ تم اپنا سارا کاٹھ کباڑ اٹھا کر ادھر ہی لے آنا اور جب تک زندہ ہو، اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہنا۔''

''اچھا خیال ہے۔'' اس نے کورا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''شکریہ مسٹر کالون فیلڈ...''

''یہ کس لیے؟'' کورا نے چونک کر کہا۔

''کالون فیلڈ... روزیٹی اور وارن، دونوں سے تنگ تھا۔ اگر میں نے اسے یہ پٹی نہ پڑھائی ہوتی کہ وارن سے کہے کہ یہ کتابیں اگر ویلما عطیہ نہ کرتی تو لاکھوں کما سکتی تھی۔ بس یہ بات اس نے وارن تک پہنچائی اور پھر جیسے ہی موقع ملا، اس نے ویلما کو گھیر لیا اور اب دونوں پولیس کے گھیرے میں ہیں۔''

''مگر ویلما کیسے پکڑی گئی؟''

''کالون کی بدولت... وہ دونوں پر نظریں رکھے ہوئے تھا۔ اس نے ہی سب سے پہلے لاش دیکھی اور پولیس کو اطلاع دی مگر وہ کمزور آدمی ہے۔ اسی کی درخواست پر میں نے سارا چکر چلا کر اسٹین کو باور کروایا اور وہ میری باتوں میں آگیا۔ ویسے بھی تو وہ قاتل ہی تھے۔''

''تو یہ تم...''

''اور نہیں تو کیا، ورنہ تمہارے خیال میں وہ بے وقوف اسٹین ویلما کو پکڑ سکتا تھا۔'' یہ کہہ کر لیوپڈ مسکرا دیا۔ ''ویسے بھی میں اپنی کتابوں اور دستاویزات کو خود سے الگ نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ میری خواہش تھی اور ہر خواہش کی ایک قیمت ہوتی ہے...''

''اور جسے کبھی کبھی کچھ بے وقوف اپنی حماقتوں کے ذریعے... دوسروں کے لیے ادا کر دیتے ہیں۔'' کورا نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''ہائے بے چاری ویلما اور وارن... تمہاری خواہش کی قیمت ادا کر گئے۔''

''اور کالون زبردست معاون ثابت ہوا۔'' لیوپڈ نے ہنس کر جواب دیا۔

سلیم انور

آخری تصویر

کامیابیاں انتھک محنت اور لگن سے حاصل ہوتی ہیں... وہ بھی مسلسل کامیابی کے راستے پر گامزن تھا... مگر اچانک ہی ایک بڑی کامیابی نے ناکامی کا روپ دھار لیا...

اس فوٹوگرافر کی کارگزاری جو ہر جگہ پہنچنا اپنا اولین فرض سمجھتا تھا

یہ صبح کا پُرسکون وقت تھا۔

فضا میں اڑتے ہوئے راج ہنسوں کی قیں قیں اور پشتے سے ٹکرانے والے پانی کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دور ایک موٹر بوٹ کی پٹ پٹ بھی مدھم ہوتی جا رہی تھی جو گھاٹ سے چند منٹ قبل روانہ ہوئی تھی۔

کرٹس ڈیوز کو معلوم تھا کہ یہ علاقہ اب ویران ہوگا۔ آخر کار یہ جرم سرزد ہوئے تین دن ہو چکے تھے۔ میڈیا کی توجہ اب دیگر تازہ ترین واقعات کی جانب مبذول ہو چکی تھی۔

کرٹس نے جھک کر اس سیاہ دھبے کی قریب سے تصویر کھینچ لی جسے وہ پرانے خون کی حیثیت سے پہچان چکا تھا۔ یہ وقت کا زیاں ہے، اس نے سوچا۔

اگر وہ میت کو دفنانے سے پہلے بلا اجازت اندر گھس جاتا اور تابوت میں لیٹی ہوئی اداکارہ کی تصویر اتار لیتا تو اس تصویر کی اسے ٹھیک ٹھاک رقم مل سکتی تھی لیکن اب حالات پرانے وقتوں کی طرح نہیں رہے تھے۔ آج کل ہر طرف سیکیورٹی ہوتی ہے اور انہیں جل دینا آسان کام نہیں تھا۔

اس کے ذہن کے پردے پر اپنی جوانی کے منظر گھومنے لگے۔ اس نے اپنی پہلی تصویر مشہور اداکار جیمز کیگنی کی اتاری تھی جب وہ خود بطور زیر تربیت فوٹوگرافر کم رپورٹر

www.paksociety.com

کی حیثیت سے شکاگو ہیرالڈ کے لیے کام کررہا تھا۔ اس تصویر کے عوض ملنے والے معاوضے نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

اس وقت سے وہ بہترین سے بہترین تصویریں کھینچنے کی کوشش کررہا تھا، چاہے کوئی اسے خریدے یا نہ خریدے۔ اس کی گزراوقات کا ذریعہ اب یہی فوٹوگرافی تھی۔ اسی بنا پر اس نے شادی بھی نہیں کی تھی کیونکہ اس کے پاس بھی اتنا فالتو وقت نہیں تھا کہ وہ اس بارے میں دھیان دیتا۔ وہ مستقل حرکت میں رہتا تھا اور اگلے بہترین شاٹ کے لیے اِدھر سے اُدھر گھومتا رہتا تھا۔

''گڈ مارننگ!'' اسے اپنے عقب میں ایک زنانہ آواز سنائی دی۔

کرٹس نے گھوم کر دیکھا تو بیس بائیس سال کی ایک لڑکی اسٹائلش لباس میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ عمر میں اس سے لگ بھگ چالیس برس چھوٹی رہی ہوگی۔ اس کے شانے تک پھیلی ہوئی براؤن زلفیں دھوپ کی روشنی میں جگمگا رہی تھیں۔ اس کی گردن میں ایک سستا سا کیمرا لٹکا ہوا تھا۔

پھر اس لڑکی کی نظریں فٹ پاتھ پر سفید چک دار خاکے پر مرکوز ہوگئیں جو خون کے دھبے کا احاطہ کرنے کے لیے کھینچا گیا تھا۔

کرٹس کو ایک لمحے کے لیے اس لڑکی کا چہرہ جانا پہچانا سا لگا۔

''یہ وہ مقام ہے جہاں اسے قتل کیا گیا تھا؟'' اس عورت نے خاکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

کرٹس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

'ایک اور تجسس کی متلاشی'، کرٹس نے سوچا۔

''بظاہر یہ لگتا ہے کہ وہ سمندر کا نظارہ کرنے کے لیے یہاں آئی تھی اور کوئی اس کا پیچھا کرتا ہوا آگیا۔ یہ ڈکیتی کی ایک سیدھی سی واردات تھی۔ اس نے مزاحمت کی۔'' کرٹس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ایسا ہوجاتا ہے۔''

''رات کو تو یہاں خاصا سناٹا ہوتا ہوگا؟''

کرٹس نے اس لڑکی کے عقب میں اچٹتی نگاہ ڈالی اور بولا۔ ''یہاں دن میں بھی سناٹا ہی رہتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے وہ یہاں آئی تھی۔ تم تو جانتی ہو، نمایاں شخصیات کو تنہائی کم ہی میسر آتی ہے۔''

اس عورت نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے گردن ہلا دی۔ ''اداکاراؤں کو بعض اوقات سب سے الگ تھلگ کچھ تنہائی درکار ہوتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ عورت اس کے نزدیک سے گزر کر آگے بڑھ گئی اور اپنی نظریں پھیلے ہوئے سمندر کے پانی پر جمادیں۔

کرٹس کی حسِ شامہ سے اس پرفیوم کی خوشبو ٹکرائی جو اس عورت نے لگایا ہوا تھا۔ پھر اس کی نگاہیں عورت کے ٹائٹ بلاؤز اور اس کے جسم کے ابھرے ہوئے خطوط کا جائزہ لینے لگیں۔ عورت کچھ دیر تک سمندر کو دیکھتی رہی، اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

جب وہ پلٹی تو ایک لمحے کے لیے اس کی نگاہیں کرٹس کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ وہ غور سے کرٹس کا جائزہ لینے لگی۔ پھر وہ بولی۔ ''میں تمہیں جانتی ہوں۔ تم کرٹس ڈیوز ہو۔۔۔ فوٹوگرافر!''

کرٹس کا جسم یہ سنتے ہی تن گیا۔ وہ ہمیشہ سے یہی چاہتا تھا کہ اسے پہچان لیا جائے۔ اپنی شناخت اسے احساسِ برتری دلا دیتی تھی۔ لیکن یہ ماضی کی بات تھی۔ اب تو برسوں ہوگئے اسے کوئی پہچانتا بھی نہیں تھا۔ اس کی زندگی کے وہ بہترین دن اب پیچھے رہ گئے تھے۔

''جب میں کم عمر تھی تو میں نے تمہاری پکچرز بکس میں سے ایک کتاب خریدی تھی۔ تم تمام اسٹارز کی فوٹوگرافی کیا کرتے تھے۔ وہ کتاب فلم اسٹارز کی تصویروں سے بھری ہوئی تھی۔'' اس عورت نے بتایا۔

تب کرٹس نے اس کے گلے میں لٹکے ہوئے کیمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم بھی فوٹوگرافر ہو؟''

''نہیں، بس فوٹوگرافی سے سرسری طور پر دلچسپی ہے۔ یہاں ایک دو روز کے لیے آئی تھی۔'' اس نے دور فاصلے پر نشیبی علاقے کی جانب اشارہ کیا جو ایک دھبے کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ ''اب جبکہ میں یہاں آئی ہوئی ہوں تو چند ایک تصویریں بھی کھینچ لوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ''میرا نام سمانتھا انگرز ہے!''

کرٹس نے ہاتھ ملاتے ہوئے سوچا کہ سمانتھا کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک صبح کی روشنی کی ہے یا اس کے لیے ستائشی جذبے کے اظہار کی، وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔

''تم یہ کام کس طرح سرانجام دیتے ہو؟'' سمانتھا نے پوچھا۔

اس سوال پر کرٹس کے جسم میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ اپنے کام کے متعلق باتیں کرنے سے اسے عشق تھا اور ایک طویل عرصے کے بعد کسی نے اس سے اس کے کام کے

www.paksociety.com

بارے میں سوال کیا تھا۔

''یہ سب ٹائمنگ، ٹیلنٹ اور کسی حد تک خوش نصیبی پر منحصر ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ فلم اسٹارز کہاں جانے والے ہیں اور آپ کو بھی تیار رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔'' کرٹس نے جواب دیا۔ اس کے لہجے سے فخر عیاں تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ کو درست مقام کا علم کس طرح ہوجاتا ہے؟ میں تو ہمیشہ ان کی تلاش میں رہتی ہوں لیکن مجھے تو کبھی کوئی فلم اسٹار دکھائی نہیں دیتا!'' سمانتھا نے کہا۔

''یہ رابطوں کی بات ہے۔ میں ہر وقت لوگوں کو فون کرنے کا عادی ہوگیا ہوں۔ وہ مجھے پہلے سے باخبر کردیتے ہیں۔ پھر بات صرف پیچھا کرنے کی رہ جاتی ہے۔''

''تو تم ان کا تعاقب کرتے ہو؟''

''اس کو تعاقب کہنا درست نہیں۔ دیکھو، یہ لوگ مشہور و معروف ہوتے ہیں۔ ان سیلی برٹیز میں سے چند ہر فلم کا معاوضہ لاکھوں میں لیتے ہیں۔ پھر وہ چیختے ہیں کہ انہیں اپنے لیے پرائیویسی چاہیے۔ تنہائی اور مداخلتِ بے جا سے تحفظ۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے یہ بات قطعی گوارا نہیں۔ جب ایک بار وہ خود کو پبلک کی چیز بنانے کا فیصلہ کرلیتے ہیں تو پھر وہ ہمارے ہوجاتے ہیں۔ ان کا اپنا اختیار ختم ہوجاتا ہے۔ اور میرے علاوہ جو کوئی بھی ان کی شخصیت کا کوئی حصہ حاصل کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔'' کرٹس نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ چاہے کوئی تمہیں کچھ بھی کہے تم اپنے کام سے باز نہیں آتے ہوگے۔'' سمانتھا نے کہا۔

''بالکل ٹھیک! میں ایک شکاری کی طرح ہوں مس سمانتھا! ایک بار جب میں اپنے شکار کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہوں تو پھر میرا ٹارگٹ چاہے کچھ بھی کرلے، میں اپنا فیصلہ نہیں بدلتا۔ اس کی تصویر کا حصول میرے لیے مقصدِ حیات بن جاتا ہے۔'' کرٹس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''تو تم نے حال ہی میں کن کن نامور فلمی شخصیات کی تصویریں اتاری ہیں؟'' سمانتھا نے جاننا چاہا۔

'یہ بھی کوئی دلدادہ لگتی ہے۔' کرٹس نے سوچا۔ کیوں نہ میں اسے ناشتے کے لیے مدعو کرلوں؟ پھر کسی کو کیا پتا کہ بات کہاں تک پہنچ جائے؟ ''کچھ عرصہ قبل میڈونا کی تصویریں اتاری تھیں۔ میں نے جون ٹراوولٹا کی تصویریں اس وقت کھینچی تھیں جب حال ہی میں اس کے جہاز کو ایمرجنسی لینڈنگ کرنی پڑی تھی۔''

''کبھی کسی لاش کی تصویر کھینچی؟''

'یہ تو مُردوں کی رسیا لگتی ہے۔ مجھے اس کے پیچھے جانا ہوگا۔' کرٹس نے دل ہی دل میں کہا۔

''چند مرتبہ اتفاق ہوا ہے۔'' کرٹس نے کہا۔ اس نے اپنے لہجے کی تلخی پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''کیا تم نے کورائن کارٹر کی تصویر نہیں کھینچی تھی؟'' سمانتھا نے پوچھا۔

''تم اس کے بارے میں جانتی ہو؟ ہاں، وہ واقعی زبردست تصویریں تھیں، لیکن اسے تو بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ یقیناً پچیس سال ہوچکے ہیں۔ وہ ایک ابھرتی ہوئی باصلاحیت، ہونہار نوجوان فنکارہ تھی اور ہمیشہ اخبارات کی زینت رہتی تھی۔ شادی شدہ تھی لیکن دوسرے مردوں پر ہاتھ صاف کرنے سے گریز نہیں کرتی تھی۔'' کرٹس نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

سمانتھا بدستور ساکت کھڑی رہی۔ ''عینی گواہوں کا کہنا تھا کہ ایک کار اس کا تعاقب کررہی تھی۔ وہ گھبراہٹ میں اسٹیئرنگ وہیل پر کنٹرول برقرار نہ رکھ سکی اور اس کی کار ایک پتھریلی دیوار سے جاٹکرائی۔ تم نے اس کے مرنے سے عین قبل اس کی تصویریں اتاری تھیں۔''

کرٹس مسکرا دیا۔

اس وقت پریشانی سے بچنے کے لیے اسے چند فینسی جھوٹ بولنا پڑے تھے لیکن ان تصویروں کو اس نے خاصی بڑی رقم کے عوض فروخت کیا تھا۔ ''آپ وہ کرتے ہیں جو آپ کو کرنا چاہیے۔'' کرٹس نے جواب دیا۔

تب سمانتھا اس کے نزدیک آگئی۔ ''تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔'' ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں نہ جانے کہاں سے ایک چاقو آگیا۔ جس کی تیز دھار نے پلک جھپکتے میں کرٹس کے گلے کو نشانہ بنالیا۔

پھر سمانتھا نے یکے بعد دیگرے کرٹس کی گردن پر تین وار کیے۔ کرٹس کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سمانتھا کو دیکھتا رہ گیا۔

''جانتے ہو کورائن کارٹر کون تھی؟ وہ میری ماں تھی!'' سمانتھا نے زہریلے لہجے میں کہا۔

پھر ہوش و حواس کھونے سے قبل کرٹس کی بے جان ہوتی ہوئی آنکھوں نے جو آخری منظر دیکھا، وہ یہ تھا کہ سمانتھا انگرز اس کے مرنے سے قبل اپنے کیمرے سے اس کی تصویریں اتار رہی تھی!

للکار

طاہر جاوید مغل

بتیسویں قسط

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے... سرپھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستانِ محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر... ایک للکار ہے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کرلیا۔ ثروت کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم مغورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے میں اوجھل ہو گیا۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور ٹل پانی۔ مجھے پکوڑا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے جاملا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کرلیا۔ ہم جوڈو کراٹے کے نامور چیمپئن جیکی کو اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ جیکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زرگاں میں تین ہندے قتل ہونے پر سلطانہ کو پکڑ لیا گیا۔ سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ وہاں عمران کو دیکھ

www.paksociety.com

کر میں حیران رہ گیا۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم وہاں سے فرار ہوئے اور ایک چھوٹی سی بستی میں جا پہنچے، میں اور عمران سیٹھ کے پاس پہنچ گئے۔ پھر میں نے جارج گورا کو سابر کا چیلنج کر ڈالا۔ میں نے جارج کو جہنم واصل کر دیا۔ ہم بخیریت مندر کے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ پھر سلطانہ اور آفتاب ایک گاؤں کے شفا خانے میں گھس گئے۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنالیا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب ایک ایک کرکے یرغمالیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ حکم کے سپاہیوں نے اسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ آفتاب، ہاشم رازی کو رہا کروانا چاہتا تھا۔ رازی کو بحفاظت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ عمران نے ہاشم پر گولی چلا دی۔ ہاشم مارا گیا تاہم عمران آفتاب سے بات کرکے اس سے مذاکرات کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ سلطانہ بھی چھوٹی نال والی رائفل کے ساتھ موجود تھی۔ اچانک آفتاب پر فائر ہوا۔ آفتاب کو گولی لگی۔ آفتاب نے بھی فائر کھول دیا اور مارا یا مارا گیا۔ آفتاب اور سلطانہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہمیں زرگاں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ ہم وہاں سے فرار ہوکر پرانے قلعے میں آگئے۔ ہم نے رانا پانڈے کو ہلاک کر دیا۔ پھر چھوٹے سرکار کی طرف سے ہمیں کمک مل گئی اور ہم لڑائی جیت گئے۔ ہم لوگ چھوٹے سرکار کے تعاون سے زرگاں سے نکلے اور اسلام آباد پہنچ گئے مگر وہاں ہمیں پکڑ کر اجنبی لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ ہمیں لاہور لے آئے۔ بعدازاں ہم فرح اور عاطف سے ملے۔ پھر میں نے اچانک ثروت کی بہن نصرت کو دیکھ لیا۔ ہم نے اس کا پیچھا کیا اور اس کے نتیجے میں مجھے ثروت نظر آگئی۔ اس کی شادی ہوگئی تھی۔ پھر میں نصرت سے ملا اور ثروت کے حالات جاننے کی کوشش کی۔ نصرت نے مجھے ثروت کے حالات سے آگاہ کیا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں تھی۔ میں نے ثروت سے ملاقات کی۔ اس کی زبانی نصرت کی بیماری کا پتا چلا۔ ہم نے اس کے علاج کا بندوبست بیرون ملک کر دیا۔ پھر آسٹن ریان ولیم کی جانب سے ایک کام کی آفر ہوئی۔ ہمیں سہراب جلالی نامی عمر رسیدہ شخص کے پاس کسی خاص شے کے موجود ہونے کا پتا لگانا تھا۔ میں اور عمران باورچی کے روپ میں سہراب جلالی کے ہاں پہنچ گئے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے دو خوب صورت ڈاکٹرز بھی موجود تھیں۔ میں نے ڈاکٹر مہناز کو کریدنے کی کوشش کی۔ عمران کی جانوروں میں دلچسپی کے باعث وہ جلالی صاحب کے تیزی سے قریب آرہا تھا۔ جلالی صاحب نے 23 مارچ کی چھٹی پر نہر کنارے باربی کیو کا اہتمام کیا۔ واپسی پر ہم جب فارم ہاؤس پہنچے تو پتا چلا کچھ لوگوں نے وہاں دھاوا بول کر سب کچھ تہس نہس کر ڈالا ہے۔ ایک گارڈ مارا گیا اور کئی ملازمین زخمی ہوئے۔ دو ملازماؤں کی آبروریزی کی گئی۔ پھر ہم نے اس واقعے کی چھان بین کرنے کا فیصلہ کیا اور ہم جاوا کے گرگے سلطان کے اڈے پر پہنچ گئے۔ وہاں کافی لڑائی ہوئی اور عمران نے نادر ٹی کو ٹھکانے لگا دیا۔ ہم نے وہاں پیش آنے والے واقعات کی ویڈیو بنائی تھی۔ ہم واپس فارم ہاؤس پہنچ گئے اور جلالی کو ویڈیو دکھائی۔ ایرانی بلی کے بچے کی خوش خبری سنائی۔ اب یہاں ہماری حیثیت خاص اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ ڈاکٹر مہناز نے جلالی سے خفیہ نکاح کر لیا تھا۔ پھر ایک دن میں نے باغیچے میں فتح محمد کو کسی سے رازداری سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ مجھے فتح پر شک تھا۔ وہ وہاں سے چلا تو میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا اور ایک کوٹھی میں گھس گیا لیکن وہاں کئی لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے چار پانچ آدمیوں کو شدید زخمی کر دیا مگر انہوں نے مجھے قابو کر لیا اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔ فتح محمد بھی زخمی حالت میں وہیں پڑا تھا بعدازاں ان لوگوں نے فتح کو مار ڈالا۔ جلالی کے سیکریٹری ندیم کو وہاں دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ جاوا گروپ سے ملا ہوا ہے۔ وہاں میں نے جاوا کو دیکھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں عمران کو فون کر کے بلاؤں اور اسے شک نہ ہو۔ میں جاوا کے گارڈ کی رائفل کی زد پر تھا۔ اس نے دھمکی دی کہ میں نے اس کے کہے پر عمل نہ کیا تو میری موت یقینی ہے۔ میں نے عمران کا نمبر ملا کر اسے حقیقت بتانے کی کوشش کی۔ اس جرم کی پاداش میں مجھ پر بے تشدد کیا گیا۔ پھر میں وہاں موجود شخص کی مدد سے بھاگا مگر ہم لوگ پکڑے گئے۔ وہ شخص کوئی اور نہیں راجا تھا۔ ہمیں ڈرانے کے لیے ہم پر کتے چھوڑے گئے۔ اسی دوران میں باہر سے فائرنگ کی آوازیں آئیں۔ کسی دوسری پارٹی نے حملہ کر دیا تھا۔ اس دوران ہم بھاگ نکلے۔ پھر عمران مجھ تک پہنچ گیا۔ عمران اور راجا بھی بہت تپاک سے ملے۔ راجا کو ہوٹل میں چھوڑ کر میں اور عمران فارم ہاؤس آئے۔ ایک رات پتا چلا کہ مہناز فارم ہاؤس سے کسی کے ساتھ فرار ہوگئی ہے۔ جلالی صاحب موت کے قریب تھے۔ انہیں اسپتال پہنچایا گیا، وہ کوما میں چلے گئے تھے۔ جلالی صاحب کے کمرے میں چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ لگتا تھا مہناز نے جلدی جلدی مال سمیٹا ہے۔ وہاں مجسمے کی موجودگی کے بھی آثار تھے۔ لیکن مجسمہ بھی غائب تھا۔ پولیس پہنچ گئی تھی اور تفتیش کر رہی تھی۔ میں اور عمران اسپتال میں داخل مہناز کی والدہ کو لینے گئے، ان کی جان کو خطرہ تھا مگر وہاں دو گروپوں میں تصادم شروع ہو گیا۔ میں اور عمران مہناز کی والدہ کو ہاتھوں میں اٹھا کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم چھت پر آگئے۔ وہاں سے منظر واضح تھا۔ میں نے ایک منڈیر پھاندی اور دوسری طرف آگیا۔ عمران نے مہناز کی والدہ کو بازوؤں میں اٹھایا اور میری طرف بڑھا دیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں نے آنٹی کو گود میں اٹھایا۔ عمران بھی منڈیر پھاند کر دوسری چھت پر آگیا۔ یہ بھی کسی کمرشل بلڈنگ کی چھت تھی۔ برساتی کی طرف بس ایک چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ اس بلڈنگ کی چھت ایک تیسری بلڈنگ سے ملی ہوئی تھی۔ ہم بہ آسانی اس تیسری چھت پر پہنچ گئے۔ یہ تیسری عمارت ابھی زیرِ تعمیر تھی۔ غالباً تازہ تازہ لینٹل ڈالا گیا تھا۔ لینٹل پر تھوڑا بہت پانی کھڑا تھا۔ ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئے۔ مکمل تاریکی تھی۔ یہاں ہر طرف اینٹیں اور ریت وغیرہ بکھری ہوئی تھی۔

اسپتال کے اردگرد ہونے والی فائرنگ مسلسل جاری تھی۔ پسٹل، ماؤزر اور آٹومیٹک رائفلیں استعمال ہو رہی تھیں۔ گاہے بگاہے ایک "ری پیٹر" کی زوردار آواز ابھرتی تھی۔ اسی دوران میں ہم نے پولیس موبائلز کے سائرن بھی سنے۔ پولیس موقع پر پہنچ رہی تھی۔ مجھے اے ایس آئی گل احمد کا خیال آیا۔ اسپتال کی ایک کھڑکی میں سے میں نے اسے سڑک پر بے سدھ پڑے دیکھا تھا۔ لگتا تھا کہ "کام" آگیا ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ وہ صرف زخمی ہو اور اسے طبی امداد کی ضرورت ہو۔ اب پولیس کے آجانے سے کم از کم اسے تو طبی امداد مل ہی سکتی تھی۔

ہمیں زیرِ تعمیر عمارت کے سامنے ہی ایک سوزوکی ڈبا کھڑا نظر آیا۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ ڈرائیور غالباً اندھا دھند فائرنگ دیکھ کر یہاں گلی کے موڑ پر ہی رک گیا تھا۔ عمران نے کہا۔ "ڈبے کی طرف چلو۔"

ہم ڈبے کی طرف بڑھے۔ عمران اگلا دروازہ کھول کر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے عقبی دروازہ بھی کھول دیا۔ میں آنٹی سمیت پچھلی نشست پر چلا گیا۔ ڈرائیور ایک درمیانی عمر کا شخص تھا۔ موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، عمران نے کہا۔ "بڑے بھائی! ہم ایمرجنسی میں ہیں۔ آنٹی جی کو اسپتال لے جانا ہے۔ تم گاڑی ریورس کرو اور بائیں طرف موڑ لو۔"

ڈرائیور یقیناً پہلے ہی اندھا دھند فائرنگ کی وجہ سے خوف زدہ تھا، مزید ڈر گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر عمران کی تیز آواز نے چپ رہنے پر مجبور کر دیا۔ عمران بولا۔ "گاڑی آگے بڑھاؤ۔ ورنہ مسئلہ ہو جائے گا تمہارے لیے۔"

ڈرائیور نے ڈری ہوئی نظروں سے پیچھے دیکھا۔ یقیناً اسے عمران کے ہاتھوں میں پستول نظر آیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ گاڑی چھوڑ کر بھاگنے کا ارادہ رکھتا ہے مگر جب عمران نے اسے بازو سے پکڑا تو "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق اس نے گاڑی ریورس کی اور بائیں طرف موڑ لی۔

میں نے سکتہ زدہ آنٹی کو نشست پر بٹھا دیا تھا۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھیں۔ عمران نے کہا۔ "آنٹی! میں نے ٹھیک کہا تھا نا کہ آپ کو خطرہ ہے۔ یہ اسپتال سے باہر جو کچھ ہو رہا ہے، آپ کے لیے ہو رہا ہے۔"

"مم... میرے لیے؟ لیکن میں نے کیا کیا ہے؟"

"آپ نے کچھ نہیں کیا مگر جو لوگ مہناز کو ڈھونڈ رہے ہیں، وہ آپ کو بھی ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"مم... مہناز ٹھیک تو ہے نا؟" آنٹی نے پھر لرزاں آواز میں پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم جلد اس سے آپ کی ملاقات بھی کرا دیں۔" عمران نے کہا۔

میں جانتا تھا کہ آخری الفاظ اس نے صرف تسلی دینے کے لیے کہے ہیں... مہناز کہاں ہے؟ اس کے بارے میں ابھی ہمیں کچھ اندازہ نہیں تھا۔

آنٹی موقع محل کی پروا کیے بغیر جلالی کو کوسنے دینے لگیں۔ "اس بڈھے نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہے اور کام دیکھو۔ اللہ کرے اس کی اپنی بیٹیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو۔ اللہ کرے اس کا بھی ایسے ہی تماشا لگے..." وہ باقاعدہ رونے لگیں پھر روتے روتے ہی پوچھا۔ "اب مجھے کہاں لے کر جارہے ہو بیٹا؟"

عمران نے آنٹی کی سنی ان سنی کرتے ہوئے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی ایک طرف روک لے۔ اس نے فوراً عمران کی ہدایت پر عمل کیا۔ اسے صرف اور صرف اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ اب ہم نہر کے کنارے شاہ جمال والے موڑ کے پاس تھے۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ کسی قریبی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہو رہی تھی۔ عمران نے تحکم آمیز لہجے میں ڈرائیور سے کہا۔ "بڑے بھائی! نیچے اتر جاؤ۔ اگر پولیس وغیرہ کے چکر میں پڑے تو سخت مصیبت میں پھنسو گے۔ اگر خاموش رہے تو گاڑی تمہیں شہر میں ہی کہیں کھڑی مل جائے گی۔ اپنا موبائل نمبر دو مجھے۔"

ڈرائیور نے ہکلاتے ہوئے عمران کو اپنا فون نمبر بتایا جسے عمران نے کاغذ پر لکھ لیا۔ اس کے بعد ڈرائیور گاڑی سے اترا اور دور کھڑا ہو گیا۔ عمران نے ڈرائیونگ نشست سنبھالی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس وقت سب سے پہلا کام تو آنٹی جی کو کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچانا ہے۔" عمران نے کہا اور گاڑی پل کے پاس سے اندرونی سڑک پر موڑ لی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ ڈیفنس والے گھر کی طرف جا رہا ہے۔ شاید فی الوقت یہی قریب ترین ٹھکانا اس کی سمجھ میں آیا تھا۔

قریباً دس منٹ کی برق رفتار ڈرائیونگ کے بعد ہم ڈیفنس والی کوٹھی میں تھے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں فرح اور عاطف بڑی حفاظت کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ عمران کی ساتھی شاہین اور ننھا بالو بھی اپنی آیا صفیہ سمیت یہاں موجود تھا۔ جیلانی کے سوا سب لوگ ابھی سو رہے تھے۔ جیلانی کو بھی ہماری اچانک آمد نے حیران کر دیا۔ ہمارے ساتھ دہشت زدہ آنٹی کو دیکھ کر وہ مزید حیران ہوا۔ ہم نے سب سے پہلے آنٹی کو ائرکنڈیشنڈ کمرے میں پہنچایا اور ان کا بلڈ پریشر کم کرنے کے لیے انہیں ڈسپرین وغیرہ کھلائی۔ میرے اور عمران کے ہمدردانہ رویے نے آنٹی کا خوف کافی کم کر دیا اور انہیں احساس ہونے لگا کہ وہ یہاں محفوظ ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

عمران نے اس کوٹھی تک پہنچتے ہوئے گاڑی کو کافی گھمایا پھرایا تھا۔ اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ آنٹی کو یہاں کے محلِ وقوع کا اندازہ ہوا ہوگا۔ عمران نے جیلانی کو ہدایت کی کہ وہ سوزوکی ڈبے کی نمبر پلیٹ بدلے اور اسے ڈیفنس سے باہر نہر کنارے کسی جگہ کھڑا کر کے آئے۔ جیلانی اثبات میں سر ہلا کر باہر نکل گیا۔ عمران نے ڈیپرین کے ساتھ ہی ایک سکون بخش دوا بھی آنٹی کے معدے میں پہنچا دی تھی۔ وہ جلد ہی اپنے سوالات ترک کر کے اونگھنے لگیں۔

ہم کامن روم میں آبیٹھے۔ اب دن کی روشنی پھیلنا شروع ہوگئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”تمہارا یہ اندازہ بالکل درست نکلا کہ ریان اور جاوا گروپ کے لوگ اب ایک دم مہناز کی والدہ کی طرف جھپٹیں گے۔“

وہ ادا سے مسکرایا۔ ”میرے اندازے ہمیشہ درست ثابت ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو فساد پلس چینل دن رات ترقی کر رہا ہے... اب تم بتا سکتے ہو کہ کل کیا ہوگا؟ لیکن میں بتا سکتا ہوں۔“

”کیا ہوگا؟“

”آج سوموار ہے، کل یقیناً منگل ہوگا۔ نہ ہوا تو میرا نام بدل دینا۔“

”یہ خبر تو نہ ہوئی۔“ میں نے دلیل دی۔

”خبر ہوئی نا، کیوں نہ ہوئی۔ تم نے بحث چھیڑ دی ہے نا۔ اس کا انجام یہ ہوگا کہ میں تمہاری اس لمبی ناک پر مکا مار کر تمہارا بانسا کڑک کر دوں گا اور اپنا کوئی خراب کیمرا بھی خود ہی توڑ ڈالوں گا پھر چینل پر خبر چلے گی۔ نیوز چینل کے اہل کاروں پر فرائض کی انجام دہی کے دوران میں بہیمانہ نہ نہ تشدد۔“

”یہ بہیمانہ نہ نہ کیا ہوتا ہے؟“

”جب تشدد زیادہ برا ہو تو اسے بہیمانہ نہ نہ کہتے ہیں۔ کسی بھی لفظ یا وڈیو کلپ کو ری پیٹ کرنے سے اس کا امپیکٹ زیادہ ہو جاتا ہے۔ تم مجھے باتوں میں مت الجھاؤ۔ پوری خبر سنو... بہیمانہ نہ نہ تشدد کیا۔ کیمرا توڑ ڈالا... بلکہ ”توڑ ڈالا“ بھی ذرا کمزور لفظ ہے... چکنا چور کر ڈالا۔ چینل کے ملازمین کو عبرت ناک انجام کی دھمکیاں دیں۔ پتا چلا ہے کہ یہ تابش نامی شخص، ڈیفنس کی کوٹھی میں جوا کراتا ہے اور دو اشتہاری ملزموں کی پشت پناہی بھی کر رہا ہے۔ یہ تابش دراصل اس سابق ناظم کا بھتیجا ہے جس کے بڑے چچا کا چھوٹا داماد، صوبائی حکومت کے اہم وزیر کے پھوپھا صاحب کا کاروباری پارٹنر ہے۔ اس طرح سے یہ معاملہ صاف طور پر سیاسی حکومتی غنڈا گردی کا بنتا ہے۔ روز افزوں مہنگائی، بیڈ گ… اور ملکی سلامتی کی مخدوش صورتِ حال ہی کیا کم تھی کہ اب کیمرا ٹوٹنے والا زبردست بحران بھی پیدا ہو گیا ہے۔ لگتا ہے کہ کوئی عظیم تبدیلی آنے والی ہے۔ دانشور پہلے ہی دو… سے کہہ رہے ہیں کہ آنے والے چند دن بہت زیادہ اہم… اور اب تو دنوں کی نہیں گھڑیوں کی بات ہے۔ ہو سکتا ہے جب ہم بریک پر جائیں تو ہمارے واپس آنے تک ملک میں بہت کچھ بریک ہو چکا ہو اور اس تبدیلی کی وجہ سے پوری… میں طاقت کا توازن خراب بلکہ چکنا چور... بلکہ ریزہ ریزہ ہو چکا ہو۔ اقوامِ متحدہ بیٹھی سر پکڑ کر رو رہی ہو اور نیٹو چ… کر...“

”خدا کے لیے... خدا کے لیے... تم ٹھیک ہو۔“ میں نے اس کے سامنے عاجزی سے ہاتھ جوڑے۔

وہ مسکرا کر چپ ہو گیا۔ ایک دم میں چونک گیا۔ آنٹی کے موبائل فون کا خیال آیا۔ جب ہم آنٹی کو اسپتال جا رہے تھے تو ہمارے ذہن میں تھا کہ ان کا موبائل فون ضرور ساتھ لانا ہے لیکن وہاں ایک دم ہی ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔ ہمیں مہلت ہی نہیں ملی کہ ہم آنٹی کا شولڈر بیگ یا کوئی اور چیز ساتھ لے سکیں۔ عمران نے میرے چہرے سے میرے خیالات کا اندازہ لگا لیا اور بولا۔ ”آنٹی کے موبائل فون کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے ہو؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون میرے سامنے رکھ دیا۔

”آنٹی کا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں... میں نے جاتے ساتھ ہی آنٹی کے تکیے کے نیچے سے نکال لیا تھا۔“

”ایک نمبر کے کھوچل ہو تم۔“ میں نے کہا۔

”اور تم دو نمبر کے۔ یعنی کھوچل بھی ہو اور دو نمبر بھی۔ مہناز کو ٹرائی مار کر دیکھو اس کے نمبر پر۔“

عمران نے نمبر پریس کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ تیسری چوتھی کوشش بھی ناکام ہوئی تو اس نے آنٹی کی طرف سے مہناز کو ”کال می“ کا میسیج بھیجا۔

”تمہارا دماغ اس سلسلے میں کیا کہتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں میسیج بھیجنا اور پڑھنا کوئی اچھا کام نہیں۔ لوگوں کا کافی وقت ضائع ہوتا ہے اس میں۔“

”یار! میں مہناز کے بارے میں بکواس کر رہا…

بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ جلالی صاحب کے بے ہوش ہونے کے بعد اس نے اپنے ساتھی ڈاکٹر کے ساتھ مل کر الماریوں کے تالے توڑے ہیں اور آرا کوئے سمیت دوسری چیزیں لے کر نکل گئی ہے۔“

وہ خلافِ توقع سنجیدہ ہو گیا۔ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ”لیکن پتا نہیں مجھے یہ کیوں لگ رہا ہے کہ ڈاکٹر مہناز فارم ہاؤس سے پہلے نکلی ہے، جلالی صاحب کی طبیعت بعد میں خراب ہوئی ہے۔“

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اگر ایسا ہے تو پھر الماریوں کے تالے توڑے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ جلالی صاحب بھی وہیں پر موجود تھے، ڈاکٹر مہناز ان سے چابیاں لے سکتی تھی۔“

”ہو سکتا ہے کہ وہ چابیاں کہیں رکھ کر بھول گئے ہوں اور ان کی اجازت سے ہی مہناز اور اس کے ساتھی ڈاکٹر نے تالے توڑے ہوں۔“

”لیکن تم یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ ڈاکٹر مہناز پہلے نکلی ہے اور جلالی کی طبیعت بعد میں بگڑی ہے؟“

”جگر! میں نے کہا ہے نا کہ یہ میرا اندازہ ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر جلالی صاحب، مہناز کے جانے سے پہلے بے ہوش ہوئے ہیں تو بھی ہم یقین سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ مہناز نے ان سے دغا ہی کیا ہے۔ تالے توڑنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جلالی صاحب نے مہناز کو ہدایت کی ہو کہ وہ آرا کوئے لے کر یہاں سے نکل جائے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مہناز کو چابیاں وغیرہ سونپتے، وہ اچانک بے ہوش ہو گئے۔ افراتفری میں مہناز اور اس کے ساتھی ڈاکٹر نے قفل شکنی کی اور جلالی صاحب کی ہدایت کے مطابق چیزیں نکال کر لے گئے۔“

”یعنی تم دونوں صورتوں میں ڈاکٹر مہناز کو رعایتی نمبر ہی دینا چاہتے ہو؟“ میں نے کہا۔

”نہیں، ایسی بات نہیں۔ ہمیں ہر پہلو پر غور کرنا چاہیے۔“ عمران نے کہا۔ ”اور بہتر تو یہی ہے جگر کہ ہم ایک بار پھر موقعِ واردات کا جائزہ لیں۔“

”لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ کچھ لوگ ہمارا جائزہ بھی لے رہے ہیں اور انہوں نے باقاعدہ قسم کھا رکھی ہے کہ جب تک تمہیں لمبا نہیں لٹا دیں گے، چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ وہ کیا نام لے رہا تھا خبیث ندیم... بھرت وچن، بھرت وچن رکھا ہوا ہے مہاشے جاوا نے۔“

”اس کا انتظام بھی کر لیتے ہیں۔ آخر سرکس کمپنی میں کام کیا ہے یار! کوئی بھٹیارے تو نہیں ہیں ہم۔“ عمران نے کہا۔

اسی دوران میں، میں نے ٹی وی آن کر دیا۔ صبح کی خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ پہلی خبر ہی چونکا دینے والی تھی۔ یہ کچھ دیر پہلے لوئر مال روڈ کے علاقے میں ہونے والی اندھا دھند فائرنگ کی خبر تھی۔ پرائیویٹ اسپتال کے سامنے ہونے والی اس فائرنگ میں تین افراد موقع پر جاں بحق ہوئے تھے۔ کئی افراد زخمی تھے۔ پولیس کی گاڑی کو آگ لگنے کی خبر بھی نیوز میں موجود تھی۔ اے ایس آئی گل احمد کے بارے میں اطلاع تھی کہ وہ پیٹ میں گولی لگنے سے زخمی ہوا ہے۔

نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔ ”ہمارے نمائندے نے اطلاع دی ہے کہ ہنگامہ شروع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے دو افراد تیمارداروں کی حیثیت سے ارباب کلینک میں داخل ہوئے اور انہوں نے ایک مریضہ کو اس کے بستر سے اٹھا کر لابی میں پہنچایا۔ اسی دوران میں کلینک کے سامنے اور اطراف میں کئی گاڑیاں آکر رکیں اور ان میں موجود مسلح افراد نے ایک دوسرے پر بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔ جب یہ خوفناک ہنگامہ برپا تھا، دونوں افراد مسز جمیلہ نامی اس خاتون کو لے کر اسپتال کی چھت پر پہنچے اور وہاں سے کہیں نکل گئے۔ بتایا جا رہا ہے کہ جمیلہ نامی یہ خاتون ایک لیڈی ڈاکٹر کی والدہ ہیں اور صرف تین دن پہلے کلینک میں داخل ہوئی تھیں... ہمارے نمائندے نوید شیروانی اس وقت موقع پر موجود ہیں۔ ہم ان سے ارباب کلینک کی تازہ ترین صورتِ حال معلوم کرتے ہیں۔“

چند سیکنڈ بعد نیوز روم کا رابطہ موقع پر موجود رپورٹر اور کیمرا مین سے ہو گیا۔ اسپتال کے اردگرد پولیس کی بھاری نفری نظر آ رہی تھی۔ نیوز کاسٹر نے پوچھا۔ ”ہاں نوید! اب یہاں موقع پر کیا صورتِ حال ہے؟“

نوید نے پُرجوش لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”جیسا کہ آپ میرے عقب میں دیکھ رہے ہیں، جگہ جگہ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور نظر آتے ہیں۔ یہ میری بائیں طرف جو گاڑیاں کھڑی ہیں ان پر بھی جا بجا گولیوں کے نشانات ہیں۔ اور یہ دیکھیے ناظرین! یہ دیکھیے یہ وہ جگہ ہے جہاں گھمسان کی لڑائی ہوئی ہے۔ کم از کم دو لاشیں اور پانچ زخمی افراد اسی جگہ سے اٹھائے گئے ہیں۔ یہاں آپ کو ہر طرف گولیوں کے نشانات نظر آ رہے ہیں اور خول بھی بکھرے ہوئے ہیں ابھی تک... اب میں آپ کو اس اسپتال کے ایم ایس ڈاکٹر ظفر چودھری سے ملواتا ہوں اور اس واقعے کے حوالے سے ان کی رائے

WWW.PAKSOCIETY.COM

معلوم کرتے ہیں۔"

ایم ایس چودھری صاحب غالباً منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر ابھی ابھی اسپتال پہنچے تھے اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "محترمہ جمیلہ نامی وہ مریضہ جو اسپتال کے وارڈ سے غائب پائی گئی ہیں، تین دن پہلے ہائی بلڈ پریشر اور ہائی شوگر لیول کی شکایات کے ساتھ یہاں داخل ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا ہے کہ محترمہ جمیلہ، لیڈی ڈاکٹر مہناز کی والدہ ہیں۔ یہ لیڈی ڈاکٹر مہناز وہی ہیں جن کا ذکر جلالی فارم ہاؤس والے واقعات کے سلسلے میں آرہا ہے۔ اس سلسلے میں مکمل تحقیق کرنا تو پولیس کا کام ہے، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسپتال کے باہر جو خونی تصادم ہوا ہے، وہ ان دو گروپوں کے درمیان ہی ہوا ہے جو اس سے پہلے فارم ہاؤس کے باہر اور پھر لاہور شیخوپورہ روڈ کے قریب بھی ایک دوسرے پر حملہ کر چکے ہیں۔"

نیوز کاسٹر نے اسکرین پر نمودار ہوکر کہا۔ "ہم نے اس سلسلے میں ایس ایس پی صاحب سے رابطہ کیا ہے۔ ان کی رائے معلوم کرتے ہیں۔"

باوردی پراچہ صاحب اسکرین پر نمودار ہوئے۔ تین چار لاشیں گر چکی تھیں۔ ایک خاتون غائب تھی اور بہت سا مالی نقصان بھی ہوا تھا۔ صورتِ حال کی سنجیدگی ٹوٹ کر پراچہ صاحب کے چہرے پر برس رہی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے تو وہی "ملک گیر شہرت کا حامل" گھسا پٹا فقرہ دہرایا کہ ہم پوری تن دہی سے کوشش کر رہے ہیں، کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے اور مجرموں کو جلد قانون کے کٹہرے میں کھڑا کریں گے۔ اس کے بعد وہ اپنی چھاپا مار پارٹیوں کی تفصیل بتانے لگے تھے جب نیوز کاسٹر نے پھرتی سے انہیں ٹوکا اور پوچھا۔ "جناب! ان دو افراد کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں جو سب سے پہلے اسپتال میں داخل ہوئے اور جنہوں نے لیڈی ڈاکٹر مہناز کی والدہ کو وہاں سے غائب کیا؟ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک شخص بری طرح لنگڑا بھی رہا تھا؟"

پراچہ صاحب بولے۔ "ابھی یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اسپتال کا عملہ جو حلیہ بتا رہا ہے، اس سے شک پڑتا ہے کہ یہ وہی عمران نامی شخص ہے جو اس سے پہلے جاوا کے خاص کارندے قادرے کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے اور جلالی صاحب کا جاں نثار محافظ ہونے کا دعویٰ بھی کر چکا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا ساتھی تابش ہو سکتا ہے لیکن میں پھر کہتا ہوں کہ اس مرحلے میں یقین کے ساتھ..."

نیوز کاسٹر نے پیشہ ورانہ چابک دستی سے پولیس آفیسر کی بات کاٹی۔ "پراچہ صاحب! خاتون کی گمشدگی کو اب چوبیس گھنٹوں سے اوپر ہو چکے ہیں۔ شہر میں ہر طرف ناکے لگے ہیں، اس کے باوجود اس جرم کا راستہ روکا نہیں جا سکا۔ آپ کا کیا خیال ہے، مریضہ خاتون کے اغوا کا تعلق ڈاکٹر مہناز والے واقعے سے ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مریضہ خاتون کو اغوا کرنے والے لوگ ان کے ذریعے ان کی بیٹی ڈاکٹر مہناز تک پہنچنا چاہتے ہوں؟"

"ایسا ہو بھی سکتا ہے لیکن..."

"اگر ایسا ہو بھی سکتا تھا اور خدشہ تھا کہ ایسا ہوگا کیونکہ مریضہ خاتون ڈاکٹر مہناز کی واحد قریبی عزیز ہیں، تو کیا ضروری نہیں تھا کہ حالات کو بھانپ کر خاتون کی حفاظت کا انتظام کیا جاتا؟"

اس سے پہلے کہ بوکھلایا ہوا پولیس آفیسر کوئی جواب دیتا، عمران نے ٹی وی کی آواز بند کی اور بولا۔ "یار! کہیں یہ آنٹی جمیلہ اپنے کمرے میں ٹی وی کھول کر نہ بیٹھ جائیں... انہیں پتا چل گیا کہ مہناز، فارم ہاؤس سے غائب ہے اور اس پر الزامات لگ رہے ہیں تو وہ ضرور خود کو ہارٹ اٹیک کروا بیٹھیں گی۔"

میں آنٹی جمیلہ والے کمرے میں گیا۔ عمران نے انہیں سکون بخش دوا دی تھی۔ وہ سو رہی تھیں۔ میں بہ آہستگی ٹی وی ٹرالی دھکیل کر ان کے کمرے سے باہر لے آیا...

عمران گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے دماغ میں کچھ چل رہا ہے۔ میں نے کہا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے سرکس کمپنی والی بات تم کیا کہہ رہے تھے؟ کیا کوئی ناٹک رچانے یا سوانگ بھرنے کا ارادہ ہے؟"

"وقت آیا تو سوانگ بھی بھر لیں گے لیکن فی الحال ہم جلالی صاحب کے دوست ایس پی حمزہ صاحب کے ساتھ پولیس گاڑی میں فارم ہاؤس تک جائیں گے اور اب تک ہونے والی تفتیش کے بارے میں جانیں گے۔"

عمران غالباً حمزہ صاحب سے پہلے ہی بات کر چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ ہم قریباً ایک گھنٹے بعد یہاں سے پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچیں گے۔ وہاں سے ایک گاڑی جلالی فارم ہاؤس جارہی ہے۔

اب دن چڑھ آیا تھا۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ یکے بعد دیگرے اس کوٹھی کے سارے مکین بیدار ہو گئے۔ میری من موہنی بہن فرح، بھائی عاطف، ننھا بالو اور شاہین وغیرہ۔

فرح آبدیدہ ہوکر میرے گلے لگ گئی۔ میں آج کئی ہفتے بعد اسے اپنی صورت دکھا رہا تھا۔ وہ اور عاطف یہ بھی جانتے تھے کہ میں کچھ خطرناک کاموں میں الجھا ہوا ہوں بلکہ میں اور عمران دونوں الجھے ہوئے ہیں۔ وہ روہانسی ہوکر بولی۔ "بھائی جان! آپ بہت زیادہ بدل گئے ہیں۔"

میں نے اس کا سر چوما۔ "میں نہیں بدلا۔ وقت بدل گیا ہے۔"

عاطف بھی میرے کندھے سے لگ گیا۔ میں نے اسے بھی اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ اسی دوران میں صفیہ بھی بالو کو اٹھائے نمودار ہو گئی۔ بالو کے سرخ و سپید رخسار قندھاری اناروں کی طرح دہک رہے تھے اور مجھے ایک بھولے بسرے چہرے کی یاد دلا رہے تھے۔ بالو اسی گم گشتہ چہرے کی نشانی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور خوب چوما۔

وہ مجھے ذرا حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "ایسے بٹر بٹر کیا دیکھتے ہو؟"

فرح نے کہا۔ "آپ اس طرح ہفتوں کے بعد آئیں گے تو ہم بھی ایسے ہی دیکھنے لگیں گے۔" صفیہ اور عاطف ہنسنے لگے۔

اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے تیز آواز میں بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ شاہین اور عمران تھے۔ عاطف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "لو جی پھر چونچ لڑ گئی۔ ٹیلی فون پر بھی یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔"

عمران کی آواز سنائی دی۔ "اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ کب کر رہی ہو شادی؟"

وہ جل کر بولی۔ "میں شادی کر نہیں رہی ہوں... کر چکی ہوں۔"

"کس سے؟" وہ خوش ہو کر بولا۔

"ایک ایسے شخص سے جو تم سے زیادہ عقل مند اور تم سے کہیں زیادہ اسمارٹ ہے۔"

وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ "مجھ سے زیادہ اسمارٹ تو ٹام کروز ہی ہو سکتا ہے... اور زیادہ عقل مند بل گیٹ کے سوا اور کون ہوگا۔"

"بس یہی سمجھ لو۔" شاہین پھنکاری۔

"تو... اس کا مطلب ہے کہ تم نے بیک وقت دو افراد سے شادی کی ہے؟" عمران کی آواز میں حیرت تھی۔

اس نے غالباً کوئی شے اٹھا کر عمران کو ماری۔ "یہ رواج تمہارے خاندان میں ہوگا، ہمارے میں نہیں۔"

"گویا... تمہارا کوئی خاندان بھی ہے؟" عمران نے مزید حیرت ظاہر کی۔

اٹھا پٹخ کی آوازیں آئیں۔ اس مرتبہ غالباً شاہین، عمران پر چڑھ دوڑی تھی۔ عمران کراہا۔ "دیکھو، اب تم ثابت کر رہی ہو کہ تم واقعی خاندان کے بغیر ہو۔"

کوئی برتن ٹوٹا۔ دھینگا مشتی کی دبی دبی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ مداخلت ضروری ہو گئی تھی۔ میں کھنکھارتا ہوا کمرے میں پہنچا تو عمران قالین پر چت پڑا تھا۔ شاہین اس پر سوار تھی۔ اس کا ایک گھٹنا عمران کی گردن پر تھا اور دائیں مٹھی میں عمران کے سر کے بال تھے۔

میرے قدموں کی آواز سن کر وہ دونوں ٹھٹک کر اٹھ بیٹھے۔ شاہین کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ عمران کھسیانے انداز میں بولا۔ "میں اسے بتا رہا تھا کہ اگر عورت گھر میں اکیلی ہو اور کوئی غیر مرد تمہاری طرح اچانک کمرے میں گھس آئے تو کس طرح اپنا دفاع کرتے ہیں۔"

شاہین پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ میں نے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ شاہین کے بجائے تمہیں سیلف ڈیفنس کی تربیت کی ضرورت ہے۔"

وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر ہولے سے بولا۔ "ویسے یار! زور بڑا ہے اس میں۔ ایک دم ببر شیرنی ہے۔"

"تم نے اسے جان بوجھ کر اس طرح کا کر دیا ہے۔ ورنہ کافی معقول لڑکی ہے۔ ہمدرد اور محبت کرنے والی۔"

وہ آواز دبا کر بولا۔ "کسی کو پتا تو نہیں چلا کیا ہوا ہے؟"

"نہیں نہیں... بس اتنا معلوم ہوا کہ اس نے کوئی شے تمہارے سر پر مار کر توڑی ہے اور پھر تمہیں نیچے گرا کر بڑی عزت سے تمہاری شان میں دو تین قصیدے پڑھے ہیں۔"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "بس یار! میں تو ریما، نرگس اور اس شاہین کے درمیان یوں پس گیا ہوں جیسے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان گندم۔"

"ریما، نرگس اور شاہین... یہ تو تین پاٹ ہو گئے نا۔"

"چھوڑو جگر! جب بندہ اس بُری طرح پس رہا ہو تو پاٹوں کا حساب کسے یاد رہتا ہے۔" وہ مغموم شکل بنا کر بولا۔

اسی دوران میں عاطف اور فرح وغیرہ بھی کھانستے ہوئے اندر آ گئے اور ہماری گفتگو یہاں ختم ہو گئی۔

قریباً دو گھنٹے بعد ہم ایس پی حمزہ صاحب کے ساتھ

www.paksociety.com

ایک بار پھر جلالی صاحب کے فارم ہاؤس میں تھے۔ حمزہ صاحب پڑھے لکھے شخص تھے اور عام پولیس والوں سے قدرے مختلف نظر آتے تھے۔ اپنے سینئر دوست جلالی صاحب کی موجودہ حالت پر وہ بھی بہت افسردہ تھے۔ جلالی صاحب مسلسل کومے میں تھے۔ ان کی مجموعی جسمانی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔

فارم ہاؤس میں اور کوٹھی کے اندر باہر اُداسی نظر آتی تھی۔ جلالی صاحب کے نجی چڑیا گھر کے جانور خاموش اور غمزدہ نظر آتے تھے۔ ایرانی بلی اور اس کے بچوں کی نگہداشت پر ڈاکٹر عدیل خصوصی توجہ دے رہا تھا۔ بابے طفیل کو سخت بخار تھا اور مسلسل رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ یوں تو جلالی صاحب کی موجودگی میں سارے ملازم ان سے ڈرے سہمے رہتے تھے، مگر اب جلالی نہیں تھے تو سب کو افسردگی نے گھیرا ہوا تھا۔ وہ ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد کر رہے تھے۔

ہم ایک بار پھر جلالی صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ ابھی تک کمرے کی بیشتر اشیا اسی حالت میں تھیں جس میں ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ ایس پی حمزہ صاحب نے بتایا۔ ”فنگر پرنٹس کی رپورٹ آگئی ہے۔ اس رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر مہناز کے سلسلے میں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ الماریوں کے ٹوٹے ہوئے تالوں اور دیگر اشیا پر ڈاکٹر مہناز کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ جانے سے پہلے ڈاکٹر مہناز اور اس کے ساتھی ڈاکٹر رسام نے افراتفری میں تالے توڑے ہیں اور باکس میں سے بدھا کی مورتی نکالی ہے۔“

اچانک عمران کو کچھ یاد آیا۔ اس نے کہا۔ ”سر! وہ ٹوٹا ہوا ٹائم پیس کہاں ہے جو یہاں رکھا تھا؟“

”میرے پاس ہے۔“ حمزہ صاحب نے کہا اور جیب سے چابی نکال کر ایک الماری کھولی۔ اس میں کچھ دیگر اشیا کے علاوہ وہ ٹائم پیس بھی رکھا تھا۔ ٹائم پیس کی سوئیاں ایک بج کر تیس منٹ پر رکی ہوئی تھیں۔ یہ بات اب تک وضاحت سے سامنے آچکی تھی کہ بے ہوش ہونے سے چند سیکنڈ قبل جلالی صاحب نے اپنا ہاتھ دواؤں تک پہنچانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا یہ ٹائم پیس گرا۔ ایک طرح سے یہ ٹائم پیس جلالی صاحب کے بے ہوش ہونے کا وقت بتا رہا تھا۔

عمران نے کہا۔ ”جناب! جہاں تک مجھے یاد پڑ رہا ہے، گیٹ پر آمد و رفت کے رجسٹر میں مہناز اور اس کے ساتھی کی روانگی کا وقت ایک بج کر پانچ منٹ لکھا ہوا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر مہناز جلالی صاحب کی بے ہوشی سے پچیس منٹ پہلے یہاں سے نکل چکی تھی۔“

حمزہ صاحب نے غالباً ابھی تک رجسٹر کو غور سے نہیں دیکھا تھا یا شاید دیگر مصروفیات میں انہوں نے ٹائم پیس اور رجسٹر میں اندراج کے وقت کا موازنہ نہیں کیا تھا۔

انہوں نے ایک اے ایس آئی کو کہا اور وہ فوراً انچارج گارڈ کو رجسٹر سمیت لے آیا۔ عمران کا تجزیہ تقریباً درست ثابت ہوا۔ رجسٹر میں روانگی کا اندراج ایک بج کر پانچ منٹ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مہناز اور ڈاکٹر رسام جب یہاں سے نکلے تو جلالی صاحب اپنے ہوش و حواس میں تھے۔ اگر جلالی صاحب کی موجودگی میں ان کی مرضی کے خلاف الماریوں اور باکس کے تالے توڑے جاتے تو وہ یقیناً آواز دے کر دوسرے ملازمین کو بلا سکتے تھے۔

اس سے بہ آسانی یہ معنی اخذ کیے جا سکتے تھے کہ ڈاکٹر مہناز اور رسام اگر فاسٹنگ بدھا کی مورتی یہاں سے لے کر گئے ہیں تو جلالی صاحب کی مرضی سے لے کر گئے ہیں۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں؟ کیا وہ جلالی صاحب کی ہدایت پر کسی خاص جگہ چھپے ہوئے ہیں یا پھر انہوں نے موقع محل کے مطابق اپنی مرضی سے فیصلہ کیا ہے؟

ایس پی حمزہ صاحب نے گفتگو کے دوران میں بتایا۔ ”پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں ڈاکٹر رسام کا کھوج لگانے کی کافی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر رسام کا تعلق فیصل آباد سے ہے۔ اس کی فیملی کے سارے لوگ ابوظہبی میں رہتے ہیں۔ ڈاکٹر رسام یہاں اپنے ایک دوست رضا کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ رضا کا کہنا ہے کہ اسے پچھلے دو روز سے اس کا کچھ پتا نہیں۔ جاتے وقت اس نے بس اتنا کہا تھا کہ ایک ایمرجنسی ڈیوٹی پر شیخوپورہ جا رہا ہوں، کل دوپہر تک آجاؤں گا۔“

عمران نے کہا۔ ”فیصل آباد سے بھی پتا کرایا ہے آپ نے؟“

”ہاں، ایک ٹیم وہاں بھی گئی تھی۔ ڈاکٹر رسام کے ملنے جلنے والوں سے سوال جواب کیے ہیں۔ ڈاکٹر رسام آخری بار کوئی چھ ہفتے پہلے فیصل آباد گیا تھا۔ اس کے بعد سے اس کا کسی کو پتا نہیں۔ واقعے کے بعد سے اب تک اس کے کسی دوست یا جاننے والے کو اس کا فون بھی نہیں آیا ہے۔“

عمران نے پوچھا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے جناب کہیں ڈاکٹر مہناز اور ڈاکٹر رسام میں کوئی پرانا تعلق تو نہیں تھا؟“

”نہیں بھئی، ابھی تک اس سلسلے میں کوئی ایک شہادت بھی نہیں ملی۔ ہاں، یہ دونوں کچھ عرصہ پہلے تک سروسز اسپتال میں اکٹھے جاب ضرور کرتے رہے ہیں۔ غالباً اسی ناتے سے ڈاکٹر مہناز نے رسام کو یہاں مدد کے لیے بلایا ہوگا۔“

اسی دوران میں عمران کے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ وہ کال سنتا سنتا باہر چلا گیا۔ یقیناً کوئی اہم کال تھی۔ کچھ دیر بعد جب ہم Zoo کی طرف آئے تو عمران نے مجھے بتایا۔ ”راجا نے کام دکھا دیا ہے۔“

”کیا کیا ہے؟“

”خبیث نے کسی بندے سے پھڈا کیا ہے۔ اسے کار سے ٹکر ماری ہے اور بے ہوشی کی حالت میں ہوٹل لے آیا ہے... ہوٹل لالہ زار میں۔“

”بندہ کون ہے؟“

”میرے خیال میں جاوا ہی کا کوئی گرگا ہے۔ اتفاقاً اسے بازار میں نظر آگیا تھا۔“

”پھر اب کیا کرنا ہے؟“

”ہمیں فوراً ہوٹل پہنچنا ہوگا۔ کوئی اور گڑبڑ نہ ہو جائے۔“

ہم نے سپرنٹنڈنٹ حمزہ صاحب سے اجازت لی اور لاہور کے لیے واپس روانہ ہوئے۔ حمزہ صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ جاوا سے ٹکر لینے کے بعد عمران کی جان کو خطرہ لاحق ہو چکا ہے لہٰذا انہوں نے اصرار کر کے ہمیں پولیس کی گاڑی میں ہی واپس بھیجا۔

راستے میں عمران سے جو تھوڑی بہت گفتگو ہوئی، اس سے پتا چلا کہ راجا اپنے دوست، ہوٹل کے مالک اشفاق رانا کی کار میں باہر نکلا تھا۔ ”لاہور ہوٹل“ کے نزدیک اس نے ایک بندے کو جاتے دیکھا۔ یہ جاوا کے ساتھیوں میں سے تھا اور انڈسٹریل ایریا والی کوٹھی میں راجا اسے دیکھ چکا تھا۔ راجا کی افلاطونی طبیعت میں ہلچل ہوئی۔ کچھ آگے جا کر اس نے اس شخص کو پیچھے سے کار کی زوردار ٹکر ماری۔ وہ شخص ایک کھمبے سے ٹکرایا اور زخمی ہو کر گر گیا۔ دیکھنے والوں کو یہ سب کچھ ایک ایکسیڈنٹ کی طرح ہی لگا۔ راجا نے پھرتی سے زخمی کو اپنی کار میں ڈالا۔ ایک معزز راہ گیر بھی راجا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بظاہر یہ لوگ اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ کچھ آگے جا کر راجا نے گاڑی روک دی اور ساتھ بیٹھنے والے شخص کو منرل واٹر کی بوتل لانے کو کہا تاکہ زخمی کو پانی پلانے کی کوشش کی جائے۔ وہ بوتل لینے کے لیے اترا تو راجا نے گاڑی بھگا دی اور چکر کاٹ کر سیدھا لالہ زار ہوٹل آگیا۔ اب وہ زخمی نیم بے ہوشی کی حالت میں راجا کے کمرے میں تھا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے میں ہوٹل لالہ زار پہنچ گئے۔ ہماری ہدایت کے مطابق پولیس والے ہمیں ہوٹل سے کچھ فاصلے پر ہی اتار کر واپس چلے گئے۔ ہم کمرے میں پہنچے۔ راجا کے علاوہ اشفاق رانا بھی کمرے میں ہی تھا۔ قالین پر ایک ترپال بچھا کر زخمی کو لٹایا گیا تھا۔ اس کی ایک پنڈلی پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھی اور صاف طور پر ٹوٹ چکی تھی۔ اس کی پیشانی بھی سفید پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ یہ پٹیاں راجا اور اشفاق نے خود ہی کی تھیں۔ زخمی کی شکل دیکھ کر میں بری طرح چونکا۔ یہ سیکریٹری ندیم تھا۔ وہ پینٹ شرٹ میں تھا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی عینک ایک طرف تپائی پر رکھی تھی۔ عینک کے بغیر بھی وہ کوئی نفیس قسم کا بینک آفیسر یا پروپرائٹر ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس کی اصلیت بس ہم جانتے تھے۔ وہ جلالی صاحب کے فارم ہاؤس میں گھومنے والی وہ کالی بھیڑ تھا جس نے جلالی صاحب کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ آج یہ غدار شخص اپنے اعمال کا شکار ہو کر یہاں اس کمرے کے فرش پر موجود تھا اور بالکل بے بس نظر آتا تھا۔

راجا نے اپنا سینہ پھلایا اور فخریہ انداز میں میری طرف دیکھا پھر عمران کو دیکھ کر بولا۔ ”کیوں عمو! کیسا رہا یہ شکار؟“

”شکار تو ٹھیک ہے لیکن اگر کوئی مصیبت کھڑی ہو گئی تو؟“

”کیا مطلب؟“

عمران نے ایک نظر اشفاق رانا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”اگر کسی نے گاڑی کا نمبر وغیرہ نوٹ کر لیا ہو تو؟“

راجا بولا۔ ”اوئے چھڈ یار! یہ میرا اور رانے کا معاملہ ہے۔ تو اس کی فکر نہ کر۔ یہ بتا، کام ٹیٹ ہوا ہے یا نہیں؟“

”ہاں کام تو واقعی ٹیٹ ہے۔“ عمران نے سر ہلایا۔

راجا کے انداز نے مجھے اور عمران کو سمجھا دیا تھا کہ اس کارروائی میں کوئی گڑبڑ نمبر والی گاڑی استعمال ہوئی ہے۔

راجا نے اپنی اکلوتی سلامت آنکھ سے اشفاق رانا کو اشارہ کیا۔ وہ باہر چلا گیا۔ اب ہم تینوں تھے اور ہمارے سامنے ترپال پر زخمی سیکریٹری ندیم پڑا تھا۔ وہ شخص جسے صرف بہتر گھنٹے پہلے میں نے اور راجا نے بڑے ٹھاٹوں میں دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سنہری وہسکی اور بغل میں سنہری عورت تھی۔ انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی میں وہ کسی سرکاری سانڈ کی طرح چکراتا پھرتا تھا۔ اس نے پُرغرور انداز میں مجھے سنگین ترین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں اور پھر ان دھمکیوں

www.paksociety.com

کو عملی جامہ بھی پہنایا تھا۔ اگر قدرت، راجا کی شکل میں اور پھر ریان گروپ کے حملہ آوروں کی شکل میں مدد فراہم نہ کرتی تو شاید اب فتح محمد کی طرح میری لاش بھی اس کوٹھی میں کہیں کیڑوں کی خوراک بن رہی ہوتی۔

عمران نے راجا سے پوچھا۔ ''کچھ بتایا تو نہیں اس نے؟''

''نہیں یار! ابھی ہوش میں ہی نہیں آیا۔ منہ وچ ہی کچھ بڑبڑ کر رہا تھا۔ شاید اپنی بے بے کو جج پر جانے سے منع کر رہا تھا۔''

''تلاشی لی ہے اس کی؟''

''ہاں، یہ دیکھو۔'' راجا نے تکیے کے نیچے سے ایک قیمتی کولٹ پسٹل نکال کر عمران کو دکھایا اور بولا۔ ''خانہ خراب نے اپنی پنی (پنڈلی) پر ربڑ کے بینڈ سے باندھ رکھا تھا... اور یہ چیزیں بھی ملی ہیں۔'' راجا نے ایک دراز کھول کر کچھ چیزیں دکھائیں۔

دو چار رسیدیں تھیں، ایک قلم، ایک لائٹر، سگریٹ کا پیکٹ، ساٹھ ہزار روپے کا ایک کراس چیک... چار پانچ سو روپے کیش تھا۔

جیسا کہ بعد میں پتا چلا کیش زیادہ تھا۔ یعنی قریباً ساڑھے آٹھ ہزار روپے۔ باقی آٹھ ہزار راجا نے ''آف دی ریکارڈ'' رکھ کر اپنی جیب میں غرق کر لیے تھے۔

''موبائل نہیں ملا؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں لگتا ہے کہ موقع پر ہی کہیں گر گیا ہے۔''

''ٹھیک سے دیکھ لیا ہے؟''

''آہو یار، اتنا اندھا بھی نہیں ہوں۔''

اندازہ ہو رہا تھا کہ موبائل کے بارے میں وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔

اشفاق رانا نے راجا کے کہنے پر اردگرد کے تین چار کمرے خالی کرا لیے تھے۔ ہوٹل کے اس حصے کی طرف کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد سیکریٹری ندیم ہوش میں آ گیا۔ اس کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس بات کا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ وہ کسی طرح کی مزاحمت کر پائے گا۔ لہٰذا اسے باندھنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ہوش میں آنے کے کچھ دیر بعد ندیم نے مجھے اور راجا... کو دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کا چہرہ جو ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی زرد تھا، مزید زرد ہو گیا۔ اس نے طوطے کی طرح گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا اور خود کو ایک بند کمرے میں ہمارے درمیان پایا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر راجا نے ٹانگ کی دھکیل سے اسے لیٹا رہنے پر مجبور کر دیا اور پھنکارا۔ ''اگر رولا شولا پانے کی کوشش کی تو تمہارے منہ میں راتک کی سڑی ہوئی جرابیں گھسیڑ دوں گا اور اوپر سے کس کے پٹی باندھ دوں گا۔''

ندیم کراہتے ہوئے بولا۔ ''مم... مجھ سے کیا چاہتے ہو تم؟''

''بدلہ۔'' راجا نے اطمینان سے کہا۔ ''جو کچھ وہاں تم نے ہم دونوں کے ساتھ کیا، وہی ہم تمہارے ساتھ کریں گے۔ نہ تھوڑا کم نہ زیادہ۔''

''تمہیں بری طرح پچھتانا پڑے گا۔ جاوا صاحب تمہیں زمین کی ساتویں تہ سے ڈھونڈ نکالیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ہم زمین کے اوپر ہیں تو وہ ساتویں تہ سے کیسے ڈھونڈ نکالے گا؟ وہ تو پچھلے دو تین دن سے شاید خود ساتویں تہ میں گھسا ہوا ہے۔''

ندیم سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی پرائیویٹ جگہ پر نہیں، ہوٹل میں ہے اور یہ ایک گنجان بازار ہے۔ اس نے اچانک چلانا شروع کر دیا۔ عمران نے جست لگائی اور اس کا منہ دبوچ لیا۔ وہ بمشکل ایک آواز ہی نکال سکا تھا۔ راجا نے ایک طرف سے موٹی بدبودار جرابوں کا جوڑا نکالا اور پھرتی سے ندیم کے منہ میں گھسیڑ دیا۔ اوپر سے اس نے صافہ کس کر باندھ دیا۔

ندیم زور مار رہا تھا اور خود کو چھڑانے کی کوشش میں تھا۔ راجا نے نائیلون کی ایک مضبوط رسی اس کے ٹخنے سے باندھی اور اس کا دوسرا سرا چھت والے پنکھے کے کنڈے میں سے گزار دیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد ندیم کمرے میں الٹا لٹکا نظر آ رہا تھا۔ وہ شور مچا رہا تھا مگر منہ سے بس غوں غاں کی آوازیں ہی نکل رہی تھیں۔

راجا نے جوتا اتار کر تین چار کراری ضربیں اس کے کولہوں پر لگائیں۔ تڑاخ تڑاخ کی زوردار آوازوں کے بعد وہ قدرے شانت ہو گیا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے شدید ترین آثار تھے۔

میں نے اس کے سر کے بال مٹھی میں جکڑے۔ ''ہاں سیکریٹری صاحب! اب ہماری باری ہے۔ سلطانی گواہ بنا چاہو گے یا چھترول کے دوران میں فوت ہونا پسند کرو گے؟''

وہ کراہنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ یہ بے بسی کی معراج تھی اور ایسی ہی بے بسی سے وہ مجھے دو چار کر چکا تھا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ بے ڈھنگے طریقے سے ہوا میں جھول رہی تھی اور اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

عمران نے زہرخند سے کہا۔ ''سیکریٹری صاحب! اسی لیے ہر پنجابی فلم میں ہیرو، ولن سے یہ کہتا ہے کہ اتنا ہی ظلم کرنا چودھری جتنا سہہ سکتے ہو۔''

اسی دوران میں دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ راجا نے دروازہ کھولا۔ اشفاق رانا نے دبی آواز میں پوچھا۔ ''خیریت ہے؟ بڑی زور کی آواز آئی تھی؟''

''ہاں... ہاں خیریت ہے۔ تم ذرا ٹیپ اونچی آواز میں چلاتے رہو۔'' راجا نے مشورہ دیا اور دروازے کو پھر اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

چند منٹ کے وقفے سے اس نے سیکریٹری ندیم کی پیٹھ پر ایک اور چھترول اٹیک کیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اگلے چار پانچ منٹ میں اس کی حالت غیر ہو گئی۔ ناک اور منہ سے پانی بہنے لگا۔ اس نے ہاتھوں کے اشاروں سے ہمیں کہا کہ ہم اسے نیچے اتار دیں۔

راجا نے اس کی رسی ڈھیلی کی اور وہ دوبارہ خون آلود ترپال پر آ گیا۔

ہم دیکھ رہے تھے کہ اس کی تن فن بالکل ختم ہو چکی ہے۔ اب اگر ہم اس کے منہ سے جرابیں نکال بھی دیں گے تو وہ شور و غل نہیں کرے گا۔ پھر بھی عمران نے پہلے اس سے یقین دہانی حاصل کی اور تب جرابیں اس کے پھولے ہوئے گلوں میں سے نکالیں۔

دو تین منٹ بعد اس کی حالت قدرے بہتر ہوئی۔ عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''سیکریٹری صاحب! تمہیں پھر سے الٹا لٹکانے میں ہمیں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگے گا لیکن پھر ہم اتنی جلدی تمہیں اتاریں گے نہیں۔ بہتر ہے کہ جو پوچھتے ہیں، ٹھیک ٹھیک بتاتے جاؤ۔''

ندیم سخت جان نہیں تھا۔ نہ ہی شاید وہ بڑے دل گردے کا مالک تھا۔ غالباً دولت کی چمک اور عیاشی کا نشہ اسے پھسلا کر کہیں کا کہیں لے گیا تھا۔ اس نے عمران کی بات کے جواب میں اثبات میں سر ہلایا اور پانی مانگا۔ راجا نے اسے پانی پلایا۔ ٹانگ کی تکلیف اسے بے حال کر رہی تھی۔

عمران نے کہا۔ ''لاہور ہوٹل کے پاس تم کیا کر رہے تھے؟ اور جو بتانا سچ بتانا۔''

وہ ٹوٹی پھوٹی آواز میں بولا۔ ''میں فیصل آباد جا رہا تھا۔''

''کس لیے؟''

وہ چند سیکنڈ کے توقف کے بعد بولا۔ ''مہناز کا ساتھی ڈاکٹر رسام... وہیں کا رہنے والا ہے۔ جاوا صاحب نے میرے ذمے یہ کام لگایا تھا۔''

''کیا کام لگایا تھا؟''

''یہی کہ اس کا کھوج لگاؤں۔ آپ لوگوں کو پتا چل ہی گیا ہوگا کہ ڈاکٹر مہناز اور رسام بدھا کی مورتی سمیت غائب ہیں۔'' وہ اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔

''تم پیدل ہی فیصل آباد جا رہے تھے، خیر سے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں گاڑی تھی... ڈرائیور اور... ایک گارڈ بھی تھا۔ وہ صنوبر سنیما کی طرف کھڑے تھے۔ میں بس دو منٹ کے لیے نیچے اترا تھا، ایک دوست سے چیک لینے کے لیے۔''

''جاوا احرامی اب کہاں ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

اس سوال کے جواب میں ندیم نے کچھ تذبذب سے کام لیا۔ مگر جب عمران کے اشارے پر راجا نے پھر سے رسی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ دوبارہ بولنے لگا۔ جاوا کے بارے میں ندیم نے جو کچھ بتایا، وہ ہمارے لیے کافی حوصلہ افزا تھا۔ ندیم کی باتوں سے پتا چلا کہ وہاں بمبئی میں جاوا پر ایک افتاد آئی ہے۔ ایک خردماغ پولیس افسر نے جاوا کے چھوٹے بھائی کو اس کی گرل فرینڈ سمیت گولیوں سے چھلنی کر دیا ہے اور فرار ہو گیا ہے۔ اس پولیس افسر کا یارانہ ریان گروپ کے لوگوں سے بتایا جا رہا ہے۔ اس واقعے کے بعد جاوا فوراً اپنے لاؤ لشکر سمیت بمبئی چلا گیا تھا۔ اس کی حالت بہت بُری تھی۔ وہ اپنے سامنے آنے والے ہر شخص کو گالیاں دے رہا تھا۔ بھائی کے قتل کی اطلاع دیر سے دینے کی پاداش میں اس نے اطلاع لانے والے کو موقع پر ہی گولی مار کر شدید زخمی کر دیا تھا۔ ندیم نے اس کے اندھا دھند شراب پینے کا ذکر بھی کیا۔

میں نے چونک کر کہا۔ ''لیکن تمہاری اطلاع کے مطابق تو اس نے کوئی بھرت وچن رکھا ہوا تھا۔ شراب اور عورت کو ہاتھ نہ لگانے کی قسم کھائی ہوئی تھی؟''

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''وہ بھرت وچن بھی فی الحال ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا ہے نا جاوا صاحب کی حالت بہت بری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بمبئی میں بڑا خون خرابا ہوگا۔''

عمران نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور شعلے فلم کے گبر سنگھ کے انداز میں بولا۔ ''اب تیرا کیا ہوگا کالیے! تیرا

www.paksociety.com

تو خصم ہی تجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔''

ندیم نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ پیشانی پسینے سے تر تھی۔ لگتا تھا کہ ٹانگ کی تکلیف کے سبب وہ کسی بھی وقت بے ہوش ہو جائے گا۔ عمران نے پرچی پر ایک پین کلر انجکشن لکھا اور راجا سے کہا کہ بازار سے منگوا لے۔

اسی دوران میں عمران کے فون کی بیل ہونے لگی۔ اس نے فون سنا۔ کچھ دیر ہوں، ہاں کرتا رہا پھر باہر نکل گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہوٹل کے کوریڈور میں آ گیا۔ دو چار منٹ بعد عمران نے فون بند کیا اور گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جیلانی تیرے رقیب روسیاہ کے بارے میں معلومات دے رہا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ ماسی حمیدن سے جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے، وہ بالکل درست ہے۔ یوسف کی جرمن بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ جاتے جاتے وہ اپنی ہر چیز اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ اس کے دوستوں اور کزنز کا ایک ٹولہ اس کے ساتھ تھا اور ان لوگوں نے یوسف فاروقی کو دھمکیاں شمکیاں بھی دی ہیں۔''

''لیکن... طلاق وغیرہ تو نہیں ہوئی ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں ہوئی ہے تو ہو جائے گی۔ جیلانی نے ایک اور خاص بات بتائی ہے۔ تمہارا رقیب روسیاہ یعنی یوسف ثانی اس وقت فوٹریس کے ایک شاندار شاپنگ پلازا میں موجود ہے اور شاپنگ فرما رہا ہے۔ اس نے بہت سے بیش قیمت لیڈیز ڈریس خریدے ہیں اور ابھی مزید چیزیں خرید رہا ہے۔''

''یار! کیوں نہ اس بندے کو ایک بار دیکھا جائے۔'' میں نے کہا۔

''بے شک ہم جا سکتے ہیں۔ ویسے بھی اب ہمیں جادا کے گرگوں کا ڈر نہیں ہے۔ کم از کم مجھے تو نہیں ہے۔''

''مجھے بھی نہیں ہے اور اگر کہیں ان سے ملاقات ہو بھی گئی تو کیا ہوا۔ تم نے خود ہی تو ایک بار کہا تھا کہ لاہور کی سڑکوں پر دھینگا مشتی کرنے کا اپنا ایک مزہ ہے۔''

''یعنی تم مارا ماری کے لیے بھی تیار ہو؟''

''ایک سو ایک فیصد۔ جن سڑکوں پر ایک عمر ڈر سہم کر گزاری ہے، اب ان پر سینہ چوڑا کر کے چلنے کو دل چاہتا ہے۔'' میں نے کہا اور جیب سے ندیم کا قیمتی کولٹ پسٹل نکال کر اس کا میگزین چیک کیا۔ ایک فالتو میگزین بھی ساتھ موجود تھا۔

اسی دوران میں انجکشن آ گیا۔ ساتھ میں سرنج وغیرہ بھی تھی۔ عمران نے ندیم کی مضروب و سرخ پیٹھ پر انجکشن ٹھونکا اور راجا سے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں یہ سو جائے۔ نہ سویا تو تھوڑی سی چرس پلا دینا اس کو۔ تمہارے پاس تو ہر وقت موجود ہوتی ہے۔ لیکن ہوشیار رہنا۔''

''اس کی فکر نہ کرو عمو! یہ دوسری، تیسری بار بھی پیدا ہو جائے تو مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ لیکن تمہاری واپسی کس ویلے تک ہوگی؟''

''بس ایک دو گھنٹے تک۔'' عمران نے کہا۔

ہم نیچے آئے اور ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر فوٹریس پہنچ گئے۔ جیلانی سے فون پر ہمارا رابطہ تھا۔ ہمیں اس تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ وہ شاندار شاپنگ پلازا کے سیکنڈ فلور پر موجود تھا اور کولڈ ڈرنک پی رہا تھا۔ اس نے ہمارے لیے بھی ڈرنک منگوائے۔ ''کہاں ہے رقیب روسیاہ؟'' عمران نے جیلانی سے پوچھا۔

جیلانی نے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں شاندار قسم کا اٹالین فرنیچر سیل کے لیے موجود تھا۔ لمبی ناک والا ایک خوش رو نوجوان بڑے اسٹائل سے ''شیشہ'' پی رہا تھا اور ساتھ ساتھ فرنیچر کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا لباس جدید تراش کا اور قیمتی تھا۔ ایک ڈرائیور ٹائپ شخص اس کے قریب مؤدب کھڑا تھا۔ ''یہی ہیں یوسف فاروقی صاحب۔'' جیلانی نے سرگوشی کی۔

ہم کیفے ٹیریا کی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور اس کی حرکات و سکنات ملاحظہ کرنے لگے۔ اس نے ایک دو بار اپنے شاندار سیل فون کے ذریعے کسی سے بات بھی کی۔ یہ سوچ کر میرے دل میں ٹیس سی اٹھی کہ شاید یہ بات اس نے ویانا میں ثروت سے ہی کی ہو۔

اس نے لکڑی کی دو فولڈنگ کرسیاں ''پرچیز'' کیں۔ کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ادائیگی کی اور ڈرائیور کرسیاں اٹھا کر نیچے لے گیا۔ تب اس کی نظریں قیمتی لکڑی کے ایک شاندار SWING پر اٹک گئیں۔ ایسے خوب صورت جھولے عموماً نوبیاہتا جوڑوں کو تحفتاً دیے جاتے ہیں۔ تھوڑی سی چھان پھٹک کے بعد یوسف نے یہ جھولا بھی خرید لیا۔

''بڑی تیاریاں ہیں بھئی۔'' عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی دوران میں میرے موبائل پر کال آئی۔ میں نے دیکھا، یہ ویانا سے نصرت کا نمبر

www.paksociety.com

تھا۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے نصرت کی بے تاب آواز ابھری۔ ”تابش بھائی! آپ کہاں غائب ہو جاتے ہیں؟ بائی گاڈ بڑے کٹھور ہیں آپ۔ نہ میسیج کا جواب دیتے ہیں، نہ کال ریسیو کرتے ہیں۔“

”ابھی تم سے بات تو کی تھی۔“

”لیکن کب کی تھی، یہ بھی تو دیکھیے نا۔ لگتا ہے کہ آپ روز بہ روز مصروف ہوتے جا رہے ہیں اور یہ مصروفیت کچھ خطرناک بھی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہاں پاکستان میں آپ اپنے دوست عمران صاحب کے ساتھ مل کر کچھ گڑبڑ کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کے دوست عمران صاحب کے بارے میں ایک چھوٹی سی نیوز بھی دیکھی ہے ٹی وی چینل پر۔“

”میں نے بھی دیکھی تھی۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔“

”لیکن میری موجودگی میں آپ نے ریسٹورنٹ کے اندر جو لڑائی کی وہ تو حقیقت تھی نا؟ چلیں اس بارے میں بعد میں بات ہو جائے گی۔ اس وقت آپ کو ایک بڑی اہم اطلاع دینے کے لیے فون کیا ہے جناب۔“

”کیسی اطلاع؟“

”ہم پاکستان واپس آ رہے ہیں۔ ایک ہفتہ پہلے بڑا لمبا چوڑا ”چیک اپ“ ہوا ہے آپ کی اس بہن کا۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ابھی فوری طور پر آپریشن کی ضرورت نہیں۔ وہ دواؤں کے ذریعے پہلے مجھے اچھا کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد آپریشن کی باری آئے گی۔ جیسے بکرے کو پہلے کھلاتے پلاتے ہیں پھر چھری چلاتے ہیں۔ چچا احمد نے سینئر ڈاکٹر صاحب سے تفصیل کے ساتھ مشورہ کیا ہے۔ اگر ہم یہاں ویانا میں ہی رہیں گے تو ڈھائی تین ماہ میں کافی سارا خرچہ آ جائے گا۔ لہٰذا فیصلہ ہوا ہے کہ ہم پاکستان آ جائیں اور پہلے میڈیکیشن کا کورس پورا کریں۔“

”یہ تو اہم خبر سنائی ہے تم نے۔ لیکن پہلے میری بات احمد چچا سے کراؤ۔“ میں نے کہا۔

نصرت کی آواز سنائی دی۔ وہ احمد چچا کو پکار رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد احمد چچا کی آواز ابھری۔ وہ بھی مطمئن اور خوش محسوس ہوتے تھے۔ نصرت کے بارے میں چچا احمد سے میری تفصیلی بات ہوئی۔ انہوں نے بھی یہی بتایا کہ ابھی آپریشن ملتوی ہوا ہے اور غیر متوقع طور پر نصرت کی حالت بھی بہتر ہے۔ اگر وہ میڈیکیشن کے لیے اسپتال میں ایڈمٹ رہتی ہے تو کافی خرچہ آ جائے گا۔ ڈاکٹروں کے مطابق مناسب یہی ہے کہ وہ چند ماہ کے لیے پاکستان چلی جائے۔

ہماری اس گفتگو کے بعد عمران نے وہیں بیٹھے بیٹھے فوراً ریان ولیم سے فون پر رابطہ کیا۔ ریان صاحب اور پروفیسر رچی کے ساتھ عمران کا ٹیلی فونک رابطہ ہوتا ہی رہتا تھا۔ وہ انہیں جلالی صاحب اور آرا کوئے کے حوالے سے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ رکھتا تھا۔ ریان ولیم کو عمران کی بے پناہ ”لک“ پر کچھ انوکھا سا بھروسا ہو گیا تھا۔ حالانکہ موجودہ صورتِ حال آرا کوئے کے حوالے سے اتنی حوصلہ افزا نہیں تھی لیکن ریان ولیم کو یقین تھا کہ عمران کی کوششوں کا حتمی نتیجہ مثبت ہی نکلے گا... جیسے کوبز شو اور لگژری طیارے کا نکلا تھا۔ جاوا گروپ سے کھلم کھلا ٹکراؤ کے بعد ریان ولیم کے نزدیک عمران کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ عمران نے جس طرح جاوا کے دستِ راست نادر ٹی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا، وہ ریان ولیم کے لیے بہت اہم تھا۔ بہرحال، ریان ولیم کی خواہش تھی کہ عمران اور ریان گروپ کا تعلق پوشیدہ ہی رہے۔

عمران نے ریان ولیم سے چند لاکھ روپے منگوائے جو فوراً ہی عمران کو آن لائن ٹرانسفر کر دیے گئے۔ اس کے لیے جیلانی کا اکاؤنٹ نمبر استعمال ہوا۔

اسپتال سے نصرت کے عارضی ڈسچارج کے لیے یہ رقم ویانا بھجوانے کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔

ثروت والا معاملہ بڑی تیزی سے ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ ثروت آسٹریا سے واپس آ رہی تھی اور یہاں اس کا شوہر یوسف فاروقی اس کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اپنی ٹین ایجر جرمن بیوی سے زخم کھانے کے بعد اسے ثروت کا خیال آیا تھا... اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے سب کچھ نہیں کھویا، بہت کچھ اس کے پاس ہے اور جو کچھ اس کے پاس ہے، وہ بھی کم پُرکشش نہیں۔

میں اور عمران دیکھ رہے تھے، وہ فرنیچر مارٹ پر مختلف اشیا کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ بہرحال اس نے دو کرسیاں اور ساگوانی جھولا خریدنے پر ہی اکتفا کیا۔

عمران نے کہا۔ ”اس سے رابطہ کرو تابی! اس کو مزید جاننے میں مدد ملے گی۔“

”اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس معاملے سے دور رہوں۔“

”یار! پھر وہی دلیپ کماری... میں رادھا کے جیون پر اپنی چھایا... وغیرہ وغیرہ۔“

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ یوسف فارغ ہو

www.paksociety.com

گیا۔ دو ملازم پیک شدہ جھولا لے کر برقی سیڑھیوں کی طرف چلے گئے۔ یوسف بھی لمبے ڈگ بھرتا ہوا خارجی راستے کی طرف بڑھا۔ مجھے یہ خطرہ نہیں تھا کہ وہ مجھے پہچان پائے گا۔ بے شک ایک مرتبہ فون پر اس سے بات ہو چکی تھی لیکن وہ مجھے شکل سے نہیں جانتا تھا۔

مگر جب وہ..... قریب سے گزرا تو مجھ پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد تھوڑا سا چونک گیا۔ میں گڑبڑا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے لگا کہ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر ہیں۔ کچھ قدم آگے جا کر وہ رکا اور پھر پلٹ کر ہماری طرف آ گیا۔ اس کی تیز نگاہیں اب بھی مجھ پر تھیں۔ میرے پاس آیا اور مسکرا کر بولا۔ ”معاف کیجیے، مجھے آپ کی شکل کچھ پہچانی ہوئی لگ رہی ہے۔ کہیں دیکھا ہے آپ کو۔“

میں نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ اس کے ہاتھ نرم تھے اور انداز میں گہرا اعتماد تھا۔

”آپ کا عثمان صاحب کی فیملی سے تو تعلق نہیں ہے؟ عثمان صاحب جو میکلوڈ روڈ پر کیمیکلز کا اسٹور بھی چلاتے تھے؟“ اس نے پوچھا۔ عثمان، ثروت کے والد مرحوم کا نام تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اس کی تیز نگاہی کی داد دی اور کہا۔ ”آپ کا اندازہ درست ہے۔ آپ جن عثمان صاحب کا ذکر کر رہے ہیں وہ رشتے میں میرے خالو تھے۔“

”اوہ گاڈ! آپ تابش تو نہیں ہیں؟“ اس کی بھوری آنکھوں میں بے پناہ چمک ابھر آئی۔

”ہاں، میرا نام تابش ہے۔“

”میں نے فیملی البم میں آپ کی تصویریں دیکھی ہیں۔ ایک آدھ فیملی ویڈیو میں بھی آپ کو دیکھا ہے۔ ونڈرفل۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ اس طرح آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔“

”اور آپ کی تعریف؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آس پاس سلوٹیں پڑتی تھیں۔ ”آپ مجھے پہچاننے کی کوشش کیجیے۔ چند دن پہلے فون پر آپ سے تفصیلی بات ہو چکی ہے۔ میں نے آپ سے ملاقات کی خواہش بھی کی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”کہیں آپ یوسف تو نہیں؟ ثروت کے ہسبینڈ؟“

اس نے ایک بار پھر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”آپ جناب نے بالکل ٹھیک پہچانا۔“

”زبردست۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کی نظر واقعی کافی تیز ہے۔ چند تصویروں کی مدد سے آپ نے مجھے شناخت کر لیا اور تصویریں بھی چار پانچ سال پرانی ہوں گی۔“

”کچھ چہرے ہوتے ہیں جن پر وقت کی دھول زیادہ نہیں پڑتی اور پڑتی بھی ہے تو جمتی نہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ آپ کا تعلق کسی طور ثروت کی فیملی سے ہے۔“

کچھ دیر بعد عمران بھی اس گفتگو میں شریک ہو گیا۔ میں نے اس کا تعارف اپنے دوست کے طور پر کرایا۔ جیلانی، عمران کے اشارے پر موقع سے کھسک چکا تھا۔ ہم وہیں کیفے ٹیریا میں بیٹھ گئے۔ میں نے تین کپ کولڈ کافی منگوائیں۔ یوسف نے مجھے ویانا کی تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ ثروت اور نصرت اسی ہفتے پاکستان واپس آ رہی ہیں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے اس خبر کا علم نہیں؟ میں نے انکار میں جواب دیا۔ وہ بہت جلد بے تکلف ہو جانے والا شخص تھا اور تواتر سے باتیں کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں عمران بھی کچھ کم نہیں تھا۔ وہ باتوں کا چیمپئن تھا۔ آدھ پون گھنٹے کے اندر ہی دونوں نے کئی موضوعات چھیڑے اور سمیٹے۔ یوسف، میرے اور عمران کے کاروبار کے حوالے سے ٹوہ لینا چاہ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم ایک دوست کے ساتھ مل کر ”کار ڈیلنگ“ کر رہے ہیں۔ جیل روڈ پر ہمارا شوروم ہے۔ یہ دراصل جیلانی کا شوروم تھا۔ عمران کبھی کبھار وہاں جا بیٹھتا تھا۔ کاروں اور گاڑیوں کی بات چلی تو یوسف نے بتایا کہ اسے خوب صورت اور یونیک گاڑیوں کا شوق ہے۔ اس نے کہا۔ ”میرے پاس 75 ماڈل کی ایک شاندار مرسیڈیز ہے جو کافی عرصے سے ایک اہم سیاسی شخصیت کے زیرِ استعمال بھی رہی ہے۔“ اس نے ہمیں گاڑی کی تفصیل بتائی۔

عمران متاثر ہوا۔ اس نے کہا۔ ”کسی وقت ہمیں دکھائیے۔“

وہ بولا۔ ”کسی وقت کیوں، آپ کے پاس وقت ہے تو ابھی چلیے میرے ساتھ گارڈن ٹاؤن۔“

وہیں بیٹھے بیٹھے یوسف کے گھر چلنے کا پروگرام بن گیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہم پر اپنی امارت کا رعب بھی ڈالنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے میرے بارے میں کافی جستجو تھی۔

عمران اور میں ٹیکسی میں یہاں آئے تھے لیکن عمران نے یوسف کو بتایا کہ ہماری ہنڈا اسٹی پارکنگ میں کھڑی ہے

اور ڈرائیور اسے خود ہی لے آئے گا۔ ہم یوسف کی شاندار ٹویوٹا میں بیٹھے اور اس کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گئے۔ یہ دو بجے کا وقت تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ یہی وہ گھر تھا جہاں میں نصرت کا پیچھا کرتے ہوئے پہنچا تھا اور پھر میں نے ثروت کی پہلی جھلک بھی دیکھی تھی۔ وہ جھلک جو مجھے کئی برس کے جان لیوا انتظار کے بعد نصیب ہوئی تھی۔

مجھے زیادہ خطرہ ملازمہ حمیدن کی طرف سے تھا۔ اگر وہ گھر میں موجود ہوتی اور ہمیں پہچان کر کسی ردِعمل کا اظہار کرتی تو مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ بہر حال، خیریت گزری۔ حمیدن کی عقل کا امتحان ہی نہیں ہوا۔ وہ گھر میں موجود نہیں تھی۔ کم از کم ہمیں تو دکھائی نہیں دی۔ میری معلومات کے مطابق یوسف کا یہ گھر کرائے کا تھا۔ اس کا ذاتی شاندار گھر قریب ہی ایک پوش علاقے میں بن رہا تھا۔ پھر بھی اس رہائش گاہ کو اس نے خوب سجایا ہوا تھا۔ غالباً اس سجاوٹ کی ایک وجہ ثروت کی آمد بھی تھی... ثروت جس کے حوالے سے یوسف کا حقِ ملکیت اور احساسِ محبت اچانک جاگ گیا تھا۔ کوٹھی کے ایک کوریڈور میں رنگ و روغن ہو رہا تھا، گرامی لانوں کو خوب صورتی سے تراشا گیا تھا۔ یوسف نے ہمیں گھر کے اندرونی حصے دکھائے یہاں تک کہ بیڈ روم بھی دکھا دیا۔ بیڈ روم کو بڑے لگژری انداز میں تیار کیا گیا تھا۔ بیڈ اپنی ”سہولتوں“ کے اعتبار سے زبردست تھا۔ یہاں ایک دیوار پر یقیناً حال ہی میں ثروت کی ایک بڑی تصویر بھی لگائی گئی تھی۔ یہ وہی تصویر تھی جس کا ذکر حمیدن نے مجھ سے کیا تھا۔

یوسف نے مجھے مخاطب کیا اور مسکرا کر بولا۔ ”تابش صاحب! آپ نے پہچان ہی لیا ہوگا۔ یہ ہیں آپ کی کزن اور میری اہلیہ ثروت۔ دو چار دن میں یہاں پہنچ جائیں گی۔ پھر آپ کو کھانے پر بلائیں گے بلکہ میرا تو پروگرام بن رہا ہے کہ ثروت کی آمد پر ایک چھوٹی سی تقریب کر دی جائے۔ ایک مزیدار سا گیٹ ٹو گیدر۔“

”اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ کمرے کی آرائش اور فرنیچر وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کرنے لگا... مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے یہ بیڈ روم دکھا کر اور اس کوٹھی میں گھما پھرا کر لطف لے رہا ہے۔ جیسے اس نمود و نمائش سے اس کے کسی اندرونی جذبے کی تسکین ہو رہی ہے۔

اسی دوران میں اس کے فون پر کال آ گئی۔ اس نے کال اٹینڈ کی۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ثروت کی کال ہے۔ ثروت اس سے کسی ملازم کے بارے میں بات کر رہی تھی، جس کی بیوی کو کل فالج ہوا تھا۔ وہ یوسف سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس کی مالی مدد کرے۔ تین چار منٹ یہ بات جاری رہی۔ پھر بالکل غیر متوقع طور پر یوسف نے کہا۔ ”ثروت! تمہارے ایک جاننے والے میرے پاس موجود ہیں۔ لو ان سے بات کرو اور پہچانو۔“

اس نے ایک دم سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں اس صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھا۔ چند لمحے کے لیے گڑبڑا گیا۔ دوسری طرف سے ثروت کی مترنم آواز آ رہی تھی۔ ”ہیلو... ہیلو کون؟“

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ”ہیلو... کیسی ہیں آپ؟“

ثروت نے ایک لمحے میں آواز پہچان لی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے دو تین بار ہیلو کہا پھر یہ کہتے ہوئے فون یوسف کی طرف بڑھا دیا۔ ”شاید لائن کٹ گئی ہے۔“

”ہاں، لمبے فاصلے کی کال میں لائن اکثر کٹ جاتی ہے اور کبھی صرف محسوس ہوتا ہے کہ کٹ گئی ہے۔“ اس کا لہجہ بظاہر عام تھا مگر اس کی تہ میں معنی خیزی چھپی ہوئی تھی۔

مجھے احساس ہوا کہ ثروت کو اس طرح بے وجہ فون بند نہیں کرنا چاہیے تھا۔ شاید وہ حواس باختہ ہو گئی تھی۔

ہم قریباً ایک گھنٹا یوسف کے ساتھ رہے۔ اس نے شاندار چائے پلائی۔ اپنی گفتگو میں اس نے کہیں اپنی رسوا کن محبت کا ذکر نہیں کیا... نہ ہی ہمیں بتایا کہ اس کی چہیتی جرمن بیوی بھی اس کے ساتھ اس گھر میں رہتی تھی۔ اس چہیتی بیوی کی صرف ایک نشانی ہمیں یہاں نظر آئی۔ یہ ایک شیفرڈ کتا تھا جو ڈاگ ہاؤس میں گوشت پر منہ مار رہا تھا۔ حمیدن کے مطابق یہ گریس کا کتا تھا۔ وہ شوہر کی طرح اس کتے کو بھی غیر اہم جان کر یہاں چھوڑ گئی تھی۔

یوسف ہمیں کھانا بھی کھلانا چاہتا تھا مگر مجھے ملازمہ حمیدن کی طرف سے اندیشہ تھا۔ ہم نے کھانے سے معذرت کی۔ یوسف نے ہم سے وعدہ لیا کہ ثروت اور نصرت کی آمد پر اگر پارٹی ارینج ہوئی تو ہم دونوں اس میں ضرور شرکت کریں گے۔ مجھ سے پہلے عمران نے وعدہ کر لیا۔ میں نے کولٹ پسٹل ایک ربڑ بینڈ کے ذریعے اپنی پنڈلی سے باندھ رکھا تھا۔ اس پسٹل کا ہلکا سا ابھار پینٹ میں سے نظر آتا تھا۔ مجھے شروع سے آخر تک یہی فکر رہی کہ کہیں یہ ابھار یوسف کی نگاہوں میں نہ آ جائے۔

عمران دس منٹ پہلے ہی فون کر کے جیلانی کو ہدایت

دے چکا تھا کہ وہ ہنڈا سوک لے کر گارڈن ٹاؤن پہنچ جائے۔ اس نے یوسف کا ایڈریس بھی سمجھا دیا تھا۔

قریباً پندرہ منٹ بعد ہم ہنڈا سوک پر یوسف سے رخصت ہو رہے تھے۔ میرے فون پر بار بار عاطف کی کال آ رہی تھی۔ میں نے گاڑی میں بیٹھ کر کال اٹینڈ کی۔ عاطف کی پریشان آواز سنائی دی۔ ”بھائی جان! وہ آنٹی جمیلہ جاگ گئی ہیں۔ بہت فکر مند ہیں۔ مسلسل رو رہی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کی بیٹی مہناز کو کچھ ہو گیا ہے اور ہم لوگ ان سے چھپا رہے ہیں۔ وہ بار بار اسے فون بھی کر رہی ہیں مگر وہاں سے کوئی جواب نہیں آ رہا۔“

”ٹھیک ہے، ہم دس منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔ تم ان کے پاس بیٹھو اور باتوں میں لگاؤ۔“ دس پندرہ منٹ بعد ہم ڈیفنس والی کوٹھی میں موجود تھے۔ آنٹی جمیلہ واقعی رو رو کر ہلکان ہو رہی تھیں۔ درحقیقت ان کی بیماری کی وجہ بھی بیٹی کا رویہ ہی تھا۔ اب بیٹی کی گمشدگی نے انہیں مزید تباہ حال کر دیا تھا۔

انہوں نے عمران کو کندھوں سے تھام کر جھنجوڑنا شروع کر دیا۔ ”تم لوگ مجھے ٹھیک بات بتاتے کیوں نہیں ہو؟ کیا ہوا ہے میری مہناز کے ساتھ؟ کہاں گئی ہے وہ؟ اس نے تو کبھی اس طرح اپنا فون بند نہیں کیا تھا۔ وہ خبیث جلالی بھی فون نہیں اٹھا رہا۔ اللہ کرے مر گیا ہو وہ۔ جنازہ نکل جائے اس کا۔ اس نے میری بیٹی کو تماشا بنا دیا ہے۔ پتا نہیں، کیا تعویذ گھول کر پلا دیے ہیں اسے۔“ وہ ایک بار پھر جلالی کو کوسنے لگیں۔

عمران نے کہا۔ ”آنٹی جی! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مہناز کے ساتھ کچھ ایسا ویسا نہیں ہوا۔ وہ خطرے سے بچ کر نکل گئی ہے۔ آپ خود سوچیں اگر وہ کسی مصیبت میں آ گئی ہوتی تو پھر اسے ڈھونڈنے والے اسپتال کیوں آتے اور آپ کو پکڑنے کی کوشش کیوں کرتے؟ وہ اصل میں ڈاکٹر مہناز ہی کو تلاش کر رہے ہیں۔“

”کیوں کر رہے ہیں؟ میری بیٹی نے کیا بگاڑا ہے کسی کا؟ اگر کسی کی دشمنی اس خبیث بڈھے کے ساتھ ہے تو اس میں میری بچی کا کیا قصور ہے؟“

ہم اسے کیسے بتاتے کہ وہ اس ”خبیث بڈھے“ کی بیوی ہے اور اس کی ہر اچھائی برائی میں اس کی حصے دار بن چکی ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ اس سارے معاملے میں پوری طرح ملوث ہو چکی ہے۔

ہم دونوں نے آنٹی سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور انہیں کافی حد تک پُرسکون کر دیا۔ میں نے کہا۔ ”آنٹی! آپ اپنا سیل فون ہر وقت کھلا رکھیں۔ کسی بھی وقت ڈاکٹر صاحبہ کی کال آپ کے نمبر پر آ سکتی ہے۔“

عمران نے کہا۔ ”اس کے علاوہ آپ ایک دو ایس ایم ایس بھی اسے کر دیں۔“

”مجھے نہیں کرنا آتا۔“ آنٹی جمیلہ نے اشک بار لہجے میں کہا۔

عمران نے آنٹی جمیلہ کی طرف سے دو ایس ایم ایس مہناز کے نمبر پر بھیج دیے۔ ان میں آنٹی کی بیماری کا ذکر تھا، اسپتال کا ذکر تھا اور مہناز سے کہا گیا تھا کہ وہ فوراً رابطہ کرے۔

آنٹی کو وہ دوائیں زبانی یاد تھیں جو انہیں اسپتال میں دی جا رہی تھیں... عاطف نے بازار سے وہ دوائیں لا دی تھیں۔ فرح نے ہمارے سامنے آنٹی کو دوا کھلائی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ غنودگی محسوس کرنے لگیں۔ ان کو آرام دینے کے پیشِ نظر ہم ان کے کمرے سے نکل آئے۔ فرح نے کہا۔ ”رات کا کھانا تیار ہے۔ ڈرائنگ روم میں آ جائیں۔“

”کیا پکایا ہے ہماری بہن نے؟“ عمران نے پوچھا۔

”آپ کی بہن نے نہیں، آپ کی انہوں نے پکایا ہے۔ زبردست قسم کے قیمہ کریلے، ساتھ میں دہی کی نمکین لسی اور گرم گرم روٹیاں۔“

عمران بولا۔ ”اگر یہ اہتمام شاہین نے کیا ہے تو پھر اس نے ضرور اس میں زہر ملایا ہوگا۔“

”زہر نہیں جی، محبت ملائی ہے۔ وہ آپ کی ناراضی دور کرنا چاہتی ہیں۔“

”میری بہن! چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر، زخم تو خربوزے کو ہی لگنا ہے۔ پہلی ناراضی دور ہو گئی تو پھر اگلی لڑائی کے لیے جگہ بنے گی نا۔ کیا زبردست شعر کہہ گئے ہیں اس بارے میں مولانا حسرت موہانی۔ سانوں نہر والے پل تے بلا کے تے ماہی خورا کتھے رہ گیا۔“

فرح اور عاطف ہنس ہنس کر دوہرے ہونے لگے۔ انہیں ہنستے دیکھ کر ہالو بے وجہ قلقاریاں مارنے لگا۔ فرح نے کہا۔ ”عمران بھائی! یہ شعر تو نہیں ہے اور یہ نہر کے پل کی بات کہاں سے آ گئی؟“

وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ”محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ اور یہاں تو محبت بھی ہے اور جنگ بھی۔“

میں نے کہا۔ ”واقعی ”محبت والے اونٹ“ کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ اب یہی دیکھو، وہ بے چاری تمہاری وجہ

www.paksociety.com

سے دکھی بھی ہوتی ہے اور تمہیں مناتی بھی ہے۔۔۔ تم سے معافی بھی مانگتی ہے۔''

''بہت خوب۔'' عمران نے دیدے نچائے۔ ''اس نے مجھے اڑنگا مار کر گرایا۔ میرے سینے پر سوار ہوئی، میرے بال نوچے اور تم اب بھی مجھے ہی جابر خاں قرار دے رہے ہو۔ ٹھیک ہی کہا تھا فلسطینی رہنما بروس لی نے، بے وقوف دوست سے عقل مند دشمن اچھا ہوتا ہے۔''

''بروس لی، فلسطینی رہنما نہیں تھا اور نہ ہی اس نے کوئی ایسی بات کہی تھی۔'' عاطف مسکرایا۔

''اوئے پھپھر! اگر تم حسرت موہانی کے شعر پر نہیں بولے تو بروس لی کے مقولے پر تمہیں کیوں تکلیف ہوئی ہے۔ یہ تو سراسر نسلی تعصب ہے بلکہ ہرول بھر شاٹ ہے۔''

''ہرول بھر شاٹ؟ یہ کیا ہوتا ہے عمران بھائی؟'' عاطف نے پوچھا۔

میں نے عمران کا گریبان پکڑ لیا۔ ''اب ایک لفظ بھی منہ سے نکالا۔ تو میں گھونسا جڑ دوں گا۔''

اس سے پہلے کہ باقاعدہ ہماری دھینگا مشتی شروع ہو جاتی، کچن کے دروازے پر شاہین نمودار ہوئی اور ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ فرح اور عاطف مسلسل ہنس رہے تھے۔

شاہین نے واقعی نہایت مزیدار کھانا پکایا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ سرکس میں جسمانی کرتب دکھانے والی یہ ہوش ربا لڑکی، گھر گرہستی بھی کر سکتی ہے۔

شاہین اور عمران کی صلح کی خوشی میں، میں نے سب کو آئس کریم کھلائی اور اردگرد کی گمبھیر پریشانیوں سے خود کو جدا کر کے کچھ اچھا وقت گزارا۔

بالو اس نئے ماحول میں بہت خوش تھا۔ وہ اپنی توتلی زبان میں بابا۔۔۔ تاتا کرتا تھا۔ ہر کوئی اسے گود میں اٹھائے پھرتا تھا۔ زری بھی اس ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کر چکی تھی۔ وہ اب باقاعدہ فرح سے پڑھ بھی رہی تھی۔ اس کے طور اطوار اب کافی سلجھ گئے تھے۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں گھاگرا چولی پہن کر اپنے جسم کی نمائش کرنے والی اور آنکھوں آنکھوں میں توبہ شکن اشارے پھینکنے والی زری اب ایک نئے سانچے میں ڈھلتی جا رہی تھی۔

زری نے شروع شروع میں کئی بار کہا تھا۔ ''میرا من ناہیں لگتا۔ مجھے زرگاں کی یاد آوت ہے، میں واپس جانا چاہت ہوں۔'' مگر اب وہ یہ فقرہ جیسے بھول ہی گئی تھی۔۔۔ میرے سامنے آتے ہوئے وہ اوڑھنی سے اپنا سینہ خوب ڈھانپ کر رکھتی تھی اور اس کی نگاہ بھی نیچی رہتی تھی۔ یہ اسباق اسے بھانڈیل اسٹیٹ میں سلطانہ نے ہی پڑھائے تھے۔

کھانا کھانے کے کچھ ہی دیر بعد عمران نے کہا۔ ''بس اب چلیں۔''

''کہاں؟'' میں نے دبی آواز میں پوچھا۔

''کہیں بھی، یہاں سے تو نکلیں۔ یہ نہ ہو کہ یہ ساری خوشی دھری کی دھری رہ جائے۔۔۔ اور ہم دونوں کے درمیان پھر جنگ چھڑ جائے۔'' اس کا اشارہ اپنے اور شاہین کی طرف تھا۔

جب ہم اچانک جانے کے لیے تیار ہو گئے تو وہ سب لوگ کافی مایوس ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ اب ہم آئے ہیں تو ایک دو دن رہیں گے اور ہلا گلا ہوگا۔ خاص طور سے شاہین چپ نظر آنے لگی۔ وہ واقعی دل کی گہرائیوں سے عمران کو چاہتی تھی۔ عمران کی طرف کیا صورتِ حال تھی، اس کا کچھ اتا پتا نہیں چلتا تھا۔

عمران نے سب کو تسلی دی کہ وہ ایک دو دن میں ضرور واپس آئیں گے اور پھر ہو سکتا ہے کہ ویک اینڈ ان کے ساتھ ہی گزاریں۔

میں سمجھ گیا کہ عمران کو کیوں جلدی ہے۔ ہم ایک مصیبت سیکریٹری ندیم کی شکل میں ہوٹل لالہ زار کے کمرے میں چھوڑ آئے تھے۔ اس مصیبت کی نگرانی پر بھی ایک مصیبت کو ہی مقرر کیا گیا تھا مجھے اور عمران کو پورا یقین تھا کہ ندیم کی جیب سے زیادہ کیش نکلا ہے۔ راجا نے صرف پانچ سو روپے شو کیے تھے۔

ہم ہوٹل لالہ زار پہنچے۔ یہاں راجا۔۔۔ بالکل راجا اندر بنا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگیں اٹھا کر میز پر رکھی ہوئی تھیں، وھسکی سے شغل کر رہا تھا اور کوئی چار درجن پری پیکر لڑکیاں اس کے سامنے رقص کر رہی تھیں۔ یہ لڑکیاں دراصل ٹی وی اسکرین پر تھیں۔ راجا نے کوئی گرما گرم انڈین فلم لگا رکھی تھی۔ وہ سب ناچتی تھرکتی حسیناؤں کو ایک ہی نظر اور ایک ہی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ نیچے ترپال پر ندیم اسی طرح بندھا پڑا تھا۔ ہاں، یہ تبدیلی ضرور آئی تھی کہ اس کی ٹانگ پر باقاعدہ پلاسٹر چڑھا ہوا تھا اور سرہانے دوائیوں کی کئی بوتلیں اور سرنجیں وغیرہ نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً راجا۔۔۔ اور اشفاق نے مل کر اس کے لیے کسی ڈاکٹر کا انتظام کیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ اشفاق رانا کا ایک پڑوسی اور ہم راز ڈاکٹر تھا۔

ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا تھا ورنہ ندیم کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔

''اب اس کا کیا کرنا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔ میرا اشارہ نیم بے ہوش پڑے ندیم کی طرف تھا۔

وہ بولا۔ ''بہتر تو یہی تھا کہ حضرت جلالی صاحب یہاں ہوتے۔ وہ اپنے طریقے کے مطابق اس نمک حرام کو کوئی یادگار سبق سکھاتے۔ لیکن وہ تو خود اس وقت زندگی موت کے درمیان جھول رہے ہیں۔ اس خبیث سے حساب ہمیں ہی برابر کرنا ہوگا۔''

''اب کیا کرو گے؟''

''کچھ نہیں، ابھی تو اسے کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچاتے ہیں جہاں یہ اطمینان سے ہماری مہمان نوازی کا لطف اٹھا سکے۔'' اس کے ساتھ ہی عمران نے اقبال کو فون کیا اور اس سے کہا کہ ندیم کے قیام طعام اور دشنام وغیرہ کا مناسب انتظام کیا جائے اور اسے لالہ زار ہوٹل سے بحفاظت اٹھا بھی لیا جائے۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران کے پاس شہر میں کوئی ایسی خاص جگہ موجود ہے جہاں کسی کی دخل اندازی کا ڈر نہیں اور وہ دو چار بندوں کو وہاں مستقل مہمان بنا کر رکھ سکتا ہے اور ان سے پوچھ گچھ بھی کر سکتا ہے۔

میرے فون پر میسیج پر میسیج آ رہے تھے۔ یہ نصرت کے میسیج تھے۔ وہ مجھ سے جاننا چاہتی تھی کہ یہاں لاہور میں اصل صورتِ حال کیا ہے۔ کیوں باجی ثروت کے ساتھ یوسف بھائی کے رویے میں نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں؟ کیا وہاں اندرونِ خانہ کوئی اتھل پتھل ہوئی ہے؟ یہ بھنک شاید نصرت کو بھی پڑ چکی تھی کہ یوسف کی جرمن بیوی اسے چھوڑ کر جا چکی ہے۔

اب میرے پاس اس حوالے سے مکمل معلومات موجود تھیں لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ یہ معلومات میرے ذریعے نصرت اور ثروت تک نہ پہنچیں۔ میرے دل میں یہ بات گھر کر چکی تھی کہ یوسف کے بارے میں، میں جو بھی منفی بات کروں گا، ثروت اس کا الٹا اثر لے گی۔ وہ یہی سمجھے گی کہ میں اس کی طرف اپنا راستہ ہموار کرنے کے لیے یوسف کے معاملات کو اچھال رہا ہوں۔

میں نے اس سلسلے میں عمران سے مشورہ کیا۔ اس کی رائے مجھ سے کچھ مختلف تھی۔ وہ بولا۔ ''دیکھو جگر! ہمیں اس بندے کی کیٹگری کا پتا چل چکا ہے۔ یہ کافی حد تک موقع پرست اور شاید نفس پرست بھی ہے۔ اپنی جرمن محبوبہ کے عشق میں ڈوب کر اس نے جس لڑکی کو برسوں تک قابلِ اعتنا نہ سمجھا، اب اس کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ اب اسے یہ احساس ہو رہا ہے کہ وہ ''پیتل'' کے عشق میں سونے کو مٹی میں رول رہا تھا۔ شاید ایسے ہی موقع کے لیے کہا جاتا ہے کہ ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ محبوبہ، بیوی کا نشہ ہرن ہوا ہے تو اب اسے ثروت نظر آ رہی ہے۔ وہ اسے اپنی قربتیں عنایت کرنا چاہ رہا ہے۔ دوسری طرف اس کے والد فاروقی صاحب بھی اس تبدیلی سے خوش ہوں گے۔ یعنی ایک تیر سے دو شکار۔ یہ محبت نہیں سراسر مطلب پرستی ہے اور ثروت کو اس مطلب پرستی سے آگاہ ہونا چاہیے۔''

بے فکری

تین مرد ٹرین میں بیٹھے تھے۔ قریب ہی ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ ایک مرد نے برہم لہجے میں خاتون سے کہا۔

''آپ اپنا سوٹ کیس یہاں سے اٹھا لیں۔''

''کیوں جناب؟'' خاتون نے حیرانی اور غصے سے کہا۔

''وہ اس لیے کہ کہیں میرے سر پر نہ گر جائے۔'' خاتون بے نیازی سے بولیں۔ ''آپ فکر نہ کریں اس میں کوئی چیز ٹوٹنے والی نہیں ہے۔''

(مرسلہ: محمد احسن، لاہور)

حساب دانی

ایک بڑے میاں ہر اتوار کو اپنے پوتے کے ساتھ گرجا گھر جاتے اور پادری کے وعظ کے دوران میں سو جاتے۔ ایک روز پادری نے پوتے سے کہا۔

''بیٹے! میں تمہیں دو ڈالر انعام دوں گا۔ تم اپنے دادا جان کو میرے وعظ کے دوران میں سونے نہ دیا کرو۔''

بچہ بڑی خوشی سے راضی ہو گیا مگر اگلے ہفتے بڑے میاں پھر زور و شور سے خراٹے لے رہے تھے۔ وعظ کے بعد پادری نے غصے میں پوتے سے کہا۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں تمہیں دو ڈالر دوں گا تم دادا جان کو سونے نہ دینا۔''

''جی جناب! مگر دادا جان نے مجھے تین ڈالر دیے تھے اور کہا تھا کہ مجھے جگانا نہیں۔''

(محمد امان، کوٹری)

www.paksociety.com

''وہ آگاہ ہو جائے گی یار! کچھ بھنک تو دونوں بہنوں کو پڑ ہی چکی ہے، باقی سب کچھ یہاں پاکستان آکر معلوم ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے جو ہمارے خیال ہیں، وہ نصرت کے بھی ہوں گے۔ وہ ثروت کو ہر اونچ نیچ سے آگاہ کرے گی۔''

''پھر بھی تابی! تمہیں خاموش نہیں رہنا چاہیے۔ چلو ثروت سے نہیں تو نصرت سے ایک بار تفصیل سے بات کرلو۔ اسے سمجھا دو کہ جو شخص پچھلے دو ڈھائی سال ثروت کو ہتک آمیز طریقے سے نظر انداز کرتا رہا ہے، اب اس کا شوہر بننے پر کیوں تُلا ہوا ہے۔''

میں نے عمران سے وعدہ کیا کہ میں نصرت کو فون کروں گا لیکن میں نے کیا نہیں۔ ہاں میں نے ایک عام سا میسیج ضرور کردیا۔ اس میں، میں نے نصرت کے اس شبہے کی تصدیق کی کہ یوسف اور گریس میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے اور گریس اسے چھوڑ کر واپس جرمنی جا چکی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اب یوسف، ثروت کو اہمیت دینے پر مجبور ہو رہا ہے۔

مجھے یقین تھا کہ باقی کا کام نصرت خود کرے گی اور بڑی بہن سے یوسف کے حوالے سے بحث مباحثہ کرے گی۔ لیکن یہاں مسئلہ یہ تھا کہ ثروت اپنے مشرقی مزاج کے مطابق یوسف کو مجازی خدا کا درجہ دے بیٹھی تھی۔ اس کی ساری ستم ظریفیوں کو اب تک خندہ پیشانی سے جھیلتی رہی تھی اور اب بھی جھیلنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے جب وہ یوسف کے خلاف خلع بہ آسانی حاصل کرسکتی تھی... لیکن بقول نصرت اسے خلع یا طلاق جیسے لفظ سے ہی نفرت تھی۔ اس کے ذہن میں کچھ واہمے بُری طرح بیٹھ چکے تھے اور ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اس نے یوسف سے طلاق لینے کا سوچا اور اس کا جوان بھائی ناگہانی موت کا شکار ہو گیا۔ اب وہ نصرت کی سنگین بیماری کو بھی اپنے ازدواجی حالات اور سوچوں سے نتھی کرچکی تھی۔ یہ خیال کسی عقیدے کی طرح اس کے ذہن میں راسخ تھا کہ وہ طلاق لینے والا گناہ کرے گی تو نصرت کی موت پر مہر تصدیق لگائے گی۔ میں نے اور عمران نے اس موضوع پر کئی بار بحث و تبصرہ کیا تھا۔ آخر کیوں ایسے واہمے... ایسے بے بنیاد عقیدے انسان کے ذہن میں پلتے ہیں اور پروان چڑھتے ہیں؟ کیا یہ انسان کے اندر کی کمزوریاں ہوتی ہیں جو وہ ان واہموں میں جکڑا جاتا ہے؟ میں فلاں کام کروں گا تو اس کی سزا مجھے فلاں طریقے سے بھگتنا پڑے گی۔ میں اس طرح سے خوشی حاصل کروں گا تو اس کا خمیازہ مجھے اس المیے کی صورت میں جھیلنا پڑے گا۔ اب بظاہر ''ایک گمراہ اور قدر ناشناس شوہر سے رخ پھیرنے میں'' اور چھوٹی بہن کے بیمار ہونے میں کوئی تعلق نہیں تھا مگر ثروت نے اپنے ذہن میں یہ تعلق بنایا ہوا تھا۔ اس تعلق پر ایک زوردار ضرب لگائے جانے کی ضرورت تھی۔ بے بنیاد واہمے کے اس بت کو یقین کے کلہاڑے سے چکنا چور کیا جانا ضروری تھا۔ ہم واہموں کے خلاف لڑ رہے تھے اور اب واہمے کا ایک اور سومنات ہمارے سامنے تھا۔ لیکن پتا نہیں کہ اس سومنات پر میں خود کوئی کلہاڑا چلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سومنات کو توڑنے والی خود ثروت ہو۔

اگلے روز میں اور عمران ڈیفنس والی کوٹھی میں واپس آگئے۔ خوب رونق رہی... باربی کیو کا جو پروگرام کافی عرصے سے ملتوی ہو رہا تھا، پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ میڈم مغفورا بھی اس خوشگوار تقریب میں شریک ہوئی۔ وہ ہلکا پھلکا رقص بھی کر لیتی تھی۔ اس کے رقص نے محفل کو دوبالا کیا۔ اس نے کھینچ کر عمران کو بھی اپنے ساتھ شریک کرلیا۔ عمران بھی ہرفن مولا شخص تھا۔ اس سے پہلے میں نے اسے پرانے محلے میں چاچے نذیر کی شادی پر رقص کرتے دیکھا تھا۔ بڑی خوب صورتی اور لے تھی اس کی حرکات و سکنات میں۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ریشم کی طرح نرم یہ شخص وقت آنے پر فولاد بلکہ دہکا ہوا فولاد بن جاتا ہے۔ شاہین اور زری نے بھی اس ہلکے پھلکے رقص میں شرکت کی۔ فرح اور عاطف نے گٹار بجانے پر اکتفا کیا۔ میں اور اقبال تالیاں بجاتے رہے۔ زندگی میں سنگینی اور رنگینی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اس بات کا علم صرف مجھے اور عمران کو تھا کہ جہاں یہ محفل برپا ہے، وہیں زمین میں سراج کے خطرناک غنڈے کی لاش بھی دبی ہوئی ہے۔

اس تقریب کے دوران میں ہی میرے سیل فون پر کال آئی۔ یہ یوسف کی طرف سے تھی۔ یوسف نے مجھے بتایا کہ... پرسوں ثروت آسٹریا سے واپس آرہی ہے۔ اس خوشی میں ایک گیٹ ٹوگیدر ہے۔ مجھے اور عمران کو ہر صورت آنا ہے۔ وقت رات نو بجے کا تھا۔

میری دھڑکنیں تیز ہوتی جارہی تھیں۔ میری اور ثروت کی کہانی ایک نئے موڑ پر آرہی تھی۔

اگلے دو روز میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا، سوائے اس کے کہ ایک بار آنٹی جمیلہ کے فون پر ایک گمنام نمبر سے کال آئی۔ آنٹی نے ریسیو کی تو دوسری طرف مہناز تھی۔ اس نے بس اتنا ہی کہا۔ ''ہیلو امی! میں مہناز بول رہی ہوں۔'' اس کے بعد کسی وجہ سے لائن کٹ گئی۔ آنٹی جمیلہ دیوانہ وار ہیلو ہیلو کہتی رہیں۔ ہم نے اس موبائل نمبر کا پتا کروایا جس سے کال آئی تھی۔ حسبِ اندیشہ وہ نمبر گمنام ہی

نکلا۔ ایمن آباد کے ایک مزدور شرافت علی کا ایڈریس تھا۔ اس بے چارے کا بس شناختی کارڈ ہی استعمال ہوا تھا۔ اس کال سے کم از کم اتنا تو ثابت ہوا کہ مہناز جہاں کہیں بھی ہے، زندہ سلامت ہے۔

جلالی صاحب بدستور کومے کی حالت میں تھے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر یقین سے کچھ نہیں کہہ پا رہے تھے۔ ان کی عمر تو مزاحمت کرنے والی نہیں تھی لیکن ان کی سخت جانی دیکھتے ہوئے امید کی جاسکتی تھی کہ شاید وہ موت کے فرشتے پر بھی گرجیں برسیں اور اسے اس کے کام سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ ایس پی حمزہ صاحب دیگر پولیس افسران کے ساتھ مل کر خاصی تگ و دو کر رہے تھے لیکن ابھی تک مہناز اور رسام کا کوئی کھوج ملا تھا اور نہ ہی آرا کوئے کا کوئی سراغ ہاتھ آیا تھا۔

اسپتال سے آنٹی جمیلہ کے اغوا کی کچی رپورٹ بھی درج ہوئی تھی۔ تاہم ہم نے ایس پی حمزہ صاحب کو آگاہ کردیا تھا کہ آنٹی ہمارے پاس حفاظت سے ہیں۔ حمزہ صاحب نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی تھی کہ ہم انہیں اپنے پاس رکھیں۔

اسپتال کے سامنے اندھا دھند فائرنگ میں زخمی ہونے والے اے ایس آئی گل احمد کی حالت اب اسپتال میں خطرے سے باہر تھی۔ میں نے فون پر اس کی مزاج پرسی کی تھی۔

جاوا گروپ کی ہنگامہ خیزی بھی کچھ ماند پڑ گئی تھی اور یقیناً اس کی وجہ یہی تھی کہ جاوا کو اپنے ایک دوسرے پھڈے کے سلسلے میں فوراً بمبئی جانا پڑ گیا تھا۔ جاوا کے کئی قریبی اور سرگرم ساتھی بھی جاوا کے ساتھ ہی گئے تھے۔ عمران نے ریان ولیم سے جو رقم نصرت کے ''اسپتال کے بل'' کے لیے لی تھی، اس کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ یوسف آج کل حاتم طائی کی قبر پر لات مار رہا تھا اور خاص طور سے ثروت پر مہربانیوں کی بارش کر رہا تھا۔ نصرت نے ہمیں بتایا تھا کہ اسپتال کا بل یوسف بھائی کی طرف سے ادا کیا جا چکا ہے۔

اور یہ ایک رنگین شام تھی۔ گارڈن ٹاؤن میں یوسف فاروقی کی رہائش گاہ جگمگا رہی تھی۔ کوٹھی کے اندر باہر کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وسیع لان میں خوب صورت شامیانہ لگا کر کیٹرنگ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یوسف اپنی شادی کو ''ری نیو'' کر رہا ہے۔ آج کئی ماہ بعد میں نے ثروت کو دیکھا۔ جھلملاتے ستاروں والی نیلگوں ساڑی میں وہ دلکش نظر آئی تھی۔ ساڑی کے ستاروں کی جھلملاہٹ میں اس کا چہرہ چاند کی طرح تھا مگر یہ چاند روشن ہونے کے باوجود اُداس تھا۔ اس کی تہ میں کہیں اداسی اور پژمردگی ایک سرد اندھیرے کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔

یوسف کی موجودگی میں ہمارے درمیان بس یہ گفتگو ہوئی۔

''ہیلو تابش!''

''ہیلو ثروت! کیسی ہو تم؟ بہت کم تبدیلی آئی ہے تم میں۔''

''لیکن آپ میں تبدیلی آئی ہے اور اتنا عرصہ کہاں غائب رہے ہیں آپ؟ نصرت بتا رہی تھی کہ آپ کہیں انڈیا وغیرہ چلے گئے تھے۔''

''ہاں، کچھ عرصہ رہا ہوں انڈیا میں بھی۔ امی کے جانے کے بعد دل ایک دم اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ کہیں نکل جانے کو جی کرتا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہوگا، ان کی موت جن حالات میں ہوئی۔''

ثروت نے اثبات میں سر ہلایا اور دکھ بھری سانس لی اور موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ''فرح اور عاطف کیسے ہیں؟ سنا ہے کہ وہ بھی لاہور میں ہیں۔ ان کو بھی لے آتے آپ۔ مدت ہو گئی انہیں دیکھے ہوئے۔''

''چلیں، اب کسی دن ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔''

بس اسی طرح کی چند رسمی باتیں ہوئیں۔ قریب کھڑی نصرت نے جب دیکھا کہ باتیں کچھ زیادہ ہی رسمی اور بے محل ہو گئی ہیں تو اس نے مداخلت کی اور چہکنے لگی۔ وہ اس وقت صحت مند نظر آرہی تھی۔ خوب سجی ہوئی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک سنگین بیماری سے فائٹ کر رہی ہے۔

یہ ایک اچھی تقریب ثابت ہوئی۔ میوزک... قہقہے... کھانا... ڈرنک، سب کچھ موجود تھا۔ بس اس تقریب میں دو باتیں کچھ علیحدہ سی تھیں۔ ایک تو یوسف کی تیز نظریں جو گاہے بگاہے میرے اندر کچھ ٹٹولنے لگتی تھیں اور دوسرے ثروت کے بظاہر مسکراتے چہرے کے پیچھے چھپی ہوئی بیزاری آمیز اداسی۔ ایک دو بار اس سے نظریں ملیں لیکن یہ نظریں کسی بھی طرح کا ابلاغ نہیں کرسکیں۔ عمران اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''اس موقع پر ایک پیانو ضرور ہوتا ہے اور ہیرو اس پر گانا گاتا ہے۔ ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ... یا پھر، جھوم جھوم کے ناچو آج، گاؤ آج...''

www.paksociety.com

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اگر تم گانا چاہو تو گا سکتے ہو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

اسی دوران میں تین چار مہمان عمران کے پاس آن کھڑے ہوئے۔ ان میں دو لڑکیاں اور ایک جواں سال شخص تھا۔ "ہیلو جی!" جواں سال شخص نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ عمران سے مصافحہ کیا۔ "ہم نے آپ کو پہچان لیا ہے جی۔ بڑی خوشی ہوئی ہے آپ جیسے انٹرنیشنل فنکار کو یہاں دیکھ کر۔" اس نے کہا۔

"انٹرنیشنل فنکار؟" عمران نے حیرت سے کہا۔ "میں نے تو کسی فلم میں کام نہیں کیا۔"

ایک لڑکی ہنسی۔ "فلموں میں کام کرنے والے تو مصنوعی ہیرو ہوتے ہیں جی۔ اصل ہمت و جرأت تو آپ لوگ دکھاتے ہیں۔ ہم نے اسٹار سرکس میں دو تین بار آپ کا شو دیکھا ہے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے عمران کے گرد بھیڑ لگ گئی۔ دو چار دیگر معزز مہمانوں نے بھی اسے ACROBAT کی حیثیت سے پہچان لیا۔

نصرت نے عمران کا بازو تھام لیا۔ "عمران بھائی! دیکھیں لوگ آپ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اس وقت تفریح کا ماحول بنا ہوا ہے... آپ کچھ تھوڑا بہت دکھائیں نا۔"

"تمہارا مطلب ہے میں یہاں قلابازیاں لگانا شروع کر دوں؟"

"نہیں، لیکن کوئی چھوٹا موٹا ٹرک۔ کوئی ہاتھ کی صفائی۔"

عمران نے اپنی خوب صورت ٹائی پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ "میرا تو ایک ہی "ٹرک" لوگوں کو زیادہ پسند ہے۔ ریوالور میں ایک گولی رکھ کر اور چرخی گھما کر اپنے آپ پر فائر کرنا۔"

"نہیں، نہیں۔ ایسا خطرناک کام نہیں۔ کچھ اور۔" نصرت نے ٹھنک کر کہا۔

"تو اپنے تابش بھائی سے کہو نا۔ اب یہ بھی کچھ کم فنکار نہیں ہے۔ برف کے بلاک کو دو ٹکڑے کر سکتا ہے۔ ٹکر مار کر درخت کو اکھاڑ سکتا ہے۔ ڈبل اینٹیں چبا سکتا ہے۔"

"آپ مذاق نہ کریں۔" نصرت نے اس کا کندھا جھنجوڑا۔

"اچھا کچھ دیکھتا ہوں۔ شاید گاڑی میں کوئی چیز مل جائے۔"

… وہ گاڑی میں گیا اور کچھ دیر بعد ایک ریوالور لے آیا۔ سب اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ نصرت نے احتجاج کیا۔ "یہ کیا عمران بھائی! آپ پھر یہ ہتھیار لے آئے۔"

"اور کچھ تھا ہی نہیں۔ تاش کے پتوں وغیرہ کے کھیل تو آپ لوگوں کو پسند نہیں آئیں گے نا۔"

عمران نے ریوالور کا چیمبر کھولا اور اس کے دو خانوں میں گولی ڈال دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے چرخی گھمائی اور ریوالور کی نال اپنی بائیں ہتھیلی پر رکھ دی۔

"نہیں نہیں... ایسا نہیں کرنے دیں گے۔" یوسف آگے بڑھ کر بولا۔ "یہ خوشی کی محفل ہے بھائی صاحب! ہمیں کوئی رسک نہیں لینا چاہیے۔"

عمران نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "مجھے بھی پتا ہے۔ اسی لیے نقلی ریوالور لایا ہوں۔ صرف پٹاخا چلے گا لیکن آپ اس کو اصلی گولی ہی سمجھیے اور دیکھیے میری "لک" کام کرتی ہے یا نہیں۔ میں تین مرتبہ ٹریگر دباؤں گا اور مجھے یقین ہے، تینوں بار گولی نہیں چلے گی۔"

یوسف نے ریوالور الٹ پلٹ کر دیکھا۔ یہ واقعی "ڈمی" نظر آ رہا تھا۔ لوہے پر برش سے رنگ کیا گیا تھا۔ عمران نے ریوالور ہتھیلی پر رکھا اور ٹریگر دبایا۔ "ٹرچ" کی آواز نکل کر رہ گئی۔ دوسری بار پھر چرخی گھمائی گئی۔ اس مرتبہ بھی گولی نہیں چلی... تیسری مرتبہ بھی گولی اور "ہیمر" آمنے سامنے نہیں آئے۔ عمران نے کہا۔ "بات صرف اعتماد اور یقین کی ہوتی ہے۔ جب آپ یقین کے ایک خاص لیول کو چھو لیتے ہیں تو پھر غیر مرئی طاقتیں آپ کا ساتھ دینے لگتی ہیں۔ آپ کے پانسے سیدھے پڑنے لگتے ہیں۔" عمران نے دونوں فائر ہوا میں کیے۔ دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔

ایک فیشن ایبل لڑکی نے انگریزی میں پوچھا۔ "مسٹر عمران! آپ اصلی گولیوں سے بھی کھیلتے ہیں... اس وقت آپ کے احساسات کیا ہوتے ہیں؟"

"ویسے ہی جیسے اب ہیں۔" عمران نے سیدھا جواب دیا۔

ایک خاتون نے کہا۔ "سنا ہے آپ کا نشانہ بھی بہت اچھا ہے۔"

عمران نے کہا۔ "غالباً آپ نے ٹھیک ہی سنا ہے۔ آپ اپنے سر پر سیب رکھیں، میں ابھی اڑانے کو تیار ہوں۔"

ایک شخص نے خاتون کے شوہر کو مخاطب کر کے ہانک لگائی۔ "شاہ صاحب! جلدی کیجیے۔ سیب لائیے۔ آپ کے لیے اچھا موقع پیدا ہو رہا ہے۔"

… محفل کشتِ زعفران بن گئی۔ میری نظر ایک بار پھر ثروت کی طرف اٹھی۔ وہ اس شور شرابے میں بھی بالکل تنہا تھی۔ اکیلی... اداس... اس کی اداسی جیسے اڑ اڑ کر میرے سینے تک بھی پہنچ رہی تھی اور میرے اندر ایک صحرا سا آباد کر رہی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان چند میٹر کا فاصلہ تھا لیکن یہ صدیوں پر محیط تھا۔ وہ یوسف فاروقی کی بیوی بن کر بھی اس کی بیوی نہیں تھی۔ اس کے ہونٹوں پر میرے ہونٹوں کی مہر کے سوا ابھی کوئی مہر نہیں تھی۔ لیکن اب صورت حال بدل رہی تھی۔ کیا واقعی صورتِ حال بدل رہی تھی؟

ہم دونوں رات دو بجے کے لگ بھگ یوسف، ثروت اور نصرت سے رخصت ہو کر واپس لوٹے۔ رات اوس میں بھیگی ہوئی تھی۔ نہر کنارے چاندنی کا پڑاؤ تھا۔ وہ ریوالور جس سے عمران نے محفل میں تماشا دکھایا تھا، سیٹ کے نیچے پڑا تھا۔ اسپیڈ بریکر پر جھٹکا لگنے سے وہ میرے پاؤں کی طرف کھسک آیا۔ میں نے اسے اٹھایا اور اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا پھر ایک جھانپڑ عمران کی گردن پر مارا۔ ریوالور نقلی نہیں تھا۔

☆☆☆

... وہ بڑی جان لیوا شب تھی۔ میں کمرے میں بے چین ٹہل رہا تھا۔ میرے اندر وہی کیفیت پیدا ہو رہی تھی، جب میرا دل چاہتا تھا کہ میں اپنے جسم کو بڑی بے رحمی سے اذیت کی بھٹی میں جھونک دوں۔ کچھ ایسا کروں کہ میرے مساموں سے پسینے کے بجائے لہو رسنے لگے۔ میری ہڈیاں چٹخ جائیں اور سینہ پھٹ جائے۔

اگلی صبح نو بجے کے لگ بھگ نصرت کا فون آ گیا۔ "کیسے ہیں تابش بھائی؟" اس نے نارمل آواز میں پوچھا۔

"ٹھیک۔"

"اتنا مختصر جواب... کیا یہ اور مختصر نہیں ہو سکتا تھا؟"

میں خاموش رہا۔ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "بھائی جان! میں آپ کی دلی کیفیت سمجھ رہی ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ جو کچھ آپ جھیل رہے ہیں، میں بھی آپ کے ساتھ جھیل رہی ہوں۔ لیکن ہمارے پوائنٹ آف ویو سے ایک اچھی اطلاع بھی ہے جو میں آپ کو پہنچانا چاہتی ہوں۔"

"کیسی اطلاع؟" میں نے پژمردہ آواز میں پوچھا۔

"باجی ثروت میں کچھ تبدیلیاں آئی ہیں۔ یوسف بھائی کے لیے ان کی بے دام کی غلامی میں کچھ فرق پڑا ہے۔ وہ یوسف بھائی سے کچھ کھنچی ہوئی ہیں۔ رات کو بھی وہ ماسٹر بیڈ روم میں سونے کے بجائے اس کمرے میں سوئی ہیں جہاں … کی موجودگی میں سویا کرتی تھیں... اوپر والی منزل میں۔"

"اس سے کیا ہوگا نصرت؟"

"مجھے نہیں پتا لیکن انہوں نے یوسف بھائی کو کم از کم یہ تو بتا دیا ہے کہ وہ چابی والا کھلونا نہیں جسے جب چاہا الماری میں پھینک دیا، جب چاہا نکالا اور چابی گھما کر چلا لیا۔"

نصرت کی باتیں میرے دل میں عجیب سی امید جگا دیتی تھیں۔ اس وقت بھی اس کی باتوں نے امید جگائی۔ یوں لگا جیسے میں ابھی مکمل طور پر ڈوبا نہیں ہوں۔ ہاتھ پاؤں چلانے کی گنجائش باقی ہے اور شاید سہارے کے لیے دو چار تنکے بھی میرے ہاتھ آ گئے ہیں۔

نصرت کہہ رہی تھی۔ "... تابش بھائی، پلیز! آپ نے ہمت نہیں ہارنی۔ اگر آپ نے ہمت ہار دی تو قسم سے میں بھی ہار دوں گی۔ میں وقت سے پہلے ہی مر جاؤں گی۔ میں اگر اب تک زندہ ہوں تو صرف اس لیے کہ میں آپ کے چہرے پر امید دیکھ رہی ہوں۔ وہ امید جو آپ کو اور باجی کو ایک کر سکتی ہے۔"

میں خاموش رہا۔ وہ بولی "... مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ آپ مجھے بتائیں، میں آپ سے ملنے کہاں آؤں؟"

"کیا بات ہے نصرت؟"

"وہ ایسے نہیں حل کر ہی ہو سکے گی۔ آپ بتائیں آپ کہاں مل سکتے ہیں اور کب؟"

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "اگر ضروری ہے تو پھر جس طرح تم چاہو۔ تم مجھے اپنی سہولت کے مطابق بتا دو۔ میں پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے تابش بھائی! کل دوپہر گلبرگ کے "فوڈ پوائنٹ" پر۔ آپ ایک بجے تک پہنچ جائیں۔"

اگلے روز میں مقررہ وقت پر ریسٹورنٹ پہنچ گیا اور نصرت کا انتظار کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ ہماری گفتگو ثروت اور یوسف کے حوالے سے ہی ہوگی لیکن مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس گفتگو میں ثروت خود بھی موجود ہوگی۔ مجھے تب پتا چلا جب نصرت اور ثروت دونوں ریسٹورنٹ میں داخل ہوئیں۔ نصرت کا وزن کافی کم ہو چکا تھا مگر وہ ہشاش بشاش تھی۔ اس نے دور ہی سے مجھے دیکھ لیا لیکن ظاہر نہیں کیا۔ جب وہ دونوں بالکل قریب پہنچ گئیں تو نصرت نے حیرت ناک لہجے میں کہا۔ "اوہ تابش بھائی! آپ یہاں؟"

میں اٹھ کھڑا ہوا اور ان دونوں سے ملا۔ میں سمجھ گیا کہ نصرت نے ڈراما کیا ہے اور اب مجھے بھی یہ ظاہر کرنا ہے کہ…

www.paksociety.com

ملاقات اتفاقیہ ہوئی ہے۔

میں نے دونوں کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ چند لمحوں کے لیے تو یوں لگا جیسے ثروت پلٹ جائے گی یا پھر کسی اور میز پر بیٹھے گی۔ لیکن جب نصرت بیٹھ گئی اور شولڈر بیگ میز پر لٹکا دیا تو مجبوراً ثروت کو بھی بیٹھنا پڑا۔ وہ پریشان نظر آ رہی تھی اور بے چین نظروں سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ اتفاقاً میں ایک نیم تاریک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ جگہ باقی ہال سے کچھ کٹی ہوئی تھی۔ ثروت کے جسم سے اٹھنے والی ''پروفیسی'' کی خوشبو یادوں کے تار چھیڑ رہی تھی۔

''آپ کیا لیں گی؟'' میں نے نصرت اور ثروت کو مشترکہ طور پر مخاطب کیا۔ ثروت سے پہلے ہی نصرت بول اٹھی۔ ''کھانے کا وقت ہے پیزا منگوا لیجیے۔ میرا خیال ہے کہ ہم تینوں شوق سے کھا لیں گے۔''

''نہیں نصرت! میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔ اور مجھے جلدی واپس بھی جانا ہے۔ تم صرف کوئی کولڈ ڈرنک منگوا لو۔''

''خدا کا خوف کریں باجی۔ اگر اتفاقاً تابش بھائی ہاتھ آ ہی گئے ہیں تو ان کی جیب کچھ ہلکی کرنی چاہیے۔''

''پلیز نصرت! مسخری مت کرو۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی۔'' ثروت نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ اس کے بالوں کی لٹ اس کے سرخ ہوتے چہرے پر جھولنے لگی تھی۔

''اچھا بابا! کولڈ ڈرنک ہی منگوا لیتے ہیں۔''

میں نے کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا۔

ثروت بدستور لال بھبوکے چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی۔ نصرت نے لجاجت سے کہا۔ ''پلیز باجی! اگر اتفاق سے تابش بھائی مل ہی گئے ہیں تو آپ اس طرح آگ بگولا تو نظر نہ آئیں۔''

''میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں۔'' وہ تپے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کیا مطلب؟''

''تم جان بوجھ کر مجھے یہاں لائی ہو۔ تم نے پلان کیا ہے۔ یہ کوئی ٹی وی ڈراما نہیں ہے، زندگی ہے... اس میں اس طرح کے ناٹک نہیں چلتے...'' اس کے خوب صورت بندے ہل رہے تھے جیسے وہ بھی طیش میں لرز رہے ہوں۔

نصرت نے گہری سانس لے کر بڑی بہن کی طرف دیکھا پھر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''اچھا جو بھی ہے، اب اپنا موڈ ٹھیک کریں۔ ہم ڈرنک لے کر چلے جاتے ہیں یہاں سے۔''

وہ درد سے بولی۔ ''تم لوگ... یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ یہ آگ کا کھیل ہے۔ اس کی کوئی ایک چنگاری بھی میرے گھر کو برباد کر سکتی ہے... اور میں... ہرگز یہ نہیں چاہتی۔ اور نہ کسی کو ایسا کرنے کی اجازت دوں گی۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ثروت! یقین کرو، مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ یہاں تم دونوں سے ملاقات ہو گی۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں؟''

''لیکن آپ کو یہ تو پتا ہوگا کہ نصرت آپ سے ملنے آ رہی ہے۔ وہ کیوں آ رہی تھی۔ آپ دونوں میرے بارے میں ہی ڈسکس کرنا چاہتے ہوں گے نا۔''

''نصرت نے صرف اتنا کہا تھا کہ ایک بہت اہم بات ہے اور اس کے لیے میرا آنا بہت ضروری ہے۔ یہ روہانسی ہو رہی تھی۔''

نصرت نے کہا۔ ''اچھا باجی! ان باتوں کو چھوڑیں... پلیز چھوڑیں۔ میں آپ سے... بلکہ آپ دونوں سے بس... اور بس اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ خدا کے لیے ان حالات کے بارے میں ٹھنڈے دل دماغ سے سوچیں... آپ دونوں سمجھ دار ہیں، پڑھے لکھے ہیں، جھوٹ اور سچ میں فرق کر سکتے ہیں۔ خود کو رسموں، رواجوں کی بھینٹ نہ چڑھنے دینا۔ اگر کوئی راستہ نکل سکتا ہے تو نکال لینا۔ میں نے دیکھا ہے باجی کہ...''

ثروت کا چہرہ سرخ تر ہو گیا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں جا رہی ہوں۔''

نصرت نے بیٹھے بیٹھے اس کا بازو تھام لیا۔ ''پلیز باجی... پلیز! ایسا نہ کریں۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ جانا چاہتی ہیں تو ہم دونوں چلتے ہیں۔ آپ دو منٹ بیٹھ جائیں۔''

''نصرت! چھوڑو مجھے۔'' ثروت نے تلخ لہجے میں کہا اور ہاتھ پیچھے کھینچا۔ اس کی کہنی لگنے سے شیشے کا گلاس گر کر ٹوٹ گیا۔

''پلیز باجی۔'' نصرت نے التجا کی۔ اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آئی تھی۔

یہ جیسے اس کی آواز ہی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے بھی ثروت کی طرح چونک کر نصرت کو دیکھا۔ اس کا چہرہ ہلدی ہو رہا تھا۔ ہونٹ ایک دم ہی نیلے سے پڑ گئے تھے۔ پھر اس نے ثروت کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا اور دونوں بازو میز پر رکھ کر ان پر اپنا سر جھکا دیا۔ اس کے جسم میں لرزش تھی۔

''کیا ہوا نصرت؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

ثروت بھی ایک دم ٹھٹک گئی۔ وہ اس نے شولڈر بیگ

پھر سے میز پر رکھا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''نصرت... نصرت!'' اس نے اس کا شانہ ہلایا۔

نصرت اسی طرح بیٹھی رہی۔ لمبی سانسیں لیتی رہی۔

''ویٹر! پانی لاؤ۔'' میں نے پکار کر کہا۔

اردگرد کے لوگ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے تھے۔ ایک کونے میں پیانو بجاتے فنکار ملازم نے بھی اپنے ہاتھ روک لیے۔

''یااللہ خیر۔'' ثروت بولی۔

ویٹر پانی لایا۔ ہم نے نصرت کو پلانے کی کوشش کی۔ وہ صرف ایک گھونٹ ہی بھر سکی۔ اس کے ہونٹ خشک تر اور نیلگوں ہوتے جا رہے تھے۔

''تابش! اس کو اسپتال لے جانا ہوگا۔'' ثروت نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

میں نے ریسٹورنٹ کے ایک سینئر ملازم کو ثروت کی گاڑی کی چابی دی کہ وہ اسے ڈرائیو کر کے دروازے کے عین سامنے لے آئے۔ میں اور ثروت، ڈگمگاتی نصرت کو سہارا دے کر دروازے پر لے آئے۔ اسے گاڑی میں سوار کر کے ہم تیزی سے قریبی کلینک کی طرف روانہ ہوئے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر تھا، نصرت پچھلی سیٹ پر نیم دراز تھی اور اس کا سر ثروت کی گود میں تھا۔ ثروت مسلسل اسے دلاسا دے رہی تھی۔ میں نے تیز ڈرائیونگ کی اور چار پانچ منٹ میں کلینک پہنچ گئے۔ نصرت کو فوراً ایمرجنسی میں پہنچایا گیا۔ اس کی گردن پسینے سے تر تھی اور وہ تیز سانس لے رہی تھی۔ اتفاقاً نصرت کی ایک میڈیکل فائل گاڑی میں ہی تھی۔ اس میں اس کی بیماری سے متعلق کئی اہم کاغذات موجود تھے۔

ثروت نے ایک سینئر ڈاکٹر کو یہ فائل دکھائی۔ فوری طور پر نصرت کے وائٹل سائنز چیک کیے گئے۔ ڈاکٹر کہا۔ ''گھبرانے کی بات نہیں، وقتی اثرات ہیں۔ انشاء اللہ یہ ابھی ٹھیک ہو جائیں گی۔''

نصرت کو ایمرجنسی میں ہی گلوکوز ڈرپ لگا دی گئی۔ ایک دو انجکشن بھی اس میں لگائے گئے۔ ہم دونوں نصرت کے اردگرد اکڑوں بیٹھے تھے۔ ثروت کا چہرہ اس کی شدید اندرونی پریشانی کا غماز تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد نصرت کی حالت بہتر ہونا شروع ہو گئی۔ اس کی سانس ہموار ہونے لگی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں کے باہری گوشے نم ہوئے پھر ان میں سے دو موٹے آنسو نکل کر اس کے کانوں کی طرف رینگ گئے۔

ثروت نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے اسے پچکارا۔ ''نہیں میری گڑیا! نہیں، ایسا نہیں کرتے۔''

وہ خاموش رہی۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمایا ہوا تھا۔ شاید ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے اپنے ایک ہاتھ میں میرا اور دوسرے میں ثروت کا ہاتھ تھام لیا اور عجیب آواز میں بولی۔ ''میں آپ دونوں کے لیے جی رہی ہوں۔ آپ دونوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں آپ سے... اور کچھ نہیں کہتی، صرف اتنا کہتی ہوں... آپ اپنے اپنے حالات کو سمجھیں۔ اپنے بارے میں جو فیصلہ کریں، پوری سچائی کے ساتھ کریں۔ زمانے پر نہ جائیں۔ یہ زمانہ تو کسی حال میں خوش نہیں ہوتا۔''

ثروت نے نرمی سے کہا۔ ''اچھا... ابھی تم چپ رہو۔ خود کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرو۔''

''آپ خوش ہوں گے، تو میں خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ سچ کہتی ہوں باجی! خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' وہ رونے لگی۔

ثروت جھکی اور بے چین ہو کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا... اسے پچکارنے لگی۔ ہم دونوں کے ہاتھ ابھی تک نصرت کے ہاتھ میں تھے۔ پتا نہیں کس جذبے کے تحت اس نے یہ دونوں ہاتھ باہم ملا دیے اور انہیں اپنی گردن کے نیچے سینے پر رکھ لیا۔ ثروت کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے میری نگاہوں سے ٹکرائیں... اور پھر جھک گئیں۔

ڈرپ ختم ہونے تک ہم دونوں نصرت کے دائیں بائیں موجود رہے اور اس سے دل بہلاوے کی باتیں کرتے رہے۔ پرانے دنوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں جن کے پیچھے یادوں کے تانے بانے پھیلے ہوئے تھے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ڈرپ ختم ہو گئی۔ نصرت کی طبیعت اب کافی سنبھل چکی تھی۔ ڈاکٹر نے جانے کی اجازت دے دی۔ ثروت جلد از جلد گھر واپس لوٹنا چاہتی تھی...... میری گاڑی ابھی تک شاپنگ پلازا پر ہی کھڑی تھی۔ نصرت اور ثروت اپنی گاڑی پر گھر روانہ ہو گئیں تو میں رکشا پکڑ کر شاپنگ پلازا کی طرف چل دیا۔ میرے ہاتھ پر ابھی تک ثروت کا لمس موجود تھا اور کسی سنہری روشنی کی طرح چمک رہا تھا۔ لاہور میرے اردگرد تھا۔ اس کے گلی کوچوں میں زندگی اپنی بھرپور روانی کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ وہی جانا پہچانا شور، وہی دیکھے بھالے مناظر اور ان مناظر سے بہت اوپر نیلا آسمان، جس نے لاہور کے گنبدوں، میناروں اور شاہراہوں پر سایہ کر رکھا تھا۔ اس آسمان پر سفید کبوتر اٹکھیلیاں کرتے تھے اور رنگ برنگی پتنگیں

فرانے بھرتی تھیں۔ یہ ایک خوشگوار شام تھی۔ میں اس شام کے اثر میں ڈوب گیا۔ مجھے لگا رکشا ڈرائیور عقب نما آئینے میں میرے ''ہاتھ'' کو دیکھ رہا ہے... اور اس ''ہاتھ'' پر چمکتا ہوا سنہری لمس اسے نظر آرہا ہے۔ میں نے بے ساختہ اس ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے ڈھانپ دیا۔

اسی دوران میں عمران کی فون کال آگئی۔ اس نے پوچھا۔ ''کہاں ہو؟''

میں نے کہا۔ ''ڈیفنس کی طرف ہی آرہا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''اب ڈیفنس کی طرف نہ آؤ۔ سیدھے تھانہ گلبرگ آجاؤ۔ میں یہیں پر ہوں۔''

''کیا ہوا؟ لاہور کالج کی کسی لڑکی سے جوتے تو نہیں کھائے تم نے؟''

''لگتا ہے کہ تمہیں کوئی تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں۔ میں پکڑا نہیں گیا ہوں بلکہ کسی کو پکڑنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ ایک اہم کھوج ملا ہے ڈاکٹر مہناز کا۔ اس کے ساتھی ڈاکٹر رسام کی مہران کار ٹریس ہو گئی ہے۔''

''اوہ، یہ تو واقعی خاص خبر ہے... میں آرہا ہوں۔'' میں نے کہا اور رکشا والے کو رکشا موڑنے کی ہدایت کی۔

پندرہ بیس منٹ بعد میں مطلوبہ پولیس اسٹیشن میں موجود تھا۔ عمران یہاں پہلے سے موجود تھا اور فون پر جلالی صاحب کے دوست ایس پی حمزہ سے بات کر رہا تھا... بیس اکیس سال کا ایک لڑکا انسپکٹر کے سامنے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے گندمی گال پر ایک دو طمانچوں کے نشان تھے۔ تھانے کے احاطے میں سفید رنگ کی مہران کار میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ کار کی ونڈ اسکرین پر ''ڈاکٹر'' کا اسٹیکر بھی لگا ہوا تھا۔

حمزہ صاحب سے بات ختم کر کے عمران نے میری طرف دیکھا اور میلے کچیلے لڑکے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''ان سے ملو، یہ ہیں ڈاکٹر مہناز کے چھوٹے بھائی گلو صاحب۔ پورا نام غلام علی ہے۔ لاہور کی سڑکوں پر تین ٹانگوں والے ایک جانور کے ساتھ کرتب دکھاتے ہیں، میرا مطلب ہے کہ رکشا چلاتے ہیں۔''

''ڈاکٹر مہناز کا بھائی اور رکشا چلاتا ہے؟ اور اس کی تو صورت بھی بالکل نہیں ملتی؟''

''سگا بھائی نہیں ہے یار، بس اسے باجی کہتا ہے۔ اس نے علاج ولاج کیا تھا اس کا دو تین سال پہلے۔'' عمران نے دبلے پتلے لڑکے کی پتلون کا پائنچا اوپر کر کے اس کی ٹانگ دکھائی۔ ٹانگ کی شکل بگڑی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے وہ چکنا چور ہو گئی تھی اور گوشت کے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر اسے پھر سے ''تعمیر'' کیا گیا ہے۔ ٹانگ بہت دبلی بھی تھی۔

عمران نے کہا۔ ''دو تین سال پہلے یہ سروسز اسپتال میں داخل تھا۔ وہیں پر ڈاکٹر مہناز سے اس کی دوستی ہوئی۔ یہ اسے باجی کہتا ہے۔ ایکسیڈنٹ میں ٹانگ کے ساتھ ساتھ اس کا رکشا بھی چکنا چور ہو گیا تھا۔ یہ جب ٹھیک ہوا تو مہناز نے اسے پھر سے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد دی۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ مہناز نے ایک این جی او کے تعاون سے اسے رکشا لے کر دیا اور کرائے کا مکان بھی دلوایا۔''

''لیکن آج ڈاکٹر مہناز اور رسام والی گاڑی اس کے پاس کیسے آگئی؟'' میں نے پوچھا۔

''جلالی فارم ہاؤس سے نکلنے کے بعد ڈاکٹر مہناز اور رسام پناہ کے لیے گلو کے مکان پر ہی آئے تھے۔ وہ ایک دن اور ایک رات گلو کے مکان پر رہے۔ اس دوران میں یہ مہران گاڑی باہر گلی میں کھڑی رہی۔ اس کے اوپر غلاف چڑھا دیا گیا تھا تاکہ یہ شناخت نہ ہو سکے۔''

گلو مسلسل سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے شرمساری ٹپک رہی تھی۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ ''لیکن اس گاڑی کا پتا کیسے چلا؟''

عمران نے کہا۔ ''یہ لاٹ صاحب، گاڑی پر اپنی گرل فرینڈ کو سیر کرانے نکلے تھے، پکڑے گئے۔'' پھر عمران نے گلو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''گلو صاحب! کچھ اپنی زبان سے بھی بیان فرمایئے۔''

وہ چپ رہا تو ایس ایچ او نے اس کے کندھے پر چھڑی سے ضرب لگائی اور دہاڑ کر کہا۔ ''اوئے بولتا ہے یا کسی اور طریقے سے تیری زبان کھولوں؟''

اگلے چار پانچ منٹ میں گلو نے خالص لاہوری لہجے میں اٹک اٹک کر جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ وہ کینال پارک کی گنجان آبادی میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے۔ باجی مہناز منگل کی رات اس کے گھر آئی۔ اس کے ساتھ ایک اور ڈاکٹر بھی تھا۔ دونوں اسی مہران گاڑی پر تھے۔ ان کے پاس کینوس کا ایک بیگ تھا جس میں کوئی قیمتی چیز تھی... لیکن اس قیمتی چیز کے بارے میں باجی مہناز نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ گلو کو صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ باجی مہناز اور اس کے ساتھی ڈاکٹر کو کچھ لوگوں کی طرف سے خطرہ ہے اور وہ اپنی جان کے ڈر سے یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ گلو نے ان دونوں کو ہر طرح سہولت پہنچانے کی کوشش کی۔ اگلے روز گلو کے دو تین دوست اس سے ملنے آئے مگر اس نے انہیں دروازے سے ہی ٹرخا دیا۔ اگلی رات بھی مہناز اور رسام نے

گلو کے گھر میں ہی گزاری۔ مہناز کے کہنے پر گلو نے ایک برقع کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ یہ برقع وہ باغبانپورہ سے اپنی ایک خالہ کے گھر سے لے کر آیا تھا۔ صبح منہ اندھیرے مہناز اور رسام کہیں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ گلو کے بار بار پوچھنے پر مہناز نے صرف اتنا ہی بتایا کہ کچھ غنڈے ان کے پیچھے ہیں اور وہ ان سے بچنے کے لیے پشاور کی طرف جا رہے ہیں۔ بہرحال گلو کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ پشاور کی طرف ہی گئے تھے۔ جاتے ہوئے مہناز نے گلو کو مہران کار کی چابی دی اور اس سے کہا کہ وہ سورج نکلنے سے پہلے ہی گاڑی کو یہاں سے لے جائے۔ اس نے کہا کہ وہ اسے مین سڑک کے پاس کسی گلی میں چھوڑ آئے اور دوبارہ وہاں نہ جائے۔ گلو سمجھ گیا کہ یہ گاڑی ان ''غنڈوں'' کی نظر میں آچکی ہے جو مہناز اور رسام کا پیچھا کر رہے ہیں۔ گلو سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے گاڑی کے حوالے سے مہناز کی تاکید کو نظرانداز کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس کی ہدایت کے عین مطابق عمل کرتا اور اسے کہیں چھوڑ آتا، اس نے تھوڑی سی تفریح کرنا چاہی۔ محلے کی ایک لڑکی فوزیہ سے اس کی دوستی چل رہی تھی۔ اس نے سوچا فوزیہ کے ساتھ ایک چکر ریس کورس پارک کا لگا لینا چاہیے۔ اس غلطی کی پاداش میں اب گلو تھانے میں تھا اور گاڑی باہر احاطے میں کھڑی تھی۔ فوزیہ کی منت سماجت کی وجہ سے ایس ایچ او نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم گلو کے ساتھ اس کے گھر میں موجود تھے۔ گلو زیرِ حراست تھا اور دو پولیس اہلکار سادہ لباس میں اس کے ساتھ موجود تھے۔ گلو نے ہمیں وہ کمرا دکھایا جہاں ڈاکٹر مہناز نے رات گزاری تھی۔ ایک بوسیدہ سا پلنگ تھا۔ ایک خستہ حال جستی الماری بھی یہاں موجود تھی۔ عمران نے گلو سے پوچھا۔ ''ڈاکٹر رسام کہاں رہا تھا؟''

گلو نے کہا۔ ''وہ باجی مہناز کے ساتھ ہی رہا تھا جی۔ پر سوتے وقت باہر برآمدے میں آگیا تھا۔''

''جس تھیلے کی تم بات کر رہے ہو، وہ کہاں تھا؟''

''وہ باجی مہناز نے اپنے پلنگ کے نیچے رکھا ہوا تھا، پر بعد میں انہوں نے تھیلا الماری میں رکھ دیا تھا اور تالا لگا کر چابی اپنے پرس میں ڈال لی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے مہناز سے پوچھا نہیں کہ تھیلے میں کیا ہے؟''

''جب انہوں نے خود نہیں بتایا تو پھر مجھے پوچھنا چنگا نہیں لگا تھا۔''

''تمہارا اپنا کیا خیال ہے کہ اس میں کیا تھا؟''

''کوئی وزنی سی شے تھی۔ باجی مہناز اسے بڑے آرام سے اٹھاتی اور رکھتی تھیں۔ شاید وہ شیشے کی بنی ہوئی تھی۔'' پھر وہ ذرا توقف کر کے گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''پر مجھ کو ماف کر دیں جی۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ میں باجی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔'' وہ مجھے اور عمران کو بھی پولیس والے ہی سمجھ رہا تھا، اس لیے مجھ سے معافی کا طلبگار تھا۔

عمران نے کہا۔ ''معافی تمہیں ایک ہی صورت میں مل سکتی ہے۔ جو کچھ تمہیں معلوم ہے صاف صاف اور کھل کر بتاؤ۔ یہاں جو جو کچھ ہوا، اس کا پورا نقشہ بیان کر دو۔''

''م... میں کیا بتاؤں جی؟''

''شروع سے بتاؤ۔''

''وہ دونوں رات ڈھائی تین بجے کے قریب یہاں پہنچے تھے۔ دونوں کافی پریشان تھے۔ باجی نے بتایا کہ کچھ لوگ ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں فوراً باہر گلی میں جا کر گاڑی پر کپڑا ڈال آؤں۔ اس کے بعد وہ دونوں کمرے میں چلے گئے اور کھسر پھسر کرتے رہے۔ جلدی ہی صبح ہو گئی۔ باجی بار بار کہیں فون کر رہی تھی، پر وہ مل نہیں رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بندہ بیمار تھا اور باجی اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ وہ بار بار ڈاکٹر رسام سے کہہ رہی تھیں کہ پتا نہیں انہوں نے فلاں دوا کھائی ہے کہ نہیں۔ فلاں ٹیکا لگوایا ہے کہ نہیں۔ وہ شاید کوئی بڑی عمر کا بندہ تھا۔ باجی اس کا عجیب سا نام لے رہی تھیں... مجھے اب... یاد نہیں آرہا...''

''جلالی تو نہیں کہہ رہی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں... شاید یہی کہہ رہی تھیں۔ انہوں نے کوئی پندرہ بیس دفعہ فون کیا پر نہیں ملا۔ پھر انہوں نے کسی اور کو فون کیا۔ اس بندے نے کوئی اچھی خبر نہیں سنائی۔ اس نے بتایا کہ وہ جس بندے کا پوچھ رہی ہیں، وہ شاید بے ہوش ہو گیا ہے اور اسے لاہور کے اسپتال میں لایا گیا ہے۔ اس کے بعد باجی کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی۔ وہ رونے لگ پڑیں۔ انہوں نے ڈاکٹر رسام سے کہا کہ وہ ابھی اسپتال جانا چاہتی ہیں۔ انہوں نے اپنا چھوٹا بیگ اٹھایا اور جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ ڈاکٹر رسام غصے سے بولا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ وہ پکڑے جائیں گے۔ اس موقع پر ڈاکٹر رسام نے پولیس کی بات بھی کی۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان دونوں کو غنڈوں کے علاوہ پولیس سے بھی خطرہ ہے۔ بعد میں ڈاکٹر رسام باجی مہناز کو کھینچ کر کمرے میں لے گیا۔ اس کے بعد دونوں میں جو باتیں ہوئیں، اس کا مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔''

www.paksociety.com

عمران نے کہا۔ ”مہناز نے جس دوسرے بندے کو فون کیا اور جس نے اسے جلالی کی خراب حالت کے بارے میں بتایا اس کا نام تم نے سنا؟“

”نہیں جی۔“

”یہ بھی پتا نہیں چلا کہ وہ مرد تھا یا عورت؟“

”میرا خیال ہے کہ عورت تھی۔“

”اچھا، اس کے بعد کیا ہوا؟ مہناز اور رسام کا سارا دن کیسے گزرا؟“ عمران نے پوچھا۔

”باجی مہناز تو بہت پریشان رہیں۔ انہوں نے سارا دن کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ ڈاکٹر رسام ان سے تسلی کی باتیں کرتا رہا۔ پتا نہیں انہیں کیا سمجھاتا بجھاتا رہا...“

باتیں کرتے کرتے اچانک عمران کی نظر کسی چیز پر گئی اور وہ چونک گیا۔ کمرے کی دہلیز سے باہر چارپائی کے نیچے اسے کچھ دکھائی دیا تھا۔ وہ چارپائی کی طرف گیا اور جھک کر کسی شے کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے وہاں سے کچھ اٹھایا۔ یہ کانچ کی سبز چوڑیوں کے دو تین ٹکڑے تھے۔ میں نے پہچان لیا۔ ایسی سبز چوڑیاں میں نے ڈاکٹر مہناز کی خوب صورت کلائی میں دیکھی تھیں۔

عمران نے ٹکڑے گلو کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ یہاں کیسے آئے؟“

وہ فوراً بولا۔ ”میں نے آپ کو بتایا ہے ناکہ فون پر بڑی خبر سننے کے بعد باجی نے فوراً اسپتال جانا چاہا تھا۔ ڈاکٹر رسام نے انہیں پکڑ کر مشکل سے روکا تھا۔ اسی کھینچا تانی میں یہ چوڑیاں ٹوٹی تھیں۔ باجی کی کلائی سے خون بھی نکلا تھا۔“

”لیکن یہ چوڑیاں تو یہاں کمرے کے سامنے پڑی ہیں۔ تم بتا رہے ہو کہ ڈاکٹر رسام نے تمہاری باجی کو صحن میں روکا تھا۔“

”ہاں روکا تو صحن میں ہی تھا۔ شاید ایک دو ٹوٹے یہاں بھی گر پڑے ہوں۔“ گلو نے کہا۔

میں اور عمران دھیان سے گلو کو دیکھنے لگے۔ کیا گلو کے پیچھے بھی کوئی کہانی تو نہیں تھی؟ بظاہر تو گلو بہت زیادہ ہوشیار چالاک نظر نہیں آتا تھا۔ مہناز کا نام بھی وہ بڑی عزت سے لے رہا تھا۔ بہرحال اس موقع پر کچھ بھی یقین سے کہنا مشکل تھا۔

”اچھا اس کے بعد کیا ہوا؟ مہناز اور رسام کب روانہ ہوئے یہاں سے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ رات کو بس تھوڑی دیر کے لیے ہی سوئے ہوں گے۔ باجی مہناز تو آدھی رات کو ہی اٹھ گئی تھیں۔ وہ بار بار کسی کو فون بھی کر رہی تھیں۔ پھر وہ دونوں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ڈاکٹر رسام نے باجی کو زبردستی بس تھوڑا سا دودھ پلایا تھا۔ جاتے وقت باجی نے ایک بار پھر مجھے تاکید سے کہا کہ میں گاڑی کو فوراً کہیں چھوڑ آؤں۔ بس جی میری بھیڑی قسمت کہ میں نے ان کی بات نہ مانی۔“

ہم نے غلام علی عرف گلو سے قریباً ایک گھنٹے تک سوال جواب کیے۔ ڈاکٹر رسام کی مہران کار کی تلاشی ہم تھانے میں ہی اچھی طرح لے چکے تھے۔ اس میں سے کوئی خاص چیز برآمد نہیں ہوئی تھی۔ گلو سے پوچھ گچھ کے نتیجے میں دو باتیں وضاحت سے سامنے آئیں۔ پہلی تو یہ کہ عمران کا اندازہ شاید درست تھا۔ ڈاکٹر مہناز نے کوئی چکر نہیں چلایا تھا بلکہ جلالی صاحب کی ہدایت کے مطابق آرا کو بے کو لے کر فارم ہاؤس سے بھاگی تھی۔ فارم ہاؤس سے نکلنے کے بعد بھی اسے جلالی صاحب کی ازحد فکر رہی تھی اور ان کی بے ہوشی کا سننے کے بعد وہ بے حد غمزدہ ہو گئی تھی۔

دوسری بات یہ سامنے آئی تھی کہ جلالی صاحب کو فون کرنے میں ناکام ہونے کے بعد مہناز نے کسی اور کو فون کیا تھا اور اس نے مہناز کو جلالی صاحب کی خراب حالت کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ اطلاع دینے والی غالباً کوئی عورت تھی۔ یہ کون عورت تھی؟ یقیناً وہ فارم ہاؤس میں ہی تھی۔ لیکن اس نے پولیس کی تفتیش کے دوران میں یہ بات چھپائی تھی کہ اسے، جلالی صاحب کی بے ہوشی کے بعد ڈاکٹر مہناز کا فون آیا ہے۔ کیا یہ عورت ڈاکٹر مہناز کی ہم راز تھی؟ اگر وہ ہم راز تھی تو پھر یقیناً وہ مہناز کے موجودہ پتے ٹھکانے سے بھی واقف ہو سکتی تھی۔

میں اور عمران ایک بار پھر جلالی فارم ہاؤس پہنچے۔ اگلے دو تین روز ہم نے اسی کھوج میں گزارے کہ یہاں سے جانے کے بعد ڈاکٹر مہناز نے فون پر کس سے رابطہ کیا تھا۔ گینگ ریپ کا شکار ہونے والی زرینہ اور رخشی کے علاوہ مزید دس پندرہ عورتیں بھی جلالی کی رہائش گاہ میں موجود تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی ہو سکتی تھی۔ یہ تیسرے روز کی بات ہے، میرے فون پر نصرت کی کال آئی۔ میں اس وقت فارم ہاؤس کی چھت پر تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ نصرت کی آواز میں ہلکی سی شوخی تھی۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد وہ بولی۔ ”تابش بھائی! میں خوش ہوں۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ یوسف بھائی خوش نہیں ہیں۔“ یوسف بھائی کہتے ہوئے اس کے لہجے میں عجیب سی تلخی سرایت کر جاتی تھی۔

”یہ کیا بات ہوئی؟ وہ خوش نہیں ہے تو تم خوش ہو۔ وہ کیوں خوش نہیں ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”وہ اس لیے خوش نہیں ہیں کہ باجی ان سے خوش نہیں ہیں۔ باجی مسلسل میرے ساتھ اوپر والی منزل پر سو رہی ہیں۔ وہ کھانا بھی زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی کھاتی ہیں۔ اس رویے کی وجہ سے یوسف بھائی بہت پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اس بات کا اندازہ تو مجھے فنکشن والے روز ہی ہو گیا تھا کہ یوسف کو ثروت کی طرف سے وہ پذیرائی نہیں ملے گی جس کی وہ توقع کر رہا ہے۔“

نصرت بولی۔ ”باجی ثروت بالکل ٹھیک کر رہی ہیں... بلکہ ابھی ”ٹھیک“ سے کچھ کم ہی کر رہی ہیں۔ عورت کو اپنی تفریح کا ذریعہ سمجھنے والوں کے ساتھ یہی رویہ ہونا چاہیے۔ کل بڑا مزہ آیا۔ حمیدن کی بڑی بیٹی شانو کی موج ہو گئی۔ جناب یوسف بھائی باجی کے لیے جو کپڑے لائے تھے، ان میں سے دو جوڑے باجی نے شانو کو عنایت کر دیے اور کیے بھی یوسف بھائی کے سامنے ہی۔“

”کیا مطلب؟“

”یہ بڑے مہنگے جوڑے تھے۔ پندرہ پندرہ ہزار سے کم کیا ہوں گے لیکن باجی کو کچھ چست تھے۔ باجی نے شانو کو دے دیے۔ جناب یوسف تلملائے تو بہت ہوں گے لیکن موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے چپ رہے۔ آج بھی وہ مجھے اور باجی کو باہر بوفے ڈنر پر لے جانا چاہ رہے تھے لیکن باجی نے طبیعت کی خرابی کا کہہ کر ٹال دیا ہے۔ اب وہ منہ بنا کر اکیلے ہی چلے گئے ہیں۔ کسی دوست کو ساتھ لے گئے ہیں۔ شاید وسیم نام ہے اس کا۔ فلموں کی ایڈیٹنگ وغیرہ کرتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”نصرت! لیکن ایسا کب تک چلے گا؟ ظاہر ہے کہ ثروت اس کی قانونی بیوی ہے۔ وہ بھی اسے اپنا قانونی شوہر سمجھتی ہے۔ تم خود ہی کہتی ہو، وہ معافی تلافی کرنا بھی خوب جانتا ہے۔ جلد یا بدیر وہ ثروت کو منانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ پھر وہی ہوگا جو وہ چاہتا ہے۔“

”آپ ہمیشہ مایوسی کی باتیں ہی کیوں کرتے ہیں؟ ایک طرف آپ مجھے ہمت دلاتے ہیں کہ میں مایوسی کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دوں، دلیری سے اپنی بیماری کا مقابلہ کروں۔ دوسری طرف خود ہمت ہارے ہوئے نظر آتے تھے۔ خدا کے لیے تابش بھائی! یہ آگے بڑھنے کا وقت ہے۔

خدارا ◉ خدارا

شوگر کے مریض

ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبۂ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0308-6627979
0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں
شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

اپنے آپ کو اور اپنی محبت کو منوانے کا وقت ہے۔ آپ بڑے اچھے وقت میں... ہاں، بڑے ہی اچھے وقت میں... اس کہانی میں انٹر ہوئے ہیں۔ یہ بہت سنہری وقت ہے تابش بھائی! آپ کوشش کریں تو بہت کچھ بدل سکتا ہے۔ جو کچھ ناممکن نظر آرہا ہے، وہ بالکل ممکن ہوسکتا ہے۔“

”لیکن نصرت... وہ تو میری ہر بات کو الٹ لیتی ہے۔ یہ سمجھتی ہے کہ میں بس اس کا گھر توڑنا چاہتا ہوں۔“

”کون سا گھر تابش بھائی! یہاں کوئی گھر نہیں ہے۔ یہاں کچھ نہیں ہے۔ بس مطلب پرستی کی آگ ہے جس میں باجی کو بڑی ”محبت“ سے جھلسایا جارہا ہے۔“

”لیکن وہ تو ایسا نہیں سمجھتی نا۔“

”وہ بھی سمجھنا شروع ہوگئی ہیں۔ جو کچھ میں آپ کو بتا رہی ہوں، اس سے کیا مطلب نکلتا ہے۔ کیا آپ سمجھ نہیں رہے یا پھر سمجھنا نہیں چاہ رہے؟“ وہ ایک بار پھر جذباتی ہو رہی تھی۔ مجھے ریسٹورنٹ والا واقعہ یاد آگیا جب اس کی طبیعت ایک دم خراب ہوئی تھی۔

میں نے موضوع بدل دیا اور کچھ دیر تک اس سے گفتگو کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کردیا۔

اس کے بعد بھی ہم تین چار گھنٹے تک فارم ہاؤس میں رہے لیکن میرا ذہن مسلسل ثروت میں اٹکا رہا۔ میں اپنا دھیان ہٹانے کی کوشش کرتا تھا لیکن ہر بار اس کی سوچیں کلاوا کاٹ کر حملہ آور ہوجاتی تھیں۔ رات نو بجے کے لگ بھگ ہم شیخوپورہ سے لاہور واپس آگئے۔ راستے میں عمران نے تین چار خاص جگہوں پر گاڑی روکی اور اپنی جانی پہچانی فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے بڑی خاموشی سے بہت سے ضرورت مندوں کا وظیفہ لگا رکھا تھا وہ کسی نہ کسی طرح ان لوگوں تک پیسے پہنچاتا رہتا تھا... وہ لوگ اس پر جان چھڑکتے تھے... ہم راوی کے پل پر سے گزر رہے تھے جب عمران کے سیل فون پر راجا کے دوست ہوٹل اونر اشفاق رانا کی کال آئی۔ اس نے بتایا کہ راجا نے بازارِ حسن میں ایک پھڈا کردیا ہے، ہم فوراً وہاں پہنچیں ورنہ وہ حوالۂ پولیس ہوجائے گا۔

عمران نے راجا کو غائبانہ چند صلواتیں سنائیں اور پھر بازارِ حسن کی طرف رخ کرلیا۔ ہم زیادہ دور نہیں تھے۔ قریباً دس منٹ بعد ہم اشفاق رانا کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گئے۔ گاڑی ہم نے کچھ فاصلے پر ہی کھڑی کردی تھی۔ رات ساڑھے نو بجے کا وقت تھا۔ بازار کی رونق عروج پر تھی۔ ایک طرف زندہ دکانیں سجی ہوئی تھیں، دوسری طرف [illegible]

کے پھیرے تھے۔ پکوانوں کی خوشبو، پھولوں کے ہار اور گجرے، چھنا چھن کی آوازیں اور فحش اشارے، سب کچھ یہاں موجود تھا۔ ایک سہ منزلہ کوٹھے کے سامنے کئی افراد کھڑے نظر آئے۔ وہ بالائی کھڑکیوں کی طرف اشارے کر رہے تھے۔ ہم اندر داخل ہونے لگے تو ایک گارڈ نما شخص نے ہمیں روکا۔ عمران اسے بے پروائی سے دھکیلتا ہوا اندر چلا گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر فرسٹ فلور پر پہنچے۔ یہاں کوٹھے والوں نے راجا کو ایک کمرے میں بند کیا ہوا تھا اور پولیس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ راجا سخت نشے میں لگتا تھا، وہ اندر سے گالیاں بک رہا تھا۔ باہر سے نائکا اور دیگر طوائفیں اس کے لتے لے رہی تھیں۔

پتا چلا کہ راجا یہاں گانا سننے آیا تھا۔ اس نے زیادہ مقدار میں پی لی اور پھر وہی ہوا جو اکثر ایسی جگہوں پر ہوتا ہے۔ اس نے ایک لڑکی کو گھسیٹ کر کمرے میں لے جانا چاہا۔ نائکا نے راجا سے کہا۔ ”یہ تمہاری بہن صرف گانا گاتی ہے، پیشہ نہیں کرتی۔ بھاگو یہاں سے۔“

راجا نے کہا۔ ”تم سب بکاؤ مال ہو۔ صرف قیمت بڑھانے کے لیے نخرے کرتی ہو...“ اور یہ بات راجا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

تکرار بڑھ گئی تو راجا نے ایک دلال کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔ اس کے بعد باقاعدہ ہنگامہ ہوگیا۔ چار چھ بندوں نے مل کر راجا کو گرایا اور کمرے میں بند کردیا۔ راجا کا دوست اشفاق جو اس کے ساتھ ہی یہاں آیا تھا، موقع کی نزاکت دیکھ کر کھسک گیا اور ہمیں فون کیا۔

اسی دوران میں نیچے سڑک سے پولیس کار کا سائرن سنائی دینے لگا۔ سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آواز گونجی اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک سب انسپکٹر اپنے چار پانچ اہلکاروں کے ساتھ دندناتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ وہ بہت طیش میں دکھائی دیتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ نائکا سے بات شروع کرتا، عمران اس کے قریب پہنچا اور اس سے مصافحہ کرنے کے بعد اس کے کان میں کچھ کہتا ہوا اسے ایک طرف لے گیا۔ دو منٹ بعد میں نے دیکھا کہ وہ اپنے سیل فون کے ذریعے سب انسپکٹر کی بات کسی سے کروا رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ ایس پی حمزہ صاحب تھے۔ سب انسپکٹر ایک دم مؤدب نظر آنے لگا تھا۔ اس کے فوراً بعد میں اور عمران کوٹھے سے نیچے اتر آئے... اور کچھ آگے جا کر اپنی گاڑی میں آبیٹھے۔

”اب کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ نائکا کو دو تین [illegible]

پڑے گا سب انسپکٹر کو اور راجا صاحب کو بھی باعزت رہا کرنا پڑے گا۔ بھئی یہاں جس کی لاٹھی اسی کی بھینس... اور جس کی بندوق اسی کا موسیقی خانہ ہوتا ہے۔“

عمران نے درست ہی کہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد ہم نے راجا کو بڑے ٹھاٹ سے سیڑھیاں اترتے دیکھا۔ پولیس والے اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور لے گئے۔ پروگرام کے مطابق بازار سے دور جا کر انہوں نے اسے چھوڑ دینا تھا۔ میں نے عمران سے کہا۔ ”یار! اس کا کچھ کرو، نہیں تو یہ ہمیں کہیں بری طرح پھنسا دے گا۔“

عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”جس کا اب تک کچھ نہیں ہوسکا، اب کیا ہوگا۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ یہاں وہی روپے خرچ کرنے آیا تھا جو اس نے ندیم کے بٹوے سے غائب کیے تھے۔“

عمران کے جواب دینے سے پہلے ہی میں بری طرح چونک گیا۔ میری نظر عمران کے ساتھی جیلانی پر پڑی تھی۔ وہ کچھ فاصلے پر ایک بارونق پان شاپ پر کھڑا پان لگوا رہا تھا۔ میں نے عمران کی توجہ جیلانی کی طرف دلاتے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے، تمہارے سارے یار دوست اسی بازار میں گھومتے پھرتے ہیں؟“

عمران کے چہرے پر سنجیدگی طاری رہی۔ وہ بولا۔ ”اگر یہ جیلانی یہاں ہے تو پھر ضرور کوئی خاص بات ہے۔“

اچانک میری سمجھ میں عمران کی بات آگئی۔ عمران کی ہدایت کے مطابق آج کل جیلانی، یوسف کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھ رہا تھا۔ اسی دوران میں جیلانی نے گھوم کر دیکھا تو اس کی نگاہ بھی ہماری گاڑی پر پڑ گئی۔ اس نے دھیان سے نمبر پلیٹ دیکھی۔ یقیناً وہ اس گاڑی کو پہچانتا تھا۔ وہ چونکا ہوا نظر آیا۔ تاہم وہ تذبذب میں تھا کہ گاڑی کی طرف آئے یا نہیں۔ عمران نے اس سے موبائل پر رابطہ کیا۔ ”ہیلو جیلانی! کیا عیاشی ہورہی ہے؟“

”گاڑی میں آپ ہی ہیں؟“ جیلانی نے پوچھا۔

”بالکل، میں ہی ہوں بقلم خود... آجاؤ۔“

”ٹھیک ہے۔“

چند سیکنڈ بعد جیلانی ٹہلتا ہوا ہماری گاڑی کی طرف آیا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ الائچی سپاری پان کی خوشبو گاڑی میں پھیل گئی۔ جیلانی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی بہت اہم خبر ہے۔ وہ حیران لہجے میں بولا۔ ”آپ دونوں یہاں کیسے پہنچ گئے؟“

عمران نے کہا۔ ”یہ بعد میں بتاؤں گا، پہلے تم کچھ کہو۔“

وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ ”یوسف یہاں موجود ہے۔ ساتھ میں اس کا دوست ”فلم ایڈیٹر“ وسیم ہے۔ انہوں نے اپنی گاڑی ساتھ والی سڑک پر پارک کی ہے۔“

”کہاں گئے ہیں وہ؟“ عمران نے پوچھا۔

جیلانی نے گاڑی کے اندر سے ہی ایک شاندار پلازا نما بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا۔ یہ دراصل ایک جدید کوٹھا یا چوبارہ تھا۔ سامنے دو تین گاڑیاں بھی کھڑی نظر آرہی تھیں۔ جیلانی نے کہا۔ ”یہ مشہور نائکا شارہ بائی کا ڈیرا ہے۔ کہنے کو تو بس ناچ گانے کا کام ہی کرتی ہے لیکن اندرخانے سب کچھ ہوتا ہے۔ اس کا تھوڑا بہت تعلق اسٹوڈیو والوں سے بھی ہے۔ فلموں میں ایکسٹرا لڑکیاں بھی سپلائی کرتی ہے۔“

”یوسف یہاں کیا کرنے گیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ظاہر ہے کہ ان گمراہ لوگوں کو نصیحت وغیرہ ہی کرنے گیا ہوگا۔“ عمران نے جھٹ کہا۔ ”انہیں بتانے گیا ہوگا کہ یہ اچھا دھندا نہیں ہے۔ اس سے باز آجائیں اور اگر بہت ضروری ہے اور مجبوری ہے تو پھر اچھے لوگوں کے ساتھ کام کریں۔“

جیلانی نے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ یہ وسیم نامی لڑکا یوسف کو گھیر گھار کر یہاں لایا ہے اور اب یہ دونوں اوپر بیٹھے گانا سن رہے ہیں۔“

عمران نے کہا۔ ”یہ گھیر گھار کر لانے والی بات بھی تم نے خوب کہی ہے۔ بھئی وہ عاقل بالغ بندہ ہے۔ اس کی اپنی مرضی ہے تو اس کے قدم اس ”ہیوٹی کلینک“ میں پڑے ہیں نا۔“

ہمارے اردگرد لاہور کا بازارِ حسن اپنے پورے ہلارے میں تھا۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ دودھیا قمقموں کی روشنی کے پس منظر میں گھنگروؤں کی جھنکار اور طبلے کی تھاپ تھی۔ کھڑکیوں میں رنگین آنچل تھے اور گلی کوچوں میں بے شمار خوشبوئیں چکرا رہی تھیں۔ جیسے کسی کمرے کا تعفن دور کرنے کے لیے اگربتیوں اور گلدستوں کا سہارا لیا گیا ہو۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی۔“ عمران نے کہا۔ ”یہ کافی امیر بندہ ہے۔ اس ”شوق“ کے لیے وہ کسی اس سے بہت اچھی جگہ پر بھی جاسکتا تھا۔ آج کل تو بہت سی فیشن ایبل آبادیوں اور اونچے ہوٹلوں میں بھی یہی کاروبار ہورہا ہے...“

جیلانی نے کہا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ یہ لوگ یہاں گانا سننے نہیں، کسی اور کام سے آتے ہیں؟“

"یہ ہو بھی سکتا ہے۔" عمران نے کہا۔

"لیکن آپ کا یہ خادم اندر تک ہو کے آیا ہے۔ وہاں پورا پورا فلمی سین ہے۔ باقاعدہ چاندنی بچھی ہے، گاؤ تکیے رکھے ہیں، سازندے براجمان ہیں۔ نائکا پاندان، سیٹھ حضرات... سارے لوازمات موجود ہیں۔ یہ دونوں صاحبان بھی بڑے سلیقے سے خاندانی نوابوں کی طرح بیٹھے ہیں۔"

...ہم تینوں قریباً آدھ گھنٹا مزید وہاں موجود رہے۔ پھر ہم نے چند تماش بین ٹائپ افراد کو زینے اترتے دیکھا۔ ان میں ہمیں یوسف بھی نظر آیا۔ اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر رات کو لگائے جانے والے گلاسز تھے۔ اس نے پی کیپ بھی پہن رکھی تھی۔ وہ ایک اونچا لمبا قبول صورت شخص تھا۔ بظاہر شریف النفس بھی نظر آتا تھا مگر آج ہم اس کا ایک بالکل مختلف روپ دیکھ رہے تھے۔ ایک ایسا روپ جو شاید ثروت وغیرہ کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ تاہم ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ بہت کچھ سامنے آنا باقی تھا۔

یوسف اور وسیم نامی لمبے بالوں والا لڑکا "بے فکروں" کے انداز میں سگریٹ پھونکتے اور باتیں کرتے ایک گلی میں اوجھل ہو گئے۔ جیلانی ان کے پیچھے گیا۔ پانچ منٹ بعد اس نے آکر اطلاع دی کہ دونوں قریبی سڑک سے اپنی ہنڈا اکارڈ میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ وہ دونوں بس ناچ گانا دیکھنے ہی یہاں آئے تھے۔

عمران نے کہا۔ "مجھے کچھ شک ہو رہا ہے۔ ایک کام کرتے ہیں۔"

"کیا؟"

عمران نے کچھ کہنے کے بجائے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس نے جیلانی کو ہدایت کی کہ وہ محتاط طریقے سے یوسف اور لمبے بالوں والے وسیم کی نگرانی جاری رکھے۔ اس کے علاوہ وہ رپورٹ بھی دیتا رہے۔ جیلانی "اوکے" کہتا ہوا اپنی موٹر سائیکل کی طرف چلا گیا۔ عمران نے تیزی سے گاڑی موڑی اور رش میں سے چابک دستی کے ساتھ راستہ بناتا ہوا ڈیفنس کی طرف روانہ ہو گیا۔

سڑکوں پر رش کم تھا۔ صرف آدھ گھنٹے میں ہم ڈیفنس والی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ عمران نے کہا۔ "مجھے ذرا اِن شین ہونا ہے، مطلب ہے کہ ذرا اچھے والے کپڑے پہننے ہیں۔"

"تم کہیں شاربہ بائی کے کوٹھے پر جانے کا ارادہ تو نہیں کر رہے ہو؟"

"سمجھ دار ہوتے جا رہے ہو لیکن رفتار سست ہے۔" عمران نے کہا۔

"میں تو نہیں جا رہا۔"

"تم کیوں نہیں جا رہے؟ بھئی ہر بڑے آدمی کے ساتھ ایک اسسٹنٹ یا سیکریٹری ٹائپ کا بندہ تو ہوتا ہے نا۔ اور تم ماشاء اللہ صورت سے بھی اس کردار کے لیے بالکل فٹ ہو۔ لباس بھی تمہارا ٹھیک ہی ہے۔ بلکہ ٹھیک سے بھی کچھ کم ہی ہے۔"

"ضرورت سے زیادہ غلط فہمی ہے تمہیں اپنے بارے میں۔"

"غلط فہمی، ضرورت کے مطابق ہو ہی نہیں سکتی... اچھا مجھے صرف دس منٹ دو، میں لباس تبدیل کر کے آتا ہوں۔ تم اپنے بالوں کو تھوڑا سا اور تتر بتر کر لو، ایسے لگے کہ کسی سے جھانپڑ کھائے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ تیزی سے اپنے کمرے میں اوجھل ہو گیا۔

اب رات کے تقریباً بارہ بج چکے تھے۔ عاطف، فرح اور زری سمیت تقریباً سب ہی سو چکے تھے۔ کسی کو ہماری آمد کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈا پانی وغیرہ پیا۔ میری پسندیدہ آئس کریم جو فرح نے شاید میرے ہی لیے فریزر کے ایک کونے میں چھپائی ہوئی تھی، میرے کام آئی۔

کچھ دیر بعد عمران کمرے سے باہر آگیا۔ میں دیکھ کر دنگ ہو گیا۔ وہ کافی حد تک بدلا ہوا تھا۔ وہ نہایت قیمتی کپڑے کی شلوار قمیص میں تھا۔ اوپر عمدہ تراش کی واسکٹ تھی۔ کلائی میں ڈھائی تین لاکھ والی راڈو گھڑی، درمیانی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی، بالکل نئے ماڈل کا اسپیشل سیل فون جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ سیٹلائٹ فون تھا۔ عمران نفیس خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ وہ ویسے بھی زبردست مردانہ کشش رکھتا تھا۔ سج سنور کر اور بھی نکھر آیا تھا۔

"یہ کس پر بجلی گرانے کا ارادہ ہے؟" میں نے کہا۔

"ارادہ کوئی نہیں۔ جو بھی سامنے آجائے۔ بس شرط یہ ہے کہ جوان ہو اور فیملی ہو۔"

ایک دم وہ ٹھٹک گیا۔ سامنے کوریڈور کے سرے پر شاہین کھڑی تھی اور تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ "بیڑا غرق..." وہ منہ میں بڑبڑایا۔

شاہین دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی ہمارے قریب آگئی۔ اس نے سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا اور بال ربن سے بندھے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ سونے کی تیاری میں تھی لیکن ہماری آمد کے بعد بستر پر نہیں گئی تھی۔

وہ عمران کی آنکھوں میں جھانک کر نہایت چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "رات کے بارہ بجے اس طرح بن ٹھن کر اور خوشبوئیں لگا کر کہاں کا ارادہ ہے؟"

"بس ایک ضروری کام ہے یار۔"

"ظاہر ہے ضروری کام ہی ہوگا، ورنہ اس وقت تم کسی عالم دین کا درس سننے تو نہیں جا رہے۔"

"دراصل ایک لڑکی کو چکر دینا ہے۔ وہ ایک غلط فہمی کا شکار ہے۔"

وہ عجیب لہجے میں بولی۔ "مجھے پتا ہے وہ لڑکی میں ہی ہوں۔ مجھے ہی چکر دیا جا رہا ہے اور میں ہی غلط فہمی کا شکار ہوں۔"

"نہیں یار! میں تو... نرگس کی بات کر رہا ہوں۔ وہ سمجھتی ہے کہ ریما کے سوا اس کا کوئی رقیب ہے ہی نہیں۔ اور ریماجی کو وہ کافی حد تک برداشت کرنا شروع ہو گئی ہے۔ ریماجی آج کل ملک سے باہر ہیں۔ اب ذرا سوچو، میں اس طرح رات کے بارہ ایک بجے بن ٹھن کر کہیں جاؤں گا اور نرگس کے سامنے جاؤں گا تو اسے کیا میسج ملے گا۔ اسے پتا چل جائے گا کہ اس کی کچھ اور سوکنیں بھی لاہور شہر میں موجود ہیں۔ بس اس کا دل کھٹا ہو جائے گا اور میں یہی چاہتا ہوں۔"

شاہین نے تنک کر کہا۔ "تمہارے اندر دل کھٹا کرنے کی خداداد صلاحیت موجود ہے۔ تمہیں اس کے لیے کوئی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم میں سے کئی ایک کے دل تمہاری طرف سے کھٹے ہو چکے ہیں۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ..."

"اپنا منہ بند رکھو۔" وہ جذباتی لہجے میں عمران کی بات کاٹ کر بولی۔ "تم اب ہر حد سے گزر رہے ہو۔ میں... سویرے ہی جا رہی ہوں یہاں سے۔ اب مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا اور نہ مجھے ڈھونڈنے کی۔"

اس کی خوب صورت آنکھوں میں باقاعدہ آنسو جھلملانے لگے۔ عمران زیرِ لب مسکرایا اور اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے گھٹنے چھو لیے۔ "پلیز... پلیز... رونے دھونے کا پروگرام شروع نہ کرو۔ میں مذاق کر رہا تھا۔ ابھی تو ہماری صلح کی مہندی بھی پھیکی نہیں پڑی اور تم پھر لڑنے پر تل گئی ہو۔"

اس کے بعد اس نے مختصر الفاظ میں شاہین کو بتایا کہ وہ میرے ہمراہ واقعی ایک بہت سنجیدہ کام سے جا رہا ہے اور اس کام کا تعلق براہ راست ثروت والے معاملے سے ہے۔ پہلے تو شاہین نے یقین نہیں کیا پھر وہ گواہی طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے عمران کی بات کی تائید کی۔ وہ آنسو پونچھتی ہوئی اندر چلی گئی۔ ہم کوٹھی سے باہر نکلے تو میں حیران ہوا۔ دروازے پر ایک شاندار لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ عمران کا ساتھی امتیاز اس میں باوردی ڈرائیور کی حیثیت سے موجود تھا۔ نیلی وردی والے ایک مسلح گارڈ نے جلدی سے ہمارے لیے دروازہ کھولا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا اور حیران ہوا۔ وہ اقبال تھا۔ پچھلے آدھ پون گھنٹے میں عمران نے کافی پلاننگ کر لی تھی۔

لاہور کی سنسان سڑکوں پر فراٹے بھرتی ہوئی گاڑی بازارِ حسن کی شب بیدار روشنیوں کی طرف روانہ ہوئی تو میں نے عمران کو مخاطب کر کے کہا۔ "کچھ میرے پلے بھی ڈالو چودھری صاحب! کیا ارادے ہیں؟"

"کچھ خاص نہیں۔ بس شاربہ بائی کے کوٹھے پر جائیں گے۔ ویک اینڈ کی رات ہے۔ کچھ موج میلا دیکھیں گے۔ شاربہ بائی پر ذرا اپنا رعب وغیرہ ڈالیں گے اور دیکھیں کہ وہ کیا بیچتی ہے اور کس طرح؟"

"لگتا ہے کہ کسی طرح کا شبہ ہو رہا ہے تمہیں اس پر۔" میں نے کہا۔

"نہیں، اس پر نہیں۔ تمہارے رقیبِ روسیاہ یوسف فاروقی پر ہو رہا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اپنی دل پشوری کے لیے شاربہ بائی کے کوٹھے پر جاسکتا ہے۔ اس کا لیول اس سے کافی اونچا ہے۔ اسے تو ٹاؤن شپ کی کسی کوٹھی میں یہ موج میلا دیکھنا چاہیے تھا، یا پھر بازارِ حسن میں ہونا چاہیے۔"

جلد ہی ہم ایک بار پھر بازارِ حسن کی روشنیوں میں پہنچ گئے جہاں دن سوتے ہیں اور راتیں جاگتی ہیں۔ اور یہ تو ویک اینڈ کی رات تھی۔ زیادہ رونق اور زیادہ جھنکار والی۔ سرِعام بھاؤ تاؤ ہو رہے تھے۔ قیمتیں چکائی جا رہی تھیں اور وصولی کی جا رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تاریک سیلن زدہ کھولیوں سے لے کر بڑے بڑے جدید چوباروں تک ہر طرح کی دکان یہاں سجی ہوئی تھی۔ قانون کے رکھوالے بھی یہاں وہاں گھوم رہے تھے... کہیں اپنی مٹھی گرم کر رہے تھے، کہیں خوامخواہ "شریف" خریداروں کو ڈرا دھمکا رہے تھے۔

جلد ہی ہم اس پلازا نما عمارت کے سامنے پہنچ گئے جہاں نائکا شاربہ بائی اپنا شاپنگ مال سجائے بیٹھی تھی۔ شاربہ بائی کے ملازموں نے ہماری آمد کو خصوصی اہمیت دی۔ عمران سمیت ہم سب کو اپنا اپنا کردار اچھی طرح معلوم تھا۔ امتیاز ڈرائیور کے طور پر گاڑی میں رہا۔ اقبال گارڈ کے طور پر اور

www.paksociety.com

میں ہمراہ ماتحت کی حیثیت سے عمران کے ساتھ اندر گیا۔ ہم سنگِ مرمر کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ایک ہال کمرے میں پہنچے۔ یہاں وہی نقشہ تھا جو جیلانی نے بتایا تھا۔ اس جگہ کو رقص گاہ کی حیثیت سے سجایا گیا تھا... غالباً ابھی ابھی ایک نشست ختم ہوئی تھی۔ سازندے چائے پی رہے تھے اور قالین پر بچھی چاندنی کی سلوٹیں درست کی جارہی تھیں۔

شاربہ بائی کا نام تو ذرا جدید تھا مگر وہ ایک روایتی نائکا ہی نظر آتی تھی۔ عمر چالیس سے اوپر، ہونٹ پان سے رنگے ہوئے، چہرے پر بے پناہ کاروباری ذہانت... وہ عمران کو تولنے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ عمران نے چاندنی پر بیٹھنے کے بجائے دائیں بائیں دیکھنا شروع کیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اس استعمال شدہ چاندنی پر بیٹھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ شاربہ بائی اس کا ارادہ بھانپ کر فوراً ملازماؤں سے مخاطب ہوئی۔ ''کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ چودھری صاحب کے لیے کرسیاں لاؤ۔''

جلد ہی ہمارے لیے تین مرصع و منقش کرسیاں حاضر کر دی گئیں... میں ذرا مؤدب انداز میں عمران کی دائیں جانب بیٹھ گیا۔ اقبال گارڈ کی حیثیت سے ایک طرف کھڑا رہا۔

یہاں خوب صورت لڑکیوں کی جھلک نظر آرہی تھی اور ان کے کھلکھلے سے قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے۔ وسکی اور روسٹ گوشت کی ہلکی سی بو سارے میں چکرا رہی تھی۔ نائکا شاربہ بائی اور عمران میں چند رسمی باتیں ہوئیں۔ ان باتوں میں عمران نے شاربہ بائی کو بتایا کہ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی ہے مگر یہاں اس کوٹھے پر پہلی بار آیا ہے۔ اس نے خود کو زمیندار شو کیا جس کی شیخوپورہ کے نواح میں کوئی تیس مربع نہری زمین تھی، اس کے علاوہ ''کار ڈیلنگ'' کا کاروبار بھی دو تین شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔

شاربہ بائی بہت گھاگ تھی تاہم مرعوب نظر آنے لگی۔ کچھ دیر بعد شاربہ کے اشارے پر تین بنی سنوری لڑکیاں ہال میں داخل ہوئیں اور فرش پر بچھی چاندنی پر آبیٹھیں۔ ان تینوں نے باقاعدہ گھنگرو باندھ رکھے تھے اور ایک دوسری سے چہلیں کر رہی تھیں۔ انداز یہی تھا کہ، پسند کرو ہمیں۔ ہماری قیمت ادا کرو اور آج شب کے لیے ہماری ساری جملہ خدمات حاصل کرلو۔

اپنی ''منہ دکھائی'' کے بعد وہ چلی گئیں۔ عمران نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا تو ایک اور لڑکی آگئی۔ یہ ان تینوں سے زیادہ خوب صورت تھی۔ عمر بھی بس اکیس بائیس سال رہی ہوگی۔ اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا استعمال کرتے ہوئے وہ اس انداز سے بیٹھی تھی کہ اس کے ترشے ہوئے جسم کی ہر خوبی نمایاں تر ہوگئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے خریدار کا نخرہ دیکھتے ہوئے دکاندار نے اپنا بہترین مال سامنے رکھ دیا ہو۔

نائکا شاربہ نے بھویں اچکا کر کہا۔ ''ابھی نئی نئی کام میں آئی ہے۔ دو ڈھائی مہینے ہوئے ہیں ''تھڑ اتروائی'' کو۔ ڈانس میں تو لکھنؤ والیوں کو بھی مات دیتی ہے۔''

عمران نے تعریفی انداز میں سر ہلایا لیکن کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے بعد شاربہ بائی نے یکے بعد دیگرے دو اور لڑکیاں سامنے کیں۔ ان میں سے ایک بہت گوری چٹی تھی لیکن نقش عام سے تھے، ایک خوب صورت لیکن عمر میں بڑی تھی۔

عمران نے بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو آپ کا بڑا چرچا سنا تھا... پر... طبیعت کچھ جم نہیں رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بائی جی... یہ کوئی عام بندہ نہیں ہے، چودھری عمران صاحب شیخوپورہ والے آپ کے پاس آئے ہیں، کوئی ایسا مال دکھائیں جو کھرا باندھ کر رکھا ہوا ہے۔''

''اچھا ایک بار وہ پہلے والی کا رقص تو دیکھ لیجیے۔'' نائکا نے کاروباری لہجے میں کہا۔ اس کا اشارہ دوسرے نمبر پر آنے والی لڑکی کی طرف تھا۔

عمران نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا پھر بھی نائکا شاربہ بائی نے مسکراتے ہوئے سازندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے ساز چھیڑ دیے۔ انڈیا کا کوئی فلمی گیت تھا۔ لڑکی آئی۔ اس نے جھک کر ''مجرا'' پیش کیا اور پھر گانے کی لے پر رقص کرنے لگی۔ وہ واقعی اپنے فن میں ماہر تھی۔ جسم کی بوٹی بوٹی پھڑکتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے باوجود عمران کے چہرے پر کسی خاص پسندیدگی کے تاثرات نظر نہیں آئے۔ اس نے جیسے طے کیا ہوا تھا کہ شاربہ بائی کو مایوس ہی کرنا ہے۔ بہرحال رقاصہ کی حوصلہ افزائی کے لیے عمران نے دو تین بار جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑی فراخ دلی سے کرنسی نوٹ اس پر لٹائے۔ یہ ہزار ہزار کے نیلے نوٹ تھے۔ عمران نے پلک جھپکتے میں ڈیڑھ دو لاکھ روپیا لٹا ڈالا۔ شاربہ بائی کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ کچھ اور بھی مرعوب دکھائی دی۔

یہ وہی رقم تھی جو عمران نے ریان ولیم سے چند دن پہلے وصول کی تھی تاکہ نصرت کو آسٹریا بھجوائی جا سکے۔ بعدازاں اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی کیونکہ اسپتال کا بل یوسف فاروقی نے پہلے ہی چکتا کر دیا تھا۔ اب یہ رقم اس

بالاخانے میں کام آرہی تھی۔

رقص کے بعد عمران اٹھنے کے لیے تیار نظر آنے لگا۔ نائکا شاربہ بائی بے قرار نظر آئی۔ وہ عمران سے کھسر پسر کرنے لگی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے سازندوں کو اشارہ کیا۔ وہ جو بڑی مستعدی سے نوٹ سمیٹ رہے تھے، اشارہ پا کر باہر نکل گئے۔ دو ملازمائیں بھی باہر چلی گئیں۔ عمران نے چودھریانہ انداز میں اپنے ''گارڈ'' یعنی اقبال کو بھی باہر جانے کا اشارہ کیا۔

اب ہال کمرے میں شاربہ بائی کے ساتھ بس میں اور عمران تھے۔ شاربہ بائی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا، عمران نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں... یہ یہیں رہے گا، اس سے کوئی پردہ نہیں۔''

شاربہ بائی نے دو چار فقروں میں تمہید باندھی۔ اس کے بعد رازداری کے لہجے میں بولی۔ ''ایک زبردست ''پیس'' ہے۔ آپ کی شان کے مطابق۔ طبیعت خوش ہو جائے گی۔ ایسا موقع قسمت سے ہی ملتا ہے۔''

''موقع؟'' عمران کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں، چودھری صاحب! موقع ہی سمجھو۔ اس بازار کی چڑیاں جب کسی اونچے مقام پر پہنچ جاتی ہیں نا تو پھر ان کو عقاب کے پر لگ جاتے ہیں۔ آسانی سے کسی کے ہاتھ نہیں آتیں۔ بڑا اونچا لیول ہو جاتا ہے ان کا۔ یہ تو مجبوری ہے جس میں یہ عقاب کے پروں والی چڑیا پھنسی ہوئی ہے۔ کچھ پیسے تو خرچ ہوں گے آپ کے پر جی خوش ہو جائے گا۔''

''تم تو بجھارتیں بوجھوا رہی ہو آنٹی۔'' عمران نے کہا۔

وہ دبے دبے جوش کے ساتھ مسکرائی۔ دائیں بائیں دیکھا اور پھر ایک سائڈ بورڈ کے اندر سے ایک فلمی میگزین نکال کر ہمیں دکھایا۔ میگزین کے بیک ٹائٹل پر ایک جواں سال پاکستانی ہیروئن کی تصویر تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے کافی نام کمایا تھا۔ شروع شروع میں اردو فلموں میں آئی... پھر پنجابی فلموں کی طرف رخ کیا اور قسمت نے ایسی یاوری کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے صفِ اول کی ہیروئنوں میں شامل ہوگئی۔ اپنے معصومانہ نقوش اور رقص میں مہارت کے سبب یہ بے شمار دلوں کی دھڑکن بن گئی۔ اب کچھ عرصے سے فلموں کے مجموعی حالات کے سبب اس کی مارکیٹ ویلیو میں تھوڑی سی کمی واقع ہوئی تھی۔ اس کے باوجود اسے ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔

''اسے پہچانا آپ نے؟'' نائکا شاربہ بائی نے پوچھا۔

''اسے کون نہیں پہچانتا لیکن... بات کیا ہے؟'' عمران نے کہا۔

''چودھری صاحب! میں اس کی مجبوری کا ذکر کر رہی تھی۔ یہ آپ کو مل سکتی ہے، اگر آپ کچھ پیسے خرچ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو۔''

''تم مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟'' عمران کے لہجے میں ہلکا سا جوش تھا۔

''نہیں، مذاق والی کوئی بات نہیں۔''

''لیکن... لیکن تمہارے ساتھ اس کا لنک کیسے ہو گیا؟''

نائکا شاربہ بائی نے ذرا فخریہ انداز میں کہا۔ ''اپنے بازار کا ہیرا ہے۔ ہمارے سامنے پلی بڑھ کر جوان ہوئی ہے۔ اب بھی ملتی ہے تو گھٹنوں کو ہاتھ لگاتی ہے۔ جن بچیوں کو اس طرح ترقی ملتی ہے، ان میں کچھ نہ کچھ گن تو ہوتا ہے نا پھر۔''

''مجھے تو اب بھی یقین نہیں آرہا۔''

شاربہ بائی نے دائیں بائیں دیکھا پھر ایک گاؤ تکیے کے نیچے سے کچھ دن پرانا ایک اخبار نکال کر عمران کے سامنے کیا۔ اندرونی صفحے پر ایک دو کالمی اشتہار پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ دیکھیں جی۔''

عمران نے پڑھنا شروع کیا۔ گردن ٹیڑھی کر کے میں نے بھی اشتہار پر نگاہ ڈالی۔ متن کچھ اس طرح تھا۔ ''جوہر ٹاؤن میں دو کنال کی کوٹھی۔ نئی بنی ہوئی۔ 80 فٹ سڑک... پارک کے سامنے۔ مالک ضرورت مند۔ فوری فروخت، نہایت مناسب قیمت۔''

نیچے فون نمبرز وغیرہ لکھے تھے۔

شاربہ بائی نے کہا۔ ''یہ چندو کی کوٹھی ہے (مشہور پاکستانی ہیروئن کا گھریلو نام)۔ ابھی دو سال پہلے بڑے چاؤ سے بنوائی تھی اس نے۔ چار کروڑ سے کم قیمت نہیں ہے اس کی۔ لیکن اب مجبوری کی وجہ سے تین بلکہ اس سے بھی کم پر دینے کو تیار تھی۔ پر اللہ کی مرضی ہے کوئی ڈھنگ کا گاہک ہی نہیں مل رہا۔ ویسے بھی علاقے میں پراپرٹی کا کام بڑا مندا جارہا ہے۔''

''پر مجبوری کیا ہے اسے؟'' عمران نے پوچھا۔

''ان کاروباری لوگوں کو سو طرح کی مصیبتیں ہوتی ہیں۔ چندو کو بیٹھے بٹھائے اپنی فلم بنانے کا شوق چرایا تھا۔ یہ پچھلے سال کی بات ہے۔ کافی سارا روپیا خرچ کر دیا اس نے، پر فلم بیٹھ گئی۔ کافی سارا نقصان ہوا۔ اب وہی نقصان

پورا نہیں ہو رہا۔ قرض والے سر پر چڑھے ہوئے ہیں، کچھ قرض بینک سے بھی ہے۔ میں نے کہا ہے نا کہ مجبوری ہے ورنہ اس بازار کی چڑیاں جب اونچا اڑنے لگتی ہیں تو پھر ہاتھ نہیں آتیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ..." عمران نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہاں، اسے کوئی ڈیڑھ کروڑ روپے کی فوری ضرورت ہے۔ ظاہر ہے یہ کوئی اکیلا بندہ تو نہیں دے سکتا۔ اس نے خاص خاص گاہکوں کے لیے اپنا تھوڑا سا ٹائم بیچا ہے۔"

شاربہ بائی نے 'ٹائم' کے لفظ پر ماہرانہ زور دیا۔

عمران تھوڑی دیر تک اپنی ٹھوڑی کھجاتا رہا پھر ذرا رنگ بازی کے انداز میں بولا۔ "کیا بھاؤ نکالا ہے چندو جی نے ٹائم کا؟"

شاربہ بائی نے پان کی گلوری عمران کو پیش کی اور ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کر کے بولی۔ "دس لاکھ ایک رات کے لیے... ہفتے کی بکنگ ہو تو چالیس۔"

"کچھ زیادہ ہیں آنٹی۔"

"چودھری جی! یہ بھی تو دیکھو کہ کس کے لیے دے رہے ہو۔ جس کی جھلک دیکھنے کے لیے لوگ اسٹوڈیو کے دروازے پر دھکے کھاتے ہیں۔"

عمران کچھ دیر تک غور و فکر کے انداز میں خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "اگر ہفتے کی بکنگ ہو تو کہیں باہر بھی جا سکتے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ بھوربن وغیرہ... یا پھر دبئی شوبئی؟"

"نہیں... اس میں دو چار شرطیں ہیں اور ایک شرط یہ بھی ہے کہ چندو کہیں جائے گی نہیں اور جگہ بھی اس کی مرضی کے مطابق ہوگی۔"

عمران خود کو پرجوش ظاہر کر رہا تھا۔ اس کی نگاہ گاہے بگاہے میگزین کے بیک ٹائٹل کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی۔

اس حوالے سے شاربہ بائی اور عمران میں دس پندرہ منٹ تک مزید رازدارانہ بات چیت ہوئی۔ کچھ ضروری امور طے ہوئے۔ شاربہ بائی نے کھلے ڈلے انداز سے بات چیت شروع کر دی۔ اس نے عمران کو بتایا کہ اگلے چھ سات دن میں چندو کی دو بکنگز اور ہیں تیسری بکنگ اس کی ہو سکتی ہے۔

عمران نے کہا۔ "میں صاف بات کرنے کا عادی ہوں آنٹی! مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا۔ کیا اس معاملے میں کوئی دھوکا تو نہیں ہے؟"

وہ ذرا گردن اکڑا کر بولی۔ "چودھری صاحب! آپ پہلی بار میرے پاس آئے ہیں اس لیے اتنے سوال پوچھ رہے ہیں۔ جب پھر آئیں گے تو کچھ نہیں پوچھیں گے، پیسے نکال کر رکھ دیں گے۔ اس بازار میں میرا ایک نام ہے، ایک ساکھ ہے۔ ہم زبان سے پھرنے والے لوگ نہیں ہیں۔"

عمران نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے آنٹی! میں کل شام تک اپنے بندے کے ہاتھ دو لاکھ ایڈوانس بھیج دوں گا۔"

"نہیں نہیں چودھری! اس کی بھی لوڑ نہیں۔ جب "شریف" بندوں کے درمیان زبان ہو گئی تو بس ہو گئی۔" اس نے رسماً کہا لیکن یقینی بات تھی کہ وہ ایڈوانس رقم کی خواہش رکھتی تھی۔

اب ہمیں اس سوال کا جواب ملنا شروع ہو گیا تھا۔ یوسف فاروقی جیسا "ہائی جینٹری" کا بندہ اس عام سے کوٹھے پر کیوں آیا تھا۔ اس کے ساتھ فلم لائن کا وسیم احمد تھا۔ دونوں کو ان درمیانی شکل و صورت والی لڑکیوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ ناچ گانے میں بھی کوئی بہت اونچا معیار نہیں رکھتی تھیں۔ یوسف فاروقی اور وسیم کی یہاں آمد کی وجہ کچھ اور تھی اور یہ یقیناً وہی وجہ تھی جو ابھی ہمارے سامنے آئی تھی۔ یہاں انہیں کوئی بہت خاص الخاص مال مل سکتا تھا۔ فلمی دنیا کا ایک ایسا ستارہ جسے عام لوگ اسکرین پر دیکھنے کے لیے بھی دھکے کھاتے تھے۔

ہم شاربہ بائی کے بالاخانے کی مرمریں سیڑھیاں اترنے کے بعد اپنی لینڈ کروزر میں آ بیٹھے۔ ایک نشئی مست ہو کر بیچ بازار میں ناچ رہا تھا اور کھڑکیوں میں سے ہیجڑے اس پر آوازیں کس رہے تھے۔ چوباروں سے گانے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور بالکونیوں میں بنتی سنورتی لڑکیاں راہگیروں کو رجھا رہی تھیں۔ میں نے مذاقاً کہا۔ "یار دیکھنا ناچنے والا کہیں راجا ہی تو نہیں۔"

اقبال بولا۔ "نہیں، آج اسے کافی سبق مل گیا ہے۔"

عمران نے کہا۔ "یہ تمہاری غلط فہمی ہے یارو... جو سبق حاصل کر لے وہ راجا ہو ہی نہیں سکتا۔"

ہم ناچنے والے ادھیڑ عمر شخص کے قریب سے ہو کر گزرتے ہوئے بڑی سڑک کی طرف آ گئے۔ یوں لگا جیسے ایک دم تازہ اور پاکیزہ ہوا پھیپھڑوں میں گھسی ہے۔

"یہ کیا چکر چل رہا ہے یار! لگتا تو نہیں کہ شاربہ جھوٹ بولے گی۔" میں نے کہا۔

"گناہ کے اکثر کام بڑی نیک نیتی اور سچائی کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔" عمران نے فلسفہ بگھارا اور پھر اپنا ایک واقعہ سنانے بیٹھ گیا جب جیلانی کے محلے میں ایک چور مسجد سے لاؤڈ اسپیکر وغیرہ چرانے کی نیت سے داخل ہوا۔ اس نے مؤذن کے سر پر چوٹ لگائی اور باندھ کر حجرے میں ڈال دیا۔ جب وہ سامان سمیٹ کر جانے لگا تو فجر کی اذان کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ اس نے مسروقہ لاؤڈ اسپیکر سے پہلے باقاعدہ اذان دی، اس کے بعد غائب ہوا۔

میرا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ یوسف فاروقی اپنے مقام سے بہت گرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ آج رات ایک ایسی جگہ پر پایا گیا تھا جس کے بارے میں ثروت شاید سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اسے مجازی خدا کا درجہ دیتی تھی اور یہ مجازی خدا خود ہوس کے کوچے میں ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ ابھی ثروت کا نمبر ملاؤں اور اس سے وہی زبان بولنے لگوں جو نصرت اس سے بولتی تھی۔ اسے بتاؤں کہ وہ پیتل کو سونا سمجھ رہی ہے۔ سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ اپنی زندگی ایک ایسے شخص کے لیے خراب کر رہی ہے جو بگڑے امیرزادوں والی ہر برائی اپنے اندر..... رکھتا ہے۔

لیکن کیا واقعی صورتِ حال وہی تھی جو ہم نے آج محسوس کی تھی؟ کیا واقعی یوسف اس بازارِ حسن میں ایک خریدار بن کر آیا تھا؟ یا پھر یہ کوئی اور چکر تھا، اس کے پیچھے کوئی اور وجہ تھی؟ میں جلد بازی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ثروت کی اس نگاہِ ملامت کا خوف تھا جو یوسف کی بدنامی کے حوالے سے مجھ پر پڑتی۔ میں اس نگاہ کا شکار ہو جاتا تو پاتال سے زیادہ گہرائی میں جا گرتا۔ جب تک کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہ آتا، میں نصرت سے بھی اس اہم واقعے کا ذکر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ہم سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے ہی ڈیفنس والی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ ہم احتیاطاً کوٹھی سے ایک بلاک پہلے ہی اتر گئے۔ ہم اکثر ایسا ہی کرتے تھے۔ باقی کا فاصلہ پیدل طے کیا جاتا تھا۔ اس رات کی جانے والی اس احتیاط نے ہمیں بہت فائدہ دیا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ امتیاز اور اقبال لینڈ کروزر لے کر واپس چلے گئے۔ کوٹھی جا کر عمران نے بستر پر ہست لگا دی۔ میں حسبِ معمول فرش پر لیٹا۔ جسم تھکن سے چور تھا۔ ہم نے صورتِ حال پر تبصرہ کرنے سے گریز کیا اور سو گئے۔

دس بجے کے قریب عمران نے مجھے جگایا۔ ناشتے کے فوراً بعد ہم راجا کی خبر لینے نکل گئے۔ وہ ہوٹل لالہ زار میں ہی تھا اور رات کی مار کٹائی کے بعد اس کا خراب حلیہ مزید خراب ہو گیا تھا۔ ہم ہوٹل پہنچے تو وہ کمرے میں ہی لیٹا تھا۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھ کے نیچے بھی ایک گومڑ نمودار ہو چکا تھا۔ ایک ہاتھ اور گھٹنے پر بھی چوٹ آئی تھی۔ تاہم ان چوٹوں کی اسے کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ عمران نے بروقت اپنے تعلقات استعمال کر کے اسے مکھن کے بال کی طرح نکال لیا تھا۔ اب وہ اس بات کا پکا فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ بازارِ حسن کی اس لڑکی کا غرور ضرور توڑے گا جس نے اس کی پیشکش کو ٹھکرایا ہے اور اس کی درگت بنوائی ہے۔ اس لڑکی کو حاصل کرنے کے لیے اب وہ بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجموعی طور پر اس کا موڈ درست تھا اور جب موڈ درست ہوتا تھا تو وہ بے تکان بولتا تھا۔ عمران نے کہا۔ "بھا راجا! مار کھانے کے بعد تو تمہاری زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے۔"

وہ بولا۔ "تم نے بالکل کنڈم مثال دی ہے۔ قینچی کی طرح زنانیوں کی زبان چلتی ہے۔"

"چلو قینچی کی جگہ خنجر کا لفظ لگا دیتے ہیں۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے اور یہ خنجر کل یا پرسوں پھر اسی کوٹھے پر جا کر چلے گا۔ ایک ایک کی بولتی بند نہ کر دوں تو نام راجا نہیں..." پھر بات کرتے کرتے وہ ذرا سا چونکا۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔ "ہاں، ایک بات یاد آئی۔ پرسوں رات کو تم دونوں کسی خنجر کی بات کر رہے تھے۔ کوئی قیمتی چاقو یا خنجر تھا، گینڈے کی ہڈی کے دستے والا جو وہاں شیخوپورہ والی کوٹھی میں رہ گیا تھا۔"

"وہ بڑا خاص خنجر تھا بھا راجا۔" عمران نے کہا۔ "تابش نے اس خنجر سے انڈیا میں ایک بہت بڑے ڈان کا پیٹ پھاڑا تھا لیکن تم نے اس کا ذکر کیوں کیا ہے؟"

"مجھے پتا ہے اب وہ خنجر کس کے پاس ہے؟" راجا نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے کہا۔

"کس کے پاس ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اسی کوٹھی میں سلطان چٹے کے ایک چمچے کے پاس دیکھا تھا... اور میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی اسی کے پاس ہو گا۔"

"کیا نام ہے اس کا؟" عمران نے پوچھا۔

"نام شام کا تو مجھے پتا نہیں۔ پر شکل دیکھتے ہی فوراً پہچان لوں گا کتے کے تخم کو۔"

عمران نے کہا۔ "تمہیں کیسے یقین ہے کہ یہ وہی خنجر

ہے؟''

''مچھلی کی طرح دستہ ہے نا اس کا۔ کناروں سے سفید اندر سے کالا۔ ایک طرف لال رنگ کا نگ بھی لگا ہوا ہے۔''

''نشانیاں تو تم بالکل ٹھیک بتا رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر گھبراؤ نا، خنجر تمہیں واپس مل جائے گا۔''

''لیکن کیسے؟''

''بس یار! یہ چھوڑ دو نا مجھ پر۔ ایک بندے کو پیچھے لگاتا ہوں۔ تھوڑا سا مال پانی خرچ کرنا پڑے گا۔ پر کوئی گل نہیں، میں کرلوں گا۔ بندے کا پتا لگ گیا تو پھر اس کا پیٹ پھاڑ کر بھی نکال لوں گا اپنی چیز۔''

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن عمران نے آنکھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔ وہ راجا کا رمز شناس تھا۔ اس کے ذہن کی گتھیوں کو سمجھتا تھا۔

کچھ دیر بعد جب راجا کسی کام سے باہر گیا تو عمران نے ہولے سے کہا۔ ''جگر! مجھے لگتا ہے کہ تیرا کام بن گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''پہلے وعدہ کرو کہ ابھی بات اپنے تک ہی رکھو گے۔''

میں نے فوراً وعدہ کرلیا۔ وہ دیدے گھما کر بولا۔ ''مجھے شک ہے کہ خنجر راجا کے پاس ہے یا اس کے پاس پہنچ چکا ہے۔''

''ہائیں۔''

''یہ بڑی گڑبڑ شے ہے۔ تم کچھ نہیں جانتے اس کے بارے میں۔'' عمران نے کہا۔ ساتھ ساتھ اس کی نظریں تیزی سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اچھا تم ایسا کرو کمرے سے نکل کر کھڑے ہو جاؤ۔ جب راجا کوریڈور کے سرے پر نظر آئے تو زور سے کھانس کر مجھے اشارہ دے دینا۔ اس طرح۔'' عمران نے مجھے کھانس کر دکھایا۔

میں کوریڈور میں کھڑا ہو گیا۔ عمران تیزی اور چابک دستی سے راجا کے کمرے کی تلاشی لینے لگا۔ جلد ہی اس نے جوشیلے انداز میں مجھے پکارا۔ میں نے چند قدم پیچھے ہٹ کر کمرے میں جھانکا۔ ایک الماری کے اندرونی خانے میں پرانے اخباروں کے نیچے جو شے نظر آ رہی تھی، یہ وہی یادگار خنجر تھا جس کے بے مثال پھل نے بھانڈیل میں جارج گورا کے پیٹ کی سیر کی تھی۔ اس چاقو نما خنجر سے مجھے ایک خصوصی تعلق پیدا ہو چکا تھا۔

مجھے خنجر کی جھلک دکھانے کے بعد عمران نے اسے فوراً تہ شدہ اخباروں سے ڈھک دیا اور خانے کو بند کرکے الماری کے پٹ بھیڑ دیے۔ میں خوشی آمیز حیرت محسوس کرتا [illegible] کمرے میں واپس آ گیا۔ راجا کے گن سامنے آ رہے [illegible] عمران نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، یہ چاقو راجا کے پاس کیسے پہنچا؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے کیا پتا؟ تمہارا ہی یار ہے۔''

''لیکن اس آسانی تحفے کو ڈھونڈ کر تو تم ہی لا [illegible] ہو نا۔'' عمران نے کہا اور چند لمحے توقف کرکے بولا۔ ''[illegible] اندازہ ہے کہ یہ چاقو ندیم کی تلاشی میں برآمد ہونے [illegible] چیزوں میں ہی موجود تھا۔ راجا نے آٹھ ہزار روپے کی طر[ح] اس چاقو کے بارے میں بھی ہمیں نہیں بتایا۔ اب اسے پتا [چلا] ہے کہ یہ چاقو تمہارے لیے بہت اہم ہے اور تم اس کی گمشدگی پر پریشان ہو۔ اب وہ ہم سے اس کے پیسے کھرے کرنا [چا]ہتا ہے لیکن میرے اندازے کے مطابق یہ ہمیں بہت سستے میں مل جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہزار روپیا۔ یہ اس کی اصل قیمت کا سواں حصہ بھی نہیں ہے۔''

''لیکن کیا یہ پیسے دینے ضروری ہیں؟''

''نہیں، راجا سے بنا کر رکھنا ضروری ہے۔ یہ جیسا [بھی] ہے لیکن ہے کام کا بندہ۔ تم دیکھتے رہنا۔''

اس گفتگو کے دوران میں ہی میری نظر کچھ اشیا [پر] پڑی۔ یہ وہ چیزیں تھیں جو چند دن پہلے ندیم سے برآمد ہوئی تھیں۔ دو چار رسیدیں، ایک قلم، ایک لائٹر، سگریٹ کا پیکٹ، ساٹھ ہزار کا کراس چیک اور چار پانچ سو کیش۔ ابھی کچھ دیر پہلے الماری کی تلاشی کے دوران میں عمران نے یہ اشیا سامنے والی دراز سے نکالی تھیں۔ میں یونہی الٹ پلٹ کر ان چیزوں کو دیکھنے لگا۔ اچانک ایک مڑے تڑے وزیٹنگ کارڈ نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ کارڈ پر لکھا تھا۔ میوزک اینڈ ڈانس اکیڈمی۔ شام کی ریگولر کلاسز۔ بہترین ماحول۔ زیر سرپرستی مسز شارہ بہ غیاث۔ نیچے جو ایڈریس تھا وہ میرا جانا پہچانا تھا۔ یہ بازارِ حسن کے اسی کوٹھے کا تھا جہاں ہماری ملاقات [شار]ہ بائی سے ہو چکی تھی۔

میں نے یہ کارڈ عمران کو دکھایا۔ اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیل گئیں اور آنکھوں میں چمک نمودار ہو گئی۔

چند ہی منٹ میں ہم ایک انکشاف انگیز نتیجے پر پہنچ گئے تھے۔ اس بات کے واضح اشارے مل رہے تھے کہ شارہ بائی اور جاوا گروپ کے لوگوں میں تعلق ہے۔ جاوا کا تعلق فلم لائن سے تھا، دوسری طرف شارہ بائی بھی فلمی اداکارا[ؤں] سے رابطوں کا دعویٰ کر رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''یار! یہ کہیں وہی ڈبل گیم تو نہیں جو ہم اس سے پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''وہی ''ہم شکلی'' والا چکر۔ جاوا کے لوگ مشہور فلمی چہروں کی نقلیں جمع کر رہے ہیں۔ دو تین انڈین اداکاراؤں کی زبردست کاپیاں ہم دیکھ چکے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ دو چار پاکستانی اداکاراؤں کے ڈپلی کیٹ بھی ان لوگوں کو مل چکے ہوں۔''

''بالکل ایسا ہوسکتا ہے۔'' عمران نے پُرجوش انداز میں سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

''اس کا تو یہ مطلب بھی ہے کہ کل شاربہ بائی نے تم سے جو سودا کیا ہے وہ بھی کسی ''ڈمی'' لڑکی کے لیے ہوگا۔ کوئی ایسی لڑکی جو بہت حد تک ہماری فلمی ہیروئن سے مشابہ ہوگی۔ ایسے لوگوں کے لیے اس قسم کے کھیل کھیلنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مہینا ڈیڑھ مہینا پہلے میں نے ایک اردو روزنامے میں اشتہار دیکھا تھا۔ کچھ اس طرح کا مضمون تھا کہ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی صورت کسی مشہور اداکار یا اداکارہ یا کسی ''سیلیبریٹی'' سے ملتی ہے تو ہم سے رجوع کریں۔ ہمارے پاس آپ کے لیے اچھی آفرز ہیں۔ میرے خیال میں اس طرح کے اشتہارات سے کوئی شخص بھی مشہور چہروں سے ملتے جلتے چہرے اکٹھے کرسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان درجنوں چہروں میں سے کوئی ایک آدھ چہرہ ایسا بھی ہو جو واقعی حیرت انگیز مشابہت رکھتا ہو۔ اور جب یہ کام وسیع پیمانے پر کیا جائے تو پھر مشابہ چہرہ ملنا اور بھی ممکن ہوجاتا ہے۔''

''یہ تو بڑا زبردست گیم لگ رہا ہے۔ مشہور لوگوں سے ملتے جلتے لوگ اکٹھے کرو اور پھر انہیں مختلف کاموں کے لیے استعمال کرو۔''

''بالکل، مجھے ایک عریاں فلم یاد آرہی ہے۔ عریاں فلمیں دیکھنے والوں میں وہ کافی مقبول ہوئی تھی۔ تماش بین طبقے نے اس فلم کو ایک مشہور اداکارہ کی فلم سمجھ کر دیکھا تھا اور دانتوں میں انگلیاں دبائی تھیں۔ لیکن بعض لوگ پورے یقین سے کہتے ہیں کہ وہ اس اداکارہ کی نہیں بلکہ اس کی ہم شکل کی فلم تھی۔''

''میرے خیال میں تو اس طرح مشہور لوگوں کو اپنے مقاصد کے لیے بلیک میل بھی کیا جاسکتا ہے۔ یعنی خرابی بسیار کے بہت سے طریقے موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن... تمہارا کیا اندازہ ہے عمران... اخبار میں کوٹھی کی '' فروخت کا'' وہ اشتہار بھی ڈمی تھا؟''

''یہ تو کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے ڈیڑھ دو ہزار خرچ کر کے کوئی بھی ایڈ دے سکتا ہے۔''

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ عمران موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا کیا اندازہ ہے جگر! کیا یہ فاروقی واقعی مشہور فلمی ہیروئن کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کے لیے شاربہ بائی کے ڈیرے پر پہنچا ہے؟''

''بظاہر تو یہی لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''فلم ایکٹر وسیم احمد بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کے ساتھ یوسف کی یاری لگتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یوسف کا غم غلط کرنے کے لیے اس نے یوسف کو یہ انوکھی راہ دکھائی ہو۔''

''غم غلط سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا وہی ثروت والا معاملہ؟''

''ہاں، نصرت جو کچھ بتا رہی ہے اس سے یہی پتا چلتا ہے کہ گھر میں تناؤ ہے۔ ثروت اوپر کی منزل پر نصرت کے ساتھ سوتی ہے۔ میاں بیوی آپس میں بس ضروری بات چیت کرتے ہیں۔''

''اپنے آپ کو بڑے ہلکے کردار کا ثابت کر رہا ہے بندہ۔'' عمران نے کہا۔

''لیکن ابھی تک ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت بھی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ویسا نہ ہو جیسا ہم سمجھ رہے ہیں۔ کبھی تو ہوتا ہے کہ کئی شوہر اپنی بیویوں کو ''راہِ راست'' پر لانے کے لیے اس طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ بیوی، شوہر کو غلط ماحول سے بچانے کے لیے اس کی ہر بات ماننے کو تیار ہوجاتی ہے۔''

اسی دوران میں راجا واپس آگیا۔ وہ تھوڑا سا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ یہ رات والی مارا ماری کا نتیجہ تھا۔ عمران نے منہ بنا کر کہا۔ ''یار بھا راجا! تم ایک دو دن میں وہ چاقو یا خنجر بھی بے تابی کو لا دو، ورنہ یہ سوکھ کر کانٹا ہوجائے گا۔ لیکن ہاتھ پاؤں بچا کر، کہیں کوئی اور پھڈا کھڑا نہ کر دینا۔''

''اوئے عمو... میں خود تھوڑا جاؤں گا اوکھلی میں سر دینے کے لیے۔ ایک کرائے کے بندے کو بھیجوں گا۔ تو فکر نہ کر سب ٹھیک ہوجائے گا... ایک دم ٹیٹ۔''

عمران نے جیب سے تین ہزار روپے نکال کر اسے دیے۔ ''یہ خرچے کے لیے رکھ لو نا... باقی بعد میں دیکھیں گے۔''

راجا نے تھوڑا سا تذبذب دکھا کر روپے رکھ لیے۔ عمران کے چہرے پر ممنونیت برس رہی تھی۔ میں نے مسکراہٹ دبانے کے لیے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

راجا کے پھٹیچر موبائل پر کال آگئی۔ وہ اسے سنتا ہوا باہر چلا گیا۔ ہم ایک بار پھر پرانے موضوع پر آگئے۔ عمران نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر واقعی جاوا گروپ کے لوگوں کا تعلق شاربہ بائی سے ہے تو پھر ان لوگوں کا اس کے ہاں آنا جانا بھی ہوگا۔ ہم کل رات شاربہ بائی کے کوٹھے پر تھے۔ کہیں ایسا نہ ہوا ہو کہ جاوا کے کسی بندے نے ہمیں پہچان لیا ہو۔''

''یہی بات میں سوچ رہا ہوں۔ ہم کوٹھے سے سیدھے ڈیفنس والی کوٹھی چلے گئے تھے۔ ہم ایک بلاک پہلے تو اتر گئے تھے لیکن پھر بھی خطرہ تو موجود ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ گاڑی سے اترنے کے بعد کسی نے ہمارا پیچھا نہیں کیا۔ میں نے عقب میں نگاہ رکھی تھی۔ اگر کوئی ہمارے تعاقب میں ہوگا بھی تو وہ لینڈ کروزر کا پیچھا کرتے ہوئے آگے نکل گیا ہوگا۔''

''یعنی ایسی صورت میں اقبال اور امتیاز اس کی نظر میں آگئے ہوں گے۔ اقبال کل یہاں ہوٹل میں بھی آیا تھا۔ اس طرح یہ ہوٹل بھی جاوا گروپ کی نظر میں آسکتا ہے۔''

ابھی بمشکل میرا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ عمران چونک گیا۔ اس کی نگاہ ادھ کھلے دروازے سے باہر گئی تھی۔ ایک بیرا ہاتھوں میں رات کے کھانے کی ٹرے لیے گزر رہا تھا۔ عمران اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ بیرا سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل پر جا رہا تھا۔ ہم بھی سیڑھیوں کی طرف آئے۔ بیرے نے مڑ کر ہمیں دیکھا اور چونکا... وہ اوپر والے کوریڈور میں پہنچا تو ایک بار پھر اس نے گھوم کر دیکھا۔ اس نے کھانے کی ٹرے ایک طرف پھینکی۔ سالن، روغنی نان اور سلاد وغیرہ ہوا میں اڑتے نظر آئے۔ بیرے نے اپنے لباس میں سے پستول نکالا اور اندھا دھند عمران پر گولی چلائی۔ عمران اس سے پہلے ہی فرش پر گر چکا تھا۔ فائر خالی گیا۔ جواب میں عمران کی چلائی ہوئی گولی حملہ آور کے پیٹ میں لگی۔ وہ اوندھے منہ بوسیدہ قالین پر گرا۔

عمران اور میں تیزی سے واپس پلٹے۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے عمران نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''یہ جاوا گروپ کا بندہ ہے۔ سلطان چنا کا گن مین۔''

ہم سیڑھیاں اترے تو ایک اور ہٹا کٹا شخص نظر آیا۔ اسے بھی ہم نے اس سے پہلے ہوٹل میں نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے اور وہ اپنے لباس سے کوئی ہتھیار نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عمران نے اسے ایک لمحے کا موقع بھی نہیں دیا۔ سیڑھیاں اترتے اترتے اس نے بلندی سے ہی اس شخص پر جست لگائی۔ عمران کے دائیں ہاتھ میں موجود پستول کا آہنی دستہ پورے زور سے اس شخص کے سر پر لگا اور وہ بے سدھ ہوکر ایک طرف گر گیا۔

میں اور عمران بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچے۔ میں نے بازار کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول کر دیکھا۔ ایک بار پھر وہی نقشہ نظر آیا جو دس بارہ دن پہلے پرائیویٹ اسپتال کے باہر نظر آیا تھا۔ کم از کم تین مشکوک گاڑیاں ہوٹل لالہ زار کے سامنے موجود تھیں۔ ان کے قریب جو ایک دو غنڈا ٹائپ افراد نظر آرہے تھے، وہ یقیناً جاوا گروپ کے ہی تھے۔

راجا بھی آگیا تھا اور حیرت سے منہ کھولے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ہوٹل کو جاوا کے لوگوں نے گھیر لیا ہے۔''

''کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' عمران نے کہا۔

''یہاں پچھلی طرف ایک دروازہ ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔'' راجا نے کہا۔ ہم راجا کے پیچھے دوڑے۔ چند سیڑھیاں اتر کر ہم ہوٹل کے کچن میں داخل ہوگئے۔ دھڑا دھڑ کڑاہی گوشت اور سبزی وغیرہ تیار ہو رہی تھی۔ کھانا پکانے والے ہماری اس اندھا دھند داخلت پر حیران رہ گئے۔ راجا نے کچن کا بیرونی دروازہ کھولا۔ لیکن ابھی اس نے ایک قدم ہی آگے بڑھایا تھا کہ عمران نے کالر سے پکڑ کر اسے واپس کھینچ لیا... اس دروازے کے عین سامنے بھی ایک گاڑی نظر آرہی تھی اور اس کے قریب ایک مسلح باوردی گارڈ بالکل چوکس کھڑا تھا۔ راجا کو دیکھتے ہی اس نے رائفل سیدھی کرلی تھی۔ اس کے باوجود کہ ہم نے کچن کا دروازہ بند کر دیا تھا، پمپ ایکشن گن کا ایک فائر ہوا اور کڑاہی گوشت بناتا ہوا ایک باورچی فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔

''لالے! بری طرح پھنس گئے ہیں۔ ایک دم ٹیٹ کام ہوا ہے۔'' راجا نے کہا۔

''کوئی اور راستہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، آؤ میرے پیچھے۔'' راجا نے کہا اور ہوٹل کے اس حصے کی طرف بھاگا جہاں ایک چھوٹے سے صحن میں ہوٹل

www.paksociety.com

کے ملازموں اور گاہکوں وغیرہ کے سائیکل اور موٹر سائیکل کھڑے رہتے تھے۔ ہم اس صحن..... سے گزر کر ایک چھوٹی سی دکان کے عقب میں پہنچے۔ راجا نے اپنے کندھے کی زوردار ضرب سے دکان کی عقبی کھڑکی توڑ دی۔ ہم کود کر دکان میں گھسے۔ یہ ربڑی اور فالودے کی دکان تھی۔ دو خواتین سمیت چار پانچ گاہک موجود تھے اور ربڑی والے دودھ کے گھونٹ لے رہے تھے۔ ان کی ہوائیاں اڑ گئیں۔ عورتیں چلاتی ہوئی باہر کی طرف بھاگیں۔ ہم کرسیاں الٹاتے اور لوگوں سے ٹکراتے باہر بازار میں آگئے۔ یہاں اچھی خاصی رونق تھی لیکن اگر ہمارا خیال یہ تھا کہ ہم بچ نکلے ہیں تو یہ غلط تھا۔ جونہی ہم بازار میں نکلے، ایک طرف سے دو ہوائی فائر ہوئے۔ پھر ہم نے کچھ افراد کو اپنی طرف لپکتے دیکھا۔ وہ لوگوں میں سے راستہ بناتے ہوئے ہماری طرف جھپٹتے چلے آرہے تھے۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی ایک درجن سے کم نہیں تھی۔ اور یقیناً اردگرد مزید افراد بھی موجود ہوں گے۔ ہوٹل لالہ زار کا بڑا مکمل گھیراؤ کیا گیا تھا... اور گھیراؤ کرنے والوں کے ارادے نہایت خطرناک تھے۔ ہمیں دائیں جانب کچھ عافیت نظر آئی۔ ہم اسی طرف بھاگے۔ رش اتنا زیادہ تھا کہ یہاں فائرنگ نہیں کی جاسکتی تھی، ورنہ اب تک ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوچکی ہوتی۔ دوسری طرف ہمارے پاس ایک پستول کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور اس میں سے بھی ایک گولی عمران ہوٹل کے اندر نقلی بیرے پر داغ چکا تھا۔

یکایک دائیں طرف سے جھپٹنے والے دو تین افراد ہمارے سر پر پہنچ گئے۔ ان کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں مجھے گراری دار چاقو صاف نظر آیا۔ میرے قریب پہنچتے ہی اس شخص نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور ایک غلیظ گالی کے ساتھ چاقو میرے پہلو میں گھونپنا چاہا۔ اگر اس نے مجھ پر حملہ کیا ہوتا تو شاید کامیاب ہوجاتا لیکن اس نے باروندا جیکی کے شاگرد پر حملہ کیا تھا اور شاگرد بھی وہ جس نے کئی ماہ دیوانہ وار اپنے استاد کی مار کھائی تھی۔ میں نے بھاگتے بھاگتے اس کا خطرناک وار اپنی کلائی پر روکا اور اس کی بائیں پسلیوں کے نیچے ایک مخصوص جگہ گھٹنے کی کارگر ضرب لگائی۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح سڑک پر گرا اور ہجوم کے پاؤں تلے روندا گیا۔ دوسری طرف میں نے ایک اور شخص کو عمران کے سر کی زوردار ٹکر کھا کر دودھ کے کڑاہے میں گرتے دیکھا... لاہور کی سڑکوں پر دھینگا مشتی کی ہماری خواہش اس طرح پوری ہورہی تھی کہ ایک خلقت انگشت بدنداں تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہے۔ بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ہم کھلی جگہ پر نکل آئے تو جاوا کے درجنوں کرگے ہمیں بھون کر رکھ دیں گے۔ ہم رش والے حصوں میں گھس رہے تھے مگر یہ بھی اندیشہ تھا کہ اس طرح ہم عام لوگوں کی زندگیاں خطرے میں ڈال دیں گے۔

اچانک ہمیں لگا کہ اب ہم قدرے کھلی جگہ پر آ گئے ہیں اور اب کسی بھی وقت ہم پر فائرنگ ہوجائے گی۔

''اس سامنے والی بلڈنگ میں۔'' عمران نے پکار کر اور انگلی سے اشارہ بھی کیا۔

یہ ایک چھوٹی سی دومنزلہ عمارت تھی۔ نیچے میڈیکل اسٹور تھا۔ اسٹور کے ساتھ اوپر جاتی ہوئی سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں میں داخل ہوئے اور آہنی دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ فائر ہوئے اور ایک گولی دروازے میں لگی۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے پورشن میں آگئے۔ یہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ ہم نے سیڑھیوں کا بالائی دروازہ بند کر دیا۔ میں نے محتاط انداز میں ایک کھڑکی تھوڑی سی کھولی اور نیچے جھانکا۔ ہمارا تعاقب کرنے والے اردگرد پوزیشنیں لے رہے تھے۔ دو گاڑیاں تیز رفتاری سے آئیں۔ ان کے بریک چرچرائے اور ان میں سے بھی مسلح افراد نکل کر اردگرد پھیل گئے۔ ان میں سلطان چنا بھی نظر آیا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' راجا نے ہانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

عمران نے اپنے پستول کی گولیاں چیک کیں، پھر بولا۔ ''اب تو جو کرنا ہے، شیر نے ہی کرنا ہے۔''

''اور شیر کون ہے؟'' راجا نے دریافت کیا۔

''اس کا فیصلہ ابھی تھوڑی دیر میں ہوجائے گا۔'' عمران نے کہا۔

لائٹس آف ہورہی تھیں۔ دکانوں کے شٹر دھڑا دھڑ گر رہے تھے۔ لوگ اپنی سواریوں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ سامنے والے ایک میوزک سینٹر میں دکاندار اپنا ٹیپ ریکارڈ آن چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ آواز بلند ہورہی تھی۔ اک پل ہے زندگی جو تھم گئے تو کچھ نہیں... یہ قدم کسی مقام پر رک گئے تو کچھ نہیں۔

...اور یہ لاہور کی ایک سنگین رات تھی۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

ماضی کی پرچھائیاں وقت گزرنے کے باوجود پیچھا نہیں چھوڑتیں... اسے بھی بیتے ہوئے واقعات کی کسک چین نہیں لینے دیتی تھی... بالآخر اس نے ان چبھتی یادوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے ایک ترکیب سوچ لی مگر یہ خوش تدبیری بھی اس تاریکی کا ازالہ نہ کرسکی۔

زندگی کی بساط پر ایک بازی کا خوفناک کھیل... تمام مہرے اس کی جنبشِ نگاہ کے مطابق حرکت کر رہے تھے مگر...

بچاؤ

اقبال کاظمی

جمشید خاقانی کا شمار ایسے لوگوں میں کیا جاسکتا تھا جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ جب تک زندہ رہتے ہیں انہیں کچھ نہیں کرنا پڑتا... سوائے اس کے کہ اپنے عالی شان دفتر میں بیٹھے دولت کا حساب لگاتے رہیں۔ جمشید خاقانی بھی شاید اسی لیے پیدا ہوا تھا کہ اطمینان سے بیٹھا اپنے بزرگوں کے لگائے ہوئے پودے کا پھل کھاتا رہے۔ اس کی عمر اگرچہ پینتالیس کے لگ بھگ تھی لیکن قابلِ رشک صحت کی بنا پر پینتیس سے زیادہ کا نظر نہیں آتا تھا۔

بالوں میں اگرچہ چاندی کے تاروں کی سی چمک آگئی تھی مگر ایسے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے جنہیں بڑھاپے کی علامت کہا جاسکتا۔ لمبے قد، صحت مند جسم اور عمدہ تراش کے قیمتی لباس میں اس کی شخصیت خاصی پُروقار نظر آرہی تھی لیکن اس وقت اس کے چہرے پر کچھ ایسی علامات تھیں جن سے تشویش و تردد کا تاثر ملتا تھا۔ اس کی پرائیویٹ سیکریٹری نے جب انٹرکام پر ناصر شیرانی کی آمد کی اطلاع دی تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے ہی لمحہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

''ہیلو شیرانی!'' وہ ویٹنگ روم میں منتظر ایک اسمارٹ آدمی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ میری دعوت پر تم بلاحیل و حجت یہاں چلے آئے۔ تم یقیناً یہ جاننے کے لیے بے چین ہوگے کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟''

شیرانی کو واقعی حیرت تھی۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ جمشید خاقانی کے پاس قانونی مشیروں کی ایک پوری فوج تھی۔ اگر اسے کوئی مسئلہ درپیش تھا تو وہ ان میں سے کسی ایک کو یا سب کو طلب کرسکتا تھا۔ مزید حیرت اس بات پر تھی کہ جمشید اس کے استقبال کو خود دفتر سے باہر آیا تھا جبکہ ایسے لوگ اپنے ملاقاتیوں کو گھنٹوں انتظار کراتے ہیں۔ اس کے ہاتھ ملانے کے انداز میں اگرچہ گرمجوشی تھی لیکن شیرانی نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ وہ کچھ نروس سا ہو رہا تھا۔ اسی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وہ جمشید خاقانی کے کمرائے خاص میں آگئے۔

''بیٹھو!'' جمشید نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

نشست سنبھالتے ہوئے شیرانی متجسس نگاہوں سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ شاندار اور خوب صورت طریقے پر آراستہ دفتر کی ایک دیوار پر خاقانی انٹرپرائز کا طلائی مونوگرام آویزاں تھا۔ اس ادارے کے تحت کئی تجارتی کمپنیاں اور دو ٹیکسٹائل ملز بڑی کامیابی سے چل رہی تھیں۔ جمشید خاقانی دفتر کے اسی کمرے میں بیٹھا سارے کاروبار کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

''کیا تم میرے لیے کچھ وقت نکال سکتے ہو شیرانی؟'' جمشید اس کے مقابل دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال کیسے آگیا؟'' شیرانی اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''اگر کوئی قانونی مسئلہ ہے تو آپ اپنے کسی تنخواہ دار قانونی مشیر سے یہ کام کیوں نہیں لیتے؟''

''نہیں!'' جمشید نے نفی میں سر کو حرکت دی۔ ''وہ لوگ دیگر ذمے داریوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ یوں بھی، جو کام تم سے لینا چاہتا ہوں وہ ان کے فرائض کی حدود میں نہیں آتا۔''

''کیا آپ تفصیل سے کچھ بتانا پسند کریں گے؟'' شیرانی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''بہتر ہوگا کہ پہلے یہ پڑھ لو۔ میرا خیال ہے اس سے وضاحت ہو جائے گی۔'' جمشید نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔

شیرانی نے تہ شدہ کاغذ کھولا۔ پنسل سے آڑے ترچھے حروف میں مختصر سی تحریر تھی۔

''مسٹر جمشید خاقانی!

اگر آپ کو اپنے بیٹے جنید کی سلامتی عزیز ہے تو اس کے لیے آپ کو صرف دس لاکھ روپے کی قربانی دینا ہوگی۔ پولیس سے رجوع کرنے کی صورت میں جنید کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ مجھے امید ہے کہ آپ کسی بدحواسی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے ٹھنڈے دماغ سے کام لیں گے۔ آج شام چھ بجے ٹیلی فون پر دوسری ہدایات کا انتظار کریں۔''

شیرانی نے جمشید کی طرف دیکھا جو صوفے سے اٹھ کر میز کے پیچھے کرسی پر جا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر فکر کے آثار اب زیادہ نمایاں ہو چکے تھے۔ وہ شیرانی کی طرف دیکھتے ہوئے خاموش بیٹھا نچلا ہونٹ چبا رہا تھا۔

''میں تو اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ آپ کی اولاد نہیں ہے۔'' شیرانی نے کہا۔

''جنید میری دوسری بیوی کی اولاد ہے۔ شادی کے بعد میں نے اسے نہ صرف قانونی طور پر اپنا لیا تھا بلکہ اس کا نام تبدیل کر دیا تھا۔''

''عمر کیا ہے؟'' شیرانی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''پانچ سال۔''

''یہ خط آپ کو کیسے ملا؟''

''آج صبح کی ڈاک سے۔''

''کیا میں اس کا لفافہ دیکھ سکتا ہوں؟''

جمشید نے میز کی دراز سے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا جس پر ایڈریس بھی پنسل ہی سے لکھا ہوا تھا۔ لفافے پر گزشتہ روز کی مُہر تھی اور اسی شہر کے کسی علاقے سے پوسٹ کیا گیا تھا۔

''اب بتاؤ میں کیا کروں؟ مجھے تمہارا مشورہ درکار ہے شیرانی۔'' جمشید نے کہا۔

''میرا مشورہ تو یہی ہے کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پولیس کو مطلع کر دیں۔''

''نہیں، میں ایسا نہیں کرسکتا۔'' جمشید پیشانی سہلاتے ہوئے بولا۔ ''جنید کی زندگی داؤ پر لگی ہے اور میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔''

شیرانی نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ عجلت میں ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا جو ان کے لیے واقعی خطرناک ثابت ہو۔ خط کی تحریر سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے انتہائی سفاک ہے۔ ہدایات کی خلاف ورزی پر وہ ایک انسانی زندگی کا چراغ گل کرنے میں کسی جھجک کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔

''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم فون کال کا انتظار کرلیں۔ کوئی حتمی فیصلہ اس کے بعد ہی کیا جاسکے گا۔'' شیرانی بولا۔

''میرا بھی یہی خیال تھا۔'' جمشید نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم بھی یہی کہو گے۔ صبح جس وقت مجھے یہ خط ملا تم میری اس وقت کی کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ خط ملنے کے تھوڑی ہی دیر بعد میں بینک چلا گیا تھا۔''

''رقم لینے کے لیے؟'' شیرانی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں، میں نے پرانے نوٹوں کی صورت میں مطلوبہ رقم بینک سے نکلوالی ہے۔''

''رقم کہاں ہے؟''

جمشید نے میز کے سرے پر رکھے ہوئے بریف کیس کی طرف اشارہ کر دیا اور پھر اس کی اجازت پا کر شیرانی نے اٹھ کر بریف کیس کھول دیا۔ ایک ہی نظر کافی تھی۔ سو سو کے پرانے نوٹوں کے بنڈل سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ شیرانی بریف کیس بند کر کے دوبارہ اپنی جگہ پر آگیا اور جمشید کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ اس کام کے لیے آپ نے میرا ہی انتخاب کیوں کیا ہے؟''

''تم نے میری پہلی بیوی کے طلاق کے مقدمے میں جس ذہانت اور کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا، اس سے میں واقعی بہت متاثر ہوا تھا۔'' جمشید نے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔ ''محض تمہاری وجہ سے مجھے اس کیس میں اپنی شکست تسلیم کرنا پڑی تھی جس کے نتیجے میں، میں نے اپنی بیوی کو طلاق کے ساتھ بیس ہزار روپیا ماہانہ نان و نفقہ کے طور پر دینا بھی منظور کر لیا تھا۔ طلاق کے اس مقدمے میں اگرچہ چوٹی کے وکیلوں کا ایک پینل میرا دفاع کر رہا تھا لیکن تمہاری ذہانت کے سامنے وہ بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے۔ بہرحال، اس واقعے کے بعد میں نے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کیں تو بعض دلچسپ انکشافات بھی ہوئے۔ میں یہ بھی جان چکا تھا کہ معقول معاوضہ لے کر تم عدالت کے باہر بھی کام کرتے ہو۔ اس وقت جو مسئلہ درپیش ہے اس سے صرف تم جیسا ذہین آدمی ہی نمٹ سکتا ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم انکار نہیں کرو گے۔''

شیرانی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ محض اس کی ذہانت کی بدولت جمشید خاقانی کو عدالت میں طلاق نامے پر نہ صرف دستخط کرنے پڑے تھے بلکہ جائداد کا کچھ حصہ نسرین کے نام منتقل کرنے کے علاوہ بیس ہزار روپے ماہانہ کے اقرار نامے پر بھی دستخط ثبت کرنے پڑے تھے۔

شادی کے وقت نسرین کی عمر صرف بائیس سال تھی۔ اس کا شمار شہر کی حسین ترین عورتوں میں کیا جاسکتا تھا۔ وہ پرائیویٹ سیکریٹری کی حیثیت سے جمشید کے دفتر میں آئی تھی لیکن چند ماہ بعد ہی وہ اس کے دل کے راستے گھر میں داخل ہو گئی۔ شادی کے ایک ہفتے بعد نسرین کی سفارش پر جمشید نے ایک غریب نوجوان یعقوب کو ڈرائیور کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا تھا لیکن چند ماہ بعد ہی یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ یعقوب، نسرین کا محبوب تھا جسے شادی کے بعد بھی اس نے ملازمت کے بہانے اپنے قریب رکھا تھا۔ جمشید نے یعقوب کو فوراً ہی ملازمت سے نکال دیا لیکن وہ اپنی ازدواجی زندگی میں وہ خوشیاں حاصل نہ کرسکا جسے وہ اپنا حق سمجھتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شادی کے صرف چھ ماہ بعد اسے نسرین سے بھی دستبردار ہونا پڑا اور پہلے سے طے شدہ شرائط کے مطابق اپنی کچھ جائداد بھی اس کے حوالے کرنی پڑی۔ طلاق کے بعد نسرین اس دو منزلہ عالیشان مکان میں منتقل ہوگئی جو اب قانونی طور پر اس کی ملکیت تھا۔ اب وہ کھل کر سامنے آگئی تھی۔ اس کا زیادہ وقت یعقوب کے ساتھ مختلف مقامات کی تفریح میں گزرتا۔ جمشید سے ملنے والی کار ان کی تفریح میں خاصی مددگار ثابت ہو رہی تھی لیکن نسرین بھی اس دنیا کی زیادہ خوشیاں نہ سمیٹ سکی۔ طلاق کے چند ماہ بعد وہ بھی پُراسرار حالات میں موت کا شکار ہوگئی۔

اس رات وہ یعقوب کے ساتھ فلم کا آخری شو دیکھ کر لوٹی تھی۔ یعقوب اسے پورچ کے سامنے اتار کر گاڑی کو گیراج کی طرف لے گیا تھا۔ نسرین اس کا انتظار کرنے کے بجائے

www.paksociety.com

اوپر چلی گئی۔ دوسری منزل پر پہنچ کر بیڈ روم کی طرف جانے کے بجائے نہ جانے کیوں بالکونی میں آ گئی۔ بالکونی کی ریلنگ دوفٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ پھر نہ جانے کس طرح اس کا پیر پھسلا، وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور نیچے کنکریٹ کے فرش پر جا گری۔ وہ سر کے بل گری تھی۔ گردن کی ہڈی ٹوٹتے ہی روح نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ بعد میں میڈیکل رپورٹ سے یہ انکشاف ہوا کہ نسرین ہیروئن کے استعمال کی عادی تھی اور اس وقت بھی اس کے خون میں اس نشہ آور دوا کی آمیزش پائی گئی تھی جس سے یہ فرض کر لیا گیا کہ نشے کی وجہ سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی ہوگی۔

پولیس نے یعقوب کو شبہ میں گرفتار کر لیا۔ اس کا سابقہ ریکارڈ کچھ اچھا نہیں تھا۔ ان دنوں وہ کوئی کام دھندا بھی نہیں کر رہا تھا، اس کی آمدنی کا ذریعہ نسرین ہی تھی۔ اس نے یہ تو اعتراف کر لیا کہ ہمیشہ کے لیے اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے نسرین کو ہیروئن کے نشے کی عادت اسی نے ڈالی تھی لیکن اس کے قتل سے سختی سے انکار کرتا رہا۔ اس کا بیان تھا کہ جب وہ کار کو گیراج میں بند کر کے اوپر پہنچا تو نسرین کی چیخ سن کر بالکونی کی طرف دوڑا تھا پھر جب نیچے پہنچا تو وہ ختم ہو چکی تھی۔

اس واقعے کو ایک سال ہو چکا تھا۔ کوئی ثبوت نہ ہونے کی بنا پر پولیس کو یعقوب کو بھی چھوڑنا پڑا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ واقعہ بھی اب لوگوں کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔

''شیرانی!'' جمشید کی آواز سن کر وہ خیالات کی دنیا سے باہر آ گیا۔ ''کیا تم میری مدد کرنے کو تیار ہو۔ میرا مطلب ہے رقم اس شخص تک پہنچانے کی ذمے داری لے سکتے ہو؟''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اس طرح رقم کی ادائیگی کے خلاف ہوں۔ اس نامعلوم شخص نے ابھی آپ کو محض دھمکی دی ہے، جنید کو اغوا نہیں کیا گیا اگر محض اس دھمکی پر اس کا مطالبہ پورا کر دیا گیا تو کل وہ اسی طرح اپنا کوئی اور مطالبہ بھی منوا سکتا ہے۔''

''یہ محض دھمکی نہیں۔'' جمشید کے جبڑے بھنچ گئے۔ ''مطالبہ پورا نہ ہونے پر جب جنید کو واقعی اغوا کر لیا جائے گا تو تم اس وقت کی صورتِ حال کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس وقت میرے سامنے سب سے اہم مسئلہ جنید کی سلامتی کا ہے۔''

''کیا اسے کہیں اور نہیں بھیجا جا سکتا۔ میرا مطلب ہے یہاں سے دور کسی دوسرے شہر؟''

''اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کا گھر یہاں ہے، اسے باہر کیسے بھیج دوں اور پھر ہمیشہ کے لیے تو اسے گھر سے دور نہیں رکھا جا سکتا۔''

''کیا آپ نے اپنی بیگم سے اس سلسلے میں کوئی بات کی ہے؟''

''نہیں۔'' جمشید نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ سنتے ہی وہ پاگل ہو جائے گی۔ لیکن کیا تمہارے خیال میں مجھے، اسے بتا دینا چاہیے؟''

''میرا خیال ہے پہلے اس شخص کی طرف سے فون کال کا انتظار کر لینا چاہیے۔ اس دوران میں اپنے کچھ ضروری کام نمٹا..... لیتا ہوں۔ میں آفس ہی میں رہوں گا۔ جیسے ہی فون آئے مجھے......''

شیرانی کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ جمشید اپنی کرسی پر اس طرح اچھلا جیسے اس کے سر پر بم پھٹا ہو۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں اور وہ متوحش نگاہوں سے فون کی طرف دیکھنے لگا۔

''ابھی صرف چار بجے ہیں۔ کسی اور کا فون ہو گا۔ اطمینان سے بات کریں۔'' شیرانی نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

جمشید نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ وہ اسے کان کے قریب لاتے ہوئے اس طرح ڈر رہا تھا جیسے خدشہ ہو کہ دھماکے سے پھٹ نہ پڑے۔ بولنے سے پہلے اس نے کھنکھار کر حلق صاف کیا مگر پھر بھی آواز ایسی تھی جیسے کہیں اٹک اٹک کر آ رہی ہو۔ شیرانی اور جمشید کے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ دوسری طرف سے کوئی عورت بات کر رہی تھی۔ اس کی آواز ایسی ہی تھی جیسے پوری رفتار سے ٹیپ ریکارڈر کھول دیا گیا ہو۔ اگرچہ ایک لفظ بھی شیرانی کے پلے نہیں پڑ سکا تھا لیکن جمشید کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔ اس کا چہرہ اس طرح سفید ہو چکا تھا جیسے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ چند لمحوں بعد اس کے ہونٹوں سے مردہ سی آواز نکلی۔

''سنو خالدہ! بدحواس ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو۔ کسی کو بتانے یا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے کمرے میں رہو۔ میں فوراً آ رہا ہوں۔'' جمشید نے ریسیور رکھ کر شیرانی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ کس کا فون تھا؟'' شیرانی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ لے گئے۔'' جمشید نے میز پر گھونسا مارا۔ ''وہ جنید کو لے گئے۔''

''او ہ کیسے؟'' شیرانی بھی چونک گیا۔

''اسکول کی پرنسپل کا بیان ہے کہ میں نے اسے فون پر ہدایت کی تھی کہ جنید کو چھٹی دے کر میرے شوفر کے ساتھ بھیج دیا جائے جبکہ گزشتہ ایک سال سے میرے پاس کوئی شوفر نہیں ہے۔ اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد جب چھٹی کے وقت خالدہ، جنید کو لینے کے لیے اسکول پہنچی تو انکشاف ہوا کہ وہ ڈرائیور کے ساتھ جا چکا ہے۔ مجھے اب گھر چلنا چاہیے۔ خالدہ یقیناً ہلکان ہو رہی ہوگی۔''

''میرے خیال میں اب پولیس کو اطلاع کر دینی چاہیے۔'' شیرانی نے مشورہ دیا۔

''نہیں!'' جمشید نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''پہلے میں ان کا مطالبہ پورا کروں گا۔ جنید کے بخیریت گھر واپس آنے کے بعد پولیس کو اطلاع دی جائے گی۔''

''میں اس معاملے میں مداخلت نہیں کروں گا جو بہتر سمجھیں وہی کریں۔ مجھے جنید کے اسکول کا پتا بتا دیں۔'' شیرانی اٹھتے ہوئے بولا۔

جمشید نے اسے اسکول کا پتا بتا دیا۔ شیرانی جب دروازے کی طرف بڑھا تو جمشید بھی اپنی کرسی سے اٹھ کر میز کے سرے پر رکھے ہوئے بریف کیس کے ہینڈل پر گرفت جما رہا تھا۔

☆☆☆

اسکول کی پرنسپل مسز شہناز ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ خالدہ نے اسے سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ جنید کے بارے میں وہ کسی سے تذکرہ نہیں کرے گی۔ چنانچہ جب شیرانی نے اس سے رابطہ قائم کیا تو اس نے پہلے فون پر خالدہ اور جمشید خاقانی سے اجازت لینا ضروری سمجھی پھر شیرانی کے سوالات کے جواب دینے کے لیے تیار ہوئی۔

''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا تھا جو جنید کو لینے کے لیے آیا تھا؟'' شیرانی نے پوچھا۔

''ہاں، وہ تیس بتیس سال کا ایک دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ باریک مونچھیں، آنکھوں پر عینک، پیشانی پر دائیں طرف آنکھ سے ذرا اوپر چونی کے برابر زخم کا پرانا نشان اور سر پر ڈرائیوروں والی سفید ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔''

''آپ نے کار بھی دیکھی ہوگی؟''

''جی ہاں! میرے دفتر کا کمرا چونکہ گیٹ کے قریب ہی ہے اور اس کی کھڑکیاں باہر کی طرف کھلتی ہیں اسی لیے میں نے اس شخص کو آسانی سے دیکھ لیا تھا اور کار بھی نظروں میں تھی۔ وہ سرمئی رنگ کی مرسیڈیز تھی۔ مسٹر جمشید کو بھی میں نے اکثر یہی کار چلاتے ہوئے دیکھا ہے لیکن اب میں کہہ سکتی ہوں کہ کار اس شخص نے چوری کی ہوگی۔''

''اگر آپ اس شخص کو دوبارہ کہیں دیکھ لیں تو کیا شناخت کر لیں گی؟'' شیرانی نے پوچھا۔

''ہاں، میرا خیال ہے، میں اسے پہچان لوں گی۔''

''جنید کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ اسے یقیناً یہ علم ہوگا کہ ان کے ہاں کوئی ڈرائیور نہیں ہے۔ اسے شبہ تو ہونا چاہیے تھا۔''

''جنید بہت ذہین بچہ ہے لیکن اس عمر کے بچے عام طور پر ایسی باتوں کا خیال نہیں رکھتے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ دراصل اس میں میرا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ فون پر کبھی کبھار مسٹر جمشید سے میری بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ اس شخص کی آواز بھی مسٹر جمشید کی آواز سے اس حد تک ملتی جلتی تھی کہ میں آسانی سے دھوکا کھا گئی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ شخص مسٹر جمشید کو بہت قریب سے جانتا ہوگا۔''

''شاید آپ کا خیال درست ہو۔ جنید کے اغوا کا یہ منصوبہ بڑی ہوشیاری سے تیار کیا گیا تھا۔ بہرحال، مجھے یقین ہے کہ ہم جلد ہی اس نامعلوم شخص کا سراغ لگا لیں گے۔'' شیرانی یہ کہتا ہوا اٹھ گیا۔

شیرانی کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ کوئی بات ایسی تھی جو اس کے ذہن میں چبھن سی پیدا کر رہی تھی۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ بات واضح نہیں ہو رہی تھی۔ دوسری طرف جمشید کو ملنے والا وہ دھمکی آمیز خط بھی اس کے ذہن میں مسلسل الجھن کا باعث بنا ہوا تھا۔ اس خط کے بارے میں بھی کوئی بات واضح نہیں ہو رہی تھی۔

اسکول سے نکلنے کے بعد وہ آس پاس کے دکانداروں اور وہاں کے رہنے والوں سے سرمئی رنگ کی مرسیڈیز اور اس کے ڈرائیور کے بارے میں پوچھتا رہا لیکن اس شہر میں اس رنگ اور اسی ماڈل کی بیسیوں کاریں موجود تھیں۔ کوئی بھی مفید طلب بات معلوم نہ ہو سکی۔

چھ بج کر پانچ منٹ پر شیرانی نے جمشید خاقانی کا فون نمبر ملایا۔ کال فوراً ہی ریسیو کر لی گئی۔ اس کی آواز پہچانتے ہی جمشید بولا۔ ''ٹھیک چھ بجے اس گمنام شخص نے فون کیا تھا۔ جنید اس کے قبضے میں ہے اور اس نے آج رات رقم کا مطالبہ کیا ہے۔''

''اس سلسلے میں اس نے کچھ ہدایات بھی دی ہوں گی؟'' شیرانی نے پوچھا۔

''ہاں، اس نے ہدایت کی ہے کہ میں رقم کو اخباری کاغذ کے ایک پیکٹ میں لے کر رات دو بجے حسن اسکوائر سے

www.paksociety.com

اسٹیڈیم کی طرف چلنا شروع کردوں، حسن اسکوائر اور اسٹیڈیم والے چوراہے تک کے تقریباً ایک میل لمبے راستے میں وہ کسی بھی جگہ مجھ سے مل لے گا۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ میں کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کروں۔ ایسی صورت میں جنید کی زندگی کو خطرہ بھی لاحق ہوسکتا ہے۔ اس کا ایک آدمی نہ صرف ابھی سے اس سڑک پر موجود رہے گا بلکہ اس نے میری بھی نگرانی شروع کرادی ہے تاکہ میں کسی سے رابطہ قائم نہ کرسکوں۔ اس کے کہنے کے مطابق اگر کوئی مشتبہ بات نہ ہوئی تو اس سڑک پر ہی وہ کسی بھی جگہ مجھ سے رابطہ قائم کرلے گا۔ گڑبڑ کی صورت میں اس کا ساتھی جنید کا کام تمام کردے گا اور اگر کسی گڑبڑ کے بغیر اسے رقم مل گئی تو اس کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد جنید واٹر پمپ کے آس پاس کسی جگہ مل جائے گا۔'' چند لمحے ریسیور پر خاموشی رہی پھر جمشید کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

''اب بتاؤ، مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''میرا خیال ہے آپ کو اس کی ہدایات پر عمل کرنا چاہیے۔'' شیرانی نے جواب دیا۔

''میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔'' ریسیور پر جمشید کی آواز ابھری۔ لہجہ بتا رہا تھا کہ مجرم کی ہدایت پر عمل کرنے کا فیصلہ وہ پہلے ہی کرچکا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس دوران آپ گھر پر ہی رہیں۔ میں کسی وقت آپ کو فون کروں گا۔''

''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں۔ ہمارے کرنے کو کچھ ہے ہی کیا، سوائے اس کے کہ خاموشی سے بیٹھے انتظار کرتے رہیں۔ آپ کی بیگم کا کیا حال ہے؟ میرا مطلب ہے زیادہ خوف زدہ تو نہیں؟''

''خوف زدہ! ارے بھئی اسے دو مرتبہ بے ہوشی کا دورہ پڑ چکا ہے۔ اگر تم اس عذاب سے نجات دلا سکو تو وہ تمہاری بہت مشکور ہوگی۔''

''مجھ سے جو کچھ بھی بن پڑا کروں گا۔'' شیرانی نے کہتے ہوئے فون بند کردیا۔

اب اس کے کرنے کے لیے واقعی کچھ نہیں تھا۔ ابھی صرف شام ہوئی تھی اور دوسرے مرحلے کے لیے کم از کم آدھی رات کا انتظار کرنا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے کا وقت تو مختلف مصروفیات میں گزر گیا۔ پھر ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھا کر گھر چلا گیا۔ صوفے پر نیم دراز ہوکر اس نے کچھ دیر اونگھ لینے کی کوشش کی مگر آنکھیں بند کرتے ہی ایک پانچ سالہ معصوم بچے کا چہرہ ذہن میں ابھر آیا۔ وہ چشم تصور سے دیکھ سکتا تھا کہ بچہ انتہائی خوف زدہ اور سہما ہوا تھا۔ پھر شیرانی کے ذہن میں ان چہروں کی گھناؤنی تصویر ابھر آئی جنہوں نے اس بچے کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ ایسے درندہ صفت لوگ یقینی طور پر کسی ہمدردی کے مستحق نہیں تھے اور نہ ہی انہیں قابلِ اعتماد سمجھا جاسکتا تھا۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ رقم حاصل کرنے کے بعد وہ جنید کو رہا کردیں گے۔ جنید ایک ذہین بچہ تھا۔ ممکن ہے اپنی رہائی کے بعد کسی موقع پر وہ مجرموں میں سے کسی کو شناخت کرلے۔ ظاہر ہے مجرم ایسا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ اس لیے خدشہ تھا کہ رقم کا مطالبہ پورا ہونے کے بعد مجرم کہیں جنید کو بھی موت کے گھاٹ نہ اتار دیں۔

شیرانی صوفے سے اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اسے ہر صورت میں جنید کو بچانا تھا لیکن فی الحال کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ایک لمحے کو پولیس کا خیال اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔ پولیس اپنے وسائل سے کام لے کر مجرموں کا سراغ لگا سکتی تھی لیکن ایک معصوم زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی اور وہ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔

رات سوا بارہ بجے کے قریب شیرانی اپنے فلیٹ سے نکل کر گلشن اقبال میں واقع جمشید خاقانی کی عالیشان کوٹھی پہنچ گیا۔ جمشید کی دوسری بیوی خالدہ کو پہلی مرتبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ لمبے قد کی ایک خوب صورت عورت تھی۔ عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس وقت اس کا چہرہ حسرت و یاس کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آنکھوں میں خوف تیر رہا تھا۔ آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی جیسے وہ دیر تک روتی رہی ہو۔ مجموعی طور پر وہ برسوں کی بیمار نظر آرہی تھی۔ تعارف ہوتے ہی وہ بولی۔

''کیا آپ کے خیال میں میرا بیٹا محفوظ ہوگا؟ ظالموں نے اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا ہوگا؟''

شیرانی نے جمشید کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ہونق بنا بیٹھا تھا۔ خالدہ کی حالت بتا رہی تھی کہ کوئی بھی خلافِ طبع بات سنتے ہی اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑ جائے گا۔ اس موقع پر ایسی کوئی صورتِ حال خود ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی تھی۔

''میرا خیال ہے وہ لوگ جنید کو کوئی نقصان پہنچانے کی حماقت نہیں کرسکتے۔'' شیرانی بولا۔

''خوف و دہشت سے اس کا برا حال ہو رہا ہوگا۔'' خالدہ نے سسکی بھری۔

''بچے بہت معصوم ہوتے ہیں مسز جمشید! اور وہ بعض باتوں کو بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ چند روز بعد جمشید بھی اس واقعے کو ذہن سے نکال دے گا۔''

''میری مدد کر خدایا!'' خالدہ آنکھیں بند کرکے

سسکیاں بھرنے لگی۔

جمشید چند لمحے بیوی کو تسلی دیتا رہا تھا پھر اسے سہارا دے کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اس کی واپسی میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ ''میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔'' وہ آتے ہی بولا۔

''ابھی تو کافی وقت ہے۔'' شیرانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یوں بھی اگر وہ لوگ آپ کے مکان کی نگرانی کررہے ہوں گے تو انہیں کسی قسم کا شبہ ہوسکتا ہے۔''

جمشید بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کی حالت ایسے شخص کی سی تھی جس کے اعصاب برداشت کی آخری حد کو چھو رہے ہوں۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ میز کے قریب رک گیا اور میز پر رکھے ہوئے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور تیز تیز کش لگانے لگا۔ اس کی ذہنی کیفیت اس قدر دگرگوں تھی کہ اس نے شیرانی کو بھی سگریٹ پیش نہیں کیا۔ اس کی اس بداخلاقی کو آسانی سے نظرانداز کردیا۔ کافی دیر بعد شیرانی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

''اب ہمیں چل دینا چاہیے۔ لیکن ہم یہاں سے اکٹھے نہیں نکلیں گے۔ پہلے میں نکلوں گا۔ اور اس کے بیس منٹ بعد آپ باہر آئیں گے۔''

''تم کہاں ملو گے؟'' جمشید نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں اسٹیڈیم کے سامنے سڑک کے دوسری طرف اسپورٹس ٹریننگ سینٹر کے میدان کی جھاڑیوں میں چھپ کر انتظار کروں گا۔ مجھے شبہ ہے کہ مجھ اسی جگہ آپ سے رابطہ قائم کرے گا کیونکہ اس ایک میل لمبی سڑک پر وہی ایسی جگہ ہے جہاں کسی مداخلت کی امید نہیں کی جاسکتی لیکن آپ اس وقت تک میرے قریب آنے کی کوشش نہیں کریں گے جب تک کہ وہ آپ سے رقم وصولی کرکے چلے نہ جائیں۔''

''ٹھیک ہے، سمجھ گیا۔'' جمشید نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اوکے، خدا حافظ۔ مجھے امید ہے معاملہ بخیر و خوبی اختتام کو پہنچ جائے گا۔'' شیرانی کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

رات دو بجے یونیورسٹی روڈ پر اگرچہ اکا دکا گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی لیکن حسن اسکوائر سے اسٹیڈیم کی طرف جانے والی سڑک سنسان پڑی تھی۔ اسٹیڈیم سے پہلے عمارتوں کے ہیولے چاندنی میں عجیب پُراسرار تاثر دے رہے تھے۔ شیرانی اسٹیڈیم کی دیوار کے عین سامنے..... دوسری طرف جھاڑیوں میں دبکا بیٹھا تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے کافی دیر ہوچکی تھی۔ اس دوران سڑک سے اکا دکا گاڑی بھی گزری تھی لیکن کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی الیکٹرانک واچ کی لائٹ جلا کر وقت دیکھا۔ تین بج چکے تھے۔ اسے تشویش ہونے لگی۔ نہ تو ابھی تک کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا تھا اور نہ ہی جمشید خاقانی نے اس سے رابطہ قائم کیا تھا۔

چار بج گئے۔ شیرانی کی تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ جھاڑیوں سے نکلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سے آنے والی ایک کار کے ہیڈلیمپس کی روشنی دیکھ کر رک گیا۔ چند سیکنڈ بعد کار اس کے قریب ہی سڑک پر آکر رک گئی۔ کار کے رکتے ہی جمشید کی آواز سنائی دی۔ وہ اس کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ شیرانی جھاڑیوں سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اگلا دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ گیا۔ جمشید کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر اس طرح جمے ہوئے تھے جیسے وہ چپک کر رہ گئے ہوں۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ شیرانی کے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ یوٹرن لے کر کار حسن اسکوائر کی طرف دوڑنے لگی۔

''کیا رہا؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد شیرانی نے پوچھا۔

''اپنی کار حسن اسکوائر پر چھوڑ کر میں پیدل اس طرف آرہا تھا کہ تقریباً نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک کار عقب سے میرے قریب آکر رکی۔ کار میں ایک ہی آدمی تھا۔ اس نے میرا نام لے کر پکارا پھر پوچھا کہ میں رقم لایا ہوں یا نہیں۔ میں نے خاموشی سے رقم والا پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا جس وجہ سے میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا۔ رقم لیتے ہی اس نے میرے سر پر کسی چیز سے ضرب لگائی۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو سڑک سے ہٹ کر جھاڑیوں میں پڑے ہوئے پایا۔ غالباً مجھے بے ہوش کرنے کے بعد وہ شخص مجھے وہاں ڈال گیا تھا تاکہ کسی کی نظروں میں نہ آسکوں۔ ہوش میں آتے ہی میں اس جگہ پہنچا جہاں میں نے کار چھوڑی تھی۔ میں اگرچہ اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اپنے قریب کار کے رکتے ہی اتفاق سے میں نے اس کا نمبر دیکھ لیا تھا جو ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ کیا تم اس کار کا پتا چلا سکتے ہو؟'' جمشید نے کہتے ہوئے کار کا نمبر بتایا۔

''رجسٹریشن آفس سے کار کا پتا لگ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ چوری کی نہ ہو۔'' شیرانی بولا۔

www.paksociety.com

"لیکن جنید کی واپسی سے پہلے ہم ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔" جمشید نے کہا۔

"ہاں، اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ شخص اپنا وعدہ پورا کرتا ہے یا نہیں۔"

"اس نے کہا تھا وہ جنید کو واٹر پمپ کے آس پاس کہیں چھوڑے گا لیکن سوال یہ ہے کہ جنید کو وہاں کس جگہ تلاش کیا جائے؟"

"اس کی ضرورت نہیں، اگر وہ واقعی جنید کو کہیں چھوڑ گیا تو یقیناً اس پر کسی پولیس والے کی نظر پڑ جائے گی۔ وہ ایسا علاقہ ہے جہاں رات کے آخری پہر بھی کسی نہ کسی قسم کی آمدورفت رہتی ہے۔ وہاں بچے کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا۔ پولیس خود آپ سے رابطہ قائم کرے گی۔"

"اس کا مطلب ہے گھر میں بیٹھ کر انتظار کے سوا کچھ نہیں کیا جاسکتا۔" جمشید نے کہتے ہوئے کار کا رخ اپنے گھر کی طرف موڑ دیا۔

خالدہ ان کی منتظر تھی۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا پھر اس کی آنکھوں سے جواب پاکر ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جمشید کے کہنے پر وہ کافی بنانے چلی گئی۔

کچھ ہی دیر بعد خالدہ کافی بنا کر لے آئی۔ اس دوران جمشید سگریٹ پھونکنے کے علاوہ ایک ہاتھ سے اپنا سر بھی سہلاتا جا رہا تھا جہاں پچھلے حصے پر ایک گومڑا سا نظر آرہا تھا۔ کافی کے دوران خاموشی رہی۔ گہرے سکوت میں کوئی معمولی سی آواز بھی بازگشت سی پیدا کردیتی۔ خالدہ کی حالت ابتر تھی۔ ہر معمولی سی آواز پر بھی وہ بری طرح چونک جاتی۔ اس کی نظریں بار بار ٹیلی فون کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

ساڑھے پانچ بج گئے۔ شیرانی کے اپنے اعصاب بری طرح متاثر ہو رہے تھے۔ اس نے خالدہ کی طرف دیکھا جس کی قوتِ برداشت اب جواب دے چکی تھی۔ وہ ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتا۔ جنید کہاں ہے؟ وہ فون پر میرے جنید کی رہائی کی اطلاع کیوں نہیں دیتے؟"

جمشید نے اسے پکڑ کر دوبارہ صوفے پر بٹھا دیا اور کندھے تھپتھپانے لگا۔ شیرانی اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "ایسی باتوں میں تھوڑا بہت وقت تو لگتا ہی ہے مسز جمشید! گھبرائیے نہیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

لیکن یہ تاخیر شیرانی کے لیے خود تشویش کا باعث بنی ہوئی تھی۔ اگر جنید کو اغوا کرنے والا انہیں ڈبل کراس کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا تو اس تاخیر کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس لیے جمشید نے عجیب سی نگاہوں سے شیرانی کی طرف دیکھا۔ ممکن ہے اس وقت وہ بھی اسی پہلو پر غور کر رہا ہو۔

مزید ایک گھنٹا گزر گیا۔ اب دن کی روشنی پھیل چکی تھی اور باہر سڑک پر ٹریفک کی آمدورفت بھی شروع ہوچکی تھی۔ خالدہ نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے اب باقاعدہ رونا شروع کردیا تھا۔ ساڑھے نو بجے شیرانی اٹھ کر فون والی میز کے قریب چلا گیا اور ریسیور اٹھا کر وہیکل رجسٹریشن آفس کا نمبر ڈائل کرنے لگا جہاں ایک کلرک سے اس کی علیک سلیک تھی۔ رابطہ قائم ہونے پر اس نے مطلوبہ کار کا نمبر بتایا اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ اس دوران جمشید خاقانی بھی اٹھ کر اس کے قریب آگیا تھا۔ چند منٹ بعد دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ شیرانی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے فون بند کردیا اور جمشید کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "وہ کار گلبرگ میں رہنے والے رشید وہاب نامی ایک شخص کی ملکیت ہے اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ گزشتہ رات اس کی کار چوری ہوگئی تھی یا وہ خود کسی طرح اس معاملے میں ملوث ہے۔"

"کیا اس سلسلے میں کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے؟"

"ہاں، میں ابھی کوشش کرتا ہوں۔" شیرانی نے کہتے ہوئے دوبارہ فون کا ریسیور اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ قائم ہونے پر اس نے انسپکٹر رضوی سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس کا نام سنتے ہی ریسیور پر انسپکٹر رضوی کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو شیرانی! کہاں غائب ہو بھئی، کئی مہینوں سے تمہارے بارے میں کچھ سنا نہیں۔ ریٹائر تو نہیں ہوگئے؟"

"ریٹائر تو شاید میں مرنے کے بعد بھی نہ ہوں۔ بہرحال تم سے ایک کام آن پڑا۔" شیرانی بولا۔

"کہو؟"

"ایک کار کے بارے میں معلوم کرنا ہے کہ گزشتہ رات اس سے متعلق چوری کی کوئی رپورٹ تو درج نہیں ہوئی؟"

"یہ اگرچہ میرا شعبہ نہیں ہے لیکن کار کا نمبر بتاؤ۔ میں معلوم کرلیتا ہوں۔"

شیرانی نے مطلوبہ کار کا نمبر بتا دیا۔ چند منٹ بعد فون پر انسپکٹر رضوی کی آواز سنائی دی۔ "نہیں شیرانی! شہر کے کسی تھانے میں اس کار کی چوری کی رپورٹ نہیں لکھوائی گئی۔"

"شکریہ! ایک بات اور، ذرا چیک کرکے بتاؤ کہ رشید وہاب نامی کسی شخص کے بارے میں پولیس میں کوئی ریکارڈ تو

نہیں ہے۔"

"اس میں کچھ وقت لگے گا۔ اپنا نمبر دے دو، میں معلوم کرکے تمہیں فون کردوں گا۔"

"ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا۔" شیرانی نے کہتے ہوئے جمشید خاقانی کا نمبر بتا دیا۔

فون بند ہونے کے بعد کمرے کی فضا میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ جمشید کی پیشانی شکن آلود تھی اور وہ بار بار دانتوں سے انگلیوں کے ناخن کاٹ رہا تھا جس سے اس کی ہیجانی کیفیت کی عکاسی ہو رہی تھی۔ تقریباً بیس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی تو اس نے اچھل کر ریسیور اٹھا لیا لیکن دوسری طرف کی آواز سنتے ہی اس کا منہ لٹک گیا اور اس نے ریسیور خاموشی سے شیرانی کی طرف بڑھا دیا۔ انسپکٹر رضوی کی کال تھی۔

"رشید وہاب کے بارے میں نوٹ کرو شیرانی! گلبرگ کا رہنے والا یہ شخص منشیات کی اسمگلنگ کے الزام میں چار مرتبہ گرفتار ہوچکا ہے۔ آخری مرتبہ تین سال پہلے جیل سے رہا ہوا تھا۔"

"اس کا کوئی ساتھی جس کے بارے میں کچھ معلوم ہو؟" شیرانی نے پوچھا۔

"فائل کے مطابق اس کاروبار میں اس کا کوئی شریک کار نہیں تھا۔ جب وہ آخری مرتبہ سزا بھگت رہا تھا تو جیل میں اس کی کوٹھری کا ساتھی یعقوب نامی ایک نوجوان شخص تھا جسے اس سے پہلے ہی رہا کردیا گیا تھا۔"

"شکریہ! فی الحال مجھے یہی معلوم کرنا تھا۔ ضرورت پڑی تو دوبارہ زحمت دوں گا۔" شیرانی نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا پھر قریب کھڑے ہوئے جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ایک سراغ ملا ہے آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ کار کا مالک رشید وہاب اور یعقوب آپس میں دوست ہیں۔"

"یعقوب!" جمشید نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں، آپ کی پہلی بیوی کا دوست! جس کے بارے میں پولیس کو شبہ تھا کہ اسی نے نسرین کو بالکونی سے دھکا دے کر ہلاک کیا تھا لیکن اس کے خلاف کوئی بات ثابت نہیں ہوسکی تھی۔"

"اوہ، اس کا مطلب ہے کہ جنید کو اسی نے اغوا کیا ہے؟"

"جنید کے اغوا میں ان دونوں میں سے کسی ایک کا ہاتھ ہوسکتا ہے، ممکن ہے یہ منصوبہ دونوں نے مل کر بنایا ہو؟"

جمشید کی کنپٹیوں کی نسیں پھڑپھڑانے لگیں۔ وہ چند لمحے متوحش نگاہوں سے شیرانی کی طرف دیکھتا رہا پھر کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ چند منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پستول نظر آرہا تھا۔ "یہ پستول کئی برس پہلے میں نے شوقیہ طور پر خریدا تھا لیکن کبھی اس کے استعمال کا موقع نہیں ملا تھا مگر آج..."

"نہیں۔" خالدہ چیخی۔ "تم ایسا نہیں کرو گے جمشید۔"

"تم اس معاملے سے الگ رہو۔" جمشید نے اسے جھڑک دیا پھر شیرانی کی طرف رخ کرکے بولا۔ "چلو شیرانی! مزید تاخیر ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔"

شیرانی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ جذباتی ردِعمل بھی ان کے لیے سودمند نہیں ہوگا مگر جمشید نے اس کی ایک نہ مانی اور وہ دونوں رشید وہاب کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ مکان تلاش کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ مکان کی دوسری منزل پر رہائش پذیر تھا اور آمدورفت کا راستہ بھی الگ تھا۔ وہ دبے قدموں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ وہاں آتے ہی جمشید کا لہجہ اور انداز بدل گیا۔ وہ سرگوشیانہ لہجے میں شیرانی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "تم دروازے سے ذرا ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔ میں دستک دوں گا۔ ظاہر ہے فوری طور پر پوری طرح دروازہ کھولنے کے بجائے پہلے وہ اس میں جھری پیدا کرے گا۔ جیسے ہی دروازے میں جھری پیدا ہو تم اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر ٹکر مار کر دروازہ کھول دینا، اس طرح وہ بدحواس ہوجائے گا اور ہم نہایت آسانی سے اس پر قابو پاسکیں گے۔"

شیرانی نے تائید میں سر ہلا دیا۔ دروازے میں ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آرہا تھا۔ اوپر آتے ہوئے وہ لوگ یہ تو دیکھ چکے تھے کہ مکان کی نچلی منزل خالی تھی۔ غالباً مکین کہیں گئے ہوئے تھے اور اب شیرانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید دوسری منزل پر بھی کوئی موجود نہ ہو۔ وہ دروازے کے قریب ہی دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ جبکہ جمشید نے سامنے کھڑے ہوئے دروازے پر دستک دی۔ کئی لمحات گزر گئے۔ اندر گہری خاموشی رہی اور کوئی جواب نہیں ملا۔ جمشید نے دوبارہ دستک دی۔ اس مرتبہ چند سیکنڈ بعد ہی بولٹ گرائے جانے کی آواز سنائی دی اور دروازہ تھوڑا سا کھل گیا۔ اسی لمحے شیرانی نے کندھے کی پوری قوت سے دروازے کو ٹکر ماری۔ دروازہ ایک دھماکے سے اندر کھڑے ہوئے آدمی کو لگا اور وہ کراہتا ہوا پیچھے لڑھک گیا لیکن اس نے سنبھلنے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ اسے دیکھتے ہی شیرانی چونک گیا۔ وہ یعقوب تھا۔ جس کے چہرے پر خوف کی زردی پھیل رہی تھی۔ جیسے اس نے

www.paksociety.com

موت کو اپنے سامنے دیکھ لیا ہو مگر دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ پتلون کی جیب کی طرف بڑھتے دیکھ کر جمشید چلّایا۔

"بچو شیرانی! نیچے گر جاؤ۔"

یعقوب کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر شیرانی نے بڑی پھرتی سے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک زوردار دھماکا ہوا جس کے فوراً ہی بعد کمرے کی فضا میں جمشید کی کربناک چیخ گونج اٹھی۔ شیرانی نے مڑ کر دیکھا۔ یعقوب دوڑتا ہوا دوسرے کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ شیرانی بھی جیب سے پستول نکال کر اس کے پیچھے لپکا۔ جب وہ دروازے میں داخل ہوا تو یعقوب کھڑکی پر جھکا ہوا تھا۔ اس کا آدھا دھڑ کھڑکی سے باہر تھا۔ غالباً وہ چھلانگ لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔

"رک جاؤ یعقوب!" شیرانی چیخا۔

یعقوب نے پیچھے مڑ کر اندھا دھند دو فائر کر دیے۔ دونوں گولیاں شیرانی کے سر کے اوپر سے گزرتی ہوئی عقبی دیوار میں پیوست ہو گئیں۔ اسی لمحے شیرانی کے عقب سے جمشید کی آواز سن کر یعقوب اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس کا ہاتھ فوراً ہی حرکت میں آ گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پستول کا ٹریگر دبا سکتا، جمشید کے پستول کی گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہو گئیں اور وہ منہ سے آواز نکالے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

شیرانی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یعقوب ختم ہو چکا تھا۔ وہ اس کی یا جمشید کی طرف توجہ دیے بغیر کمرے سے نکل کر دوسرے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی نظریں اس بچے پر جم گئیں جو پلنگ پر آڑھا ترچھا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور منہ پر بھی ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ وہ اگرچہ ہوش میں تھا لیکن اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اسے کوئی نشہ آور دوا استعمال کرائی گئی تھی۔ اسی لمحے جمشید خاقانی دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔

"جنید! میرے بیٹے۔" وہ دوڑ کر بچے سے لپٹ گیا۔

☆☆☆

پولیس سے نمٹنا کچھ آسان ثابت نہیں ہوا تھا۔ انسپکٹر رضوی تو گویا شیرانی کی جان کو آ گیا تھا۔ اسے صورتِ حال سمجھانے کے لیے شیرانی کو پوری کہانی دہرانی پڑی۔ تب کہیں وہ قابو میں آیا۔ جمشید کا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اسے اسپتال بھیج دیا گیا۔ کئی گھنٹوں بعد جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو شیرانی بھی انسپکٹر رضوی کے ساتھ پولیس اسٹیشن آ گیا۔

"رشید وہاب کے بارے میں کیا خیال ہے، کیا اسے گرفتار کرنے کی کوشش نہیں کرو گے؟" شیرانی نے کہا۔

"وہ اس معاملے میں ملوث نہیں ہے۔ آخری مرتبہ رہائی کے بعد اس کی مسلسل نگرانی کی جا رہی تھی۔ اس دوران اس نے کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کی۔ اس کے برعکس اس نے الیکٹریشن کا کام سیکھ کر باعزت ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ان دنوں وہ حیدرآباد کی ایک فیکٹری میں کام کر رہا ہے۔ پولیس کو اس کے بارے میں پوری معلومات حاصل ہیں۔ بچے کے اغوا کا یہ منصوبہ یعقوب نے اکیلے ہی بنایا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے معاملہ ختم؟" شیرانی بولا۔

"تقریباً ختم ہی سمجھو۔" انسپکٹر رضوی نے جواب دیا۔

"لیکن ایک بات کی ابھی وضاحت نہیں ہو سکی۔ جمشید خاقانی کے کہنے کے مطابق اس نے گزشتہ رات یعقوب کو دس لاکھ رقم ادا کی تھی۔ لیکن یعقوب کے مکان کی تفصیلی تلاشی کے باوجود اس رقم کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔"

"شاید اس سلسلے میں ایک اور کوشش کرنی پڑے۔ بہرحال، اب میں اجازت چاہوں گا۔" شیرانی کہتا ہوا اٹھ گیا۔

انسپکٹر رضوی سے رخصت ہونے کے بعد شیرانی کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رقم کہاں غائب ہو گئی۔ پھر دفعتاً اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک پبلک کال آفس میں گھس گیا اور فون پر جمشید کے گھر کے نمبر ڈائل کیے۔ کال اس کی بیوی خالدہ نے ریسیو کی۔ جمشید کی بازیابی پر شیرانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ جمشید اپنے دفتر جا چکا ہے۔

پی سی او سے باہر نکلتے ہی شیرانی کو ایک خالی ٹیکسی مل گئی جس نے چند منٹ میں اسے جمشید خاقانی کے دفتر والی عمارت کے سامنے پہنچا دیا۔ ٹیکسی سے اتر کر وہ عمارت میں داخل ہوا۔ عمارت میں واقع بیشتر دفاتر بند ہو چکے تھے۔ جمشید کے دفتر کا عملہ بھی جا چکا تھا۔ ایک چپراسی موجود تھا جس نے شیرانی کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ چپراسی کو ایک طرف ہٹاتا ہوا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

جمشید اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ شیرانی کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے کرسی سے اٹھ کر مصافحے کے لیے بایاں ہاتھ آگے بڑھایا کیونکہ دایاں ہاتھ زخمی ہونے کی وجہ سے ایک پٹی کی مدد سے گلے میں جھول رہا تھا۔ اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے جمشید نے سگریٹ کا پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ شیرانی نے بے تکلفی سے سگریٹ نکال کر لگایا اور ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

"تمہاری مدد سے یہ معاملہ بخیر و خوبی طے ہو گیا۔ میری بیوی خالدہ خاص طور سے تمہاری مشکور ہے۔" جمشید نے کہا۔

"جنید اب کیسا ہے؟" شیرانی نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"قدرے بہتر ہے۔ اسے زیادہ وقت نشہ آور دوا کے زیرِ اثر رکھا گیا ہے۔ ٹھیک ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا۔" جمشید خاقانی نے کہتے ہوئے میز کی دراز کھول کر چیک بک نکالی اور قلم اٹھاتے ہوئے گویا ہوا۔ "اظہارِ تشکر کے طور پر میں تمہاری معمول کی فیس سے دگنا چیک کاٹ رہا ہوں۔"

"میرا خیال ہے یہ کیس ابھی ختم نہیں ہوا۔ سب سے پہلے میں دو لاکھ کی وہ رقم تلاش کرنا چاہتا ہوں جو آپ نے گزشتہ رات یعقوب کو ادا کی تھی۔"

"لیکن... تم اس رقم کو کہاں تلاش کرو گے؟"

"یہاں، اس دفتر میں۔" شیرانی نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"جمشید خاقانی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ گھورتی ہوئی نگاہوں سے شیرانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں... میرا مطلب ہے... تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میرا مطلب بالکل واضح ہے مسٹر جمشید! آپ نے وہ رقم یعقوب کو ادا نہیں کی۔ وہ سرے سے وہاں آیا ہی نہیں تھا جہاں بقول آپ کے اس نے ملاقات طے کی تھی اور آپ کے پاس اس پیکٹ میں کرنسی نوٹ نہیں ردی کاغذ بھرے ہوئے تھے۔ وہ پیکٹ آپ نے وہیں کہیں جھاڑیوں میں پھینک دیا ہو گا جو تلاش کرنے پر مل سکتا ہے۔ آپ نے سر پر ضرب لگنے اور اپنی بے ہوشی کا ڈراما بھی خوب رچایا تھا۔ میں اس اداکاری کی داد ضرور دوں گا۔"

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا شیرانی؟" جمشید کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

"میں اس امر کی داد بھی ضرور دوں گا کہ آپ نے یہ منصوبہ بڑی ذہانت سے ترتیب دیا تھا۔ اس طرح آپ اپنا نہ صرف اصل مقصد چھپانا چاہتے تھے بلکہ ایک تیر سے دو شکار بھی کرنا چاہتے تھے۔"

"میرا اصل مقصد کیا تھا؟" جمشید نے اسے گھورا۔

"یعقوب کا قتل! آپ اسے کم از کم ایک گواہ کی موجودگی میں قتل کرنا چاہتے تھے اور یہ تاثر بھی دینا چاہتے تھے کہ یہ قتل اپنے تحفظ کے لیے کیا گیا تھا۔"

"تمہاری بات میرے پلے نہیں پڑی۔" جمشید میز پر آگے کو جھکتے ہوئے بولا۔

"کیا واقعی؟" شیرانی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "تو پھر تفصیل مجھے خود ہی بتانی پڑے گی۔ اصل بات یہ ہے کہ یعقوب آپ کو بلیک میل کر رہا تھا۔ جس رات آپ کی پچھلی بیوی بالکونی سے گر کر ہلاک ہوئی تو یعقوب نے غالباً آپ کو وہاں دیکھ لیا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ نسرین پھسل کر نہیں گری تھی بلکہ آپ نے اسے دھکا دیا تھا۔ یعقوب کے پاس آپ کے خلاف یقیناً کوئی ٹھوس ثبوت بھی موجود ہو گا۔ کوئی ایسا ثبوت جسے آپ جھٹلانے کی جرأت نہ کر سکتے ہوں۔ اس نے تفتیش کے دوران پولیس کی سختیاں برداشت کر لیں لیکن آپ کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسے آپ سے کسی قسم کی ہمدردی تھی بلکہ وہ اس بات سے ذاتی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور بعد میں اس نے اپنے اس مقصد پر عمل بھی شروع کر دیا۔"

"بہت خوب۔" جمشید نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "لیکن سوال تو یہ ہے کہ میں نسرین کو کیوں قتل کرنے لگا۔ میرے پاس اس کی کوئی وجہ نہیں تھی۔"

"نسرین کو ادا کی جانے والی نان و نفقہ کی رقم سے بڑی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ بیس ہزار روپے مہینا یا بالفاظِ دیگر دو لاکھ چالیس ہزار روپے سالانہ۔ اگر اس رقم کو دس سال تک پھیلا دیا جائے تو چوبیس لاکھ بنتی ہے۔ آپ دونوں کی صحت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا تھا کہ دونوں کم از کم دس سال مزید زندہ رہیں گے۔ آپ سے شادی سے پہلے نسرین، یعقوب سے محبت کرتی تھی۔ اسی لیے اس نے آپ سے سفارش کر کے اسے گھر میں ڈرائیور کی ملازمت دلا دی تھی تاکہ نہایت دیدہ دلیری سے آپ کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہیں لیکن آپ کو کسی طرح اس حقیقت کا علم ہو گیا جس کا نتیجہ طلاق کی صورت میں نکلا۔ آپ سے طلاق حاصل کرنے کے بعد نسرین کو اتنا کچھ مل گیا تھا کہ اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہی تھی لیکن وہ ایک مناسب وقت تک یعقوب کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ بعد میں کسی طرح اس سے بھی نجات حاصل کر لیتی اور زندگی بھر آپ سے بیس ہزار روپے ماہانہ وصول کرتی رہتی۔ چنانچہ آپ نے نسرین سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس رات اس کے مکان میں چھپ کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ ممکن ہے آپ نسرین سے کسی قسم کا سمجھوتا کرنے کی نیت سے گئے

www.paksociety.com

ہوں لیکن یعقوب کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں تھا۔ اس لیے آپ نے سمجھوتے کا ارادہ بدل کر اسے بالکونی سے دھکا دے کر ختم کردیا۔ اس طرح آپ کو نسرین سے تو نجات مل گئی لیکن یعقوب کے شکنجے سے نکلنا آپ کے لیے ممکن نہیں تھا۔ گویا آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئے تھے۔ آپ یعقوب کے مطالبے پورے کرنے لگے جو نسرین کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھے۔ اس دوران آپ نے یعقوب سے بھی نجات حاصل کرنے کا منصوبہ بنالیا اور اسے آمادہ کرلیا کہ یکمشت رقم لے کر وہ آپ کا پیچھا چھوڑ دے گا۔ آپ نے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ جنید کے اغوا کے ذریعے مل سکتی تھی۔ آپ نے اسے یقین دلایا تھا کہ یہ سب کچھ ایک ڈراما ہوگا اور آپ اپنی بیوی خالدہ کو متاثر کرنے کے لیے یعقوب کو رقم ادا کر کے جنید کو واپس لے آئیں گے۔ آپ نے اس سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ اس بات کا کسی تیسرے شخص کو علم نہیں ہوگا۔ اس نے آپ کی بات کا یقین اس لیے بھی کرلیا کہ آپ خود اس میں ملوث ہو رہے تھے۔

''وہ دھمکی آمیز خط آپ نے خود لکھا اور خود ہی اسے پوسٹ بھی کیا اور پھر آپ نے مجھے بلا لیا تاکہ میں جنید کی بازیابی میں مددگار ثابت ہوسکوں لیکن ہم جیسے ہی یعقوب کے مکان میں داخل ہوئے آپ نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ دروازے میں ایک چھوٹا سا سوراخ بھی موجود تھا۔ اس نے یقیناً اس سوراخ سے آپ کو دیکھ لیا ہوگا۔ فوراً دروازہ کھول دینے کا مطلب یہ تھا کہ وہ آپ کا منتظر تھا۔ اسے یقین تھا کہ آپ رقم لے کر آئے ہوں گے لیکن رقم کے بجائے آپ اس کے لیے موت کا پیغام لے کر گئے تھے۔''

جمشید خاقانی کے بالائی ہونٹ پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے۔ ''یہ محض تمہارا اندازہ ہے۔'' وہ کرخت لہجے میں بولا۔ ''ایک من گھڑت کہانی جس پر کوئی بھی یقین نہیں کرسکتا۔''

''ٹھیک ہے، اسے میرا اندازہ ہی کہہ لیجیے لیکن میں اسے ثابت کرسکتا ہوں۔'' شیرانی بولا۔

''کیسے؟'' جمشید نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ نے مجھے جس کار کا نمبر دیا تھا وہ رشید وہاب کی ملکیت ہے جو ان دنوں حیدرآباد کی ایک فیکٹری میں ملازمت کر رہا ہے اور کار بھی اسی کے تصرف میں ہے جس کا ثبوت حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اسکول پرنسپل نے کہا تھا کہ فون کرنے والے کی آواز آپ سے ملتی جلتی تھی۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا جبکہ حقیقتاً اسے فون بھی آپ ہی نے کیا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایسا کوئی بھی بے وقوف مجرم میری نظروں سے آج تک نہیں گزرا جو پہلے تو دھمکی آمیز خط لکھ کر رقم کا مطالبہ کر ڈالے اور بچے کو اغوا بعد میں کرے۔''

''سنو شیرانی! اگر میں یعقوب کو قتل کرنا چاہتا تو کسی ایسے موقع پر کرسکتا تھا جب آس پاس کوئی موجود نہ ہوتا۔ آخر مجھے اپنے جرم کا گواہ فراہم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''اس لیے آپ پولیس کو تحقیقات کی گہرائی میں جانے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ کسی اور موقع پر قتل کی صورت میں پولیس یعقوب کے بارے میں تحقیقات ضرور کرتی۔ اس کا بینک اکاؤنٹ بھی پولیس کی نظروں میں آجاتا۔ نسرین کے حوالے سے تحقیقات کرتی ہوئی پولیس آپ تک بھی پہنچ جاتی۔ اس طرح آپ کے لیے بہت سی ایسی مشکلات پیدا ہوسکتی تھیں جن سے پیچھا چھڑانا ممکن نہ ہوتا۔ اس کے برعکس آپ نے یعقوب کو جنید کے اغوا میں پھنسانے کا منصوبہ بنایا۔ اس طرح اسے قتل کر کے بھی آپ پر کوئی آنچ نہ آتی۔''

''درست ہے۔ لیکن میرے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا۔'' جمشید خاقانی خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

''پولیس جب یہاں سے دو لاکھ کی وہ رقم برآمد کرلے گی تو تمام ثبوت خودبخود فراہم ہو جائیں گے۔'' شیرانی مسکرایا۔ جمشید چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''یعقوب مرچکا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کو علم نہیں ہے کہ نسرین کو بالکونی سے دھکا میں نے دیا تھا۔ اس طرح میرے خلاف کچھ ثابت نہیں ہوسکتا۔''

جمشید نے اچانک ہی میز پر رکھا ہوا کاغذ کاٹنے والا چاقو اٹھا کر شیرانی پر حملہ کردیا لیکن شیرانی غافل نہیں تھا۔ اس نے کلائی تھام کر جمشید کا بازو مروڑ دیا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے پھسل کر قالین پر گر گیا۔ اس کا دوسرا بازو ویسے ہی زخمی تھا۔ ایک زوردار جھٹکا دینے سے وہ کراہتا ہوا فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

شیرانی کو یقین تھا کہ منصوبہ فیل ہونے کے صدمے سے وہ ہارٹ اٹیک سے بچ گیا تو پھانسی یا عمر قید سے کسی طرح بھی نہ بچ سکے گا۔

انڈے کی چوری

[illegible]

ہر نئی شے اپنے اندر طلسم رکھتی ہے... اس کی زندگی بھی سحر انگیزی اور رنگین مزاجی کا امتزاج تھی... سونے پہ سہاگا اس کا کام کسی مہم جوئی سے کم نہ تھا... ایک انوکھی اور نرالی دنیا سے تعلق رکھنے والے شخص کے نت نئے جلووں اور حربوں سے لیس ہنستی مسکراتی تحریر...

عالمی شہرت یافتہ چور نک ویلوٹ کا ایک اور یادگار کارنامہ

نک ویلوٹ کے مقابلے جو عورت بیٹھی تھی وہ اب نوجوانی کی حدود سے خارج ہو چکی تھی مگر اس کے لباس کی تراش خراش اور اس کا رکھ رکھاؤ اس قسم کا تھا جو دولت مند لوگ عمر کو پیچھے دھکیلنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

''آپ چیزیں چراتے ہیں؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''جی ہاں مگر بے قیمت چیزیں۔ نہ پیسہ نہ زیورات۔''

www.paksociety.com

”تو کیا آپ میرے لیے ایک لکڑی کا انڈا چوری کر سکتے ہیں؟ ایک لکڑی کا رفو کرنے والا انڈا۔“
”میں سمجھا نہیں، یہ کیا چیز ہے؟“
اس نے اپنا بڑے بڑے موتیوں والا پرس کھولا اور کتھئی رنگ کی انڈے سے مشابہ کوئی شے نکالی۔
”وہ اس طرح کا ہوگا۔“
جو شے اس نے نک کو دی، وہ واقعی لکڑی کا انڈا تھا جو مرغی کے انڈے سے بڑا اور بالکل بیضوی تھا اور قدرتی انڈوں کے برعکس اس کا ایک سرا قدرے گول نہیں تھا۔ اس کے ایک جانب چھوٹا سا اتھلا سوراخ تھا جہاں اسے مشین میں پھنسا کر اتنی مہارت سے بنایا گیا ہوگا۔
”یہ تو رفو کرنے والا انڈا ہے۔“ نک نے اسے ہاتھ میں الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔
عورت جس کا نام کلیر تھر بی تھا، سر ہلا کر بولی۔ ”دراصل اسے رفو کرتے وقت کپڑے کے سوراخ کے نیچے لگانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اب اس کا استعمال ختم ہو چکا ہے۔“
”تو اب یہ قیمتی نوادر میں شامل ہو گیا ہوگا؟“
”نہیں۔ کم از کم ان لکڑی کے انڈوں کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ البتہ جو انڈے ہاتھی دانت، سنگ مرمر اور سنگ سیاہ سے بنائے گئے تھے وہ نوادر میں شمار ہوتے ہیں۔ میں نے آپ سے جس انڈے کی چوری کی بات کی ہے، وہ تو لکڑی کا بنا ہوا ہے۔“
”یہ رفو کا انڈا کہاں ملے گا؟“
”ایک تفریحی قیام گاہ میں جسے ’صحرا کا محل‘ کہا جاتا ہے۔ یہ نیو میکسیکو میں ہے۔ یہ انڈا اس کی مالکہ اندرا ایمسن کے قبضے میں ہے۔ اور میرے خیال میں وہ اسے اپنے سلائی کے ڈبے میں رکھتی ہے۔“
”پھر تو یہ آسان کام ہے۔“ نک نے کہا۔
”اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔ صحرائی محل میں اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے لیے بے پناہ کشش ہے اس لیے وہاں سیکیورٹی کا انتظام بھی سخت ہے۔ ایک مجرد آدمی کو تو اور بھی شبے کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ آپ کی بیوی ہیں جنہیں آپ ساتھ لے جا سکیں؟“
”میں کسی نہ کسی کو تو لے جا ہی سکتا ہوں۔“
”گڈ! میں بھی اس تفریحی محل میں پہنچنے والی ہوں۔ اس سے پہلے آپ کا کام ختم ہو جانا چاہیے۔ جون میں وہاں کا موسم زیادہ اچھا نہیں ہوتا اس لیے آپ کو جگہ آسانی سے مل جائے گی۔“
اس نے نک کو اس کی پیشگی فیس ادا کی اور اسے چھوڑنے اپنے ہوٹل والے کمرے کے دروازے تک آئی۔
ابتدا میں تو وہ ہوٹل کے بند کمروں میں کوئی سودے بازی نہیں کرتا تھا مگر اب کھلی فضا میں جاسوسی بڑی آسان ہو گئی تھی۔ اسے بہرحال ماریا پر یقین کرنا ہی تھا کہ وہ خفیہ پولیس سے متعلق نہیں ہے اور اس کا بھید معلوم کرنے نہیں آگئی ہے۔ اب اگر آپ اپنے موکلوں پر ہی اعتماد نہ کر سکیں تو اور کس پر کریں گے؟
جب وہ گھر پہنچا تو گلوریا پچھلے احاطے میں اپنی سبزی کی کیاریوں میں پانی دے رہی تھی۔ ”یہ جون میں اتنی شدید گرمی پڑ رہی ہے کہ الامان۔“ وہ بولی۔ ”یہ سبزیاں تو شاید کبھی نہیں پھلیں گی۔“
”فرض کرو میں تمہیں چند روز کے لیے یہاں سے لے جانا چاہوں تو؟“
”یہاں سے؟“ اس نے مشکوک نظروں سے نک کی طرف دیکھا۔ ”مگر کہاں؟“
”ایک تفریحی مقام پر۔ نیو میکسیکو کے صحرائی محل میں۔“
”گرمی اور صحرائی محل؟“
”ہاں ہاں۔ تمہیں وہ جگہ بہت پسند آئے گی۔“
”مگر نکی تم تو مجھے اپنے دورے پر کبھی ساتھ نہیں لے گئے؟“
”ہاں، مجھے اپنی اس کوتاہی کا احساس ہے اسی لیے میں اس بار تمہیں لے جانا چاہتا ہوں۔“
گلوریا نے ایک نظر کیاریوں پر ڈالی اور کچھ سوچ کر بولی۔ ”میرے خیال میں، مجھے کسی پڑوسن سے کہنا پڑے گا کہ وہ ہماری غیر موجودگی میں ان پودوں میں پانی دے دیا کرے۔“

☆☆☆

ان کا طیارہ البوقرق میں اتر گیا، کیونکہ وہاں سے صرف مقامی فلائٹ سانتا فے جاتی تھی اور تاؤس کے لیے تو کوئی فلائٹ تھی ہی نہیں۔ نیچے درجۂ حرارت 93 تھا اور گلوریا سوچ رہی تھی کہ کاش وہ گھر میں آرام سے بیٹھی رہتی۔
”کیا یہاں ہمیشہ اتنی گرمی پڑتی ہے؟“
”رات کو ٹھنڈک ہو جاتی ہے۔“
”مگر گرمی میں کوئی صحرائی محل جیسی تفریح گاہ میں کیوں آنا گوارا کرے گا؟“ پھر وہ اپنے سوال کا خود ہی جواب دیتے ہوئے بولی۔ ”تم کسی سرکاری کام سے آئے ہو نکی؟“
”کسی حد تک۔ مجھے یہاں ایک کام انجام دینا ہے۔“

انہوں نے ائرپورٹ سے ایک کار کرائے پر لی اور سانتا فے کی جنوبی سمت روانہ ہو گئے۔ وہاں سے انہوں نے تاؤس کا رخ کیا۔ ابھی صحرائی محل دس میل دور تھا۔ یہ محل پہاڑیوں کے دامن میں بنا ہوا تھا جس کی چوٹیوں پر اب بھی برف جمی ہوئی تھی۔
”کتنی عجیب بات ہے۔ نیچے اتنی گرمی اور اوپر برف جمی ہے۔“ گلوریا نے کہا۔
”ابھی سوئمنگ پول میں جا کر ساری گرمی دور کر لینا۔“ نک نے اسے اطمینان دلایا اور کار محل کے دہرے گیٹ کے سامنے روک دی۔
ایک باوردی محافظ نے انہیں سیلیوٹ کیا اور پوچھا کہ ان کی ریزرویشن ہے یا نہیں پھر اس نے انہیں پارکنگ کی جگہ دکھائی۔
یہ جگہ واقعی محل نما تھی مگر پارکنگ شیڈ کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس وقت لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں۔
انہیں جو کمرا ملا، اس میں شیشے کا پھسلنے والا دروازہ تھا جو سوئمنگ پول کے رخ پر کھلتا تھا۔ نک نے سامان کھولنے کی ذمے داری گلوریا کے سپرد کی اور خود لابی میں جائزہ لینے آ گیا۔ وہ خاص طور پر یہاں کی مالکہ اندرا ایمسن سے ملنا چاہتا تھا۔
”مالک موجود ہیں؟“ اس نے رجسٹریشن ڈیسک کے پیچھے موجود نوجوان سے پوچھا جس کے سینے پر اس کا نام جمی کا بیج آویزاں تھا۔
”کوئی مسئلہ؟“
”نہیں... دراصل وہ ہمارا ایک مشترکہ دوست ہے۔“
”مسز اندرا ایمسن اس کی مالکہ ہیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے اس وقت تو وہ سوئمنگ پول پر ملیں گی۔ ارے! لیجیے وہ خود ہی آ رہی ہیں۔“
نک نے اس سمت دیکھا جس سمت اس نے اشارہ کیا تھا اور حیران رہ گیا۔ جو عورت اس کی طرف آ رہی تھی وہ ماریا تھر بی تھی۔ اس کی موکلہ۔
مگر کیا واقعی وہ اس کی موکلہ ہے؟ اس نے دوبارہ غور سے دیکھا اور کچھ الجھن میں پڑ گیا۔
وہ ماریا سے حیرت انگیز طور پر مشابہ تھی مگر اس کی چال میں کوئی ایسی بات تھی جو مختلف تھی۔ یہ عورت کچھ زیادہ بااعتماد معلوم ہوتی تھی۔
”معاف کیجیے۔“ وہ بولا۔ ”آپ اندرا ایمسن ہیں؟“
وہ رک گئی اور ہلکے سے مسکرا کر بولی۔ ”جی ہاں، فرمائیے؟“
”میرا خیال ہے میں آپ کی ایک عزیز کو جانتا ہوں، ان کا نام ماریا تھر بی ہے۔“
”میری بہن ہے وہ۔ مگر آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟“
”میرا نام نک ویلوٹ ہے اور میں ایک مشاورتی فرم میں کام کرتا ہوں۔ حال ہی میں نیویارک میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔“
”بہت خوب! پچھلے سال ممی کے انتقال کے بعد سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔ کیا اسی نے آپ کو یہاں کا بتایا تھا؟“
”انہوں نے ذکر کیا تھا مگر انہوں نے مجھ سے آپ دونوں کی حیرت انگیز مشابہت کا حال نہیں بتایا ورنہ مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی۔“
اندرا مسکرائی۔ ”ہماری ایک بہن اور ہے روز جو بچپن میں ہم سے بے حد ملتی تھی۔ لوگ ہم تینوں کو جڑواں سمجھتے تھے۔“ اچانک اس کے لہجے میں کاروباری چمک پیدا ہو گئی۔ ”آپ یہاں کب تک قیام فرمائیں گے مسٹر ویلوٹ؟“
”میں اور میری بیوی چند روز آرام کی غرض سے یہاں آئے ہیں تاکہ دھوپ کھا سکیں۔“
”اچھا تو پھر خوب تفریح کیجیے۔“ یہ کہہ کر وہ رجسٹریشن ڈیسک کی طرف بڑھ گئی۔
نک کو اندرا کی رہائش گاہ کا پتا چلانے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ یہ دہرے سوئمنگ پول کے دوسری جانب قدرے اونچائی پر بنی تھی اور اس طرح بقیہ گیسٹ ہاؤس سے الگ ہو گئی تھی۔ نک کو کوئی الارم کا نظام بھی نظر نہیں آیا۔ نک کے خیال میں اندر داخل ہونا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔
وہ واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ گلوریا تیراکی کے لیے تیار تھی۔ ”آؤ نکی! چلو ذرا دیر گرمی دور کریں۔“
”ہاں چلو۔“ آخر تفریح میں حرج ہی کیا تھا۔
گلوریا پول میں تیرتی اور چھپاکے مارتی رہی اور نک ایک ادھیڑ عمر کے مرد سے باتیں کرتا رہا۔
”آپ پہلی بار آئے ہیں؟“ مرد نے ایک لمبا میکسیکی سگار سلگاتے ہوئے پوچھا۔
”ہاں پہلی بار۔“ نک نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ”بلکہ میں نے تو نیو میکسیکو ہی پہلی بار دیکھا ہے۔“
”بڑی خوب صورت جگہ ہے۔“ مرد نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام چارلی رابن ہے۔ میں انشورنس میں کام کرتا ہوں۔“
”آپ پیوبلو کی طرف گئے ہیں؟ عجیب طریقے سے

www.paksociety.com

رہتے ہیں وہاں کے لوگ۔"

نک نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ تو آج ہی آئے ہیں۔"

چارلی نے سینے کے سفیدی مائل بال کھینچتے ہوئے کہا۔ "تاؤس میں آپ رکے تھے یا نہیں؟ وہاں ایک ہوٹل میں ایسی تصاویر ہیں جو مشہور مصنف ڈی ایچ لارنس نے بنائی تھیں۔ آپ اس نام سے واقف ہیں نا؟ وہ جنس پر کتابیں لکھتا تھا۔ بہت پہلے شاید وہ تاؤس میں رہا ہے۔"

"مجھے مناظر سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔" نک بولا۔ "ہم لوگ تو یہاں ذرا آرام کرنے آئے ہیں۔"

گلوریا پول میں سے نکلی اور تولیا سے جسم خشک کرنے لگی۔ نک نے اس کا تعارف کرایا اور چارلی کو ایک پیگ کی پیشکش کی مگر اس نے انکار کر دیا۔ "میں اتنی جلدی ڈرنک نہیں کرتا۔ پانچ بجے سے پہلے یہ سگار ہی میرے ساتھی ہوتے ہیں۔"

نک کی توجہ ایک گاڑی نے اپنی طرف کھینچ لی جو بیرونی گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ چارلی میکسیکی سگاروں کی خوبیاں گنوانے میں مصروف تھا اور نک ایک فربہ اندام سفید بالوں والی عورت کو کار سے اترتے دیکھ رہا تھا۔ وہ عورت اب اپنی باقی دو بہنوں کی طرح نوجوان اور خوب صورت تو نہیں تھی مگر نک کو یقین تھا کہ وہی روز ہے۔ تیسری بہن۔

اندرا نے آگے بڑھ کر بہن کا استقبال کیا۔ دونوں بہنیں رسمی انداز میں گلے ملیں۔ نک انہیں اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئیں پھر گلوریا اور چارلی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

صحرائی محل میں جو کچھ ہو رہا تھا، نک کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اب تیزی سے کام کرنا ہوگا۔

☆☆☆

رات کو کھانے پر نک جان بوجھ کر چارلی کے قریب بیٹھا۔ وہ گلوریا کے لیے ایسا انتظام کرنا چاہتا تھا کہ اگر اسے آدھے گھنٹے کے لیے یہاں سے جانا پڑے تو گلوریا تنہا نہ رہے۔ اندرا ایمسن نے اپنی بہن کے ساتھ کھانا کھایا۔ جب اس نے دیکھا کہ دونوں بہنوں کے سامنے شیمپین کی بوتل کھول دی گئی ہے تو وہ اٹھا۔ "میرے پیٹ میں کچھ گڑبڑ سی محسوس ہو رہی ہے۔" اس نے گلوریا سے کہا۔ "میں ابھی آتا ہوں۔"

"او نکی..."

"فکر نہ کرو۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ جلدی سے سوئمنگ پول کی طرف بڑھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کچھ لوگ اب بھی تیراکی کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک احمق... رجسٹریشن ڈیسک والا نوجوان تھا۔ غالباً کچھ ملازمین کو اس وقت تفریح کا وقت دیا جاتا تھا جب مہمان کھانے میں مشغول ہوں۔

اندرا کی رہائش گاہ کی پچھلی کھڑکیاں، پول سے نظر نہیں آتی تھیں۔ نہ ہی انہیں بیرونی گیٹ کا محافظ دیکھ سکتا تھا۔ نک ایک عام چور کی طرح شیشہ کاٹ کر اندر گھس سکتا تھا۔ مگر اس کے بعد؟

اگر وہ لکڑی کا انڈا واقعی بے قیمت ہے تو پھر اسے یقیناً لکڑی کے بکس میں رکھا گیا ہوگا؟ اسے اپنی ماں کا خیال آیا جو اس کا بٹن ٹانکنے کے لیے اپنی خوابگاہ کی الماری میں سے سلائی بکس نکال کر لاتی تھیں۔ مگر گلوریا اپنا سلائی بکس ڈائننگ روم کی الماری میں رکھتی تھی۔ نک کی ایک بوڑھی چچی باورچی خانے میں سلائی کیا کرتی تھیں۔ اندرا جیسی عورت یقیناً بے حد ضرورت کے تحت ہی کچھ سیتی ہوگی تو اس صورت میں اس کا سلائی بکس کہاں ہونا چاہیے؟ نک یہی سوچتا ہوا واپس ڈائننگ ہال میں آ گیا۔

"نکی! اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" گلوریا نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک۔"

"جب تم گئے ہوئے تھے تو مسز اندرا ایمسن نے تمام مہمانوں کو آج رات اپنے مکان میں مدعو کیا تھا۔"

نک خوش ہو گیا۔ "اچھا؟"

"ان کی دونوں بہنیں یہاں موجود ہیں۔ غالباً اسی لیے انہوں نے یہ تقریب رکھی ہوگی۔"

نک نے جلدی سے اندرا ایمسن کی میز کی طرف دیکھا۔ اب وہاں تین عورتیں بیٹھی تھیں۔ ماریا تھربی بھی آ پہنچی تھی حالانکہ اس نے نک سے کہا تھا کہ وہ دو ہفتے بعد آئے گی۔ اب ان تینوں کے ساتھ بیٹھنے سے ان کی شکل، صورت اور خدوخال کا فرق نمایاں ہو گیا تھا۔

"پارٹی یقیناً مزے دار ہوگی۔" چارلی بولا۔ "انہوں نے ہم سب کو بلا کر بڑی مہمان نوازی کا ثبوت دیا ہے۔"

نک نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔ "میرے خیال میں تو آج کل یہاں صرف سات یا آٹھ افراد ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

www.paksociety.com

"پھر بھی پارٹی میں لطف آئے گا۔" گلوریا نے کہا۔ "چلو گے نا؟"

"بالکل۔"

رات کو پارٹی میں تینوں بہنیں توجہ کا مرکز تھیں۔ اندرا نے خاندانی غرور اور کچھ ڈرامائی لہجے میں اپنا اور تینوں بہنوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان کی دولت مند مگر حاکمانہ طبیعت کی مالک ماں نے ان کی کس طرح پرورش کی۔ ان کی ماں یورپین اسکولوں کی پڑھی ہوئی تھیں۔

"ہمارے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی وہ ہمارے والد سے طلاق لے چکی تھیں۔" اندرا کہہ رہی تھی۔ "اس لیے ہم نے ہمیشہ گھر میں چار ہی افراد دیکھے۔ میں، روز، ماریا اور ماما۔"

"وہ اب بھی زندہ ہیں؟" شکاگو کے ایک بینکر نے سوال کیا۔

"ان کا پچھلے سال انتقال ہو گیا۔" ماریا نے جواب دیا۔ "وہ ہمیں بہت یاد آتی ہیں۔"

"آپ تینوں بہنیں تو بے حد دولت مند ہوں گی؟"

بہنوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نک ان نظروں کا مطلب نہیں سمجھ پایا۔ "اتنے تو نہیں ہیں جتنا لوگ ہمیں سمجھتے ہیں۔" روز تھربی نے کہا۔ "وہ خاصی فربہ تھی مگر اپنی بہنوں کے آگے تو دبلی ہی نظر آتی تھی۔" "ہم میں سے صرف اندرا کی شادی صحیح جگہ ہوئی تھی۔"

"صحیح شادی کا مطلب یہ ہے۔" میزبان بہن نے مسکرا کر وضاحت کی۔ "کہ مجھے طلاق دینے سے پہلے میرے دولت مند شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی دولت سے یہ صحرائی محل قائم ہوا۔"

نک معذرت کر کے ٹوائلٹ چلا گیا۔ اس کے کانوں میں گفتگو کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے جیب سے ننھا سا چاقو نکالا اور بائیں پائنچے کی اندرونی سلائی ادھیڑنے لگا۔ پھر چاقو جیب میں رکھ کر وہ واپس ہال میں آ گیا۔

گلوریا اپنی میزبان کے قریب کھڑی تھی۔ "ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔" نک نے ان سے کہا۔ "میرے پتلون کی سلائی ادھڑ گئی ہے۔"

اندرا ہمدردی سے بولی۔ "آج کل درزی اتنی خراب سلائی کرتے ہیں کہ وہ چند روز بھی نہیں چل پاتی۔"

"میرے خیال میں ہمیں یہاں سے جانا پڑے گا۔" نک نے کہا۔ "ہاں آپ سوئی دھاگا دے سکیں تو گلوریا آپ کے کمرے میں اسے سی دے گی۔"

"کیوں نہیں۔ مجھے خود ہی یہ خیال آنا چاہیے تھا۔"

اندرا ایک کمرے میں غائب ہو گئی۔ اور پھر ایک سرخ سلائی بکس لے کر نکلی۔ "لیجیے اس میں سے جو دھاگا آپ لینا چاہیں، لے لیں۔"

دوسرے کمرے میں جا کر گلوریا نے بکس کھول کر اس میں سے پتلون کے رنگ کا دھاگا نکالا اور نک نے پتلون اتار دی۔ "بڑی شرم آ رہی ہے مجھے۔"

"ظاہر ہے۔ کیا مجھے شرم نہیں آ رہی ہے۔"

اسے توقع نہیں تھی کہ اندرا یوں اپنا بکس ان کے حوالے کر دے گی۔ وہ تو صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ بکس ہے کس قسم کا اور کہاں رکھا رہتا ہے۔ بکس میں جھانک کر دیکھا تو وہ لکڑی کا انڈا اس میں موجود تھا۔ اس نے ہاتھ ڈال کر وہ نکال لیا۔ گلوریا سلائی میں مشغول تھی۔ سارا کام آسانی سے ہو گیا۔

جب وہ ہال میں واپس آئے تو نک نے ماریا تھربی کی طرف دیکھا مگر وہ نظر بچا گئی۔ شاید وہ ابھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ نک کو اس وقت تک انتظار کرنا ہوا جب تک وہ خود اس سے بات کرنے میں کوئی خطرہ محسوس نہ کرے اور اس دوران سوائے اس کے اور کوئی کام نہ تھا کہ پارٹی کا لطف اٹھایا جائے۔

☆☆☆

صبح تک ماریا تھربی نے اس سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ اب نک پر اس لکڑی کے انڈے کے بارے میں تجسس سوار ہو گیا تھا۔ گلوریا پول کے کنارے دھوپ کھا رہی تھی اور وہ اکیلا کمرے میں بیٹھا انڈے کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اس پر کچھ نہیں لکھا تھا۔ نہ ہی کوئی علامت تھی۔ وہ ٹھوس لکڑی کا تھا اور جب نک نے اسے باتھ روم کے بیسن میں ڈالا تو وہ پانی میں تیرنے لگا۔ یہ اس انڈے کے بالکل مشابہ تھا جو ماریا تھربی نے نیویارک میں اسے دکھا دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ تاؤس کا ایک چکر لگا آئے۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" نک نے گلوریا سے کہا۔ "تم دھوپ میں زیادہ دیر نہ بیٹھنا۔"

گلوریا نے چہرہ اوپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بے یقینی سے بولی۔ "ذرا محتاط رہنا نکی۔"

تاؤس میں ایک ڈاکٹر کے ہاں سے نک نے انڈے کا ایکسرے کروایا۔ ڈاکٹر نے انڈا اسے دیتے ہوئے عجیب انداز میں کہا۔ "محض لکڑی ہے اور کچھ نہیں۔"

"میں یقین کرنا چاہتا تھا۔"

ڈاکٹر نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”لایئے دس ڈالر۔“

واپس جاتے ہوئے نک سوچ رہا تھا کہ دیکھیں اندرا کو انڈے کی گمشدگی کا کب پتا چلتا ہے اور پھر اس کے کتنی دیر بعد اسے نک کی پھٹی ہوئی پتلون یاد آتی ہے۔

وہ کار پارک کر کے اترا تو گلوریا اسے پول پر نظر نہیں آئی مگر جب وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا تو وہ دوڑتی ہوئی آ رہی تھی۔

”نکی! ہمارے کمرے کی تلاشی لی گئی ہے۔ کسی نے ہمارے کپڑوں کو خوب جھاڑ کر دیکھا ہے۔“

”کوئی چیز غائب تو نہیں ہے؟“ وہ تیزی سے اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

”میرے خیال میں تو نہیں مگر سارا سامان اتنا بکھرا ہوا ہے کہ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں بیس منٹ پہلے تک پول پر تھی جب آئی تو کمرے کا یہ حال دیکھا۔“

نک نے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ جس کسی نے بھی تلاشی لی تھی بڑی مکمل تلاشی لی تھی مگر ہر چیز وہ بکھری ہوئی چھوڑ گیا تھا یہاں تک کہ اس کا شیونگ کٹ بھی خالی کر کے ڈال گیا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس کھینچی اور گلوریا سے بولا۔ ”تم یہیں ٹھہرو اور کسی کو اندر نہ آنے دینا۔ میں ابھی آیا۔“

”تم خطرے میں ہو۔ ہے نا نکی؟“

”یہ تو عام بات ہے۔“ نک کو وہ انڈا یاد آیا۔ اسے ساتھ لے جانا ٹھیک نہیں تھا۔ کمرے میں چاروں طرف ایک نگاہ ڈالتے ہوئے وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ اور ٹوائلٹ ٹینک کا ڈھکنا اٹھا کر انڈا اس میں ڈال دیا۔ یہ کوئی چیز چھپانے کے لیے بڑی عام سی جگہ تھی مگر اسے امید یہ تھی کہ تلاشی لینے والا اتنی جلدی دوبارہ نہیں آئے گا۔ ”یہاں انتظار کرو۔“ اس نے گلوریا سے کہا اور باہر نکل گیا۔

اس نے ڈیسک پر جمی سے چارلی کے کمرے کا نمبر پوچھا اور اس کے دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔ چارلی نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے چارلی کے سینے پر ایک گھونسا رسید کیا اور اسے دھکیلتا ہوا اندر پہنچ گیا۔ ”کیا بات ہے؟“ چارلی چیخا۔

”میں بھی یہی جاننا چاہتا ہوں۔ تم نے میرے کمرے کی تلاشی لی تھی؟“

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے۔“

”جھوٹ نہ بولو۔ میں نے اندر گھستے ہی تمہارے مخصوص سگار کی خوشبو سونگھ لی تھی۔“

چارلی کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ بیٹھ گیا۔ ”میرا خیال ہے مجھے کسی کے کمرے میں گھسنے اور تلاشی لینے کا تجربہ نہیں ہے۔ میں نے بڑی احتیاط سے راکھ وغیرہ تو صاف کر دی تھی مگر بو کا خیال ہی نہیں آیا۔“

”تم کس لیے گئے تھے؟“

”ہم دونوں ایک ہی چیز کی تلاش میں ہیں۔“

”تمہیں یقین ہے؟“

”وہ چیز ایک انڈا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟“

نک بھی بیٹھ گیا۔ ”بہتر یہ ہوگا کہ تم صاف صاف بتا دو کہ تمہیں کیا کچھ معلوم ہے اور مجھے کیا معلوم ہونا چاہیے۔“

”بڑی خوشی سے۔“ چارلی نے ایک سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کبھی سینڈ ہرسٹ ہیرے کا نام سنا ہے؟ یا ایک چور مانک کا؟“

”نہیں۔“ نک نے اعتراف کیا۔

”یہ ایک بہت قیمتی ہیرا ہے جو ایک مشہور برطانوی فلمی اداکارہ کی ملکیت تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ ہیرا ان تینوں بہنوں کی ماں کی ملکیت میں آ گیا۔ پچھلے سال جب ان کا انتقال ہوا تو یہ ان کی باقی ماندہ چیزوں میں سے ایک تھا۔“

”پھر یہ کس کے حصے میں آیا؟“

چارلی مسکرا دیا۔ ”چونکہ اس کی انشورنس میری فرم نے کی ہے، اس لیے میں بھی یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ہمیں خود ابھی پتا چلا ہے کہ ان کی ماں نے ہیرے کو وارثوں تک پہنچانے کا ایک عجیب و غریب طریقہ اپنایا تھا۔ یہ ہیرا ان تین لکڑی کے انڈوں میں سے ایک میں پوشیدہ تھا جو ایک جیسے تھے اور ان کے سلائی بکس میں رہتے تھے۔ ان کی وصیت میں لکھا تھا کہ ان کی تینوں بیٹیوں کو ایک ایک انڈا بچپن کے ان ایام کی یادگار کے طور پر ملے گا جب اس انڈے کی مدد سے ان کی ماں، ان کے کپڑے رفو کر دیا کرتی تھیں۔“

”انڈے میں ہیرا؟ کتنی عجیب سی بات ہے۔“

”مگر اتنی عجیب نہیں۔ دراصل بوڑھی مسز تھربی پرانی یورپی تہذیب سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی کچھ اپنی روایتیں تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اگر مرغی گڈ فرائی ڈے کو انڈا دے اور وہ انڈا سو برس تک رکھا رہے تو اس کی زردی ہیرے میں تبدیل ہو جائے گی۔“

”تو آپ کو یہ نہیں معلوم کہ وہ ہیرے والا انڈا کس کے حصے میں آیا ہے؟“

اس نے سر ہلا دیا۔ ”ان کی ماں نے ہماری کمپنی کے سپرد ایک خط کیا تھا جسے ان کی موت کے ایک سال بعد کھولا

جانا تھا۔ اس خط میں انہوں نے تفصیل لکھ دی تھی۔ ان میں سے ایک انڈا قدرے مختلف تھا گو بظاہر وہ بالکل یکساں نظر آتے تھے مگر اس مخصوص انڈے کے سوراخ میں اگر سوئی چبھوئی جائے تو انڈا اسپرنگ کی مدد سے خود بخود کھل جائے گا ہیرا اندر موجود ہوگا۔“

”بہت خوب۔“ نک بڑبڑایا۔ وہ اس انڈے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس کے کمرے میں موجود تھا۔ ممکن ہے بکھرے میں ہیرا تو نظر نہ آئے لیکن اسپرنگ تو دکھائی دینا چاہیے تھا اور اندرا ایمسن والے انڈے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ ”اور وہ چور جس کا ابھی تم نے نام لیا تھا؟“

”وہ اس پیشے میں نیا ہے مگر خاصا ماہر معلوم ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ صورت سے کیسا لگتا ہے۔ مگر میرے مخبروں نے بتایا ہے کہ وہ بھی یہاں موجود ہے اور ہیرے کے چکر میں ہے۔“

”بڑی دلچسپ بات ہے۔ اور ماریا اور روز تھربی کیوں یہاں آئی ہیں؟“

”انہیں ایک اعتبار سے میں نے بلایا ہے۔ جب میں نے مسز تھربی کا ایک سال پرانا خط پڑھا تو میں نے تینوں سے رابطہ قائم کرنا شروع کیا تاکہ دیکھوں ہیرا کس کے پاس ہے۔ میں نے کلیر اور روز سے بات کی اور ان دونوں نے انکار کر دیا۔ تب میں نے سوچا کہ ان دونوں میں سے ایک ضرور جھوٹ بول رہی ہے تاکہ اس کی بہنیں حصہ نہ مانگنے لگیں اور حکومت بھی وراثت کا ٹیکس نہ عائد کر دے۔ چنانچہ میں نے یہاں آ کر اندرا سے بات کرنے اور اس کے انڈے کا خود معائنہ کرنے کا ارادہ کر لیا اس طرح کم از کم ایک کے بارے میں تو اطمینان کر سکتا تھا۔“

”تم نے اندرا سے بات کر لی؟“

”نہیں۔ اس کی بہنوں کی آمد کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہی۔ ظاہر ہے انہیں یقین ہوگا کہ ہیرا اندرا کے پاس ہے تب ہی تو وہ یہاں آئی ہیں۔“

”تو پھر تم نے میرے کمرے کی تلاشی کیوں لی؟“

”میں تمہاری شہرت جانتا ہوں ویلوٹ۔ میرے پاس تمہاری پوری فائل ہے۔“

”تب تو تمہیں معلوم ہوگا کہ میں کبھی ہیرے نہیں چراتا۔“

”دیکھو، میں نے سنا تھا کہ ایک جواہرات کا چور بھی یہاں آیا ہوا ہے۔ جب میں نے تمہیں دیکھا تو سوچا ممکن ہے کہ تم ہی دہری زندگی گزار رہے ہو۔“

”میں تو اپنی بیوی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے آیا ہوں۔“

چارلی معنی خیز انداز میں بولا۔ ”گلوریا تمہاری بیوی نہیں ہے۔“

نک کھڑا ہو گیا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی عجیب تھی۔ ”نہیں؟ تو پھر اسے تم کیا کہو گے؟“

چارلی اپنی کرسی سے اٹھا مگر اس نے دیر کر دی تھی۔ ابھی اس کے منہ سے پہلا حرف بھی نہ نکلا تھا کہ نک نے اس کے دو چار زوردار گھونسے جڑ دیے۔ وہ فرش پر لڑھک گیا۔

جب نک باہر نکلا تو چارلی کراہ رہا تھا۔

☆☆☆

نک کمرے میں واپس آیا تو گلوریا اپنے تیراکی کے لباس میں تھی۔ ”اگر اتنی گرمی نہ ہوتی تو ہم لوگ ٹینس کھیلتے۔ کچھ لوگ کھیل رہے ہیں۔“

”تم تو پول میں ہی رہو تو بہتر ہے۔“

”تم نے معلوم کیا ہمارے کمرے کی تلاشی کس نے لی تھی؟“

”وہ چارلی کا کام تھا۔“

اس نے لابی میں جا کر ماریا تھربی کو فون کیا۔ اس کے کمرے سے کوئی جواب نہیں آیا۔ شاید وہ اپنی بہنوں کے ساتھ ہو۔ وہ تو چاہتا تھا کہ جلد از جلد وہ انڈا اس کے حوالے کر کے بقیہ فیس لے اور گلوریا کے ساتھ واپس چلا جائے۔

بالآخر اس نے اندرا اور روز کو تلاش کر ہی لیا۔ وہ دونوں ٹینس کورٹ میں تھیں۔ مگر ماریا وہاں نہیں تھی۔ تب وہ ماریا کی رہائش گاہ کی طرف گیا۔ شاید وہ واپس آ گئی ہو۔ اس کی دستک کا کوئی جواب نہیں آیا مگر ابھی وہ جانے ہی والا تھا کہ اندر سے آنے والی ایک آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ جیسے کوئی چیز گری ہو۔

نک نے کھڑکی کے ذریعے جھانکنے کی کوشش کی۔ پردوں کے اندر سے اسے کوئی چیز فرش پر لڑھکتی نظر آئی۔ وہ پھر دروازے پر آیا اور ایک تار کی مدد سے تالا کھول لیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر ماریا پر پڑی جو فرش پر بندھی پڑی تھی اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ اس نے پیر مار کر ایک سائڈ ٹیبل گرا دی تھی جو کھڑکی میں سے لڑھکتی ہوئی نظر آئی تھی۔

نک نے جلدی سے اس کے منہ سے کپڑا نکالا اور پوچھا۔ ”یہ کس نے کیا ہے؟“

”پتا نہیں... وہ چہرے پر نقاب چڑھائے ہوئے تھا۔“

www.paksociety.com

نک نے دیکھا کہ کمرے کی تلاشی لی گئی تھی مگر یہاں تلاشی کا کام بڑی صفائی اور محتاط طریقے سے کیا گیا تھا۔ یہ چارلی کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ ہاں اگر وہ نک کی توقع سے زیادہ چالاک ہو تو دوسری بات ہے۔ ''کوئی چیز لے تو نہیں گیا وہ؟''

''نہیں، میرے خیال میں تو وہ میرے والے انڈے کی تلاش میں آیا تھا مگر میں اسے یہاں نہیں لائی۔''

''ممکن ہے وہ اندرا کا انڈا ڈھونڈ رہا ہو۔ وہ کل رات میں نے چرا لیا تھا۔''

''آپ نے چرا لیا تھا؟ وہ کہاں ہے؟''

''محفوظ ہے۔ وہ انشورنس کمپنی کا نمائندہ چارلی بھی اس کے چکر میں ہے اور غالباً وہ چور بھی جس کا نام مائنک ہے۔''

''تو آپ کو ہیرے کے بارے میں معلوم ہے؟''

''ہاں۔''

وہ اس سے نظریں چرا رہی تھی۔ ''اگر میں پہلے سے آپ کو ساری بات بتا دیتی تو آپ مجھے مایوس کر دیتے مگر اندرا کا انڈا بیکار ہے مجھے اس کا یقین ہے۔ میں آپ کے ذریعے اس کی تصدیق چاہتی تھی۔''

''آپ کا خیال صحیح ہے۔'' نک نے اعتراف کیا۔ ''میں نے اس کا ایکسرے کروایا تھا۔''

''تو پھر ہیرا روز کے پاس ہوگا۔''

''اب یہ آپ جانیں اور ظاہر ہے یہ مائنک بھی اپنے طور پر یہاں نہیں آیا ہوگا۔ اسے بھی میری طرح یہاں بھیجا گیا ہوگا۔''

''میری کسی بہن نے بھیجا ہوگا؟''

''اور کون بھیج سکتا ہے؟''

''مجھے تو اب ڈر لگنے لگا ہے۔'' وہ بولی۔

''لگنا بھی چاہیے۔ آخر آپ کو ایک چور یہاں باندھ کر ڈال گیا تھا۔''

''مائنک نام بتایا تھا نا آپ نے؟''

''ہاں، میں نے یہی نام سنا تھا۔ ممکن ہے وہ بھی یہاں ٹھہرا ہوا ہو یا ملازموں میں سے کوئی ہو۔'' ماریا تھربی نے سر ہلایا۔ ''اندرا کے مستقل ملازمین تو گرمیوں میں چھٹی پر چلے جاتے ہیں۔ یہ سب عارضی ملازم ہیں۔''

''آپ دو ہفتے پہلے ہی یہاں کیوں آگئیں؟''

''یہ روز کا خیال تھا۔ اس نے مجھے فون کیا اور کہا کہ وہ بھی آرہی ہے۔ وہ انڈے کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔''

''کس قسم کی بات؟''

''یہی کہ انڈا مل جائے تو تینوں برابر تقسیم کر لیں۔''

''تو کیا اندرا نے بھی یہ بات مان لی؟''

''ظاہر ہے اس نے بھی انکار کر دیا اور میں نے بھی کہا یہ ہیرا اسی کا ہے جس کے پاس ہے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ پیر سہلانے لگی رسی سے بندھے رہنے کی وجہ سے دوران خون رک گیا تھا۔ ''شاید وہ ہیرا روز کے پاس ہے اور وہ اس طرح شبہے کو کسی اور طرف منتقل کرنا چاہتی تھی۔''

نک کچھ الجھ کر رہ گیا۔ ''اندرا کا انڈا تو میرے پاس ہے اور اس میں ہیرا نہیں ہے۔ آپ کے انڈے میں بھی ہیرا نہیں ہے۔ باقی بچی روز۔ لیکن اس کو دوسرے پہلو سے دیکھیے۔ آپ نے مجھے یہاں بھیجا اور کسی نے مائنک کو۔ اگر ہیرا روز کے پاس ہوتا تو اسے یہاں کسی کو بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں تھی اور اندرا مائنک کو بلا نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اسے تو ابھی ہیرے کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔''

''ممکن ہے کسی اور نے...'' دروازے پر دستک کے سبب اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو باہر اندرا سیمسن کھڑی تھی۔ وہ سخت پریشان نظر آرہی تھی۔

''کسی نے میرا انڈا چرا لیا ہے۔''

اچانک اس کی نظر نک پر پڑی۔ ''تم... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ کل تمہاری ہی پتلون پھٹ گئی تھی نا؟''

نک کو تیزی سے سوچنا پڑا۔ ''میں ابھی آیا ہوں۔ مجھے آپ کی بہن سے ان لکڑی کے انڈوں کے بارے میں کچھ بات کرنا تھی۔ اگر آپ مجھ پر اعتماد کریں تو میں آپ کا گمشدہ انڈا واپس لا سکتا ہوں۔''

''تم ہی نے تو چرایا ہے، تم کیا واپس لاؤ گے۔''

''مسز سیمسن! ذرا میری بات تو سنیے۔ اس مسئلے کے حل کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آپ تینوں بہنیں، میں اور چارلی ایک جگہ جمع ہوں۔''

''تم چور ہو۔'' وہ چلائی اور اس کے سینے پر مکے مارنے لگی۔ نک نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

''اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا مسز سیمسن۔ پلیز جو میں کہہ رہا ہوں، اس پر عمل کریں۔''

''مجھے میرا انڈا واپس کر دو۔''

''اگر ہم سب اکٹھا ہو جائیں تو یہ انڈے کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔''

اس موقع پر ماریا نے بھی دخل دیا۔ ''میرا خیال ہے مسٹر ویلوٹ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آخر مل بیٹھ کر باتیں کرنے میں کیا حرج ہے۔''

اندرا کا غصہ ٹھنڈا ہونے میں کچھ دیر لگی۔ بالآخر وہ راضی ہو گئی۔ ''ٹھیک ہے۔ کھانے کے بعد میرے آفس میں جمع ہو جائیں۔ اور مسٹر ویلوٹ! آپ ہمیں دھوکا دینے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ میری یہاں کے پولیس والوں سے دوستی ہے۔ وہ فوراً آپ کو پکڑ لیں گے۔''

''میرا یہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''پھر کھانے کے بعد آپ سے ملاقات ہوگی اور ہاں آپ میرا روز کا انڈا ضرور لے کر آئیں۔''

وہ مڑی اور بہن کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔ ''اس کا مطلب ہے میرے پاس وقت بہت کم ہے۔''

''کس کام کے لیے؟''

''آپ کو انڈا سپرد کرنے کے لیے اور اپنی فیس لینے کے لیے۔''

''مگر اسے تو معلوم ہے کہ انڈا تم نے چرایا ہے۔''

''اسے شبہ ہے اور اس میں فرق ہے۔ یہ نہ بھولیے کہ یہاں ایک اور چور بھی موجود ہے۔ ہم ہر الزام اس کے سر ڈال سکتے ہیں۔''

وہ باہر نکل کر دوبارہ اپنے کمرے میں آگیا۔ گلوریا اب بھی پول میں نہا رہی تھی۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو وہ اس کے واپس آنے سے پہلے ہی انڈا واپس کر کے بقیہ فیس حاصل کر سکتا تھا۔ وہ فوراً باتھ روم میں گھس گیا اور ٹوائلٹ ٹینک کا ڈھکنا اٹھایا ہی تھا کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''کوئی چیز چھپانے کی عام سی جگہ ہے مسٹر ویلوٹ۔ حرکت کرنے کی کوشش نہ کریں۔ میرے پاس ریوالور ہے۔''

نک نے ریوالور کی نال اپنے کان کے قریب محسوس کی۔ اس نے اپنا سر ذرا گھما کر دیکھا تو نقاب کے پیچھے سے دو آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ ''تمہیں گرمی نہیں لگ رہی؟''

''باتیں مت کرو۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔''

''تو تم ہی مائنک ہو۔ میں نے تمہارے بارے میں سنا ہے۔ مجھے اندر آنے سے پہلے الماریوں کو کھول دینا چاہیے تھا یا پھر تم بیڈ کے نیچے تھے؟''

''میں نے تم سے کہا ہے کہ چپ رہو۔'' اس نے تنبیہ کی۔ ایک دستانے والا ہاتھ ٹینک کے اندر گیا۔ ''کہاں ہے وہ؟''

''کیا چیز؟''

''انڈا۔ وہ تو یہاں نہیں ہے۔''

نک نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کب کہا تھا کہ یہاں ہے۔ میں تو ٹینک کو ٹھیک کرنے آیا تھا۔''

نقاب پوش مرد نے زور سے ایک گالی دی اور ریوالور سے اس کے ضرب لگائی۔ نک نے بچنے کی بہت کوشش کی۔

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

ستمبر 2012ء ... عید سعید کی یادوں کے سنگ

قرضِ مسافت

طوائف کے ہزاروں روپ ..... کبھی دھوپ میں چھاؤں اور کبھی سرد موسم میں انتقام کی آگ۔

آخری صفحات پر عائشہ فاطمہ کا سنسنی خیز شاہکار

چچ نامہ

ایک برہمن راجا کی سندھ کی زمین پر بادشاہت کا منفرد انداز ..... راجا داہر کا تاریخی کردار .....

ڈاکٹر ساجد امجد کی کاوش

کشکول

انوار صدیقی کے قلم سے معاشرے کے منفی کرداروں اور مردِ حُر کے درمیان ایک انوکھی جنگ کا احوال

مسافر

زندگی کی رعنائیوں ..... دل کی تنہائیوں اور جگ کی رسوائیوں کا مجموعہ .....

ناصر ملک کے قلم کی روانی

جدائی

ہر دلعزیز قلم کار طاہر جاوید مغل کی محبتوں کا ایک منفرد انداز

ان کے علاوہ مرزا امجد بیگ کی جرح، محفلِ شعر و سخن، آپ کے خط

مزید کاشف زبیر، مریم کے خان، زاہد نقوی، نظارت نصر، سلیم انور، تنویر ریاض کی سحر انگیز تحاریر

ہاتھ اوچھا پڑا۔ مگر پھر بھی نک نیچے گر پڑا۔ اس کے اٹھنے سے پہلے حملہ آور جا چکا تھا۔

نک نے خاموشی سے ٹینک میں جھانکا اور دل ہی دل میں گالیاں دینے لگا۔

رات کو کھانے کے بعد وہ اندرا ایمسن کے آفس میں پہنچا ماریا اور روز پہلے سے وہاں موجود تھیں۔ چارلی فوراً ہی نک کے پیچھے آگیا۔ اس کا جبڑا سوجا ہوا تھا اور وہ بول نہیں پا رہا تھا۔

”اب تو آپ مطمئن ہیں مسٹر ویلوٹ؟“ اندرا نے پوچھا۔ ”ہم سب موجود ہیں۔“

نک نے سر ہلا دیا۔ ”سوائے مائک کے۔ وہ تو بڑا مصروف ہے۔“

”وہ کون ہے؟“ اندرا نے پوچھا۔

”وہ جس آسانی سے سب کے کمروں میں گھس جاتا ہے اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ آپ کا کوئی ملازم ہے۔ ویسے آپ کے دروازوں کو کھولنا کوئی مشکل نہیں ہے۔“

چارلی بھی بول پڑا۔ ”مطلب کی بات کرو ویلوٹ۔ تم نے ان خواتین سے کہا تھا کہ تم انڈوں کا مسئلہ حل کر سکتے ہو۔“

”بالکل۔“ وہ روز تھربی کی طرف مڑ کر بولا۔ ”آپ نے مائک کو یہاں بھجوایا تھا؟“

وہ مدافعانہ لہجے میں بولی۔ ”یہ آپ نے کیسے کہہ دیا۔ میں تو مائک کو نہیں جانتی۔“

”چارلی نے صرف آپ اور کلیر کو ہیرے کے بارے میں بتایا تھا۔ اندرا کو تو آج سے پہلے علم ہی نہیں تھا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کا انڈا بے پروائی سے سلائی بکس میں پڑا ہوا تھا یا پھر چارلی نے اس چور کی خدمات حاصل...“

”میرا دماغ خراب تھوڑی ہے۔“ چارلی برس پڑا۔ ”میں تمہاری بکواس بہت سن چکا ویلوٹ۔“

”ذرا صبر سے... تم چور کو بلوا سکتے تھے مگر تم نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ اگر تمہیں وہ ہیرا خود حاصل کرنا ہوتا تو تم ان تینوں بہنوں کو انڈے کی حقیقت سے آگاہ کیوں کرتے۔ اب بچیں ماریا اور روز۔ ماریا نے مجھے مامور کیا اور روز نے مائک کو۔“

وہ فرش کو گھور رہی تھی۔ ”میں نے اسے آج تک دیکھا بھی نہیں۔ ایک دوست نے مجھے اس کا نمبر دے دیا تھا۔“

اندرا اپنی بہن روز سے مخاطب ہوئی۔ ”تم نے میرے ساتھ ایسی حرکت کیوں کی؟“

وہ رونے لگی۔ ”مجھے پیسے کی ضرورت تھی۔ میں ماما کی جاگیر کے حصے پر آس لگائے بیٹھی تھی۔ جب وہ نہ ملا تو میں بہت مایوس ہوگئی۔“

”اور اب؟ تمہارا انڈا کہاں ہے؟“

روز نے اپنا بڑا سا پرس کھولا۔ ”میں اسے اپنے ساتھ لیے پھر رہی ہوں۔ البتہ میں نے اسے ایک گفٹ پیکٹ میں چھپا رکھا ہے۔ تم اسے دیکھ لو۔ اگر میری بات پر یقین نہ ہو۔“ اس نے ایک گفٹ پیکٹ اندرا کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”ذرا یہ مجھے دے دیجیے۔“ نک نے پیکٹ لے کر اس کی ربن کھولی اور ڈبے کے اندر سے انڈا نکال لیا۔

”اسے دیکھیں۔ اس میں تو ہیرا نہیں ہے کہیں؟“ روز نے کہا۔

”اگر ہیرا روز کے پاس ہوتا تو مائک کو نہ بلواتیں۔“ نک نے نکتہ اٹھایا مگر پھر اس نے انڈے کا ننھا سا سوراخ چیک کرلیا۔ انڈا بالکل ٹھوس تھا۔

”اب؟“ چارلی نے پوچھا۔

نک کے ذہن میں ایک سراغ سر ابھار رہا تھا۔ ”مجھے ایک گھنٹا چاہیے۔ آپ سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جائیں۔“

چارلی اور اندرا بڑبڑائے مگر پھر راضی ہوگئے۔ ”میں ذرا اس انڈے کو دوبارہ پیک کر دوں۔“ اس نے اندرا کو سب سے پہلے کمرے سے باہر نکالا۔ جب وہ تنہا رہ گیا تو اس نے کمرے میں کسی چیز کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ بالآخر اس کی نظریں ٹائپ رائٹر پر اٹک کر رہ گئیں۔

☆☆☆

گلوریا ایک رسالہ پڑھ رہی تھی، جب نک اندر آیا۔

”ارے نکی!“ ”میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ آج دوپہر ٹینک میں کچھ گڑبڑ ہوگئی تھی۔“

نک بے دھیانی سے سن رہا تھا۔ ”اچھا؟“

”فلش کام نہیں کر رہا تھا مگر میں نے خود ہی اسے ٹھیک کرلیا۔“

اس کا سر اوپر اٹھا اور اس نے آئینے میں گلوریا کی طرف دیکھا۔ ”کیسے...؟“

”میں نے ٹینک میں دیکھا تو اس میں ایک لکڑی کا ٹکڑا پھنسا ہوا تھا۔ میں نے اسے نکال دیا۔“

نک دانت پیس کر بولا۔ ”وہ لکڑی کا ٹکڑا کہاں گیا؟“

”میں نے اسے کوڑے کی ٹوکری میں... ڈال دیا تھا۔ وہ لکڑی کے انڈے کی طرح لگ رہا تھا۔“

وہ کچھ کہے بغیر تیزی سے کوڑے کی ٹوکری کی طرف لپکا۔ انڈا ٹوکری میں موجود تھا۔

گلوریا نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ ”کیا میں نے کوئی غلطی کردی تھی؟“

وہ مسکرا دیا اور اسے جلدی سے پیار کر کے بولا۔ ”تم نے تو میری بڑی مدد کی ہے گلوریا۔“

پھر اس نے ریسیور اٹھا کر ماریا تھربی کو فون کرنا شروع کردیا۔

وہ پول کے قریب اس کی منتظر تھی۔ ”آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کے پاس اندرا کا انڈا موجود ہے۔“

”ہاں یہ ہے پیکٹ میں... اگر آپ پیسے لائی ہیں تو بس ہمارا کام ختم ہو جائے گا۔“

”مگر یہ تو روز کا انڈا ہے؟“

”میں نے اسے اندرا سے بدل دیا ہے مگر اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ آپ کے پاس تو ہیرا موجود ہے۔“

”کیا مطلب؟“ اس کا چہرہ زرد ہوگیا۔

”میں نے دو انڈے اچھی طرح دیکھ لیے ہیں۔ اب یا تو چارلی نے یہ داستان اختراع کی ہے یا پھر ہیرا آپ کے انڈے میں ہے۔ اور اسی لیے آپ اسے یہاں نہیں لائیں۔ جونہی آپ کی دونوں بہنیں اپنے انڈوں کا موازنہ کرتیں، انہیں معلوم ہو جاتا کہ ہیرا آپ کے پاس ہے۔ اس لیے آپ نے مجھے اندرا کا انڈا چرانے کے لیے مامور کیا تا کہ آپ اسے اپنا کہہ کر پیش کر سکیں اور جب اندرا انڈا پیش نہیں کر سکے گی تو ہر شخص اس پر شبہ کرے گا اور آپ کو نہ اپنی بہنوں کو حصہ دینا پڑے گا نہ ٹیکس ادا کرنا پڑے گا۔“

وہ نک کے چہرے کو پڑھتے ہوئے بولی۔ ”تم ان سے کہہ دو گے؟“

”نہیں، بشرطیکہ آپ میری فیس ادا کر دیں۔ اگر مائک کو اندرا کا انڈا مل گیا تو اسے حقیقت معلوم ہو جائے گی۔“ اس نے پیکٹ یونہی اچھالتے ہوئے کہا۔

ماریا نے جلدی سے پرس کھولا۔ ”یہ لو اپنی فیس۔“

”یہ لیجیے اندرا کا انڈا۔“

نک اسے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ کسی واقعے کا منتظر تھا مگر شاید مائک اسے بے وقوف بنا گیا تھا۔ تب ہی اسے ماریا کی ہلکی سی کراہ کی آواز آئی۔ ایک سیاہ سائے نے اسے پکڑ رکھا تھا اور اس کے ہاتھ سے پیکٹ چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ نک آگے بڑھا ہی تھا کہ ریوالور کی نال اس کی طرف اٹھ گئی۔

”پیچھے رہو ویلوٹ۔ میں تمہیں قتل کرنا نہیں چاہتا۔“

”اور میں بھی مرنا نہیں چاہتا۔“

مائک تاریکی میں غائب ہوگیا۔ ماریا تھربی خوف سے کانپ رہی تھی۔ ”یہ... وہی آدمی ہے جس نے مجھے باندھ دیا تھا۔“

”مجھے اس کے آنے کی توقع تھی۔“ نک بولا۔ ”میرا اندازہ تھا کہ وہ اندرا کے عارضی ملازموں میں سے ایک ہے اور یقیناً وہ فون پر ہونے والی گفتگو سن سکتا ہے۔ اسی لیے اس نے مجھے آپ سے باتیں کرتے سن لیا تھا۔ وہ اب بھی یہی سمجھتا ہے کہ اندرا کے انڈے میں ہیرا ہے۔“ اس نے ماریا کا بازو تھام کر کہا۔ ”آئیے چلیں۔“

”کہاں؟“

”چور کو پکڑنے۔“

اندرا بار میں چارلی کے ساتھ مشروب پی رہی تھی۔

”فوراً سب کو لے کر پارکنگ شیڈ میں آجائیں۔ آپ کے ہاں آگ کا الارم ہے؟“

اس نے نک کی طرف دیکھا جیسے وہ پاگل ہوگیا ہو۔ ”ہے تو... مگر میں...“

”پلیز جلدی کیجیے۔“

تین منٹ بعد وہ سب پارکنگ شیڈ میں جمع تھے۔ ملازمین اور مہمان۔ گلوریا بھی بھاگتی ہوئی آئی۔ ”نکی! آگ لگ گئی ہے کیا؟ میں نے الارم کی آواز سنی ہے۔“

”نہیں، مگر ابھی آگ لگے گی۔ تم دیکھتی رہو۔“

پھر وہ اندرا کے ملازمین کے قریب گیا اور باری باری ہر ایک کے ہاتھ سونگھنے لگا۔ اس کی کامیابی کا انحصار اس امر پر تھا کہ مائک نے پیکٹ کھولنے سے پہلے دستانے اور نقاب اتار دیا ہو۔

تب وہ نوجوان کلرک جی کے سامنے رک گیا۔

”تمہارے ہاتھ بڑے گندے ہیں مائک۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ ”تمہیں دستانے نہیں اتارنے چاہیے تھے۔“

جی بمشکل مسکرایا۔ ”تم بہت ذہین ہو ویلوٹ۔ ممکن ہے پھر کبھی ہماری دوبارہ ملاقات ہو۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ اندرا بولی۔ ”جی چور ہے؟“

”بہترین چوروں میں سے ایک ہے۔ اب آپ اور چارلی فیصلہ کریں کہ اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جائے گا۔ میں تو اپنا کام کر چکا۔“

”مگر اس کے ہاتھ اتنے گندے کیوں ہوگئے؟“

”جب میں نے پیکٹ کو دوبارہ باندھا تو آپ کے ٹائپ رائٹر کی ربن استعمال کی تھی۔“

یہ کہتے ہوئے نک ویلوٹ کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

www.paksociety.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

...خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک ...جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی ...ہوتی ہے۔ اس کے زیر تحکیں ضلع کے سب سے ...گاؤں ...آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک ...جاگیردار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے ...نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا ...ہو جاتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، ...سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی ...آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ...پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت ...کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے ...سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا جس کا نام ...اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ...لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور ...آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو اغوا ہو ...ڈاکوؤں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ شہر یار، مختار مراد کو ...فون کر کے جنگل میں آپریشن پر زور دیتا ہے۔ ...آفتاب کے ہاں ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی ہے۔ ماہ ...اسلم کے ذریعے شہر یار کی شادی کی اطلاع ملتی ہے ...صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو اسلم کو ...شادی کی آفر کرتی ہے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا ...ٹھکانے لگانے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر ماہ بانو، اسلم اور للی ...سے بھاگ نکلتے ہیں۔ پولیس ڈیرے پر ...آپریشن کر کے تمام ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیتی ہے تاہم ماہ ...بانو کی بازیابی ممکن نہیں ہوتی۔ للی راستے میں اسلم اور ...کے درمیان ہونے والی لڑائی میں ماری جاتی ہے۔ ...اسلم کے چاقو کا شکار ہو کر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ادھر چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ ادھر مشابرم خان شہر یار کو خانقاہ کی رپورٹ دیتا ہے اور اس گاؤں میں ہونے والے مقابلے کی خبر دینے کے ساتھ وہاں اسلم اور ماہ بانو کی موجودگی اور پھر فرار کا ...ہے۔ شہر یار یہ خبر سن کر چونک جاتا ہے۔ بہر حال ...مشابرم خان کو دوبارہ ٹاہلی والا جا کر تحقیقات کرنے ...کا حکم دیتا ہے۔ مشابرم خان وہاں پہنچ کر ایک بوڑھے ...شخص سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ شہر یار کی ملاقات ...ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک ...فورس قائم کر لی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ...ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ ...کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہر یار کو ماہ بانو کا فون ...موصول ہوتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی

اسما قادری

قسط 39

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزر نا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

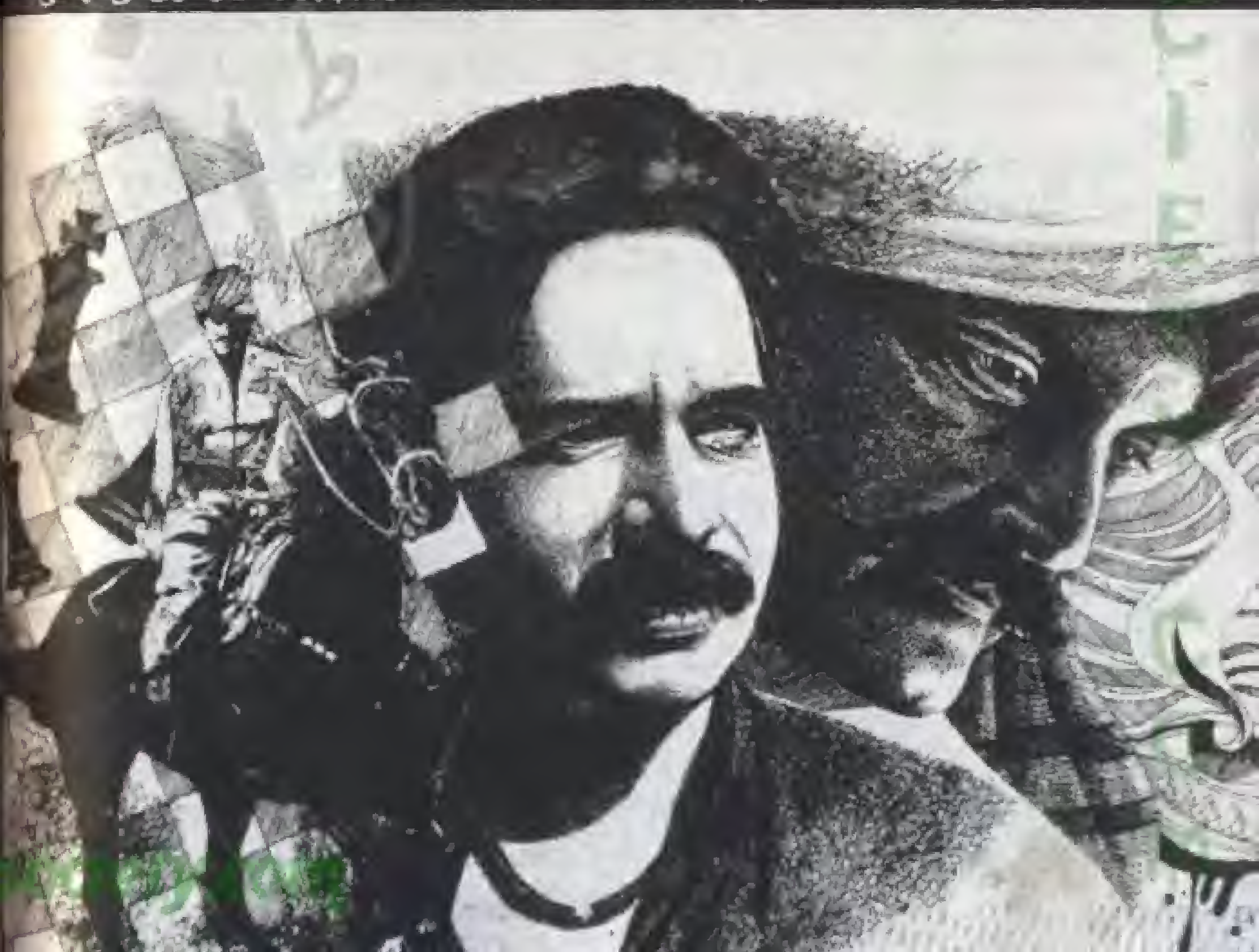

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ شہریار کو مشابرم خان کے ذریعے ... میں مشکوک اشیا کے پہنچائے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔ شہریار میجر ذیشان کے ذریعے وہاں کارروائی کرواتا ہے اور خود بھی اس کے ہمراہ ... پہنچتا ہے۔ وہاں اسے پتا چلتا ہے کہ اس کی جاسوسی کی جارہی ہے۔ وہ اپنے گھر میں جاسوسی کے لیے استعمال ہونے والی ڈیوائس کو ڈھونڈ لیتا ہے ... شہریار کو ماریا پر شبہ ہوتا ہے۔ ماریا لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے تو شہریار مشابرم خان کو اس کی نگرانی کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ ادھر شہریار کو ماہ ... کے نکاح کے سلسلے میں خود بھی لاہور جانا پڑتا ہے۔ وہ لوگ ماہ بانو اور اسلم کو بھی وہیں بلالیتے ہیں۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا ... طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی ہے۔ شہریار اس کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر ماریا کی ماں سلمیٰ یا جوزف ورما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ کرنل توحید پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ ادھر شہریار ... اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ راستے میں گاڑی کے خراب ہونے پر وہ ایک جگہ رکتے ہیں۔ اس کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہریار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں اور اس کی شناخت بدلنے کے معاملات پر غور ہوتا ہے۔ شہریار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ شہریار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے طے ہوتا ہے کہ شہریار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلائی جائے گی اور عملی طور پر بھی ایسا دکھایا جائے گا کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور وہ کوما میں چلا گیا ہے۔ اس کی جگہ اسپتال میں کوئی اور شخص ہوتا جبکہ اس کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کردی جاتی۔ مشابرم خان کو جب شہریار کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع ملتی ہے تو اس کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ شہریار، ماہ بانو، اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ ادھر اس کے ایکسیڈنٹ کا ڈراما طے کردیا جاتا ہے اور را اور موساد والے سمجھتے ہیں کہ شہریار کا کام صاف ہوگیا۔ شہریار انڈر گراؤنڈ ہوجاتا ہے اور اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ ادھر موساد والے عابد انصاری کو ٹھکانے لگادیتے ہیں۔ کشور اور آفتاب بھی نیویارک پہنچ جاتے ہیں مگر وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہوجاتی ہے تاہم مراد شاہ کشور اور آفتاب سے بہت خلوص سے ملتا ہے۔ کشور کے خدشات دور ہوجاتے ہیں اور وہ بھائی سے مل کے بہت خوش ہوتی ہے۔ ادھر شہریار کے کہنے پر ذیشان سی ایف پی کے نوجوان کو خواجہ سراؤں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے بھیجتا ہے۔ جاوید علی نامی سی ایف پی کا نوجوان خواجہ سراؤں کے ایک گرو ببلی کو اس مشن میں اپنے ساتھ شامل کرلیتا ہے۔ ببلی اسے ایک ہندو خواجہ سرا شالنی کے پاس لے جاتا ہے۔ شالنی اسے اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دیتی ہے مگر پھر اسے کراچی نوازش علی نامی شخص کی کوٹھی میں لے آتی ہے۔ وہاں تمام ملازم خواجہ سرا تھے۔ وہاں جاوید علی کو پتا چلتا ہے کہ شالنی کسی چکر میں ملوث ہے۔ وہ ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرتا ہے اور شالنی کے آدمی اسلحے سمیت پکڑے جاتے ہیں تاہم شالنی کو گرفتار کرنے کے بجائے اس کی نگرانی شروع کردی جاتی ہے۔ ادھر ذیشان موہنی کو اٹھا کر اس سے اگلوالیتا ہے کہ وہ را کی ایجنٹ ہے۔ اسے موہنی سے کافی مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ذیشان شہریار کو تفصیل سے تمام صورت حال سے آگاہ کرتا ہے۔ ادھر جاوید علی ہیڈ کوارٹر رپورٹ کررہا ہوتا ہے کہ نوازش علی کی بیٹی شازمین اس کی گفتگو سن لیتی ہے۔ وہ جاوید علی کو حقائق بتانا چاہتی ہے اور دوسرے دن اپنے کمرے میں آنے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ شالنی پکڑے جانے والے مال کے بارے میں ورما کو وضاحت دیتی ہے۔ وہ کراچی فون کرکے رنجنی پر نظر رکھنے کی ہدایت کرتی ہے۔ ورما اس کی گفتگو سن لیتا ہے اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ ورما اپنا ٹھکانا چھوڑتا ہے مگر سی ایف پی کا اہلکار اس کا پیچھا کرتا ہے اور اس کے نئے ٹھکانے تک پہنچ جاتا ہے۔ شہریار کو اس کی تصویر بھیجی جاتی ہے تو وہ اسے شناخت کرلیتا ہے۔ ادھر جاوید علی شازمین کے کمرے میں پہنچ کر شازمین سے معلومات حاصل کرتا ہے اور کوٹھی میں کارروائی کی تیاری کرتا ہے۔ وہ صورتِ حال پر غور کے لیے کمرے میں ٹہل رہا ہوتا ہے کہ مدھو اچانک کمرے میں آجاتی ہے۔ شازمین اسے کینہ توز نظروں سے گھورتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جاوید علی نے دروازے کی ناب گھمائے جانے کی ہلکی سی آواز سن لی تھی چنانچہ جب تک دروازہ کھلا، وہ جھپٹ کر آڑ میں ہوچکا تھا اور اب کھلے دروازے کے پٹ کے پیچھے پوری طرح چوکس کھڑا ہوا تھا۔

"مدھو! تمھیں تمیز نہیں ہے کہ پہلے دروازے پر دستک دے کر اجازت لو پھر دروازہ کھولو۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے کمرے کا دروازہ اس طرح بنا اجازت کھولنے کی؟" بڑے سخت تیوروں کے ساتھ شازمین آنے والے خواجہ سرا مدھو کی گوشمالی کررہی تھی۔

"شما چاہتی ہوں بی بی! ذرا پریشان تھی اس لیے دھیان نہیں رہا۔" مدھو نے فوراً ہی اس سے معافی مانگ لی لیکن حقیقتاً اس کے چہرے پر ذرا بھی شرمندگی کے آثار نہیں تھے اور وہ اپنی آنکھیں گھما گھما کر شازمین کے کمرے کا جائزہ لینے کی کوشش کررہی تھی۔

"تم یہاں آئی کس لیے ہو؟" اس کے انداز پر جھنجلاتے ہوئے شازمین نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"وہ میں ناشتے کے برتن واپس لے جانے آئی تھی۔"

"کیوں تم کیوں آئی ہو؟ کاجل کہاں ہے؟" شازمین نے مزید سختی سے پوچھا۔ ابھی تک اس نے مدھو کو کمرے کے اندر آنے کی اجازت نہیں دی تھی اور تیور بھی ایسے رکھے تھے کہ وہ خود سے قدم آگے بڑھانے کی ہمت نہ کرسکے۔ جاوید علی کے دروازے کے پیچھے مکمل طور پر چھپے ہونے کے باوجود وہ محتاط تھی کہ کہیں مدھو کمرے کے اندر گھس کر اندازہ نہ لگالے کہ وہ وہاں چھپا ہوا ہے۔

"آپ کو معلوم تو ہے جی کہ بڑی دیدی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ آرام کررہی ہیں۔" مدھو نے اس کے سوال کا جواب دیا اور پھر خوشامدانہ لہجے میں بولی۔ "آپ ہم لوگوں کو سیوا کا ایک موقع دے کر تو دیکھیں بھگوان کی سوگند آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

"بس رہنے دو۔ جب تک کاجل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوجاتی مجبوری ہے لیکن جیسے ہی وہ بستر سے اٹھنے کے قابل ہو، اسے فوراً میرے پاس بھیجو۔ میں اس کے سوا کسی کو برداشت نہیں کرسکتی۔" شازمین نے نخوت سے اسے جواب دیا اور یکدم ہی ناشتے کی ٹرالی کھینچ کر دروازے کے قریب لے گئی۔

"یہ لو۔ یہ لے جاؤ اور اب جب تک میں نہ بلاؤں کسی کو بھی یہاں آکر مجھے ڈسٹرب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اپنا جملہ مکمل کرتے ہی اس نے دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کردیا۔ اس بار وہ دروازے کو لاک کرنا نہیں بھولی تھی۔ دروازہ بند ہوجانے کے باوجود جاوید علی فوراً اپنی جائے پناہ سے نہیں نکلا اور شازمین کو اشارہ کیا کہ وہ کی ہول سے جھانک کر تسلی کرلے کہ مدھو وہاں سے چلی گئی ہے یا ابھی تک وہ ٹوہ لینے کے لیے وہیں کھڑی ہوئی ہے۔ شازمین نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور اطمینان ہوجانے کے بعد اسے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ جاوید علی باہر نکلا تو وہ خود تیزی سے حرکت میں آئی اور ایک دراز سے اسکاچ ٹیپ اور قینچی نکالی۔ قینچی کی مدد سے ٹیپ کا ٹکڑا کاٹنے کے بعد اس نے کی ہول پر چپکا دیا۔

"اب کوئی باہر سے جھانک کر اندر کا جائزہ نہیں لے سکے گا۔" وہ اپنی کارروائی کے بعد اطمینان سے بولی۔

"میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے۔ وہ لوگ یقینی طور پر مجھے کوٹھی میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ مدھو کا اچانک تمہارے کمرے میں پہنچنا، اس تلاش کا ہی ایک حصہ ہوسکتا ہے۔ تم نے اسے کمرے کے اندر نہیں آنے دیا ہے اس لیے اسے شک ہوگا کہ میں یہیں موجود ہوں۔ وہ یا اس کی کوئی ساتھی دوبارہ پھر کسی بہانے سے یہاں کا جائزہ لینے آئے گی اور کی ہول پر چپکا ٹیپ دیکھ کر ان لوگوں کا شک اور بھی پکا ہوجائے گا۔ تم انہیں اپنے کمرے کی تلاشی لینے کا موقع دو تاکہ تمہاری جان چھوٹ جائے۔ اس دوران میں تم مجھے نواب صاحب کے بیڈ روم میں پہنچا سکتی ہو۔" جاوید علی نے اس کی اس کارروائی پر اعتراض کرتے ہوئے تجویز پیش کی تو وہ فوراً قائل ہوگئی اور فوراً اسکاچ ٹیپ کو کی ہول سے ہٹا دیا۔

"مجھے نواب صاحب کے کمرے میں پہنچانے کے بعد تم کاجل کی عیادت کے بہانے نیچے کا چکر لگا کر آجاؤ تاکہ حالات کا صحیح اندازہ ہوسکے۔" اپنا رنجنی والا لباس اور اس گیٹ اپ کے لیے استعمال کی گئی دوسری اشیا سمیت کر ایک تھیلے میں ڈالتے ہوئے اس نے شازمین کو مشورہ دیا جس پر اس نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر اپنے کمرے سے باہر نکل کر جائزہ لینے لگی۔ باہر کوئی نہیں تھا اور وہ نہایت رازداری سے جاوید علی کو نواب صاحب کے بیڈ روم میں منتقل کرسکتی تھی۔ منٹوں کے اندر یہ کارروائی انجام پاگئی۔ رنجنی کا لباس وغیرہ جاوید علی خاص طور پر اپنے ساتھ اس لیے لے گیا تھا کہ شازمین کے کمرے کی تلاشی کے دوران کسی کو کوئی کلیو نہ مل سکے۔

"اب میں نیچے جاکر کاجل کا پتا کرتی ہوں۔" جاوید علی کو نواب صاحب کی خواب گاہ میں پہنچا کر شازمین اس سے کہتی ہوئی باہر نکلنے کے لیے پلٹی۔

"ذرا خیال سے شازمین! تمھیں صرف حالات کا جائزہ لینا ہے کوئی ایسی حرکت مت کرنا جس سے تم خود خطرے میں پڑجاؤ۔" جاوید علی نے اسے ہدایت کی۔

"فکر مت کرو۔ میں احتیاط کروں گی۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا اور باہر نکلنے سے پہلے بولی۔

"تم دروازہ اندر سے لاک کرلو۔ اس دروازے میں ڈبل لاک ہے جس میں سے ایک لاک تو باہر سے چابی لگا کر کھولا جاسکتا ہے لیکن دوسرا لاک صرف اندر سے کھلتا ہے۔ دروازہ بھی بہت مضبوط۔ اگر کوئی اسے توڑنا چاہے تو کئی افراد کو مل کر خاصی محنت کرنی پڑے گی۔" وہ گویا اسے آگاہ کررہی تھی کہ سیکیورٹی کے اعتبار سے یہ کمرا کتنا محفوظ ہے اور وہ یہاں بغیر کسی خوف کے آرام سے وقت گزار سکتا ہے۔ اسے اپنی حفاظت کی تو خیر کیا فکر ہونی تھی لیکن کمرے کی اس خصوصیت نے اسے کچھ اور سوچنے کا موقع ضرور دے دیا۔

ادھر شازمین سیڑھیاں اتر کر نچلی منزل پر پہنچ چکی تھی اور کوٹھی کے اس حصے میں موجود تھی جہاں خواجہ سراؤں کے لیے خوب صورت و آرام دہ کمرے موجود تھے۔ آمنے سامنے قطار سے بنے ان کمروں میں سے اس کا رُخ کاجل کے کمرے کی طرف تھا لیکن اس سے قبل کہ وہ کاجل کے کمرے میں داخل ہو پاتی، آشا کہیں سے نکل کر اس کے سامنے آگئی۔

"ہیلو بے بی! آپ اس سمے یہاں کیسے نظر آرہی ہیں؟" چہرے پر مسکراہٹ پھیلا کر اس نے شازمین سے

پوچھا۔

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ کاجل بیمار ہے، وہ بھی اتنی شدید کہ میرے کئی دفعہ بلانے کے باوجود میرے پاس نہیں آسکی تو میں نے سوچا کہ چلو چل کر خود اس کی خیریت معلوم کر لیتی ہوں۔ وہ اپنے کمرے میں ہی ہے نا؟“ آشا کا اس طرح راستہ روکنا اسے بُرا لگا تھا لیکن تحمل سے کام لیتے ہوئے آرام سے اس کی بات کا جواب دیا اور کاجل کی بابت دریافت کرتے ہوئے قدم آگے بڑھانے چاہے لیکن آشا اس کی راہ میں مزاحم تھی۔

”آپ بہت سوئٹ اینڈ کائنڈ ہیں بے بی جنہیں ایک ملازمہ کی اتنی چنتا ہے لیکن افسوس کہ آپ کی ملاقات بڑی دیدی سے نہیں ہوسکے گی۔ اصل میں مجھے ان کی طبیعت زیادہ ہی خراب لگ رہی تھی۔ اس لیے انہیں اسپتال میں ایڈمٹ کروا دیا ہے۔“ آشا کے جواب نے اسے مزید تشویش میں مبتلا کردیا۔ یہ تو طے تھا کہ نہ تو کاجل بیمار تھی اور نہ ہی اسے اسپتال میں داخل کروایا گیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ ان لوگوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ وہ ان کی قید میں تھی، زخمی تھی، یا پھر جان سے ہی مار دی گئی تھی؟ اس بارے میں کوئی حتمی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

”کون سے اسپتال میں ایڈمٹ کیا ہے اسے اور اسے اسپتال لے کر کون گیا ہے؟ تم تو یہیں موجود ہو۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں خودبخود تلخی در آئی۔ بہرحال غصے کے باوجود اس کا سوال تکنیکی اعتبار سے درست تھا۔ آشا ڈرائیور تھی اور اگر کاجل کو کسی اسپتال لے جایا گیا تھا تو آشا کو اس وقت کوٹھی میں موجود نہیں ہونا چاہیے تھا۔

”میں دیدی کو اسپتال تک چھوڑ کر واپس آگئی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کہیں جانا چاہیں اور مجھے کوٹھی میں نہ پاکر ناراض ہوں۔ لیکن آپ چنتا نہ کریں، مدھو ہے بڑی دیدی کے ساتھ.... وہ ان کا پورا خیال رکھے گی۔“ آشا نے اسے تسلی دی۔

”ٹھیک ہے، تم گاڑی نکالو۔ میں کاجل کو دیکھنے اسپتال جاؤں گی۔“ وہ سب سمجھ رہی تھی لیکن جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچانا چاہتی تھی اس لیے بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ حکم دیا۔

”شما چاہتی ہوں بے بی۔“ آشا نے فوراً ہی اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ”ابھی میں آپ کو اسپتال نہیں لے جا سکتی۔ گاڑی کچھ گڑبڑ کررہی ہے، پہلے میں اسے مکینک کو دکھا لوں پھر آپ کو اسپتال لے چلوں گی ورنہ اگر راستے میں بند ہوگئی تو آپ کو بُرا لگے گا۔“ اس بہانے باز کے پاس ہر بات کے لیے بہانہ موجود تھا۔ شازمین کا دل چاہا کہ اسے ٹیکسی لا کر اپنے ساتھ چلنے کا حکم دے لیکن پھر کچھ سوچ کر چپ ہوگئی۔ موجودہ حالات میں وہ خود بھی کوٹھی سے باہر نہیں جانا چاہتی تھی لیکن چونکہ شروع سے مزاج کے اعتبار سے نخریلی تھی اس لیے ایسے ہی چپ ہوجانا بھی مناسب نہیں تھا چنانچہ جان بوجھ کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

”تم لوگ بہت ہڈحرام ہوگئے ہو۔ میں بابا سے تمہاری شکایت کروں گی۔“ وہ تنتناتی ہوئی وہاں سے چل پڑی۔

”اس سے نواب صاحب کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں بے بی! نواب صاحب نشے میں ہیں اور اگر انہوں نے آپ کی بات سن بھی لی تو سمجھ نہیں سکیں گے۔“ اسے لگا کہ آشا اس کا مذاق اڑا رہی ہو لیکن اس بار اسے غصہ آنے کے بجائے سخت احساسِ بےبسی ہوا۔ اگر اس کا باپ اس قماش کا بندہ نہ ہوتا تو کیا مجال تھی کہ اس کوٹھی میں یہ خواجہ سرا اس طرح دندناتے پھرتے۔ آنکھوں میں آئی نمی کو چھپاتے ہوئے اس نے کوٹھی کے اس حصے کا رخ کیا جہاں نواب نوازش علی کی خواب گاہ تھی۔ عیاش فطرت نواب نے زیریں اور بالائی دونوں منزلوں پر اپنی خواب گاہیں بنا رکھی تھیں۔ اوپر موجود خواب گاہ کو استعمال کرنے کی نوبت تو بہت کم آتی تھی البتہ نچلی منزل کی خواب گاہ اس کا مستقل ٹھکانا تھی جہاں وہ کھل کر عیاشی کرتا تھا۔

آشا کے اطلاع دے دینے کے باوجود اس نے موہوم سی امید کے سہارے نواب صاحب کی خواب گاہ میں جھانکا۔ وہاں وہی منظر تھا جس کی خبر آشا دے چکی تھی۔ نواب نوازش علی اپنے عالی شان بستر پر بےترتیبی سے اوندھا پڑا ہوا تھا اور بستر کی چادر آدھی سے زیادہ نیچے لٹکی ہوئی تھی۔ بستر کے قریب ہی اوندھا پڑا جام اور بوتل بھی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ مایوس ہوکر وہاں سے پلٹ گئی۔ باہر اسے آشا کھڑی ملی۔

”میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا۔“ اس کے مایوس چہرے کو دیکھ کر اس نے تبصرہ کیا۔ شازمین اندر سے کھول کر رہ گئی لیکن بےبس تھی۔ اس کے اپنے باپ کے اعمال ایسے تھے کہ وہ ایک معمولی خواجہ سرا کے سامنے جواب دینے سے قاصر تھی البتہ اسے اس کی اوقات جتانا بھی ضروری تھا چنانچہ سخت لہجے میں بولی۔

”جلد از جلد گاڑی ٹھیک کروا کر لاؤ تاکہ میں کاجل کو

دیکھنے اسپتال جاسکوں۔“ حکم صادر کرنے کے بعد اس نے مڑ کر نہیں دیکھا اور رعونت بھرے انداز میں آگے بڑھ گئی لیکن وہ خود جانتی تھی کہ اس کا یہ انداز مصنوعی ہے اور وہ اندر سے شکست و ریخت کا شکار ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہیں بالائی منزل پر پہنچ کر اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ مدھو اس کے کمرے میں موجود تھی۔

”تم یہاں کیا کررہی ہو؟“ اس نے سخت لہجے میں مدھو سے دریافت کیا۔

”میں آپ کے کمرے کی صفائی کرنے آئی تھی۔ بڑی دیدی کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لیے میں نے سوچا کہ آج آپ کا کمرا میں صاف کردوں۔“ اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

”لیکن آشا تو کہہ رہی تھی کہ تم کاجل کے ساتھ اسپتال میں ہو۔“ اسے اچانک یاد آیا تو اس نے چونک کر پوچھا۔ مدھو لمحہ بھر کے لیے گڑبڑائی پھر سنبھل کر بولی۔

”آشا کو یاد نہیں رہا ہوگا۔ اس نے مجھے بڑی دیدی کے ساتھ جانے کا کہا تو تھا لیکن پھر اس لیے منع کردیا تھا کہ میرے پیچھے کچن کون دیکھے گا۔ میری جگہ تندنی وہاں گئی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر تمہاری صفائی مکمل ہوگئی ہے تو یہاں سے جاؤ، میں تھوڑی دیر آرام کروں گی۔“ شازمین نے بحث کرنے کے بجائے بےنیازانہ رویہ اختیار کیا اور اپنے مخصوص تیکھے لہجے میں بولی۔

”آپ آرام کریں بی بی! میں نے صفائی کرلی ہے، اگر آپ کو کوئی کمی لگے تو بعد میں مجھے بتا دیجیے گا۔“ مدھو تابع داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی شازمین نے جھپٹ کر انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔

”تندنی سے میری بات کرواؤ۔“ انٹرکام پر مخاطب خواجہ سرا کو اس نے حکم دیا۔ لمحہ بھر میں ہی اسے تندنی کی زنانہ آواز سنائی دی۔

”تندنی! شام کے وقت میرے کمرے میں آنا، مجھے تم سے ایک کام کروانا ہے۔“ فوری طور پر اور کچھ نہ سوجھا تو اس نے تندنی کو یہی حکم دے دیا اور اس کا جواب سننے سے پہلے ہی اس نے ریسیور واپس رکھ دیا۔ صورتِ حال پوری طرح اس کے سامنے تھی۔ اسے کاجل کے اسپتال میں داخل ہونے کے سلسلے میں غلط بتایا گیا تھا۔ آشا کے مطابق کاجل کے ساتھ اسپتال میں مدھو موجود تھی۔ اس کا یہ بیان غلط ثابت ہونے پر مدھو نے آشا کی یادداشت کے سر الزام رکھ کر تندنی کے اسپتال میں ہونے کی اطلاع دی تھی لیکن اب یہ اطلاع بھی غلط ثابت ہوچکی تھی۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر فوراً نواب صاحب کی خواب گاہ کی طرف بڑھی اور دروازے پر اسی مخصوص انداز میں دستک دی جس کی جاوید علی نے اسے نصیحت کی تھی۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ وہ جلدی سے اندر داخل ہوگئی اور جاوید علی کے دروازہ بند کرنے کے بعد اسے حالات سے آگاہ کرنے لگی۔

”تم ایسا کرو کہ اپنی دونوں والداؤں کو کسی طرح اس بیڈروم تک لے آؤ۔ ان دونوں سمیت تمہیں اس وقت تک یہاں رہنا ہوگا جب تک میری طرف سے تمہیں اشارہ نہ ملے۔“ سب سننے کے بعد جاوید علی نے پُرسوچ لہجے میں اسے ہدایات دیں تو وہ سراسیمہ سی ہوگئی۔

”اور تم.... تم کہاں جاؤ گے؟“

”مجھے باہر نکل کر ایکشن میں آنا ہوگا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ جو بھی کارروائی کی جائے، وہ رات کے وقت ہو لیکن موجودہ صورتِ حال میں فوری ایکشن لینا ضروری ہے۔ ہمارا جن لوگوں سے مقابلہ ہے، تم انہیں جانتی نہیں ہو۔ تمہارے تندنی کے بارے میں چیک کرنے پر وہ چونک گئے ہوں گے اور انہیں یہ یقین ہوگیا ہوگا کہ مجھے تم نے ہی چھپا رکھا ہے۔ شک وہ پہلے ہی کررہے تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو مدھو صفائی کے بہانے تمہارے کمرے کی تلاشی لینے نہ پہنچتی۔ وہ تو شاید ابھی تک وہ لوگ کاجل کی زبان کھلوانے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں ورنہ سیدھا سیدھا تم پر دھاوا بول دیتے۔“ اس نے شازمین کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کرنا مناسب سمجھا۔

”اگر حالات اتنے خطرناک ہیں تو باہر نکلنے میں تمہارے لیے بھی تو خطرہ ہوگا۔“ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ شازمین نے خدشے کا اظہار کیا۔

”مجھے خطرناک حالات سے نمٹنے کی تربیت دی گئی ہے اس لیے تم میری فکر نہ کرو۔ ویسے بھی باہر میرے لوگ میری مدد کے لیے موجود ہیں۔“ اس نے شازمین کو تسلی دی۔

”ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی لیکن دن کی روشنی میں تمہارے لیے نیچے جانا مشکل ہوگا۔ تم سیڑھیاں اترتے ہی نظروں میں آجاؤ گے۔“

”تم فکر نہ کرو، میں سیڑھیوں سے نیچے نہیں جاؤں گا۔ تمہاری غیر موجودگی میں، میں نے اچھی طرح اس کمرے کی لوکیشن کا جائزہ لے لیا ہے۔ میں اس عقبی کھڑکی سے آرام سے چھجے پر اتر جاؤں گا۔ چھجے سے میرے لیے آم کے اس درخت تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ وہاں سے صورتِ

www.paksociety.com

حال کا جائزہ لے کر میں آگے کا لائحہ عمل طے کروں گا لیکن پہلے تم دونوں خواتین کو یہاں بلوا لو۔ تم تینوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہی میں ایکشن میں آؤں گا۔" شازمین کو اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر زور دیا۔ اصل میں اسے اندیشہ تھا کہ آپریشن شروع ہونے کے بعد کہیں کوٹھی میں موجود مجرم ان خواتین کو یرغمال بنا کر فرار ہونے کی کوشش نہ کریں اس لیے پہلے انہیں محفوظ دیکھنے کا خواہش مند تھا۔

"میں ابھی دو منٹ میں انہیں لے کر آتی ہوں۔" شازمین کو اس کی بات سمجھ آگئی اور وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر جاتے ہی جاوید علی نے عقبی کھڑکی کی طرف پیش قدمی کی اور چوکھٹ پر ہاتھ جما کر چھجے پر کود گیا۔ کوٹھی کی عقبی سمت ہونے کی وجہ سے اس طرف سناٹا تھا اور اسے کسی کے دیکھ لینے کا احتمال نہیں تھا۔ ادھر شازمین نے واقعی خاصی تیزی دکھائی تھی اور نہ جانے کس بہانے سے اپنی سگی اور سوتیلی دونوں والداؤں کو لے کر نواب صاحب کی خواب گاہ میں پہنچ گئی تھی۔ جاوید علی کو غائب پا کر وہ فوراً ہی سمجھ گئی کہ وہ کھڑکی کے راستے چھجے پر موجود ہے۔

"میں جا رہا ہوں۔ تم میری ہدایات یاد رکھنا اور میرے سوا کسی اور کے کہنے پر کسی بھی حال میں کمرے کا دروازہ نہیں کھولنا۔ تم لوگ محفوظ رہو گے تو ہم اپنا کام زیادہ بہتر طریقے سے کرسکیں گے۔" اس نے سرگوشی میں ایک بار پھر اپنی ہدایات کو دہرایا، جواب میں شازمین نم آنکھوں کے ساتھ صرف گردن کو اثباتی جنبش ہی دے سکی اور آہستگی سے کھڑکی کے پٹ بند کرلیے۔ بغیر گرل کی اس کھڑکی کے پٹ بلٹ پروف شیشے پر مشتمل تھے۔ کھڑکی ایک بار اندر سے بند کرلی جاتی تو اسے باہر سے کسی طور کھولنا ممکن نہیں تھا۔ شیشہ ٹوٹنے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بند کھڑکی کے شفاف شیشے سے درخت کی طرف جاتے جاوید علی کو دیکھنے لگی۔ وہ عجیب اجنبی تھا جو صرف ایک رات قبل اسے ملا تھا اور اس قلیل مدت میں ہی اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ دوبارہ کبھی وہ اس سے مل بھی سکے گی یا نہیں لیکن پھر بھی دل اس کی سلامتی کے لیے دعا گو تھا۔

چھجے سے آم کے درخت پر چھلانگ لگانے سے قبل جاوید علی نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا اور کھڑکی میں کھڑی شازمین کی طرف دیکھ کر الوداعی انداز میں ہاتھ لہرایا۔ شازمین کا دایاں ہاتھ بھی میکانکی طور پر اٹھ گیا لیکن پھر اس نے فوراً ہی واپس کھینچ لیا۔ اپنی زندگی میں اچانک آنے والے اس شخص کو وہ کسی طور الوداع نہیں کہنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

ایک بڑی جیپ میں سامان لوڈ کیا جا چکا تھا۔ اس سامان میں ٹینٹ، اشیائے خورونوش، اسلحے اور کیمرے سمیت اور بھی بہت کچھ شامل تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ واقعی کوئی تحقیقاتی ٹیم ہے جو اپنے تحقیقی اور مطالعاتی دورے کے لیے پوری تیاری کے ساتھ جنگل میں داخل ہونے کے لیے تیار ہے۔ اظفر کی ہدایت پر اس کے ساتھیوں نے جیپ کی پچھلی نشستوں پر قبضہ جما لیا تھا اور اب اظفر اور ایک مقامی شخص ہی جیپ سے باہر کھڑے تھے۔

"میری خواہش تو تھی کہ تم ہمارے ساتھ چلتے لیکن تم نے انکار کرکے مایوس کردیا۔" ان لوگوں کو رخصت کرنے کے لیے آئے ہوئے بہرام کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اظفر نے کہا۔

"میں انکار نہیں کرتا لیکن میں نے آپ کو اپنی مجبوری بتادی ہے۔ نئے افسر کے آنے تک بنگلے کی ساری ذمے داری میرے سر ہے اس لیے میں یہاں سے دور نہیں جا سکتا۔ لیکن آپ فکر نہیں کریں میں نے آپ کے ساتھ جس بندے کو لگایا ہے، وہ بھی بڑے کام کا بندہ ہے اور جنگل کو وڈی چنگی طرح جانتا ہے۔ اگر آپ نے اس کے کہنے پر عمل کیا تو کوئی پریشانی نہیں ہوگی اور آپ حفاظت سے وقت پر واپس آجائیں گے۔" اپنے قدرتی اکھڑ لہجے کو نرم بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بہرام نے اسے جو جواب دیا، اس میں ایک پوشیدہ دھمکی بھی تھی۔

"میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہاری باتوں کو ذہن میں رکھوں لیکن تم بھی یاد رکھنا کہ اگر ہم مقررہ وقت پر واپس نہ پہنچ سکیں تو تم بس صرف دو گھنٹے تک مزید ہماری واپسی کا انتظار کرو گے اور پھر عمیر آفندی کو اطلاع دے دو گے۔ دراصل انہیں بھی جنگل میں ہونے والی حادثاتی اموات کی اطلاع مل چکی ہے اس لیے وہ ہم لوگوں کے لیے تشویش کا شکار ہیں اور انہوں نے خاص طور پر مجھے یہ حکم دیا ہے کہ جیسے ہی جنگل سے واپس لوٹوں، انہیں رپورٹ ضرور دوں۔" اظفر ذہین تھا چنانچہ نہایت آرام سے پُرسکون لہجے میں اس کی دھمکی کا جواب دے ڈالا۔

"ٹھیک ہے صاحب! میں خیال رکھوں گا۔" حیرت انگیز طور پر اس بار بہرام نے کوئی الٹی سیدھی بات کرنے کے بجائے تابع داری سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"اوکے تو پھر ہم چلتے ہیں۔" اظفر اس سے مصافحہ کر کے جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی بہرام سے گفتگو کے دوران ان کا گائیڈ کم ڈرائیور جیپ اسٹارٹ کرچکا تھا۔ اظفر نے اس کے ساتھ والی نشست سنبھال لی۔ اس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ بہرام اس وقت تک اپنی جگہ کھڑا جیپ کو دیکھتا رہا جب تک وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔ جیپ کے غائب ہوتے ہی وہ پلٹا اور بنگلے کے ایک کمرے کا دروازہ چابی کی مدد سے کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ یہ وہ کمرا تھا جو عموماً اس بنگلے میں رہنے والے افسر کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ افسر اپنی مرضی سے کسی اور کمرے کا انتخاب کرلے تو یہ اس کی مرضی ہوتی تھی لیکن ایسا اب تک شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ یہ کمرا بنگلے میں موجود دیگر تمام کمروں سے زیادہ کشادہ اور آرام دہ تھا۔ سابق فاریسٹ آفیسر عابد انصاری نے بھی اسی کمرے میں رہنا پسند کیا تھا اور اس کی موت کے بعد بھی یہاں وہ مواصلاتی آلات وغیرہ موجود تھے جن کی مدد سے رابطے کا کام لیا جاسکتا تھا۔ اس کمرے کو مقفل کیا ہی اس لیے گیا تھا کہ یہاں کسی ملازم کی رسائی نہ ہوسکے۔ صرف بہرام تھا جو اس کمرے میں آتا جاتا تھا اور ظاہر ہے اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے کمرے میں پہنچ کر دروازہ اندر سے بند کرلیا اور الماری کا قفل کھول کر اس میں سے ایک آپریٹس نکال کر کہیں رابطہ کرنے لگا۔

"وہ لوگ جنگل کی طرف روانہ ہوگئے ہیں۔ ویسے تو ان کا تمہاری طرف آنے کا ارادہ نہیں ہے لیکن ٹیم لیڈر اظفر سرپھرا بندہ ہے۔ اس کے دماغ میں سما گئی تو وہ ادھر کا رخ بھی کرسکتا ہے۔ تم لوگ اپنی جگہ ہشیار رہنا۔" رابطہ ہوتے ہی اس نے بولنا شروع کردیا۔

"ٹھیک ہے، ہم خیال رکھیں گے۔ تم بتاؤ کہ تم نے ان کی جیپ میں ٹریکر لگا دیا تھا یا نہیں؟" دوسری طرف سے اس سے استفسار کیا گیا۔ بولنے کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اگر بہرام سے اونچے مرتبے کا نہیں تو اس سے نیچے کا آدمی بھی نہیں تھا اور برابری کی بنیاد پر اس سے بات کر رہا تھا۔

"میں نے ٹریکر لگا دیا ہے۔ جیپ جہاں بھی گئی، معلوم ہو جائے گا لیکن ٹریکر پر پورا بھروسا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ جیپ جنگل میں ہر جگہ نہیں جاسکتی۔ ان لوگوں کو کہیں نہ کہیں جیپ چھوڑ کر پیدل ہی آگے بڑھنا ہوگا اور پیدل چلتے ہوئے وہ کس طرف نکل جائیں، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" بہرام تشویش کا شکار تھا۔

"فکر نہ کر۔ اپنی طرف بندوبست پورا ہے۔ تجھے معلوم تو ہے کہ انصاری صاحب کی موت کے بعد جو نیا سسٹم لگا ہے، اس نے ہمارا کام کتنا آسان کردیا ہے۔ پورا بندہ کیا، اگر چڑیا کا بچہ بھی ہماری حدود میں داخل ہوگا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ اگر تیرے شک کے مطابق اظفر اور اس کے ساتھی مشکوک لوگ ہوئے تو سمجھ لے کہ وہ اس جنگل سے صحیح سلامت واپس نہیں جائیں گے۔ ان کی آنکھیں یہاں جو کچھ بھی دیکھیں گی، اس کو بتانے کے لیے وہ باقی ہی نہیں رہیں گے۔" دوسری طرف سے اسے تسلی دی گئی۔ یہ دوسرا بندہ تھا تو مقامی ہی لیکن تعلیم یافتہ تھا اور جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کرنا جانتا تھا۔ انہوں نے کھیتوں کی حفاظت کے پیش نظر کچھ عرصہ قبل ہی ایسا سسٹم لگایا تھا کہ جیسے ہی کوئی ذی روح ان حدود میں داخل ہوتا آلات پر اشارہ موصول ہو جاتا۔ اس سسٹم میں یہ خوبی تھی کہ چھوٹی جسامت کے جانوروں اور پرندوں کی آمد پر متحرک نہیں ہوتا تھا۔ صرف بڑی جسامت کے جانوروں یا انسانوں کی آمد پر ہی سگنل موصول ہوتے۔ سسٹم کی تنصیب کے بعد بڑی جسامت کے جانوروں کو اس تیزی سے ہلاک کیا گیا تھا کہ انہوں نے خود ہی خطرہ بھانپ کر اس حصے کی طرف رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ یوں اب نگرانی کا کام کم ہوگیا تھا اور وہ اپنی حدود میں داخل ہونے والے کسی بھی مشکوک فرد کو آسانی سے ٹریس کرسکتے تھے۔

اظفر اور اس کے ساتھی ان سب باتوں سے بے خبر اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ اظفر نے اپنی ٹانگوں پر ایک نقشہ کھول کر پھیلا رکھا تھا۔ رات وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر روٹ طے کرچکا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے ظاہری طور پر بہرام کے سامنے اس کی مخالفت کرتے ہوئے جنگل کے اس حصے میں جانے سے انکار کردیا تھا جسے بہرام نے خطرناک قرار دیتے ہوئے انہیں وہاں جانے سے روکا تھا۔ بنگلے سے نکلتے وقت انہوں نے اس جگہ سے کافی فاصلے پر جنگل کے دوسرے حصے میں جانے کا اعلان کیا تھا اور اب جیپ اسی طرف رواں دواں تھی۔

"یہاں سے دائیں طرف موڑ لو۔" نقشے کے مطابق جب جیپ اس مطلوبہ مقام پر پہنچ گئی جہاں سے انہیں اپنا راستہ بدلنا تھا تو اظفر نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

"ادھر کیوں صاحب؟ ادھر جانے سے تو ہم اپنے راستے سے ہٹ جائیں گے۔" ڈرائیور نے اعتراض کیا۔

"ہمیں تم سے زیادہ بہتر معلوم ہے کہ کدھر جانا ہے۔ تم بس سیدھے طریقے سے گاڑی چلاؤ۔" اظفر نے غرا کر اسے جواب دیا۔

www.paksociety.com

’’جیسی مرضی صاحب! ہم تو حکم کے غلام ہیں لیکن بتانا فرض تھا کیونکہ آپ اس جنگل کو مجھ سے بہتر نہیں جانتے۔ جن راستوں سے ہم گزر رہے ہیں، یہ اصل جنگل نہیں ہے۔ یہ بہت صاف جگہ ہے لیکن آگے جا کر گھنا جنگل ہوگا جہاں راستے سمجھنے کے لیے نقشہ وقشہ سب بیکار ہے۔ ادھر صرف تجربہ چلتا ہے اور وہی شخص جنگل سے سلامت نکلتا ہے جو اس جنگل کو جاننے والے کے تجربے سے فائدہ اٹھاتا ہے۔‘‘ اس کے حکم کے مطابق ڈرائیور نے جیپ کی سمت تو بدل دی تھی لیکن ساتھ ہی نہایت فلسفیانہ انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

’’تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو؟‘‘ اس کی بات سن کر اظفر طیش میں آگیا۔

’’دھمکی کیسی صاحب! میں تو آپ کو سمجھا رہا تھا، آگے آپ کی مرضی کہ مانو یا نہ مانو۔ میں تو خادم ہوں۔ آپ نے جدھر کہا میں نے گڈی ادھر موڑ دی۔‘‘ ڈرائیور نے اطمینان سے جواب دیا۔ اسے ڈیوٹی پر بھیجتے ہوئے بہرام نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ ان لوگوں سے زیادہ الجھنا نہیں ہے اور نظر رکھنی ہے کہ یہ لوگ جنگل میں کیا کر رہے ہیں۔

’’یہ بہت اچھی بات ہے کہ تم حکم پر عمل کرنا جانتے ہو‘ آگے بھی اسی طرح عمل کرنا اور اپنی زبان صرف اسی وقت کھولنا جب تم سے کچھ پوچھا جائے۔‘‘ اظفر مزاجاً کچھ تند خو تھا اور اس وقت تو وہ مبینہ طور پر ایک ایسے فرد سے مخاطب تھا جو مجرموں کا ساتھی تھا اس لیے کسی مصلحت اور رعایت سے کام لینے کو تیار نہیں تھا۔ ڈرائیور نے بھی اس کا انداز دیکھتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی۔ اسے معلوم تھا کہ جیپ میں ٹریکر لگا ہوا ہے اور وہ جہاں بھی جائیں گے بہرام کو اس کی خبر ہو جائے گی اس لیے زیادہ تردد کی ضرورت نہیں ہے۔

’’یہاں روک لو۔‘‘ جنگل کا چھدرا پن ختم ہوا اور جیپ گھنے جنگل میں داخل ہوئی تو اسے چلانا مشکل ہونے لگا۔ درحقیقت ماہر ڈرائیور کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنا بھی نہیں کر پاتا اور ہمت ہار بیٹھتا لیکن ان کے ساتھ موجود شخص نے مشکل کے باوجود زبان سے اُف نہیں کہا تھا گویا وہ اظفر کے حکم پر پوری طرح عمل کر رہا تھا۔ خود اظفر نے ہی محسوس کر لیا کہ آگے جیپ میں سفر جاری رکھنا ان کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے اس لیے اسے جیپ روک لینے کا حکم دے ڈالا۔ ڈرائیور نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ خاموش رہنے کے باوجود اس وقت وہ بے حد چوکنا تھا۔ وہ لوگ جنگل کے جس حصے میں پہنچ چکے تھے، وہاں سے وہ علاقہ زیادہ دور نہیں تھا جہاں افیون کی کاشت کی جاتی تھی۔ وہ لوگ چاہتے تو پیدل چل کر بھی اس جگہ تک پہنچ سکتے تھے لیکن حسب ہدایت اسے بالکل بھی نہیں دینا تھا اور صرف نگرانی کرنی تھی۔

’’یہاں ٹینٹ لگا لو۔ یہاں رک کر ہم اپنا کام کریں گے۔‘‘ جیپ رک گئی تو وہ سب نیچے اتر آئے اور اظفر نے ادھر اُدھر ٹہلنے کے بعد ایک جگہ کی نشاندہی کرتے ہوئے ہدایت دی۔ اس کے ساتھی فوراً ہی حرکت میں آگئے اور جیپ سے ٹینٹ نکال کر مطلوبہ جگہ پر پہنچا دیے۔ یہ پیراشوٹ سے بنے ہلکے پھلکے ٹینٹ تھے جنہیں ذرا سی جدوجہد کے بعد اکیلا شخص بھی نصب کر سکتا تھا۔

’’تم یہ ٹینٹ لگا کر ان میں ضرورت کی اشیا پہنچاؤ، ہم ذرا اِدھر اُدھر گھوم کر اپنا کام کرتے ہیں۔‘‘ دو عدد ٹینٹ زمین پر ڈھیر کر دیے گئے تھے جب اظفر نے ڈرائیور کو مخاطب کر کے یہ نیا حکم دیا اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی طرف سے چند ہدایات دیے جانے کے بعد وہ لوگ متحرک ہو گئے۔ ڈرائیور بظاہر خیموں کے ساتھ الجھا ان کی ساری کارروائیاں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے شانوں سے جدید ساخت کی گنیں لٹکا رکھی تھیں اور پنڈلیوں کے ساتھ شکاری چاقو بندھے ہوئے تھے۔ ان ہتھیاروں کے علاوہ ان سب کے شانوں کے ساتھ ایک ایک مضبوط تھیلا بھی لٹکا ہوا تھا۔ ان تھیلوں میں کیا تھا، یہ تو ڈرائیور نہیں جانتا تھا لیکن اتنا سمجھ رہا تھا کہ وہ لوگ بڑی تیاری کے ساتھ وہاں آئے ہیں۔ جنگل میں کسی بھی مقصد کے تحت اترنے والوں کو تیاری تو کرنی ہی پڑتی ہے لیکن وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان لوگوں کا انداز کسی محقق یا طالبِ علم جیسا نہیں ہے۔ وہ اپنی حرکات، سکنات اور نظم و ضبط سے تربیت یافتہ کمانڈوز کی طرح لگتے تھے۔ وہ خاموشی سے یہ سب کچھ اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ دو دو کی ٹولیوں میں وہاں سے روانہ نہیں ہو گئے۔ ان کے روانہ ہوتے ہی اس نے ٹینٹ کی تنصیب کا کام چھوڑا اور اپنے لباس میں چھپایا ہوا آپریٹس باہر نکالا اور رابطہ ہونے پر دوسری طرف موجود شخص کو اپنی لوکیشن سے آگاہ کرنے لگا۔

’’بے فکر رہو، ہم نے تمہاری جیپ ٹریس کر لی ہے اور جانتے ہیں کہ اس وقت تم کہاں ہو۔‘‘ اسے جواب ملا۔

’’لیکن سر! وہ لوگ اب ادھر نہیں ہیں۔ مجھے جیپ اور سامان کے ساتھ چھوڑ کر خود پیدل آگے نکل گئے ہیں۔ مجھے ان کے ارادے ٹھیک نہیں لگتے۔ وہ ضرور اسی طرف جائیں گے جہاں جانے سے ہم انہیں روکنا چاہتے ہیں۔‘‘ اس نے تشویش بھرے لہجے میں مزید اطلاع فراہم کی۔

’’اس طرف آ کر وہ خود اپنے حق میں اچھا نہیں کریں گے۔ ہم انہیں ہر حال میں اور آسانی سے روک لیں گے۔‘‘ دوسری طرف موجود بندے کو اپنے آپ پر بھرپور اعتماد تھا۔ ڈرائیور بھی مطمئن ہو گیا کہ اس نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے اور اب اس سے آگے اسے کچھ نہیں کرنا اس لیے آپریٹس واپس لباس میں چھپا کر اظفر کے سونپے ہوئے کام کو مکمل کرنے میں لگ گیا۔ اس کے شک کے برخلاف اگر وہ لوگ جنگل کے اس خاص حصے کی طرف نہیں جاتے تو پھر یقیناً انہیں صحیح سلامت واپس آجانا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ واپس آنے کے بعد اظفر اپنی حکم عدولی پر اسے بُرا بھلا کہے اس لیے پوری جانفشانی سے ٹینٹ نصب کرنے کے بعد جیپ سے سامان نکال کر وہاں منتقل کرنے لگا۔

ادھر اظفر اور اس کے ساتھی ٹولیوں کی شکل میں آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں کچھ نہیں معلوم تھا کہ انہیں وہاں کس چیز کو تلاش کرنا ہے لیکن یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ اس جنگل میں جو بھی راز پوشیدہ ہے، اس کا تعلق جنگل کے اسی حصے سے ہے کیونکہ جب سے وہ لوگ یہاں آئے تھے، بہرام سے لے کر اس ڈرائیور تک نے انہیں جنگل کے اس حصے سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔ نہایت چابک دستی سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے وہ لوگ آگے بڑھتے رہے۔ انہوں نے دو مختلف ٹولیوں میں سفر کرنا اس لیے مناسب سمجھا تھا کہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ ایریا کا جائزہ لیا جا سکے۔ اظفر نے اپنے ساتھ آئے ہوئے وائلڈ لائف کے ماہر اور محقق پروفیسر صاحب کو اپنے ہمراہ رکھا تھا۔ پروفیسر صاحب نے تحقیق اور مطالعے کی غرض سے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ جنگلوں اور بیابانوں میں گزارا تھا اس لیے وہ خاصے چاق و چوبند تھے اور جنگل میں پیش آنے والے کسی خطرے سے نمٹنا بھی خوب جانتے تھے۔ لیکن اظفر انہیں اپنی ذاتی ذمے داری پر یہاں لایا تھا اس لیے انہیں اپنے ساتھ رکھ کر خود ان کی دیکھ بھال کرنا چاہتا تھا۔ چلتے چلتے وہ لوگ ایک مقام پر رک گئے۔ رکنے کا سبب نظر آنے والا کسی بڑے جانور کا ادھ کھایا ڈھانچا تھا۔ پروفیسر صاحب فوراً ہی اس ڈھانچے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

’’یہاں خون کی بُو محسوس ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ جانور حال ہی میں موت کا شکار ہوا ہے۔‘‘ انہوں نے نتھنے سکیڑ کر فضا کو سونگھا اور ڈھانچے کی طرف بڑھے۔ ڈھانچے کے قریب پہنچ کر انہوں نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر اس میں سے طاقتور ٹارچ نکال لی۔ دن کا وقت تھا اور سورج کی روشنی جنگل میں پہنچ رہی تھی لیکن گھنے درختوں کے پتوں سے چھن کر آنے والی یہ روشنی ناکافی تھی اس لیے انہیں ٹارچ روشن کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔

’’یہ بڑی جسامت والے ہرن کی لاش ہے جسے کئی جانوروں نے مل کر بھنبھوڑا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو نا کہ ڈھانچے کی ساری ہڈیاں سلامت نہیں ہیں اور کئی اِدھر اُدھر مختلف سمتوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق اس ہرن کو کل ہی شکار کیا گیا ہے کیونکہ ہڈیوں کے ساتھ لگے بچے کھچے گوشت میں ابھی تازگی باقی ہے۔‘‘ وہ ڈھانچے کا نہایت عمیق نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔ جائزہ لیتے لیتے وہ اس کے سر کی طرف متوجہ ہوئے تو بری طرح چونک گئے اور اظفر کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔ وہ بھی یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ ہرن کی کھوپڑی میں گولی کا سوراخ موجود ہے۔ یعنی درندوں کے دانتوں اور پنجوں کا نشانہ بننے سے قبل وہ بے چارہ ہرن کسی ظالم کی چلائی ہوئی گولی کا نشانہ بن کر موت سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ اگر شکار کرنے والا کوئی پیشہ ور شکاری ہوتا تو لاش کو درندوں کا نشانہ بننے کے لیے یہاں چھوڑ کر نہیں جاتا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ اس خوب صورت جانور کا سر اور کھال کسی طرح محفوظ کر لے اور ان کاموں سے فارغ ہو کر وہ ہرن کے لذیذ گوشت سے اپنی شکم پری کا بندوبست کرتا۔ لیکن یہاں ملنے والے آثار مختلف تھے۔ ہرن کا سر بھی موجود تھا اور لاش دیکھ کر یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ درندوں کے اس لاش پر دعوت اڑانے سے قبل اس سے کھال جدا نہیں کی گئی تھی۔

’’اس ہرن کو کتوں نے کھایا ہے۔‘‘ ہرن کی ڈھانچا نما لاش کا جائزہ مکمل کرنے کے بعد پروفیسر صاحب نے چند قدم اِدھر اُدھر چہل قدمی کرنے کے بعد اعلان کیا تو اظفر پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ایک ماہر تھے اور وہ ان کی کسی بھی رائے کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

’’میں نے لاش پر موجود دانتوں اور پنجوں کے نشان دیکھے ہیں اور اب اس فضلے کو دیکھ کر مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ اس ہرن پر کتوں نے دعوت اڑائی ہے۔‘‘ ان کی ٹارچ کی روشنی نے گھاس پھوس اور پتوں پر پڑے ہوئے فضلے کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ فضلے سے ٹارچ کی روشنی ہٹی تو اِدھر اُدھر گردش کرنے لگی اور وہ اس روشنی میں معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اظفر ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

’’میرا اندازہ ہے کہ ان کتوں کی تعداد تین یا پھر اس

سے بھی زیادہ تھی اور وہ اس سمت سے آکر واپس بھی اسی طرف چلے گئے تھے۔" انہوں نے اپنے ٹارچ والے ہاتھ کے ساتھ ساتھ دوسرے ہاتھ کو بھی حرکت دی اور سمت بتانے لگے۔ اظفر ان کی فراہم کردہ معلومات سن کر جوش میں آگیا۔ کتوں کی ضیافت کا نشانہ بنی ہرن کی لاش دیکھ کر اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ کوئی اہم کلیو تلاش کر چکا ہے اور اب اس کے لیے اس راز تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں جس تک پہنچنے کے لیے وہ یہاں آیا ہے۔ جوش اور جذبے سے بھرے ہوئے اظفر کے لیے کامیابی تک پہنچ جانے کا خیال بہت اہم تھا۔ وہ بنا سوچے سمجھے پروفیسر صاحب کی بتائی ہوئی سمت میں آگے بڑھنے لگا۔ خود پروفیسر صاحب اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر چند گز کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ایک اور ڈھانچا دیکھ کر چونک گئے۔ اس بار پروفیسر صاحب کے بتائے بغیر ہی اظفر نے جان لیا کہ اس جانور کو بھی گولی مار کر ہلاک کیا گیا ہے لیکن لاش کافی پرانی تھی کیونکہ وہاں خون کی بو سمیت ہڈیوں پر لگا گوشت بھی غائب تھا اور محسوس ہو رہا تھا کہ ڈھانچا اب گلنے سڑنے کے عمل سے گزر رہا ہے۔ بڑی محویت سے اس جائزے میں مصروف ان دونوں کو احساس ہی نہیں ہوا اور انجانی سمت سے آکر کوئی شے ان کے جسموں میں پیوست ہو گئی۔ انہوں نے اگر کچھ محسوس کیا تو صرف گردن کی پشت پر پن کی نوک جیسی چبھن اور پھر ہوش و خرد سے بیگانے ہو گئے۔ ان کے بے ہوش ہوتے ہی اطراف سے چند مسلح افراد برآمد ہوئے اور اطمینان کرنے لگے کہ وہ لوگ یقینی طور پر بے ہوش ہو گئے ہیں یا نہیں۔

"ان کے باقی دو ساتھی بھی مل جائیں تو سب کو ایک جگہ ڈال کر ہمارے دوستوں کی دعوت کا بندوبست کر دو۔ اپنا آج کا کھانا دیکھ کر وہ بہت خوش ہوں گے۔" اس دوران ہی ایک اور شخص نمودار ہوا اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"وہ دونوں بھی نظر میں آگئے ہیں صاحب! تھوڑی دیر میں وہ بھی یہیں ہوں گے۔ آپ ہمیں بس اتنا بتا دو کہ یہ کام جنگل کے کس حصے میں کرنا ہے؟" مسلح افراد میں سے ایک نے سینہ ٹھونک کر جواب دیا۔

"ان لوگوں کو جیپ سمیت اس طرف سے دور لے جانا اور خالقو سمیت سب کا کام تمام کر دینا۔" نووارد نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"خالقو کیوں صاحب؟ وہ تو اپنا بندہ ہے۔" حکم سننے والے حیران رہ گئے۔

"عقل سے کام لے مُغل! اگر خالقو کو چھوڑ دیا تو جو کچھ ہم کرنے جا رہے ہیں، اسے حادثہ کون کہے گا۔ ان کے پچھلے تو ہاتھ دھو کر بچ جانے کے لیے خالقو کے پیچھے لگ جائیں گے اور ایک نہ ایک دن وہ ہمیں مروا دے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم خود پہلے اسے ہی مروا دیں۔" اس نے نکتہ بیان کیا، وہ اعتراض کرنے والوں کے لیے قابل قبول تھا اس لیے پھر کسی نے کوئی سوال نہیں کیا اور انتظار کرنے لگے کہ اظفر کے باقی دونوں ساتھیوں کو بھی یہاں پہنچا دیا جائے۔ انہیں زیادہ دیر زحمت نہیں اٹھانی پڑی اور چار تنومند آدمی ان دونوں کے بے ہوش جسموں کو اٹھائے وہاں پہنچ گئے۔ چاروں مطلوبہ افراد ایک جگہ جمع ہو گئے تو آگے کی کارروائی کی جانے لگی۔ خالقو جیپ سمیت کہاں موجود ہے یہ انہیں بتا ہی دیا گیا تھا چنانچہ چاروں بے ہوش افراد کے علاوہ پانچ عدد کتوں سمیت اس جگہ تک پہنچنے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ کتے زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے اور چاروں بے ہوش افراد کی طرف دیکھ دیکھ کر اس طرح بھونک رہے تھے جیسے الجھن کا شکار ہوں کہ ان کا بھوجن سامنے ہوتے ہوئے بھی انہیں کھانے کے لیے کیوں نہیں دیا جا رہا۔

"خیمے اور سامان اٹھا کر واپس جیپ میں رکھ لے خالقو۔ ان کو یہاں سے دور لے جانے کا حکم ہے۔" کتوں کے ساتھ آنے والے مسلح افراد میں سے ایک نے جیپ ڈرائیور سے کہا تو وہ فوراً ہی حرکت میں آگیا۔ دو اور افراد بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔ جلد ہی سارا سامان دوبارہ جیپ میں منتقل ہو گیا اور وہ لوگ عازم سفر ہو گئے۔ سفر کا دورانیہ تقریباً پندرہ منٹ تھا۔ وہ لوگ پہلے کے مقابلے میں زیادہ گھنے جنگل میں پہنچ کر رک گئے اور بے ہوش افراد کو جیپ سے نکال کر نیچے ڈال دیا۔ خالقو اپنے بارے میں کیے گئے فیصلے سے بے خبر اس کام میں پیش پیش تھا۔ اس کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے اس بات کا اندازہ اسے اس وقت ہوا جب وہ ہدایت کے مطابق چاروں بے ہوش افراد کو مختلف پوزیشنز میں لٹاتے ہوئے تنہا رہ گیا اور اس کے ساتھیوں نے نہایت خاموشی سے اس سے الگ ہونے کے بعد خونخوار کتوں کو زنجیروں کی قید سے آزاد کر دیا۔ ایک گرانڈیل کتا برق رفتاری سے اس پر جھپٹا۔

"یہ کیا اوئے؟ اسے روکو۔" کتے کے وار سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے چیخ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"ہم اسے نہیں روک سکتے۔ اوپر سے فیصلہ ہوا ہے کہ آج تُو بھی ان کے بھوجن کا حصہ بنے گا۔" اسے نہایت

سرد مہری سے جواب دیا گیا۔ وہ سارے کے سارے ایسے ہی تھے۔ سدھائے ہوئے پالتو جانوروں کی طرح ان کی اپنی کوئی سوچ یا پسند ناپسند نہیں تھی۔ وہ بس وہ کرتے تھے جو انہیں کرنے کا حکم ملتا تھا۔ اس حکم کی زد میں ان کا اپنا کوئی ساتھی بھی آجائے تو انہیں کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ کتے کے پے در پے حملوں سے بچنے کی کوشش کرتا خالقو بار بار ان سے مدد اور رحم کی درخواست کر رہا تھا لیکن ان کے کان بند تھے۔ وہ نہایت سپاٹ انداز میں پانچ عدد جیتے جاگتے انسانوں کو خونخوار کتوں کے دانتوں اور پنجوں سے بھنبھوڑے جانے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کے لیے یہ منظر ڈیوٹی سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔ البتہ معصوم چرند پرند تھے جو کتوں کی وحشت ناک غراہٹوں اور دل دوز انسانی چیخوں سے گونجتے جنگل میں متوحش نظر آتے تھے اور بے قراری سے یوں اِدھر اُدھر دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے جیسے کسی طرح اس ظلم کو روکنے کی تدبیر سوچ رہے ہوں۔ وہ تدبیر تو کیا خاک کر پاتے البتہ کتوں کے شکم سیر ہونے کے بعد یہ وحشت ناک شور خود ہی ختم ہو گیا اور آہستہ آہستہ سب معمول پر آنے لگا۔ بپھرے ہوئے کتے بھی حلق تک ٹھونس کر کھا لینے کے بعد سست پڑ کر اپنے رکھوالوں کے پاس واپس پہنچ گئے جنہوں نے ایک بار پھر انہیں زنجیروں میں قید کر دیا اور واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ادھر بہرام کو یہاں کی پل پل کی خبر دی جا رہی تھی۔ اظفر اور اس کے ساتھیوں کی ہلاکت کی خبر بھی فوراً اس تک پہنچ گئی اور وہ یوں اطمینان سے ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا جیسے کوئی اہم فریضہ انجام دیا ہو۔ اپنے طور پر واقعی اس نے اپنا فرض ادا کیا تھا۔ یہ اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا کہ لوگوں کو جنگل کے اس مخصوص حصے تک نہ پہنچنے دے جہاں افیون کے کھیت موجود ہیں۔ اگر اظفر اور اس کے ساتھی اس جگہ سے دور رہتے تو اس سمیت چودھری کے دیگر وفاداروں کو کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن ان لوگوں نے اسے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی اور کسی اور جگہ جانے کا بتا کر اچانک ہی راستہ بدل کر ممنوعہ حصے کی طرف نکل گئے تھے جس کی سزا انہیں دردناک موت کی صورت میں دی جا چکی تھی۔

اس کام کے نمٹ جانے کے بعد بہرام کئی گھنٹوں کے لیے فارغ تھا۔ اظفر نے پہلے ہی اسے سمجھا دیا تھا کہ اگر وہ لوگ مقررہ وقت پر واپس نہ آسکیں تو دو گھنٹے کے مزید انتظار کے بعد ان کی تلاش شروع کر دی جائے۔ اس حساب سے بہرام کے پاس خاصا وقت تھا۔ اس نے یہ وقت نہایت اطمینان سے گزارا۔ اسے فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی کہ اس عرصے میں ان پانچوں لاشوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کتوں کے بعد اگر کچھ اور جنگلی جانور بھی ان لاشوں سے مستفید ہو جاتے تو یہ اس کے حق میں اور بھی زیادہ بہتر ہوتا۔ شام ڈھلے اس نے اظفر کی ہدایت کے مطابق نئے اے سی عمیر آفندی سے موبائل کی مدد سے رابطہ کیا۔ پیر آباد میں شہریار کے دور میں ہونے والے ترقیاتی کاموں کے نتیجے میں اتنی سہولت ہو گئی تھی کہ موبائل کے سگنلز ڈاک بنگلے سمیت جنگل کے کچھ حصے تک مل جاتے تھے اور موبائل سے استفادہ کیا جا سکتا تھا۔

"ہاں بہرام، کیا مسئلہ ہے؟" پی اے کی طرف سے بہرام کی کال کی اطلاع سن کر عمیر فوراً ہی لائن پر آگیا اور تشویش زدہ لہجے میں دریافت کیا۔ اظفر رشتے میں اس کا کزن لگتا تھا اور اس نے ذاتی طور پر اس سے رابطہ کر کے اس وزٹ کے لیے اجازت نامے کی درخواست کی تھی لیکن بہر حال عمیر جانتا تھا کہ یہ کوئی نجی نوعیت کا دورہ نہیں ہے اور اظفر کسی خفیہ ایجنسی کے لیے کام کر رہا ہے۔ یقینی طور پر یہ کام حساس نوعیت کا تھا اور ایسے کاموں میں خطرہ بھی ہوتا ہے اس لیے بہرام کی کال موصول ہوتے ہی وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

"مسئلہ بڑا سنجیدہ ہے سر جی! وہ جو آپ کے بھائی شہر سے آئے تھے، جنگل میں کچھ تحقیق شحقیق کرنے کے لیے۔ ان کا اور ان کے ساتھیوں کا کچھ اتا پتا نہیں ہے۔ ساتھ میں میرا بندہ جو ان کی جیپ چلا رہا تھا، وہ بھی غائب ہے۔" بہرام نے اسے اطلاع دی۔

"تو تم کیا کر رہے ہو؟ مجھے اطلاع دینے سے کیا ہوگا؟ فوراً کوئی سرچ پارٹی تیار کر کے جنگل میں بھیجو۔ اتنا وقت ہو گیا ہے اگر وہ لوگ راستہ بھٹک گئے ہیں تو رات کے وقت انہیں وہاں زیادہ پریشانی ہوگی۔" اس کے اندیشوں کے مطابق بہرام سے ملنے والی خبر واقعی بُری اور تشویش ناک تھی جسے سنتے ہی وہ بہرام پر برسنے لگا۔

"پارٹی تو تیار ہے سر جی ہور وہ لوگ بس نکل ہی رہے ہیں۔ میں نے آپ کو اطلاع اس لیے دی ہے کہ اظفر باؤ جاتے وقت کہہ کر گئے تھے کہ اگر وہ ٹیم گزرنے کے دو گھنٹے بعد بھی واپس نہ آئیں تو آپ کو خبر کر دی جائے۔ ویسے بھی مجھے لگتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میرا جو بندہ ان کے ساتھ گیا تھا اس کے پاس واکی ٹاکی تھا۔ میں بہت دیر سے اس سے گل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں

www.paksociety.com

لیکن وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ حالانکہ اگر بندہ جنگل میں بھٹک جائے تو خود سب سے پہلے واکی ٹاکی پر رابطہ کرکے خبر دیتا ہے کہ وہ مشکل میں ہے۔‘‘ بہرام کے جواب نے حالات کی سنگینی کو کچھ اور بھی بڑھا دیا لیکن عمیر امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا چنانچہ آس بھرے لہجے میں بولا۔

’’ہوسکتا ہے واکی ٹاکی خراب ہوگیا ہو یا پھر رینج کا مسئلہ ہو۔‘‘

’’ہاں جی ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ہمیں تو ہر چنگی بری گل دماغ میں رکھ کر انہیں تلاش کرنا ہوگا۔ اب آپ اجازت دیں تو میں ادھر کی کارروائی دیکھوں۔‘‘ بہرام نے سرسری سا جواب دے کر فون بند کرنے کی اجازت چاہی۔

’’ہاں، ٹھیک ہے تم اپنا کام کرو..... لیکن نہیں، ذرا سنو..... ایسا کرو کہ دو چار بندوں پر مشتمل ایک سرچ پارٹی اپنے پیچھے چھوڑ جاؤ۔ میں اپنے ایک بندے کے ساتھ خود وہاں پہنچتا ہوں۔ اس پارٹی کو میں اپنے ساتھ رکھوں گا۔‘‘ اس نے اچانک ہی خود اس کام میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

’’جیسی آپ کی مرضی سر! لیکن آپ کا خاصا ٹیم لگ جائے گا۔ ہوسکتا ہے جتنی دیر میں آپ ڈاک بنگلے پہنچیں، ہم اپنا کام مکمل کرکے واپس بھی آجائیں۔‘‘ بہرام نے اسے احساس دلایا کہ وہ کتنی دور موجود ہے۔

’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن مجھے عجیب سی بے چینی ہو رہی ہے اور میرا دل کہہ رہا ہے کہ اس وقت مجھے وہاں ہونا چاہیے۔ اگر میرے پہنچنے سے پہلے تم اظفر اور اس کے ساتھیوں کو تلاش کرکے لانے میں کامیاب ہوگئے تو یہ اور بھی اچھا ہوگا۔ میں کچھ دیر کے لیے اس سے ملاقات کرکے واپس آجاؤں گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے سر جی! میں اپنے پیچھے چار بندے چھوڑ جاتا ہوں۔ اگر آپ کے پہنچنے تک میں اپنی ٹیم کے ساتھ واپس نہ آؤں تو آپ ان لوگوں کے ساتھ چل پڑنا، باقی آگے اللہ مالک ہے۔‘‘ بہرام نے مکاری سے اسے جواب دیا جبکہ اس کے اپنے ذہن میں اب کوئی اور منصوبہ پل رہا تھا۔ اظفر سمیت ان سب کے انجام سے تو وہ واقف ہی تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ان کی لاشیں اسے جنگل کے کس حصے سے ملیں گی لیکن اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ خود یہ لاشیں دریافت کرنے کے بجائے ان کی دریافت کا سہرا عمیر کے سر رہے تو زیادہ بہتر ہے۔

ادھر عمیر نے مشابرم خان کو بلا کر صورتِ حال سے آگاہ کرکے گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ مشابرم خان شروع ہی سے ذمے دار اور فرض شناس آدمی تھا اس لیے گاڑی کو ہمیشہ بہترین حالت میں رکھتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے صرف احتیاطاً گاڑی کا تیل پانی چیک کیا اور وہ لوگ عجلت میں وہاں سے روانہ ہوگئے۔ شام تو پہلے ہی ڈھل چکی تھی، مشابرم خان کی تیز رفتاری کے باوجود انہیں ڈاک بنگلے تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا پوری طرح پھیل گیا۔ بہرام بنگلے پر موجود نہیں تھا البتہ چار افراد ساز و سامان کے ساتھ تیار ان کے منتظر تھے۔

’’نہیں صاحب! کوئی پتا نہیں ملا۔ بہرام ساتھیوں کے ساتھ تلاش میں گیا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے واکی ٹاکی پر اس سے بات ہوئی تھی۔ وہ لوگ کوشش کررہے ہیں لیکن کچھ پتا نہیں چل رہا۔‘‘ عمیر کے استفسار پر ایک آدمی نے اسے تازہ حالات سے آگاہ کیا تو اس کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔

’’ہم لوگ آپ کا ہی انتظار کررہے تھے۔ بہرام اور اس کے ساتھی جدھر گئے ہیں، ہم اس سے ہٹ کر دوسرے علاقے میں اظفر صاحب لوگوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔‘‘ عمیر کو خاموش پاکر وہ آدمی ایک بار پھر بولا تو وہ بھی فوراً متحرک ہوگیا کہ یہاں کھڑے ہوکر پریشان ہونے سے تو کچھ بھی حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ جو لوگ جنگل میں لاپتا ہوئے تھے، انہیں ڈھونڈنے کے لیے جنگل میں داخل ہونا ضروری تھا۔ ذرا دیر میں ہی ان کا سفر دوبارہ شروع ہوگیا لیکن اس بار وہ اپنی گاڑی کے بجائے محکمۂ جنگلات کی جیپ میں سفر کررہے تھے۔ ان لوگوں کے پاس طاقتور سرچ لائٹیں اور بڑی ٹارچیں موجود تھیں جس کی روشنی میں وہ اردگرد کا جائزہ لے سکتے تھے۔ جنگل کی دنیا میں اس بے وقت کی انسانی مداخلت نے وہاں موجود مخلوق کو بے چین کردیا تھا اور روشنی میں وہ اِدھر اُدھر بھاگتے نظر آرہے تھے۔ مختلف جانوروں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں اور باوجود یہ کہ وہ تعداد میں کئی تھے اور ان کے پاس مناسب اسلحے کے ساتھ ساتھ روشنی کا بھی معقول انتظام تھا، خود کو جنگل کی ہولناکی سے بے نیاز محسوس کرنا ممکن نہیں تھا۔ رات ہوجانے کے باوجود جنگل مکمل طور پر سویا ہوا نہیں تھا۔ شب پسند جانوروں کی آوازوں سے اندازہ ہورہا تھا کہ جنگل کے مکین اپنی راجدھانی میں بیدار ہیں اور انہیں اپنے گھر میں بیرونی مداخلت اچھی نہیں لگ رہی۔ کئی سوئے ہوئے جانور بھی

جاگ گئے تھے اور اپنی اپنی بولیوں میں احتجاج کررہے تھے۔ اس ہولناک ماحول کے باوجود وہ لوگ واپس جانے کا نہیں سوچ سکتے تھے۔ انہیں جنگل کی ہولناکیوں میں کھو جانے والے اپنے ساتھیوں کو تلاش کرنا تھا۔

’’وہ دیکھو..... ادھر..... ادھر کچھ ہے۔‘‘ جیپ درمیانی رفتار سے آگے بڑھی جارہی تھی کہ ایک آدمی ہاتھ سے اشارہ کرتا ہوا چیخا۔ سب کے سب اس طرف متوجہ ہوگئے اور روشنیوں کا رخ اس طرف کردیا۔ روشنی پڑتے ہی تین چار جانور وہاں سے نکل کر بھاگے۔ ڈرائیور جیپ روک چکا تھا۔ وہ سب تیزی سے جیپ سے نیچے کودے۔ منظر ہولناک تھا۔ اترتے ہی دو ادھڑی ہوئی لاشیں انہیں نظر آگئی تھیں۔ عمیر نے فوراً ہی ان لاشوں کو اظفر اور اس کے ساتھی پروفیسر کے طور پر شناخت کرلیا۔ اس کے جائزہ لینے کے دوران باقی لوگ اِدھر اُدھر پھیل چکے تھے۔ باقی تین افراد کو بھی جلد ہی تلاش کرلیا گیا۔ زمین پر نصب خیمے اور وہاں موجود ان کی جیپ کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ جنگل میں پہنچتے ہی تھوڑی دیر بعد ان کے ساتھ حادثہ پیش آگیا تھا۔ لاشوں کی ادھڑی ہوئی حالت دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ وہ اچانک درندوں کے کسی غول کے نرغے میں آگئے تھے اور انہیں اپنے بچاؤ کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔

’’کیا یہاں خونخوار درندے بھی پائے جاتے ہیں؟‘‘ عمیر نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ سوال کیا۔

’’یہاں بھیڑیے اور خونخوار کتے موجود ہیں لیکن وہ عام طور پر دن کی روشنی میں اپنے ٹھکانوں سے نکل کر شکار نہیں کرتے اور ان لاشوں کی حالت دیکھ کر صاف لگ رہا ہے کہ ان کے ساتھ کئی گھنٹے پہلے حادثہ پیش آیا تھا۔‘‘ وہ آدمی جو شروع سے ان کے ساتھ گفتگو کررہا تھا بتانے لگا۔ یہاں پہنچتے ہی وہ بہرام کو واکی ٹاکی پر واقعے کی اطلاع دینے کے ساتھ اپنی لوکیشن سے آگاہ کرچکا تھا اور اب اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

’’یہ بندہ مرا نہیں ہے سر..... ابھی اس کی سانس باقی ہے۔‘‘ مشابرم خان جو کہ عملے کے افراد کے ساتھ لاشوں کو ایک جگہ اکٹھا... کرنے کے کام میں ازخود شامل ہوچکا تھا، اظفر کے ساتھ آنے والے ڈرائیور پر جھکا ہوا چیخا۔ اس کی آواز پر عمیر اور دوسرے لوگ تیزی سے اس طرف بھاگے۔ ڈرائیور خالقو کا جسم بری طرح زخمی تھا۔ ہاتھ پیروں اور جسم کے دوسرے کئی مقامات پر سے گوشت بالکل غائب تھا اور ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔ یہاں تک کہ اس کی ایک آنکھ کا ڈیلا بھی باہر آچکا تھا لیکن اس ہیئت کذائی کے باوجود یہ حقیقت تھی کہ اس کی سانس چل رہی تھی۔ سانس کی یہ لے بے حد مدھم تھی اور لگتا تھا کہ کسی بھی وقت ڈوب جائے گی لیکن ان پانچ افراد میں سے اس واحد شخص میں زندگی کی رمق پاکر وہ لوگ جوش میں آگئے۔

’’اسے جیپ میں ڈالو خان! اسے فوری طبی امداد ملنی ضروری ہے۔‘‘ عمیر نے چلا کر مشابرم خان کو حکم دیا جس نے اس کے حکم کی تعمیل میں لمحہ بھی نہیں لگایا۔

’’تم لوگ یہاں رک کر بہرام کا انتظار کرو۔ میں ڈرائیور کے ساتھ اس بندے کو لے جارہا ہوں۔ تم لوگ ڈیڈ باڈیز لے کر بہرام کے ساتھ آجانا۔‘‘ عمیر نے کسی کو کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر خود ہی فیصلہ سنایا اور جیپ کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ جیپ ڈرائیور کو بھی پھرتی دکھانی پڑی۔ پیچھے مشابرم خان نیم جان خالقو کو سنبھالے بیٹھا تھا۔

’’تمہاری جیپ میں فرسٹ ایڈ باکس تو ہوگا؟‘‘ جیپ آگے بڑھی ہی تھی کہ عمیر نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔

’’یس سر! پیچھے والی سیٹ کے نیچے ہے۔‘‘ اس نے فوراً جواب دیا۔ عمیر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی مشابرم خان نے سیٹ کے نیچے سے فرسٹ ایڈ باکس نکال لیا لیکن اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس قدر زخمی آدمی کو کس طرح طبی امداد دے۔ اس کا پور پور زخمی تھا اور یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ مرہم پٹی کا کام کہاں سے شروع کیا جائے۔ آخر اس نے ہمت کرکے اس کی نہایت بھیانک محسوس ہونے والی آنکھ کے ڈیلے پر دوا میں ڈوبا روئی کا پھایا رکھ کر پٹی باندھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کام کا آغاز کردیا۔ عمیر بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے اگلی نشست کو پھلانگ کر پیچھے چلا آیا۔ سب سے پہلے اس نے زخمی خالقو کی نبض چیک کی۔ نبض بہت سست رفتاری سے چل رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے اس کا زندگی سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ عمیر نے بے تابی سے فرسٹ ایڈ باکس کا جائزہ لیا اور ایک ننھی سی شیشی پر لگا لیبل پڑھنے کے بعد اس کا سرا توڑ کر سرنج میں محلول کو بھرا۔ چلتی گاڑی اور اس کی محدود روشنی میں یہ کام کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ لیکن ایک انسانی زندگی کو بچانے کی لگن ان دونوں کے ہاتھوں کو حرکت دے رہی تھی۔ اس کے زخمی بازو میں دوا انجیکٹ کرتے ہی فوری ردعمل ظاہر ہوا اور اس کی سانس کی رفتار یکدم بڑھ گئی لیکن انداز ایسا تھا جیسے کوئی چراغ بجھنے سے پہلے پھڑپھڑا رہا ہو۔

’’اس کے منہ میں پانی ڈالو خان۔‘‘ اس نے مشابرم

www.paksociety.com

خان کو حکم دیا تو اس نے فوراً ہی پانی کی بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ مشکل سے چند قطرے پانی ہی نیم جان خالقو کے حلق سے نیچے اتر سکا۔ باقی دونوں طرف کی باچھوں سے بہہ گیا لیکن چند قطرے پانی نے ہی خاصا کام دکھایا اور خالقو کی باقی بچ جانے والی اکلوتی آنکھ کے پپوٹے میں حرکت محسوس ہونے لگی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آنکھ کھولنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن اس کوشش میں کامیاب نہ ہو پا رہا ہو۔

"آنکھ کھولو مین! دیکھو تم محفوظ جگہ پر ہو۔ ہمیں بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟" اس کے رخسار پر ہاتھ مارتے ہوئے عمیر دیوانہ وار اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا لیکن خالقو کی آنکھ نہ کھل سکی۔ بس ہونٹوں نے یوں جنبش کی جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہو لیکن اس کے جسم میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ آواز باہر نکل سکتی۔ عمیر نے اپنا کان اس کے ہونٹوں کے ساتھ بالکل چپکا لیا۔

"چو..... چودھ...... ری..... اف.... اف.... یون۔" بہت ہی دھیمی سرگوشی میں یہ چند ٹوٹے ہوئے لفظ اس کی سماعتوں سے ٹکرائے اور پھر فوراً ہی خالقو کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ جھٹکے کے ساتھ ہی اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ عمیر کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح اس کے بے جان وجود میں زندگی کی رمق کو محسوس کر سکے لیکن وہاں نہ تو دھڑکن تھی، نہ سانسوں کی سرسراہٹ۔ زندگی کا احساس دلانے والی نبض بھی مکمل طور پر ڈوب چکی تھی۔

"افسوس، یہ بھی نہیں رہا۔" عمیر پیچھے ہٹ گیا۔ اس شخص کی زندگی بچانے کی خواہش میں وہ اپنے کزن اظفر کی لاش کو نظرانداز کر کے آ گیا تھا لیکن پھر بھی اسے بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ خالقو کی لاش کو تھامے بیٹھے مشابرم خان نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی ہیں۔ آنکھوں کا یہ رنگ دیکھ کر اسے شہریار کی یاد آئی۔ ایسے کسی موقع پر وہ بھی انہی کیفیات کا شکار نظر آتا تھا۔

"اب کیا کرنا ہے سر؟" پیچھے کان لگائے بیٹھے ڈرائیور کی آواز نے در آنے والے خاموشی کے وقفے کو توڑا۔

"ڈاک بنگلے چلو۔ پیچھے واپس جانا بیکار ہے۔" عمیر نے اسے جواب دیا۔ حقیقتاً اس وقت وہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ مرتے ہوئے خالقو نے جو آخری دو الفاظ ادا کیے تھے، وہ بہت اہم تھے اور اسے یقین تھا کہ ان الفاظ کو ڈرائیور نے تو کیا اس کے قریب بیٹھے مشابرم خان نے بھی نہیں سنا ہوگا۔

ادھر ڈرائیور اس کا جواب سننے کے بعد وائرلیس پر مصروف ہو گیا۔ پہلے اس نے بہرام کو خالقو کی موت کی خبر سنائی پھر بنگلے پر موجود عملے کے کسی فرد کو آگاہ کرنے لگا کہ وہ لوگ واپس آ رہے ہیں اور ان کے ساتھ لاش موجود ہے۔ اس موقع پر عمیر اور مشابرم خان بالکل خاموش تھے۔ اسی خاموشی کے ساتھ انہوں نے واپسی کا سفر مکمل کیا۔ وہ لوگ بنگلے پر پہنچے تو وہاں پہلے ہی دو آدمی مستعد تھے۔ انہوں نے فوراً ہی خالقو کی لاش جیپ سے اتار کر ایک طرف رکھی اور اسے ایک چادر سے ڈھانپ دیا۔

"آپ اندر چل کر بیٹھیں سر! بہرام وغیرہ باقی لاشوں کو لے کر واپس آ جائیں تو پھر دیکھتے ہیں آگے کیا کرنا ہے۔" ڈرائیور نے عمیر سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے فوراً ہی یہ تجویز قبول کر لی اور مشابرم خان کو مخاطب کر کے بولا۔ "آؤ خان! اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔" مشابرم خان نے خاموشی سے اس کی بات پر عمل کیا۔

"اس حادثے کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" دونوں کے نشستیں سنبھال لینے کے بعد عمیر نے دھیمی آواز میں اس سے دریافت کیا۔

"مجھے لگتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی ہے۔" مشابرم خان نے فوراً ہی اسے اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

"کیوں..... تم کس بنیاد پر ایسا کہہ رہے ہو؟" عمیر نے اضطراب سے پوچھا۔

"اپنے مشاہدے کی بنیاد پر۔ مرنے والے پانچوں افراد مسلح تھے اور ان کی بہادری اور پھرتی کے بارے میں بھی مجھے کوئی شبہ نہیں ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ جائے وقوعہ پر کہیں بھی مزاحمت کے آثار نظر نہیں آئے۔ پانچوں میں سے کسی نے بھی اپنا بارودی اسلحہ استعمال کیا، نہ ہی وہ خنجر جو اب بھی ان کی پنڈلیوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ اگر ہم مان لیں کہ ان پر اچانک افتاد ٹوٹی تھی پھر بھی یہ بات بہت غیرفطری لگتی ہے کہ پانچ مسلح افراد میں سے کسی کو بھی اپنے اسلحے کو استعمال کرنے کا خیال نہیں آیا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ خطرہ ان کے لیے کوئی غیرمعمولی چیز نہیں تھی اور جنگل میں داخل ہوتے وقت تو انہیں لازماً ذہنی طور پر کسی بھی بُرے وقت کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔" مشابرم خان نے بلاجھجک اپنا مدلل تجزیہ پیش کر دیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، یہ واقعی قتل ہے۔ بالکل ویسا

www.paksociety.com

ہی قتل جس طرح پہلے شہزادی کو ہلاک کیا گیا تھا اور اس کی موت کو حادثاتی رنگ دے دیا گیا تھا۔ شاید وہ بھی ایسے کسی راز سے واقف ہو گئی تھی جس کی تلاش میں یہ چاروں یہاں آئے تھے۔ لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ ان کا اپنا ساتھی کیسے مارا گیا؟" عمیر نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی الجھن بیان کی۔ وہ دونوں نہایت دھیمی آواز میں اور احتیاط سے گفتگو کر رہے تھے تاکہ کوئی اور ان کی آواز نہ سن سکے۔

"دو باتیں ہو سکتی ہیں، یا تو خالقو غیراہم اور ناواقف بندہ تھا یا پھر انہوں نے ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے اپنے ہی ساتھی کو بلی چڑھا دیا ہے۔" مشابرم خان کے پاس جواب موجود تھا جس سے عمیر نے بھی اتفاق کیا۔ اسی وقت انہوں نے بنگلے کے احاطے میں گاڑیاں رکنے کی آوازیں سنیں۔

"شاید وہ لوگ واپس آ گئے ہیں۔" عمیر بےقراری سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ مشابرم خان نے اس کی پیروی کی اور وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے باہر پہنچے۔ باہر لاشیں اتاری جا رہی تھیں۔ ایسی لاشیں جن کی حالت دیکھ کر کوئی بھی انسان بشرطیکہ اس کے دل میں انسانیت کی رمق باقی ہو، دکھ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اور عمیر کا تو اظفر سے خونی رشتہ تھا، اس نے اپنے دل میں دکھ کی ایسی انی اترتی محسوس کی جس کا زخم روح تک میں اتر گیا۔

☆☆☆

"ہمیں نواب نوازش علی سے ملنا ہے۔" وہ دو سادہ پوش تھے جن کا ہیئر اسٹائل اور باڈی لینگویج ان کے یونیفارم میں نہ ہونے کے باوجود اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ وہ قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے سے تعلق رکھتے ہیں۔ گیٹ پر موجود چوکیدار خواجہ سرا ان دونوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ پہلے ہی رنجنی کے غیاب سے کوٹھی کی فضا خاصی کشیدہ تھی۔ آشا نے اس کی جان کھا لی تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے رنجنی کوٹھی سے کیسے غائب ہوئی۔ اس نے قسمیں کھا کھا کر آشا کو یقین دلایا تھا کہ وہ ساری رات نہایت چابک دستی سے اپنی ڈیوٹی انجام دیتا رہا ہے اور پوری رات کے دوران کسی انسان کا تو کیا..... اک چڑیا کا بچہ بھی کوٹھی سے باہر نہیں گیا لیکن آشا نے پھر بھی اسے نہیں بخشا تھا اور یہی کہتی رہی تھی کہ وہ غفلت کا مرتکب ہوا ہے۔ ان مخدوش حالات میں سادہ لباس پولیس والوں کا نواب صاحب سے ملنے کے لیے آنا خاصا معنی خیز تھا۔

"نواب صاحب تو تشریف نہیں رکھتے۔ آپ لوگ اپنا کارڈ وغیرہ دے جائیں۔ وہ آئیں گے تو انہیں آگاہ کر دیا جائے گا۔" اس نے جان بوجھ کر آنے والوں کی پہچان سے تغافل برتتے ہوئے جواب دیا۔ ویسے بھی آج کے لیے آشا کی یہی ہدایت تھی کہ آنے والے ہر ملاقاتی کو باہر سے ہی ٹال دیا جائے۔ کوٹھی میں ان خواجہ سراؤں کا اتنا اثر رسوخ تھا کہ نواب صاحب کے منیجر کو بھی بلا اجازت انیکسی سے نکل کر کوٹھی کا رخ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

"نواب صاحب کہاں گئے ہیں؟" آنے والوں نے اس کا جواب سنا تو ضرور لیکن عمل کرنے کے بجائے سخت لہجے میں سوال داغ دیا۔

"مالک کے معاملوں کی نوکر کو بھلا کیا خبر۔ وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ جب چاہیں، جہاں چاہیں جائیں اور جب چاہیں واپس آئیں۔ ہم غریبوں کو ان سے سوال کرنے کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے۔"

اس نے بڑا سیاسی سا جواب دے کر ایک طرح سے واضح کر دیا کہ اگلا کوئی سوال بھی بیکار ہے اور وہ انہیں اپنے مالک کی مصروفیات سے قطعی آگاہ نہیں کر سکتا۔

"ٹھیک ہے، نواب صاحب موجود نہیں بھی ہیں تو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے پاس کوٹھی کا سرچ وارنٹ موجود ہے اور ہم یہاں کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔" آنے والوں نے یہ ظاہر کیے بغیر کہ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے کوٹھی کو زیرنگرانی رکھے ہوئے ہیں اور جانتے ہیں کہ نواب صاحب کوٹھی سے باہر نہیں نکلے، اسے اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا۔

"شما چاہتی ہوں صاحب! نواب صاحب کی غیر موجودگی میں کسی کو کوٹھی میں آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

"تم سے اجازت مانگ کون رہا ہے؟ ہم صرف قانون کی اجازت لیتے ہیں اور قانون نے ہمیں یہ اجازت دے دی ہے۔" اس کا جواب سن کر آنے والوں کا غصہ کئی گنا بڑھ گیا اور انہوں نے ترشی سے جواب دیتے ہوئے اس پر اپنی پوزیشن واضح کی۔ پھر ان میں سے ایک نے فضا میں ہاتھ بلند کر کے ایک خاص قسم کا اشارہ کیا تو جانے کن کونے کھدروں میں چھپے مسلح افراد سامنے آ گئے۔ ان مسلح افراد کو دیکھ کر چوکیدار کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"ایک منٹ رکیں صاحب! میں اندر سے منیجر کو بلواتی ہوں۔" چوکیدار خواجہ سرا کی گھبراہٹ لازمی تھی۔ وہ اس کوٹھی کے رازوں سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ پولیس نے

اگر کوٹھی کے اندر سرچ آپریشن کیا تو نہ صرف نواب صاحب کو دریافت کرلے گی بلکہ اسلحے کا وہ ذخیرہ بھی نظروں میں آجائے گا جسے نواب صاحب کی لاعلمی میں کوٹھی کے تہ خانے میں رکھا گیا ہے۔

''ٹھیک ہے بلواؤ منیجر کو..... دیکھتے ہیں وہ کتنا طرم خان ہے اور ہمیں کیسے روکتا ہے۔'' وہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ چوکیدار تاخیری حربے آزما کر کسی طرح انہیں سرچ آپریشن سے روکنا چاہتا ہے لیکن ان کی تیاری بھی مکمل تھی اور انہوں نے کوٹھی کے اطراف میں اتنا زبردست محاصرہ کر رکھا تھا کہ کسی کا بھی یہاں سے بچ کر بھاگ نکلنا مشکل تھا۔

''آشا دیدی! منیجر صاحب کو باہر بھیج دیں۔ باہر پولیس والے آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے پاس کوٹھی کی تلاشی کا وارنٹ موجود ہے۔'' منیجر کو بلوانے کا تو محض بہانہ تھا، اصل میں اسے اندر کی کمانڈ سنبھالے بیٹھی آشا کو آگاہ کرنا تھا اس لیے بجائے منیجر سے براہِ راست رابطہ کرنے کے آشا کو انٹرکام پر اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے، انہیں انتظار کرواؤ۔ منیجر ابھی آتا ہے۔'' آشا نے گمبھیر لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔ کئی منٹ کے انتظار کے بعد سن رسیدہ منحنی سا منیجر ہانپتا کانپتا گیٹ پر نمودار ہوا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں سر! آپ نواب نوازش علی کی کوٹھی کی تلاشی لینا چاہتے ہیں؟'' اس نے نہایت حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آنے والوں سے دریافت کیا، یہ اور بات کہ اس کی حیرت کے اظہار پر چہرے پر چھایا ہوا خوف غالب تھا۔

''اگر یقین نہیں آتا تو یہ وارنٹ دیکھ لو۔'' آفیسر نے اس کی طرف وہ وارنٹ بڑھایا جس کو چوکیدار نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ منیجر نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر غور سے پڑھا۔

''سرکاری حکم سے انکار نہیں سر لیکن ذرا سوچیں کہ اگر مسلح افراد نے کوٹھی کی تلاشی لی تو نواب صاحب کی عزت ملیامیٹ ہو جائے گی۔ لوگ کیا کہیں گے کہ نواب نوازش علی کی کوٹھی پر پولیس نے ریڈ کیا ہے۔ آپ کو ان پر جو بھی شبہ ہے، وہ غلط ہے۔ نواب صاحب ایک امن پسند شہری ہیں اس لیے میری آپ سے درخواست ہے کہ ان کی عزت کا خیال کریں اور اگر یہ معاملہ کسی اور طرح سیٹل ہو سکتا ہے تو بتائیں، ہم آپ کی ہر طرح کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔'' منیجر نہایت عاجزانہ لہجے میں بات کر رہا تھا لیکن اس کی اس عاجزی کا جواب بڑی سختی سے دیا گیا۔

''ہمیں لالچ دیتا ہے بڈھے! وہ اور لوگ ہوں گے جو چند ٹکوں کی خاطر اپنا ایمان بیچ دیتے ہوں گے۔ ہم جس کام کی تنخواہ لیتے ہیں اسے پورا کرتے ہیں' تیرے جیسوں کے بہکانے پر سیٹل منٹ کرنے نہیں بیٹھ جاتے۔ تو اپنے عیاش نواب کی عزت کی کیا بات کرتا ہے۔ اس کوٹھی میں زنخوں کی فوج بھرتی کر کے اس نے بہت عزت کمائی ہے جو ہمارے ریڈ کرنے سے خراب ہو جائے گی۔'' ان میں سے ایک نے سخت طیش میں آکر منیجر کی پتلی سی گردن کو دبوچ لیا۔ منحنی سا منیجر اس کے تیور دیکھ کر بری طرح کانپنے لگا۔

''اسے موبائل میں ڈلواؤ۔ اب ان لوگوں سے کوئی بات کرنا بیکار ہے، ہمیں زبردستی کوٹھی کے اندر گھسنا ہوگا۔'' دوسرے افسر نے مشورہ دیا تو پہلے والے نے منیجر کو اپنی پشت پر کھڑے سپاہی کی طرف دھکیل دیا۔ اسی وقت کوٹھی کی طرف سے ایک ہوائی فائر ہوا۔ ردعمل میں فوراً ہی سپاہیوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں اور دونوں افسران نے بھی بغلی ہولسٹر میں موجود خوفناک گنیں کھینچ لیں لیکن پھر بھی ان سے ذرا سی چوک ہو گئی تھی اور منیجر سے نمٹنے کے دوران چوکیدار نے برق رفتاری سے اندر گھس کر گیٹ بند کر لیا تھا۔

''بہتر ہے کہ تم لوگ یہاں سے دور ہٹ جاؤ۔ ہم اپنی جان پر کھیل جائیں گے لیکن کسی کو کوٹھی کے اندر داخل ہونے نہیں دیں گے۔'' فائر کی آواز معدوم ہوتے ہی اندر سے کسی نے چیخ کر کہا۔

''قانون کے مقابل آکر تم لوگ اپنے لیے مشکلات کھڑی کر رہے ہو۔ کوٹھی پوری طرح محاصرے میں ہے اور ہماری نظروں میں آئے بغیر چڑیا کا بچہ بھی باہر نہیں نکل سکتا۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ہمیں اندر آنے کا راستہ دے دو۔ ہم اپنا کام بغیر خون خرابے کے خاموشی سے کرنا چاہتے ہیں۔'' ادھر سے جواب دیا گیا۔

''خون خرابا اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تم لوگ کوٹھی کے آس پاس سے محاصرہ ختم نہ کرو اور ہمیں یہاں سے محفوظ طریقے سے نکلنے سے روکو۔ ہمارے لیے جان دینا اور لینا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر تم نے ہماری بات نہیں مانی تو نواب نوازش علی اور اس کی فیملی بے موت ماری جائے گی۔ اپنی بات نہ ماننے کی صورت میں ہم انہیں ایک ایک کر کے ہلاک کر دیں گے۔'' اندر سے مزید جارحانہ لہجے میں دھمکی دی گئی۔

''ہم اس دھمکی میں آنے والے نہیں ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی چوکیدار نے ہمیں بتایا ہے کہ نواب صاحب کوٹھی میں موجود نہیں ہیں۔'' ادھر والوں کو بھی سب حقیقتِ حال سے آگاہی تھی لیکن محض وقت لینے کے لیے یہ جواب دیا۔ اس بات کا خدشہ تو پہلے ہی موجود تھا کہ اندر والوں نے مزاحمت کی تو سب سے پہلا قدم وہ یہی اٹھائیں گے کہ نواب صاحب اور ان کی فیملی کو یرغمال بنانے کی کوشش کریں۔ جاوید علی نے انہیں حالات سے جس حد تک آگاہ کیا تھا، اس کے مطابق نواب نوازش علی کی فیملی محفوظ تھی لیکن خود ان کی اور ان کے ایک جاں نثار خواجہ سرا کی حفاظت کے لیے جاوید علی کچھ نہیں کر سکا تھا اور وہ بدستور خطرے میں تھے۔

''تم سے جھوٹ کہا گیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ نواب نوازش علی، اس کی فیملی اور اس کی وفادار ملازمہ اب بھی اندر موجود ہے۔ اگر تم لوگوں نے ہماری بات نہ مانی تو وہ سب اپنی جان سے چلے جائیں گے۔'' اندر سے جواب دیا گیا۔

''ہم تمہاری بات کا یقین نہیں کر سکتے۔ تم ثبوت دینے کے لیے نواب صاحب کو کوٹھی کی چھت پر لے آؤ تاکہ ہم انہیں اپنی آنکھ سے دیکھ سکیں۔'' ادھر سے مطالبہ کیا گیا۔

''تم نے ہمیں بے وقوف سمجھ رکھا ہے کیا؟ ہمیں معلوم ہے کہ جیسے ہی ہم میں سے کوئی نواب صاحب کو لے کر کوٹھی کی چھت پر پہنچے گا، تمہارے اسنائپرز اسے شوٹ کر دیں گے۔'' اندر سے چلاتی ہوئی آواز میں جواب دیا گیا۔ ایک گھنے درخت کی شاخوں میں چھپا بیٹھا جاوید علی اس آواز کو شناخت کر سکتا تھا۔ وہ یقینی طور پر آشا تھی جو اس وقت دہشت گردوں کے اس ٹولے کی کمانڈ سنبھالے ہوئے تھی۔

''اس سے کہو کہ نواب صاحب کو چھت کے بجائے اوپری منزل کی سامنے والی کھڑکی میں لے کر آئے۔ کھڑکی میں وہ خود کو چھت کے مقابلے میں خاصا محفوظ سمجھے گی۔ آگے میرا کام ہے کہ میں انہیں کس طرح سنبھالتا ہوں۔'' اس موقع پر جاوید علی نے اپنی خاموشی توڑ کر باہر موجود آفیسر سے رابطہ کر کے اسے مشورہ دیا۔ آفیسر نے فوراً اس مشورے پر عمل کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اصل مسئلہ نواب صاحب اور ان کے وفادار خواجہ سرا کا ہے۔ اس خواجہ سرا کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ خواتین کے بارے میں البتہ معلوم تھا کہ وہ محفوظ ہیں اور انہیں ان کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

''ٹھیک ہے، میں تمہاری یہ بات مان رہی ہوں لیکن یاد رکھنا کہ ہمارے ساتھ کوئی چال چلنے کی کوشش نہ کرنا۔'' آفیسر کے مطالبے کے جواب میں آشا نے ذرا سا توقف کیا پھر دھمکی دیتے ہوئے بولی۔

''دھوکے کی صورت میں، فوراً ہی نواب صاحب کو گولی مار دی جائے گی اور اس کے بعد باقی لوگوں کو بھی۔ ہماری جانیں تمہیں کسی صورت سستی نہیں پڑیں گی اور ہم یہاں سے زندہ نہیں نکل سکے تو کسی اور کا جیون بھی نہیں بچے گا۔''

''ٹھیک ہے، ہم نے سب سن لیا ہے۔ پہلے تم نواب صاحب کو تو سامنے لاؤ پھر ہم دوسرے مسئلوں پر بات کریں گے۔'' مجاز آفیسر نے اسے جواب دیا۔ آشا کی دھمکیوں کے پیچھے موجود خوف اس سے پوشیدہ نہیں رہا تھا لیکن اس معاملے کو نہایت احتیاط سے ہینڈل کرنے کی ضرورت تھی۔ کوٹھی میں محصور مجرم اسی کیفیت سے گزر رہے تھے جن سے کسی بند کمرے میں موجود بلی گزرتی ہے۔ اس محصور و مجبور بلی سے پلٹ کر پنجہ مارنے کا اندیشہ رہتا ہے اور یہاں بھی سب کی نہیں تو کم از کم نواب نوازش علی اور کاجل کی زندگی خطرے میں تھی۔ اخلاقی بے راہ روی کے باوجود ابھی تک اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا کہ نواب صاحب ملک دشمن کارروائیوں میں ملوث ہیں بلکہ آثار سے یہی لگتا تھا کہ ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی لاعلمی میں انہیں استعمال کیا جا رہا ہے۔

ادھر درخت پر چھپا جاوید علی پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس نے نواب صاحب کو کوٹھی کی بالائی منزل پر پہنچانے کی تجویز اس لیے پیش کی تھی کہ اسے معلوم تھا، وہاں تک پہنچنے کے لیے اسی راستے سے گزرنا پڑے گا جہاں وہ گھات لگائے بیٹھا ہے۔ امکان یہی تھا کہ نواب صاحب کو بالائی منزل پر آشا خود لے کر جائے گی، البتہ وہ اپنی معاونت کے لیے ایک دو افراد کو ساتھ رکھ سکتی تھی اور محفوظ پوزیشن پر ہونے کی وجہ سے جاوید علی کے لیے دو تین افراد سے بیک وقت نمٹنا بالکل بھی مشکل نہیں تھا۔ وہ راستے پر آنکھیں جما کر بیٹھ گیا۔ اس کے اندازے کے برخلاف وہاں سے نواب صاحب اور آشا کے نمودار ہونے کے بجائے دو اسلحہ بردار خواجہ سرا بھاگتے ہوئے آئے۔ اس نے ان کے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی۔ حدِ نظر تک کوئی اور موجود نہیں تھا۔ شاید آشا نے خود اوپر جانے سے پہلے ان دونوں کو جائزہ لینے کے لیے بھیجا تھا، یا یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لوگ اپنے دعوے کی سچائی ظاہر کرنے کے لیے اوپر موجود خواتین کو اپنی تحویل میں لینے کی خواہش میں اس طرف آئے ہوں۔ جاوید علی چاہتا تو آسانی سے ان دونوں کو نشانہ بنا سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کو زک پہنچتے ہی

www.paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ آنلائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit http://www.paksociety.com

آشا ہوشیار ہو جاتی اور خطرے کو بھانپنے کے بعد ادھر کا رخ نہیں کرتی۔ بذریعہ طاقت ان لوگوں کے لیے کوٹھی پر قبضہ کر لینا کچھ مشکل نہیں تھا لیکن وہ وہاں موجود بے گناہ انسانوں کی جانیں کسی صورت ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ ان ساری مصلحتوں کے پیشِ نظر اس نے ان دونوں کو اپنی گرفت میں ہونے کے باوجود اوپر جانے سے نہیں روکا۔ اوپر موجود خواتین کی طرف سے ویسے بھی اسے اطمینان تھا کہ وہ نواب صاحب کی خواب گاہ میں محفوظ و مامون ہیں۔ نزدیک سے گزرنے پر اس نے خواجہ سراؤں کو شناخت کر لیا تھا۔ وہ مدھو اور سندنی تھیں، مبینہ طور پر مقتول شالنی کی وفادار اور اب آشا کی فرمانبردار۔ مدھو اور سندنی کے وہاں سے جاتے ہی آشا نواب صاحب کے ساتھ کچھ اس طرح منظر پر آئی کہ اس نے نواب صاحب کو پسٹل کی زد میں لے رکھا تھا اور لڑکھڑاتے ہوئے نواب صاحب ایک دوسرے خواجہ سرا کے سہارے آگے بڑھ رہے تھے۔ پسٹل کے علاوہ آشا کے شانے سے ایک خوفناک کلاشنکوف بھی لٹک رہی تھی جبکہ اس کی ساتھی بھی پوری طرح مسلح تھی۔ صاف لگتا تھا کہ وہ لوگ مرنے اور مارنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ جاوید علی سنبھل گیا اور اس کے بے آواز پسٹل سے گولی نکل کر آشا کے پسٹل والے ہاتھ میں پیوست ہو گئی۔ پسٹل ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا اور اس نے کراہتے ہوئے اپنے زخمی ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے تھام لیا۔ جاوید علی اس کا ردِعمل دیکھنے کے لیے رکا نہیں تھا بلکہ فوراً ہی دوسرے خواجہ سرا پر گولی داغ دی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ خواجہ سرا اپنے بچاؤ کے لیے نواب صاحب کو چھوڑ کر نیچے بیٹھ گیا اور وہ گولی جو شاید اس کے نچلے جسم کے کسی حصے پر پیوست ہوئی تھی، اس کے سر میں گھس گئی جس کے جان لیوا ہونے میں کوئی شک ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مدہوش نواب صاحب بھی اس کے سہارے سے محروم ہوتے ہی زمین بوس ہو گئے تھے اور حالات کی سنگینی سے بے خبر خاک چاٹ رہے تھے۔ آشا نے البتہ زخمی ہونے کے باوجود کارکردگی دکھانے کی کوشش کی اور شانے سے لٹکی کلاشنکوف اتارنے لگی لیکن اس کی یہ کوشش جاوید علی نے ناکام بنا دی۔ اس بار اس کی چلائی ہوئی گولی نے آشا کے بازو کو نشانہ بنایا تھا۔ دونوں ہاتھ زخمی ہونے کے بعد وہ مجبور تھی اور مقابلے پر ڈٹ نہیں سکتی تھی اس لیے شدید تکلیف میں مبتلا ہونے کے باوجود بھاگ کر خود کو محفوظ کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش بھی جاوید علی نے ناکام بنا دی۔ وہ درخت سے چھلانگ لگا کر براہِ راست آشا کے اوپر کودا تو وہ دونوں اس طرح زمیں بوس ہو گئے کہ آشا جاوید علی کے نیچے دبی ہوئی تھی۔

"تم لوگوں کو یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ صرف ہم دونوں کو زیر کر لینے سے تمہیں کامیابی نہیں ملے گی۔ ہمارے علاوہ اور بھی ہیں جو نواب صاحب اور ان کی فیملی کو مار ڈالیں گے۔" مغلوب ہو جانے کے باوجود اس نے جاوید علی کو دھمکانے کی کوشش کی اور مزید بولی۔ "اوپر میرے ساتھی موجود ہیں۔ یہ جو کچھ تم نے کیا ہے، اگر انہیں اس کے بارے میں خبر ہو گئی تو نواب صاحب کی بیویاں اور بیٹی اپنی جان سے جائیں گی۔" اس کے اندازِ گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ جاوید علی کو رنجی کی حیثیت سے شناخت نہیں کر سکی ہے۔ ظاہر ہے ایک سجے بنے خواجہ سرا اور زور آور لڑاکے میں مماثلت تلاش کرنا آسان تھا بھی نہیں۔ اس لیے اس کا دھوکا کھا جانا سمجھ آتا تھا۔ یقیناً اس کے بارے میں وہ یہی اندازہ لگا سکی تھی کہ وہ باہر موجود فورس کا کوئی کمانڈو ہے جو کسی طرح کوٹھی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

"نواب صاحب کی فیملی کا ذکر چھوڑو اور فی الحال اپنی فکر کرو۔ اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میری تیسری گولی سیدھی تمہارے بھیجے میں اترے گی۔" آشا کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگاتے ہوئے اس نے اسے جواب دیا۔ ردِعمل میں آشا نے اس پر لاتیں چلانے کی کوشش کی۔ وہ چونکہ کوٹھی میں ڈرائیور کے فرائض انجام دیتی تھی اس لیے دیگر خواجہ سراؤں کی طرح زرق برق لباس کے بجائے ڈرائیور کی چست یونیفارم زیب تن کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس کے جسم پر یونیفارم ہی موجود تھی جو خون آلود ہونے کے باوجود اسے چستی کا مظاہرہ کرنے میں مدد دے رہی تھی اور بھاری بھرکم زنانہ لباس کی طرح حرکت میں مزاحم نہیں تھی۔ بہرحال اس کی مزاحمت جاوید علی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اپنے بدن پر اس کی ٹانگوں کے وار سہنے کے بعد اس نے آشا کو گھونسوں اور مکوں پر رکھ لیا۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی وہ بے بس نظر آنے لگی۔ ناک سے بہتے خون اور چہرے پر پڑنے والی ضربوں نے اس کے خوب صورت چہرے کو بھیانک بنا دیا تھا۔ جاوید علی نے اسے چھوڑا اور پہلے زمین پر خاک چاٹتے نواب صاحب کو گھسیٹ کر پھولوں کے ایک کنج کے پیچھے اس طرح لٹا دیا کہ وہ کسی کی نظر میں نہ آسکیں ورنہ اگر آشا کے ساتھیوں میں سے کوئی اس طرف آنکلتا تو ایک بار پھر نواب صاحب کو یرغمال بنا کر ان کے لیے مسائل کھڑے کر دیے جاتے۔ نواب صاحب کی

www.paksociety.com

طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے آشا کو پسٹل کی زد پر لے کر کھڑا ہونے پر مجبور کیا۔ زخمی آشا نے بمشکل اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اب جاوید علی کا رخ بالائی منزل کی طرف جاتی سیڑھیوں کی طرف اس حال میں تھا کہ آشا کو اس نے ڈھال کے طور پر اپنے آگے لگا رکھا تھا اور آشا کی کلاشنکوف اب اس کے شانے پر لٹکی ہوئی تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے ہوئے اسے احساس ہو گیا کہ مدھو اور تندنی نواب صاحب کی اس خواب گاہ کا دروازہ کھولنے کی کوشش میں مصروف ہیں جہاں شازمین اور نواب صاحب کی بیگمات نے پناہ لے رکھی ہے۔ اس نے آشا کو ٹہوکا لگا کر رفتار بڑھانے کا اشارہ کیا۔ ان کے قدموں کی واضح آہٹیں سن کر یقیناً مدھو اور تندنی متوجہ ہو گئی تھیں چنانچہ جیسے ہی وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے، اس نے مدھو کو سامنے کھڑا پایا لیکن یقینی طور پر وہ اس صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے تو آہٹیں سن کر یہی سمجھا ہوگا کہ اس کے اپنے ساتھی نواب صاحب کو لے کر اوپر آرہے ہیں لیکن وہاں تو منظر ہی قطعی خلافِ توقع تھا جسے دیکھ کر مدھو کا منہ کھل گیا۔

''تم اور تندنی اپنے ہتھیار پھینک دو ورنہ یہ اپنی جان سے جائے گی۔'' اس کے سنبھلنے سے پہلے جاوید علی نے اسے حکم دیا۔ اس نے ایک نظر بے بس آشا کو دیکھا اور ہتھیار پھینک دیا۔ باتوں کی آواز سن کر تندنی بھی وہیں آگئی تھی اور اسے بھی اس حکم کی تعمیل کرنی پڑی تھی۔

''اب تم دونوں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو جاؤ۔'' جاوید علی نے دوسرا حکم سنایا۔ ناچار اس کی بھی تعمیل کرنی پڑی۔ جاوید علی آشا سمیت ان کے قریب پہنچا اور پسٹل کا دستہ دونوں کے سروں پر آزما کر انہیں انٹا غفیل کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے نواب صاحب کی خواب گاہ پر مخصوص انداز میں دستک دی۔ فوراً ہی شازمین نے دروازہ کھول دیا۔ وہ خاصی خوف زدہ محسوس ہو رہی تھی۔ خواب گاہ کے محفوظ ہونے کے باوجود شاید اسے ڈر رہا ہوگا کہ کہیں مدھو اور تندنی اس کا دروازہ کھولنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔

''تم تینوں خواتین مل کر ان دونوں کو کسی کمرے میں بند کر دو اور دوبارہ بیڈروم میں جا کر خود کو بند کر لو۔'' جاوید علی نے اسے ہدایت دی اور خود تیزی سے آشا سمیت ایک کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ اسے احساس تھا کہ اس کے بازو میں دبی آشا زخموں سے مسلسل بہتے خون کے باعث کمزور سے کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے مزاحمت کے قابل نہیں رہی ہے لیکن اسے آشا کے بے ہوش ہونے سے پہلے ہی کچھ کرنا تھا۔ وہ دشمن کی چال اسی پر الٹنے جا رہا تھا۔

''کوٹھی میں موجود تمام خواجہ سراؤں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ ان کی لیڈر آشا میرے قبضے میں ہے اور اگر تم لوگوں نے ہتھیار نہ ڈالے تو یہ اپنی جان سے جائے گی۔'' ایک ایسی کھڑکی کا انتخاب کرنے کے بعد جہاں کم از کم گیٹ پر موجود چوکیدار واضح طور پر آشا کو دیکھ سکے، اس نے بلند آواز میں اعلان کیا۔ اس کا یہ اعلان باہر موجود اپنے ساتھیوں کے لیے بھی اشارہ تھا کہ اندر کے حالات کافی حد تک اس کے کنٹرول میں ہیں اس لیے وہ اپنی کارروائی کر سکتے ہیں۔ فوراً ہی ردِ عمل ظاہر ہوا اور باہر موجود مسلح قانون کے رکھوالوں نے کوٹھی کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ فضا یکدم ہی مختلف قسم کے ہتھیاروں کی آوازوں سے گونجنے لگی۔ اس گونج میں نحیف پڑتی آشا کا قہقہہ منفرد اور چونکا دینے والا تھا۔ جاوید علی حیران سا اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم لوگ یہاں سے لاشوں اور ملبے کے ڈھیر کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکو گے۔ یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ باہر موجود میرے ساتھی میری جان بچانے کے لیے ہتھیار ڈال دیں گے۔ میں پہلے ہی انہیں بتا کر آئی تھی کہ انہیں زیر ہونے کی صورت کیا کرنا ہے۔'' وہ ابھی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ دھماکے سے سنائی دینے لگے۔ یہ دھماکے ان آوازوں سے قطعی مختلف تھے جو اب تک مختلف ہتھیاروں کے چلنے کی صورت میں سنائی دیتے رہے تھے۔ ان دھماکوں نے صرف فضا کو ہی نہیں لرزایا تھا بلکہ کوٹھی کی عمارت کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لرزتی عمارت کے ساتھ جاوید علی نے خود اپنا وجود بھی ڈگمگاتا ہوا محسوس کیا اور بس یہ آخری احساس تھا اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔ ڈگمگاتی، ریزہ ریزہ ہوتی عمارت کا ملبا تھا جو اس پر آگرا تھا اور اس کی سانسوں کا سلسلہ رک سا گیا تھا۔

☆☆☆

شہریار بے قراری سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ کراچی میں جو کچھ ہوا تھا، اس کی رپورٹ اسے بھی مل چکی تھی۔ نواب نوازش علی کی کوٹھی پر پولیس کی مدد سے کیے جانے والے سی ایف پی کے ریڈ کے عجیب و غریب نتائج نکلے تھے۔ جاوید علی کی فراہم کردہ معلومات اور حالات کے جائزے سے جو تصویر سامنے آئی تھی، اس کے مطابق نفسیاتی اور اخلاقی بیماریوں کے شکار نواب نوازش علی کو شالنی نے جو کہ مبینہ طور پر را کی ایجنٹ تھی، کچھ اس طرح سے اپنے جال میں پھانسا تھا کہ عملاً وہ اس کا مطیع ہو کر رہ گیا تھا... لیکن اسے خود بھی اس حقیقت کی خبر نہیں تھی۔ خوب صورت خواجہ سراؤں کے جھرمٹ میں اسے احساس ہی نہیں ہو پاتا تھا کہ اس کی ناک کے نیچے اس کی کوٹھی میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ شالنی نے کچھ اس طرح سے جال بچھایا تھا کہ نواب کی کوٹھی ایک طرف تو انتہا پسند ہندو خواجہ سراؤں کا ٹھکانا بن گئی تھی اور دوسری طرف وہ اسلحے کی ذخیرہ اندوزی جیسے خطرناک کاموں کے لیے اس کوٹھی کو استعمال کر رہے تھے۔ کوٹھی میں موجود تقریباً سارے خواجہ سرا انتہا پسند تنظیم کے رکن تھے۔ صرف چند ایسے تھے جنہیں حقائق کا علم نہیں تھا اور نہایت غیر محسوس طور پر انہیں اس رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ کسی خاص موقع پر جب کوٹھی میں ان انتہا پسند خواجہ سراؤں کا اجتماع ہوتا تو نواب صاحب کو شراب اور کسی خوب صورت خواجہ سرا کے ذریعے مدہوش کر دیا جاتا۔ نواب صاحب کا خاندان تو ویسے ہی عملی طور پر کوٹھی کی نچلی منزل سے کٹا ہوا تھا چنانچہ وہ لوگ مزے سے اپنی کارروائیاں جاری رکھتے۔ کوٹھی کے وسیع و عریض تہ خانے میں انہوں نے اپنی خونی دیوی کا مجسمہ رکھ چھوڑا تھا اور مخصوص تاریخوں پر وہیں اپنی بھیانک رسومات انجام دیتے تھے۔ اس موقع پر باہر سے بھی تنظیم کے کارکن خواجہ سرا جمع ہوتے تھے البتہ کوٹھی میں موجود خواجہ سراؤں کو اس محفل سے دور رکھا جاتا تھا۔

یہ تہ خانہ ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی کے لیے بھی بے حد موزوں جگہ تھی۔ ہتھیاروں کی آمد و رفت کے لیے بھی اجتماعات والی ترکیب استعمال کی جاتی۔ بعد میں پکڑے جانے کا ڈر اس لیے نہیں ہوتا تھا کہ نواب صاحب کو تو تہ خانے میں جھانکنے کی فرصت نہیں تھی اور ملازمین میں سے بھی صرف چند ایک ہی جو محرمِ راز تھے، اس طرف جا سکتے تھے ورنہ تہ خانہ مقفل رہتا تھا۔ جاوید علی کے کہنے پر جب کوٹھی پر ریڈ کیا گیا تو حالات میں بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ ان تبدیل شدہ حالات کے بارے میں ایک زخمی خواجہ سرا نے معلومات فراہم کیں۔ شالنی کی موت کے بعد درما نے براہِ راست آشا سے رابطہ کیا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ رنجنی نامی خواجہ سرا پر خصوصی نظر رکھے لیکن کاجل کی ملی بھگت سے رنجنی غائب ہو گئی۔ آشا نے اس پر بے حد تشدد کیا کہ کسی طرح وہ رنجنی کے بارے میں معلومات فراہم کر دے لیکن کاجل نے زبان نہیں کھولی۔ تشدد کی انتہا پر جب اس کا ضبط جواب دے گیا تو اس نے صرف اتنا اعتراف کیا کہ رنجنی کوٹھی میں ہی موجود ہے۔ کہاں؟ اس بارے میں کچھ بتائے بغیر ہی وہ مر گئی۔ ان لوگوں نے اپنے اندازے کے مطابق شازمین کو رنجنی کے غیاب میں ملوث سمجھتے ہوئے اس کے کمرے وغیرہ کی تلاشی لی لیکن وہاں انہیں کوئی نہیں ملا۔ ابھی وہ لوگ غور کر ہی رہے تھے کہ آیا وہ شازمین پر زور زبردستی کر کے رنجنی کے بارے میں کچھ اگلوا سکتے ہیں یا نہیں کہ کوٹھی پر پولیس کا ریڈ ہو گیا۔ آشا سمیت چند سرکردہ خواجہ سراؤں نے اپنی دیوی کی قسم کھا کر بہت عرصے پہلے شالنی کے سامنے یہ عہد کیا تھا کہ بدترین حالات میں بھی وہ کبھی خود کو زندہ قانون کے ہاتھ نہیں لگنے دیں گے اور تہ خانے سے بھی کوئی کچھ حاصل نہیں کر سکے گا چنانچہ جب فورس کے افسر کی طرف سے یہ مطالبہ ہوا کہ آشا نواب صاحب کو لے کر سامنے آئے تو آشا اس بات پر عمل کرنے سے پہلے اپنے دو معاونین کو یہ حکم دے گئی کہ اس کے زیر ہونے کی صورت میں تہ خانے کو تباہ کر دیا جائے۔ نامساعد حالات میں کی جانے والی تباہی کا یہ منصوبہ شالنی کی زندگی سے ہی طے شدہ تھا اور اس کے لیے انتظامات بھی کیے گئے تھے اس لیے ان لوگوں کو عمل کرنے میں چند سیکنڈ ہی لگے۔ تباہ ہونے والا اسلحے کا ڈھیر ہولناک تباہی کا سبب بنا۔ کوٹھی کی عمارت لمحوں میں زمین بوس ہو گئی۔ نچلی منزل پر موجود کوئی شخص زندہ نہیں بچا۔ ملبے کے ڈھیر سے صرف یہی ایک خواجہ سرا شدید زخمی حالت میں زندہ ملا تھا جس نے انہیں یہ معلومات فراہم کی تھیں۔ بعد میں وہ بھی زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا تھا۔

لان میں بے ہوش پڑے نواب صاحب اپنی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے تباہ ہوتی عمارت سے اڑ کر سر پر لگنے والے ایک نکیلے پتھر کی وجہ سے زندگی کی جنگ ہار گئے تھے اور شاید یہ ان کے حق میں اچھا ہی ہوا تھا ورنہ زندہ رہنے کی صورت میں انہیں جس ذلت اور رسوائی سے گزرنا پڑتا، اسے وہ اپنی تمام تر اخلاقی کج روی کے باوجود سہہ نہیں سکتے تھے کیونکہ لاکھ بگڑے ہوئے سہی، تھے تو ایک عزت دار خاندان کے چشم و چراغ جن کے ہاں اپنی تمام تر عیش پرستی کے باوجود وطن سے غداری کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کی دونوں بیگمات اور بیٹی شازمین اس تباہی میں بالکل محفوظ رہی تھیں۔ وہ تینوں ترچھے ہو کر گرنے والے چھت کے ایک بڑے حصے کے نیچے اس طرح محفوظ ہو گئی تھیں کہ انہیں ایک خراش تک نہیں آئی تھی البتہ دہشت نے انہیں بے ہوش ضرور کر دیا تھا۔ معمولی سی طبی امداد کے نتیجے میں وہ تینوں ہوش میں آگئی تھیں اور فی الحال انہیں دارالامان بھجوا دیا گیا تھا۔ کانونیٹ میں زیرِ تعلیم نواب صاحب کے بیٹے کراچی پہنچے تو

www.paksociety.com

ماں بہن کی ذمے داری سمیت جائداد کا قبضہ خود نمٹا لیتے۔ اس پورے آپریشن میں کلیدی کردار ادا کرنے والا جاوید علی بری طرح متاثر ہوا تھا اور شدید زخمی حالت میں ہنوز اسپتال کے انتہائی نگہداشت والے حصے میں زیر علاج تھا۔ کرنل توحید نے بذاتِ خود اس کے علاج کے لیے خصوصی ہدایات دی تھیں اور واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ اگر یہاں اس کا علاج ممکن نہیں ہوا تو علاج کے لیے اسے بیرونِ ملک بھی بھجوایا جا سکتا ہے۔ ملکی سلامتی کے لیے اپنی جان نثار کر دینے کا عزم رکھنے والا سی ایف پی کا ہر جوان ان کے نزدیک بہت قیمتی تھا اور وہ ان میں سے کسی کی بھی جان کی خاطر بڑی سے بڑی قیمت ادا کر سکتے تھے۔

اس پورے واقعے نے واضح کر دیا تھا کہ دشمن کی جڑیں وطنِ عزیز میں کتنی گہری ہو چکی ہیں۔ جاوید علی ہی کی مدد سے وہ لوگ شمشان گھاٹ میں ہونے والی اسلحے کی ایک ڈلیوری کو بھی پکڑ چکے تھے۔ پکڑے جانے والے مجرموں نے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ یہ اسلحہ لسانی، سیاسی اور فرقہ وارانہ فسادات برپا کرنے والے عناصر کو فروخت کرتے ہیں۔ را کا مقصد چونکہ پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا تھا اس لیے وہ انتہائی کم نرخ پر ان دہشت گردوں کو فراوانی سے اسلحہ فراہم کرتے رہتے تھے۔ اس میں سے زیادہ تر اسلحہ امریکی ساختہ تھا جو انہوں نے موساد کے تعاون سے حاصل کیا تھا اور یوں دونوں دشمن ملک کی ایجنسیاں مشترکہ ایجنڈے پر کام کر رہی تھیں۔

یہ کوئی نئی باتیں یا حقائق نہیں تھے جن سے شہریار آشنا ہوا ہو۔ اسے اس بات کا بھی غم نہیں تھا کہ اس معاملے کے حقائق کو ہمیشہ کی طرح عوام سے چھپا لیا گیا تھا اور میڈیا کو یہ بتایا گیا تھا کہ نواب صاحب کی کوٹھی کے تہ خانے میں گیس کے کچھ سلنڈر رکھے تھے، اتفاق سے ان میں سے ایک سلنڈر پھٹ گیا اور اس آتش گیر مادے کو زد میں لے لیا جو کوٹھی میں ملازم ہندو خواجہ سراؤں نے آنے والی دیوالی کے لیے ذخیرہ کر رکھا تھا۔ آگ بھڑکی تو باقی ماندہ سلنڈر بھی پھٹ گئے اور یوں ایک ہولناک حادثہ پیش آ گیا۔ کوٹھی کو مکمل طور پر کلیئر کرنے سے قبل میڈیا کے کسی نمائندے کو اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی اور نہایت صفائی سے حقائق کو چھپا لیا گیا تھا۔ ایسا ہائی کمان کے حکم پر ہوا تھا جس کے سامنے سب مجبور تھے۔ سی ایف پی والوں کی مجبوری اور بھی زیادہ اس لیے بڑی تھی کہ وہ اپنے وجود کو مخفی رکھنا چاہتے تھے اور ہائی کمان کو بھی یہی اطلاع دی گئی تھی کہ آپریشن میں خفیہ ایجنسی کے ساتھ دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے شامل تھے۔ اس رازداری کے پیچھے کیا مصلحت تھی، یہ تو ہائی کمان کو ہی معلوم ہو گی لیکن اپنی جان کی بازی لگانے والے اس لیے کڑھتے رہے تھے کہ اس کے مقابلے میں اگر بھارت میں دہشت گردی کی کوئی معمولی سی بھی واردات ہوتی تو بھارت کھل کر پاکستان پر الزام لگاتا۔

شہریار نے فی الحال اس بات کو بھی نظرانداز کر دیا تھا لیکن وہ ایک بار پھر سامنے آنے والے ورما کے نام کو نظرانداز نہیں کر پا رہا تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ وہ ورما کے موجودہ ٹھکانے سے واقف تھا اور فوری طور پر اسے گرفت میں لینے کا خواہش مند بھی تھا لیکن یہاں ذیشان اور کرنل صاحب نے اس سے اختلاف کیا تھا اور فی الحال اسے زیرِ نگرانی رکھنے پر ہی اکتفا کیے ہوئے تھے۔ لیکن شہریار کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا اور وہ ہر صورت ورما کی گردن ناپنا چاہتا تھا۔ اس کی اس وقت کی بےقراری اسی وجہ سے تھی۔ وہ تذبذب میں مبتلا تھا کہ آیا ذیشان اور کرنل صاحب کی مرضی کے خلاف بھی کوئی قدم اٹھایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ آخرکار وہ تذبذب کی اس کیفیت سے نکل آیا۔ اس نے اس دلیل سے خود کو قائل کر لیا کہ وہ جو کچھ کرنے جا رہا ہے، ملکی مفاد میں ہی کر رہا ہے اس لیے اگر ان دونوں کو برا بھی لگا تو یہ ایک وقتی ناراضی ہو گی جسے وہ جلد فراموش کر دیں گے۔ فیصلہ کر لینے کے بعد اس نے ٹہلنا موقوف کیا اور نہایت خاموشی سے تیاری کرنے لگا۔ وہ جس حصے میں مقیم تھا، وہاں ملازمین کی آمد اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتی تھی اور رات کے اس پہر تو کسی کے اس طرف آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن پھر بھی وہ بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ تیاری کے لیے اس نے بلب وغیرہ روشن نہیں کیا تھا بلکہ نائٹ بلب کی روشنی میں ہی کام کر رہا تھا۔ جینز اور ٹی شرٹ پر مشتمل گہرے رنگ کا چست لباس زیبِ تن کر لینے کے بعد اس نے پیروں میں نرم سول کے جوتے پہنے اور اپنے سامان میں موجود پسٹل کو نکال لینے کے علاوہ تیز دھار والا پتلا سا چاقو بھی پنڈلی سے باندھ لیا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں جو عکس اس کے سامنے تھا، اس میں شہریار عادل کی جھلک بہت کم ہی رہ گئی تھی اور بہت مشکل تھا کہ کوئی اسے اس حیثیت سے شناخت کر سکتا۔ خود کو درپیش کارروائی کے لیے پوری طرح تیار محسوس کرنے کے بعد وہ دبے قدموں کمرے سے باہر نکلا اور پھر پھونک پھونک کر

قدم رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر گیٹ پر چوکیدار موجود ہوتا تھا اس لیے اس طرف سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گاڑی بھی لے جانا ممکن نہیں تھا چنانچہ وہ تن بہ تقدیر عقبی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

اس عمارت کی نگرانی کے لیے چوکیدار کے علاوہ دو عدد تربیت یافتہ کتے بھی موجود تھے جو ساری رات کھلے رہتے تھے لیکن اسے ان کتوں سے اس لیے کوئی خطرہ نہیں تھا کہ طویل قیام کے عرصے میں دونوں کتے اس سے مانوس ہو چکے تھے۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ قدموں کی آہٹ پا کر ایک کتا ذرا سا بھونکا لیکن پھر اس نے شہریار کی خوشبو کو پا لیا اور بھونکنا ترک کر کے اس کے قریب آ کر اس کی ٹانگ سے اپنی تھوتھنی رگڑنے لگا۔ شہریار نے نرمی سے اس کے سر اور پشت کو سہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ دوسرا کتا بھی قریب ہی موجود تھا لیکن اپنے ساتھی کے اطمینان کے بعد اس نے کوئی تعرض نہیں کیا اور شہریار آرام سے آگے بڑھتا گیا۔ اس کا رخ کوٹھی کی عقبی دیوار کی طرف تھا۔ دیوار خاصی بلند تھی لیکن اسے تربیت کے جن مراحل سے گزارا جا رہا تھا، ان سے گزرنے کے بعد اس کے لیے یہ بلندی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ نہایت سہولت کے ساتھ دیوار کے اس پار اتر گیا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ اس علاقے میں دن کے وقت بھی سواری آسانی سے نہیں ملتی تھی۔ رات کے وقت تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی وہ ٹیکسی اسٹینڈ تک پہنچ سکتا تھا۔ اس فاصلے کو جلد از جلد طے کر لینے کی خواہش میں وہ بہت تیز چل رہا تھا۔ تیز رفتاری کے باوجود جب وہ ٹیکسی اسٹینڈ تک پہنچا تو نہ ہی سانس پھولا ہوا تھا اور نہ ہی پیروں نے احتجاج کیا تھا۔ اس بات نے اس کے دل میں خوشی کا احساس جگا دیا۔ یعنی عمر فاروق صاحب کی تربیت نے کام دکھایا تھا اور اس کا اسٹیمنا پہلے کے مقابلے میں اور بھی بہتر ہو گیا تھا۔ دل ہی دل میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے ایک ٹیکسی کا انتخاب کیا اور ڈرائیور کو اس علاقے کا نام بتایا جہاں آج کل ورما رہائش پذیر تھا۔ کرائے کے سلسلے میں اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کسی حیل و حجت کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ رات کے اس پہر ٹیکسی میں سفر کرنے والے عموماً اشد ضرورت کے تحت ہی باہر نکلتے ہیں اس لیے ٹیکسی والے بھی منہ مانگے کرائے لینا اپنا حق سمجھتے تھے۔ اس رویے کی وہ عمومی حالات میں کتنی ہی مذمت کرتا ہو لیکن اس وقت اس کے لیے ہر بات سے بڑھ کر ورما تک رسائی اہم تھی اس لیے دگنے کرائے پر بخوشی راضی ہو گیا۔

ٹیکسی اس کے مطلوبہ علاقے میں پہنچی تو اس نے ورما کی رہائش گاہ سے خاصے فاصلے پر اسے رکوا لیا اور کرایہ ادا کرنے کے بعد پیدل ہی اس طرف چل پڑا۔ پتا اس کے ذہن پر نقش تھا کہ بدترین دشمن اور بہترین دوست کے متعلق کسی چیز کو بھول جانا انسان کی فطرت کے خلاف ہوتا ہے۔ مطلوبہ پتے پر پہنچ کر اس نے کچھ دیر باہر ہی رک کر جائزہ لیا۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا اور دیواریں بھی کچھ خاص بلند نہیں تھیں۔ ایسے کوئی آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے کہ گیٹ پر چوکیدار کی موجودگی کا پتا چلتا۔ چوکیدار کے علاوہ حفاظتی انتظامات میں عموماً دو ہی چیزوں کا اہتمام کیا جاتا ہے.... ایک کتے اور دوسرے برقی رو۔ دیواروں پر تار بچھا کر ان میں برقی رو دوڑانا ایک خطرناک حفاظتی طریقہ تھا جس کے استعمال سے بےگناہ جانوں کے نقصان کا اندیشہ بھی رہتا تھا لیکن ورما جیسے بےضمیر آدمی سے کسی اخلاقی ضابطے کا خیال رکھنے کی امید نہیں تھی۔

دیواروں پر برقی تاروں کی موجودگی کو چیک کرنے کے لیے اس نے اپنی جیب سے نائلون کی پتلی سی رسی نکالی۔ اس رسی کے سرے پر ایک مضبوط دھاتی آنکڑا موجود تھا۔ بلندی پر چڑھنے کے لیے یہ رسی بڑی کارآمد شے تھی لیکن اس وقت تو اسے دھاتی آنکڑے سے کام لینا تھا۔ اگر دیوار میں کرنٹ موجود ہوتا تو دھاتی آنکڑے سے ٹکرانے کی صورت میں ردِعمل ظاہر ہوتا اور ننگے تاروں سے دھاتی آنکڑا ٹکرانے کی صورت میں رات کی تاریکی میں چنگاریاں سی اڑتی صاف نظر آتیں لیکن جب اس نے تجربہ کیا تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ احتیاطاً اس نے تجربے کو ایک بار پھر دہرایا لیکن نتیجہ وہی رہا تو اطمینان سے دیوار پر چڑھ گیا۔ دیوار پر چڑھنے کے بعد اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور کتوں کی موجودگی کی سن گن لینے کی کوشش کی۔ نیم تاریک احاطے میں اسے کچھ نہیں دکھائی دیا۔ زیادہ دیر دیوار پر رکنا مناسب نہیں تھا اس لیے وہ پنجوں کے بل اندر کود گیا۔ جچی تلی چھلانگ کے نتیجے میں بہت ہی مدھم آواز پیدا ہوئی لیکن بہرحال اگر وہاں کتے موجود ہوتے تو ضرور متوجہ ہوتے۔ اسے بےحد حیرت ہوئی کہ ورما حفاظتی اقدامات کی طرف سے اتنا بےفکر کیوں تھا؟ پھر اسے یاد آیا کہ کراچی میں بھی جب اس نے ورما کے اپارٹمنٹ میں گھس کر اسے قابو کیا تھا تو وہاں بھی ایسا کوئی انتظام نہیں تھا۔ شاید ورما کو خود پر حد سے زیادہ اعتماد تھا جو اس قسم کا اہتمام غیر ضروری سمجھتا تھا۔ فی الحال اس کے پاس ورما کی نفسیات سمجھنے کی فرصت نہیں تھی چنانچہ کھڑے ہو کر قدم

www.paksociety.com

آگے بڑھائے۔

احتیاط کے پیشِ نظر وہ مکان میں کودتے ہی اپنا پسٹل باہر نکال چکا تھا اور اب اسے تھامے ہوئے آہستگی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے دروازے کو چیک کیا۔ حسبِ توقع وہ اندر سے بند تھا۔ دروازے کے بعد وہ کھڑکیوں پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ یہ سلائڈنگ ونڈوز تھیں جن کے اندر گرل موجود نہیں تھی لیکن یہ اہتمام تھا کہ اندر سے لاک ہو سکیں اور کوئی شخص باہر سے انہیں کھول نہ سکے۔ ہاں کھڑکیوں کا شیشہ تھوڑی سی کوشش سے توڑنا ممکن تھا لیکن ظاہر ہے اس صورت میں شور ہوتا اور اندر موجود ورما متوجہ ہو جاتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے ساری کھڑکیاں چیک کر لے تاکہ اگر اتفاقاً کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی ہو تو اس سے اندر جایا جا سکے۔ دوسری صورت میں اسے یا تو چھت کا راستہ اختیار کرنا پڑتا یا کھڑکی کا شیشہ توڑنے کا رسک لینا پڑتا۔ چھت کے بارے میں اسے علم نہیں تھا کہ وہاں سے نیچے کی طرف سیڑھیاں جاتی بھی ہیں یا نہیں۔ اس لیے حسنِ اتفاق پر بھروسا کرتے ہوئے سب سے پہلے کھڑکیاں چیک کرنا ہی مناسب سمجھا۔ آخر تیسری کھڑکی پر اس کی امید بر آئی۔ یہ کھڑکی اندر سے لاک نہیں تھی اور ذرا سا زور لگا کر کھولنے پر شیشہ آسانی سے ایک طرف کھسک گیا تھا۔ اس نے بے دھڑک اندر داخل ہونے کے بجائے پہلے جھانک کر اندر دیکھا۔ کمرا سٹنگ روم کا منظر پیش کر رہا تھا اور وہاں جلتی مدھم روشنی میں وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہاں کوئی ذی روح موجود نہیں ہے۔ کمرے میں ایک طرف کمپیوٹر بھی رکھا تھا جس کی اسکرین اس وقت تاریک تھی۔ وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ جما کر اندر کود گیا۔ یہاں وہ ورما سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے آیا تھا اور امکان یہی تھا کہ اس وقت وہ اپنی خواب گاہ میں محوِ خواب ہوگا اس لیے اس کمرے میں رکنے کو بیکار جان کر قدم دروازے کی طرف بڑھائے لیکن پھر رکنا پڑا۔ رکنے کی وجہ گردن کی پشت پر محسوس ہونے والی لوہے کی ٹھنڈک تھی اور ایسا ہی ایک کھلونا اس کے اپنے ہاتھ میں بھی موجود تھا اس لیے اسے پہچاننے میں مغالطہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ پسٹل کی نال ہے جو کسی نے پشت سے اس کی گردن پر رکھی ہوئی ہے۔

”پسٹل پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو۔“ سرد آواز میں حکم دیا گیا جس کی تعمیل کرنے کے سوا اس وقت اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

”اب دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔“ اسے پسٹل سے محروم کر دینے کے بعد دوسرا حکم دیا گیا۔ گردن پر لگی نال کی موجودگی میں انکار کی گنجائش نہیں تھی چنانچہ اس نے وہی کیا جس کا اسے حکم دیا گیا تھا۔ حکم دینے والا جو کہ یقینی طور پر ورما ہی تھا، اس کی جامہ تلاشی لینے لگا۔ شہریار ہونٹ بھینچے بہت مشکل سے یہ سب برداشت کر رہا تھا۔ وہ ورما کو چیر پھاڑ کر رکھ دینے کی خواہش دل میں لے کر یہاں تک آیا تھا لیکن جتنی آسانی سے یہاں تک پہنچا تھا، اتنی ہی آسانی اور تیزی سے زیر کر لیا گیا تھا۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ ورما پہلے سے ہی گھات لگائے بیٹھا تھا اور اس کے اندر داخل ہوتے ہی ایکشن میں آ گیا تھا اور اب اپنے نفرت انگیز وجود کے ساتھ اس کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس کام کے لیے وہ اپنا صرف ایک ہاتھ استعمال کر رہا تھا، دوسرے ہاتھ میں اس نے بدستور پسٹل تھام رکھا تھا اور اوپر سے نیچے تک ہاتھوں کے سفر کے ساتھ ساتھ پسٹل کا سفر بھی جاری تھا۔ وہ اس کی جیبوں میں اڑسا سامان نکال چکا تھا اور اب اس کا ہاتھ اس پیر پر متحرک تھا جس کے ساتھ اس نے تیز دھار والا چاقو باندھ رکھا تھا۔ ہاتھ اس مقام تک پہنچا تو ورما کی مشاق انگلیوں نے فوراً ہی چاقو کی موجودگی کا اندازہ لگا لیا اور تیزی سے اس کی پینٹ کا پائنچا اوپر چڑھا کر چاقو کو بے نقاب کر دیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب شہریار کو محسوس ہوا کہ ورما کی توجہ اپنے پسٹل سے زیادہ اس کے چاقو پر مبذول ہے چنانچہ اس نے ذرا بھی تاخیر کیے بغیر ایکشن میں آنے کا فیصلہ کیا اور چاقو بندھی ٹانگ کو پھرتی سے حرکت دے کر پیچھے کی طرف اس طرح گھمایا کہ تلاشی لیتا ورما اس کی زد میں اچھی طرح آ جائے۔

اس کے اس غیر متوقع حملے نے ورما کو پیچھے کی طرف الٹا دیا جبکہ شہریار نے اچھل کر فوراً سے پیشتر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اس کی یہ حکمتِ عملی اس کے حق میں بہتر ثابت ہوئی۔ اگر اسے لمحہ بھر کی بھی دیر ہو جاتی تو ورما کے پسٹل سے نکل کر دیوار سے ٹکرانے والی گولی خود اس کے بدن میں چھید کر چکی ہوتی۔ دیکھا جائے تو اس نے پسٹل بردار ورما پر اس طرح بنا دیکھے بھالے حملہ کر کے بہت بڑا رسک ہی لیا تھا۔ ذرا سی کوتاہی یا قسمت کی خرابی سے اسے بڑا نقصان بھی ہو سکتا تھا۔ حقیقتاً اس نے جو کچھ کیا تھا، وہ عالمِ جنون میں کیا تھا ورنہ کوئی ہوش مند آدمی اس طرح کا رسک لینے سے پہلے دس بار سوچتا ہے۔

اچھل کر اپنی جگہ چھوڑنے کے بعد وہ اگلی جگہ پر بھی ٹھہرا نہیں تھا بلکہ کسی اسپرنگ کی طرح اچھل کر دوبارہ اپنی ٹانگ حرکت میں لایا تھا اور اس بار ورما اپنے پسٹل سے محروم ہو گیا تھا۔ پسٹل ہاتھ سے نکل کر جانے کہاں گرا تھا۔ ورما نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی اور کسی عقاب کی طرح پلٹ کر اس پر حملہ آور ہوا۔ اس کے حملے سے بچنے کے لیے شہریار نے بائیں جانب جھکائی دی لیکن پوری طرح خود کو محفوظ نہیں رکھ سکا اور ورما کی کھڑی ہتھیلی کا وار اس کے شانے پر لگا۔ اس کا شانہ جھنجھنا اٹھا لیکن اس کی کارکردگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس نے ورما کی کلائی کو اپنی فولادی گرفت میں لے کر اس طرح جھٹکا دیا کہ ہڈی چٹخنے کی واضح آواز کے ساتھ وہ اڑتا ہوا کمپیوٹر پر جا گرا اور اسے لیتا ہوا فرش پر آ گیا۔ نیچے گرنے سے مانیٹر کی اسکرین ٹوٹ گئی اور کرچیاں دور دور تک بکھر گئیں۔ ورما خود ان کرچیوں پر گرا اور بیک وقت کئی کرچیاں جسم میں پیوست ہونے کی وجہ سے کراہ اٹھا۔ لیکن اس حالت میں بھی اس نے ہار نہ مانی اور اچھل کر ایک بار پھر کھڑا ہو گیا۔ اس بار اس کی ٹانگ نے شہریار کے پیٹ کی مزاج پرسی کی اور وہ زوردار ضرب کے نتیجے میں الٹ کر ایک صوفے پر جا گرا۔ ورما نے اسے مہلت دیے بغیر اس پر چھلانگ لگائی اور دونوں ہاتھوں میں اس کا گلا تھام کر دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی، شہریار کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اضطراری ردِعمل کے طور پر اس نے اپنی انگلیاں ورما کی بائیں آنکھ میں گھونپ دیں۔ ورما کے لیے یہ چوٹ ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی۔ وہ زور سے ڈکرایا اور اس کے گلے کو اپنے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔

شہریار کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ اس نے ورما کو نیچے گرایا اور خود اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھنے کے بعد اسے اپنے گھونسوں کی زد پر رکھ لیا۔ ان فولادی مکوں نے ورما کی کھوپڑی کو ہلا کر رکھ دیا۔ آنکھ کے زخم نے پہلے ہی اسے نڈھال کر دیا تھا، مکوں نے برداشت کی حد ختم کر دی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی شہریار اس کے سینے پر سے اترا اور ایک ڈھیر کی صورت میں ایک جگہ پڑے اپنے سامان میں سے نائلون کی رسی اٹھا کر ورما کے ہاتھ پیروں کو اس رسی کی مدد سے اچھی طرح باندھ دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنا سامان واپس اپنی جیبوں میں منتقل کیا اور ساتھ ہی اپنا اور ورما کا پسٹل بھی اٹھا لیا۔ ورما کو ہوش میں لا کر اس سے دو دو ہاتھ کرنے سے قبل وہ ایک بار مکان کا جائزہ لے لینا چاہتا تھا۔ ویسے تو یہ سامنے کی بات تھی کہ اگر ورما کے علاوہ کوئی دوسرا شخص مکان میں موجود ہوتا تو اس ہنگامہ آرائی کے نتیجے میں ضرور متوجہ ہو کر ادھر کا رخ کرتا لیکن پھر بھی اپنے طور پر تصدیق کرنا ضروری تھا۔ لاؤنج خالی پڑا تھا۔ کچن میں بھی سناٹا تھا، البتہ کاؤنٹر پر رکھے ایک مشہور ریسٹورنٹ کے برگر کے ڈبوں اور مشروبات کی بوتلوں کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ دو افراد اس ڈنر سے مستفید ہوئے ہیں یا پھر شاید اکیلا ورما ہی دو افراد کی خوراک ہضم کر گیا تھا۔ حقیقت کچھ بھی تھی، وہ مکان میں کسی دوسرے شخص کی موجودگی کا امکان محسوس کر کے مزید محتاط ہو گیا۔ جس کمرے میں اس نے ورما کو چھوڑا تھا، اس کے علاوہ مکان میں دو کمرے مزید تھے۔ اس نے پہلے کمرے کا دروازہ کھول کر اس کا جائزہ لیا۔ کمرا کسی ذی نفس سے خالی تھا۔ کوئی قابلِ ذکر فرنیچر بھی موجود نہیں تھا، بس فرش پر کارپٹ بچھا کر چند فلور کشنز وغیرہ رکھ دیے گئے تھے۔ اس نے احتیاطاً پردوں کے پیچھے بھی دیکھ ڈالا کیونکہ اتنا اندازہ تو وہ کر چکا تھا کہ پہلے کمرے میں جب وہ کھڑکی کے ذریعے داخل ہونے کے بعد اسے خالی سمجھ کر دروازے کی طرف بڑھنے کی غلطی کر بیٹھا تھا، اس وقت ورما پردے کے پیچھے چھپا ہوا تھا اور چپکے سے باہر نکل کر اسے قابو کر لیا تھا۔

یہ احتیاط پردوں کے پیچھے جھانک لینے کے بعد بھی جب اسے وہاں کوئی نہیں ملا تو وہ اس کمرے سے نکل کر اگلے اور آخری کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ہینڈل دبا کر دروازہ کھولتے ہی اسے پہلی نظر میں نیلگوں روشنی میں بستر پر محوِ استراحت نیم عریاں لڑکی نظر آ گئی۔ لڑکی شاید گدھے گھوڑے سب بیچ کر سو رہی تھی اس لیے اسے مکان کے اندر ہونے والے کسی واقعے کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ شہریار پھرتی سے اس کے قریب پہنچا اور پسٹل کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ لڑکی کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا اور وہ اسی طرح گہری نیند سوتی رہی۔

”اے اٹھو۔“ شہریار نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑا۔

”اوں...... سونے دو نا۔ پہلے ہی تم پیمنٹ سے ڈبل وصول کر چکے ہو اور اب پھر تنگ کر رہے ہو۔ بڑے گندے آدمی ہو۔“ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں البتہ جھنجلا کر جو کچھ بولی، اس سے شہریار نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کوئی کال گرل ہے جسے ورما شب بسری کے لیے لایا تھا اور خوب اچھی طرح نچوڑ ڈالا تھا۔ اس نے ایک بار پھر لڑکی کا جائزہ لیا۔ اس کے نقش و نگار خوب صورت تھے لیکن ساتھ ہی چہرے پر ایسی کرختگی پائی جاتی تھی جو پیشہ ور عورتوں کا خاصا ہوتی ہے۔ قریب سے دیکھنے پر اس کی عمر کے بارے میں بھی اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی نوعمر لڑکی نہیں بلکہ پینتیس سے

www.paksociety.com

چالیس کے درمیان کی پختہ عمر عورت ہے جس نے اپنے آپ کو اس حد تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے کہ کم از کم جسمانی ساخت کے اعتبار سے لڑکی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ شہریار نے ایک بار پھر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔

''او یار! میں نہیں اٹھ سکتی۔ میں نے انجکشن لگا لیا ہے، اب صبح ہی اٹھوں گی۔'' اس نے بند آنکھوں کے ساتھ ہی کہہ کر کروٹ بدل لی تو شہریار کو حقیقت سمجھ میں آئی۔ وہ عورت شاید کسی قسم کے نشے کی عادی تھی اور وہ نشہ لے چکی تھی اسی لیے اردگرد سے غافل تھی۔ اس کے اور ورما کے درمیان ہونے والی جھڑپ کی آوازیں اگر اس کے کانوں تک پہنچی بھی ہوں گی تو اس نے نشے میں دھت ہونے کے باعث وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ اس کی طرف سے قدرے مطمئن ہو کر اس نے اردگرد کا جائزہ لیا اور پھر الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری کھول کر ذرا سا جائزہ لینے پر اسے ایک دراز میں رکھی ٹائیاں نظر آ گئیں۔ اس نے دو ٹائیوں کو نکالا اور اس کی مدد سے عورت کے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ اب وہ اس لائق نہیں رہی تھی کہ بستر سے اٹھ کر اس کے کسی کام میں مداخلت کر سکتی۔ مزید احتیاط کے طور پر اس نے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بھی باہر سے بند کر دیا۔ یہ کمرا جو کہ یقینی طور پر ورما کے لیے بیڈ روم کا کام دے رہا تھا، خاص توجہ کا حق دار تھا اور اسے امید تھی کہ یہاں سے اسے بہت کچھ مل سکتا ہے لیکن فی الحال اس کے پاس کمرے کی باریک بینی سے تلاشی لینے کی فرصت نہیں تھی۔

ورما کے بے ہوش اور بندھے ہوئے ہونے کے باوجود وہ زیادہ دیر اس سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ ایک سیکرٹ ایجنٹ تھا جو ہوش میں آ جاتا تو بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کے باوجود بہت کچھ کر سکتا تھا چنانچہ پہلے اس سے نمٹنا ضروری تھا۔ وہ واپس اس کمرے میں آ گیا جہاں ورما کو چھوڑا تھا۔ ان دونوں کے ٹکراؤ کے نتیجے میں کمرے کی حالت خاصی خراب ہو گئی تھی اور کئی چیزیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں جن میں سب سے قابلِ ذکر زمین بوس ہو جانے والے مانیٹر کی اسکرین کی کرچیاں تھیں۔ موٹے تلے کے جوگرز کی وجہ سے وہ مزے سے ان کرچیوں کو روندتا ہوا ورما کے قریب پہنچا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ آنکھ پھوٹ جانے کے باعث بہنے والے خون نے اس کے چہرے کو بھیانک بنا دیا تھا۔ اس خون میں اس کے نتھنوں سے بہنے والا خون بھی شامل ہو گیا تھا اور کنپٹی سے بہہ کر نیچے فرش تک پہنچ گیا تھا۔ حقیقتاً اس نے ورما کو بہت بیدردی سے مارا تھا اور ناک کے ساتھ ساتھ اس کا جبڑا بھی متاثر نظر آ رہا تھا لیکن اپنے اس جنون پر اسے کوئی ندامت نہیں تھی۔ اس کے نزدیک ورما ایک ایسا شخص تھا جس کی بوٹی بوٹی بھی الگ کر دی جاتی تو کوئی گناہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ وہ شخص تھا جس کے حکم پر لمحوں میں انسانی جسموں کے چیتھڑے اڑا دیے جاتے تھے اور جو معصوم بے گناہ لڑکیوں کو اپنی خونی دیوی کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے ذرا ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوتا تھا۔

ورما پر ایک نفرت بھری نظر ڈالتا ہوا وہ ملحقہ باتھ روم تک گیا اور وہاں سے آدھی بالٹی پانی بھر لایا۔ اس پانی کو اس نے پورا کا پورا ورما پر انڈیل دیا۔ پانی پڑنے پر وہ جھرجھری سی لے کر ہوش میں آیا اور اپنی سلامت رہ جانے والی اکلوتی آنکھ کو کھول کر دیکھا۔

''کون ہو تم..... اور کیا کرنے آئے ہو؟'' شہریار پر نظر پڑتے ہی اس نے پوچھا۔

''یہ تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے کہ تم کون ہو اور میرے وطن میں کیا کرنے آئے ہو؟'' شہریار نے تلخی سے اسے جواب دیا۔

''اوہ..... تم کوئی سیکرٹ ایجنٹ ہو۔ میں نے غلطی کی کہ تمہیں کوئی چور اچکا سمجھا اور آسانی سے اندر آنے دیا ورنہ اس وقت میری جگہ تم یہاں پڑے ہوتے۔'' ورما نے نفرت انگیز لہجے میں جواب دیا۔

''یعنی تم شروع سے جانتے تھے کہ میں تمہارے گھر میں گھسا ہوں؟''

''بالکل، اس مکان میں مختلف مقامات پر کلوز سرکٹ کیمرے موجود ہیں اور جیسے ہی کوئی کھلے گیٹ کے علاوہ کسی راستے سے مکان میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے، میری رسٹ واچ میں فکس ایک ڈیوائس اشارہ دے دیتی ہے۔ تم نے بھی جب بیرونی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی تو مجھے اشارہ مل گیا۔ میں سوتے سے اٹھ کر اس کمرے کی طرف دوڑا اور کمپیوٹر کی اسکرین پر تمہاری ایک ایک حرکت کا جائزہ لیتا رہا۔ تم کھڑکی کے راستے اندر آنے کے خواہش مند تھے۔ میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی اور جان بوجھ کر اس کمرے کی کھڑکی کا لاک کھول دیا۔ تم چور کے بجائے کچھ اور ہو، اس بات کا اندازہ اس وقت ہوا جب تم نے خاموشی سے تلاشی دیتے دیتے اچانک پلٹ کر حملہ کر دیا۔ تمہارے لڑنے کے انداز نے مجھے بتا دیا کہ تم کوئی تربیت یافتہ آدمی ہو اور میں انجانے میں تمہیں ڈھیل دینے کی غلطی کر چکا ہوں۔'' ورما نے اسے جواب دیا۔

''تمہارا یہ جواب ایک طرح سے اعترافی بیان ہے کہ تم غیر ملکی سیکرٹ ایجنٹ ہو۔'' شہریار نے اس کی بات سن کر نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

''تم کچھ بھی کہہ لو، کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے بھی اپنی سرزمین پر غیر ملکی سیکرٹ ایجنٹوں کا وجود تمہارے لیے کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ یہاں اتنی بڑی تعداد میں مختلف ملکوں کے ایجنٹوں کا جال بچھا ہوا ہے کہ تم اپنے پڑوسی بلکہ سگے بھائی کے بارے میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ تمہارے ملک کا وفادار ہے یا غدار۔'' ورما نے ایک تلخ حقیقت بیان کی تھی۔ یہ اس ملک کا المیہ تھا کہ اس پر بسنے والے ہی اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ غیر ملکی خفیہ ایجنسیوں کا وجود کسی ملک میں ہونا اتنی خطرناک بات نہیں تھی جتنا اس ملک کے اپنے باسیوں کا ان ایجنسیوں کے لیے کام کرنا۔ پیسے بلکہ بے تحاشا پیسے کی چمک لوگوں کے ایمان کو اس طرح ڈگمگا دیتی تھی کہ وہ اپنے ضمیر سمیت مادرِ وطن کا سودا کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔

''غداروں اور دشمنوں کو نیست و نابود کرنا ہی میری زندگی کا مشن ہے۔ جیسے میں تجھ تک پہنچا ہوں، ویسے ہی غداروں تک بھی پہنچ جاؤں گا۔ مجھے طعنے دینے کے بجائے فی الحال تو تُو اپنی خیر منا۔'' ورما سے بے تحاشا نفرت تو اپنی جگہ تھی ہی، اس وقت اس کی بکواس سن کر وہ اور بھی طیش میں آ گیا اور ایک لات گھما کر اسے رسید کی۔

''خیر! میں نہیں تم مناؤ۔ تم مجھے زیادہ سے زیادہ اتنا ہی نقصان پہنچا سکتے ہو کہ میری جان لے لو لیکن اس کارنامے کے بعد خود تمہیں صحیح سلامت یہاں سے نکلنا نصیب نہیں ہوگا۔'' ورما کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔ زخمی آنکھ اور خون سے لتھڑے چہرے کے ساتھ مسکراتا وہ بہت ہی بھیانک لگ رہا تھا لیکن اصل چیز اس کا اطمینان تھا۔ مخالف حالات کے باوجود وہ پریشان نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ شہریار کے ہاتھوں نہیں بلکہ شہریار اس کے ہاتھوں زیر ہوا پڑا ہو۔ اس بات نے شہریار کو چونکا دیا۔ وہ اپنے اردگرد خطرے کی بو محسوس کرنے لگا۔ اس احساس نے اس کی وحشت کو اور بھی بڑھا دیا اور اس نے زخمی ورما کو بُری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔

''بتا کیا چکر ہے؟ تجھے کس کی مدد کا آسرا ہے جو مجھے اس طرح دھمکا رہا ہے؟'' وہ ورما کو مارتا جا رہا تھا اور پوچھتا جا رہا تھا۔ ورما کے منہ سے اس مار پیٹ کے نتیجے میں ہلکی ہلکی کراہوں کے سوا ایک لفظ بھی برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ اسی اثنا میں فضا میں فائر کی آواز گونجی۔

''لو وہ آ گئے۔'' ورما نے تکلیف کے باوجود سلگا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشی سی کی۔ شہریار جو فائر کی آواز پر پہلے ہی ٹھٹک گیا تھا، اس جملے کو سن کر سمجھ گیا کہ ورما نے کسی طرح اپنے مددگاروں کو یہاں بلوا لیا ہے اور اب وہ یہاں اس مکان میں کسی چوہے کی طرح پھنس گیا ہے۔ اس چوہے دان سے نکلنے کا راستہ کس طرح نکلتا، یہ تو بعد کی بات تھی..... فی الحال اسے ورما سے نمٹنا تھا۔ اس موذی سانپ کو وہ کسی بھی طرح ایک بار پھر آزاد ہونے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ اس کے سینے میں دفن رازوں کو اگلوانے کی خواہش کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے پسٹل کا رخ اس کے سینے کی طرف کر دیا لیکن اس سے قبل کہ وہ فائر کرتا، باہر سے سنائی دینے والے فائروں کی پے در پے آوازوں نے اس کی ٹریگر پر جمی انگلی کو حرکت دینے سے روک دیا۔ سنائی دینے والی فائرنگ کی آواز بالکل ایسی تھی جیسے دو گروہ آپس میں مقابلہ کر رہے ہوں۔ ان گروہوں میں سے ایک گروہ تو یقینی طور پر ورما کے آدمیوں کا تھا لیکن دوسرے کے بارے میں درست قیاس کرنا ذرا مشکل تھا۔ نہیں معلوم تھا کہ ورما کے آدمی اپنے ساتھ اپنے دشمنوں کو پیچھے لگا کر لے آئے ہیں یا پولیس کی کوئی گشتی گاڑی ان کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔

معاملہ جو بھی تھا، وہ اپنے لیے بچت کا ایک موقع نکال سکتا تھا۔ اس نے ورما کو فوری طور پر ہلاک کرنے کا ارادہ ترک کیا اور پسٹل سے ایک زوردار ضرب اس کی کنپٹی پر رسید کر کے اسے بے ہوش کر دیا۔ اب ورما اس کے خلاف کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا اور اس کے پاس موقع تھا کہ وہ اس کو یہاں سے زندہ نکال کر لے جانے کے امکانات کا جائزہ لے سکتا۔ اپنے پاس سواری کی کمی کی موجودگی کا مسئلہ وہ ورما کی گاڑی کے ذریعے حل کر سکتا تھا۔ ذہن میں ابھرنے والا یہ خیال اسے اتنا اچھا لگا کہ فوراً ہی ورما کو اس کی گاڑی میں منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا بلکہ ایک طرح سے اسے افسوس ہی ہوا کہ اس نے یہاں اتنا وقت کیوں ضائع کیا اور پہلے ہی یہ فیصلہ کیوں نہیں کر لیا۔ اس نے بے ہوش ورما کو اپنے کندھے پر لادا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں داخل ہوتے وقت وہ دیکھ چکا تھا کہ ورما کی گاڑی احاطے میں داخلی دروازے کے قریب ہی کھڑی ہوئی ہے۔ ورما کو اس کی گاڑی میں منتقل کرنے کا کام اس نے سہولت سے پورا کر لیا۔ باہر فائرنگ کا سلسلہ ہنوز جاری تھا لیکن اس کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔ اس نے ایک خطرناک چانس لینے کا فیصلہ

www.paksociety.com

کیا۔ اگر وہ تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا ہوا وہاں سے نکل جاتا تو ممکن تھا کہ باہم فائرنگ میں مصروف دونوں گروہوں کو چکما دے کر نکل جانے میں کامیاب ہو جاتا ورنہ دوسری صورت میں اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، وہ ورما کو اس کے ساتھیوں کے درمیان دوبارہ واپس نہیں جانے دے گا اور بازی ہاتھ سے نکلتی دیکھ کر فوراً ہی اسے گولی مار دے گا۔

اس منصوبے پر عمل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ بیرونی گیٹ بند تھا۔ اگر وہ گیٹ کھولنے جاتا تو واپس ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھنے تک باہر موجود لوگ متوجہ ہو جاتے۔ چابی کے بغیر گاڑی کھولنا اور چلانا تو اس کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ تربیت کے کڑے مراحل سے گزرتے اس نے جہاں بہت کچھ سیکھا تھا، وہاں ایک معمولی تار کی مدد سے کسی بھی لاک کو کھول لینا یا چابی کے بغیر گاڑی اسٹارٹ کر لینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ درپیش مسئلے کا بھی آخر ایک حل اسے سوجھ گیا۔ اس نے اپنے پاس موجود نائلون کی ڈوری نکالی اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ فائرنگ کا سلسلہ اب بہت ہی سست ہو گیا تھا۔ اندر وقفے وقفے سے ایک دو فائر سنائی دے رہے تھے۔ اس نے گیٹ کے قریب پہنچ کر اس کا جائزہ لیا۔ خوش قسمتی سے گیٹ اس نوعیت کا تھا کہ اس کے دونوں پٹ اندر کی طرف کھلتے۔ اس نے گیٹ پر لگا اوپری بولٹ اور درمیان میں موجود کنڈی کھولی اور نائلون کی رسّی کا ایک سرا کنڈی سے باندھنے کے بعد دوسرے سرے پر موجود آنکڑے کو دروازے کے دوسرے پٹ میں اٹکا دیا۔ رسّی خاصی بڑی تھی اور وہ اسے آرام سے گاڑی تک لے جا سکتا تھا۔ اس کا پروگرام تھا کہ گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرنے کے بعد رسّی کھینچ کر گیٹ کے دونوں پٹ اندر کی طرف کھینچ کر کھول دے گا اور گاڑی کو تیزی سے نکال کر لے جائے گا۔ اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے ابھی وہ رسّی سمیت گاڑی تک پہنچا ہی تھا کہ کوئی دھم سے اندر کودا۔ اس نے اضطراری ردِعمل کے طور پر فوراً ہی پسٹل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

''سی ایف پی۔'' وہ شخص فوراً ہی بلند آواز میں بولا تو شہریار کا پسٹل والا ہاتھ جھک گیا اور ہونٹوں سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ باہر متصادم گروہوں کے بارے میں اب سارے شکوک دور ہو گئے تھے۔ وہ ورما کے ساتھی اور سی ایف پی کے اہلکار تھے جو پچھلے کئی منٹوں سے آپس میں برسرِپیکار تھے اور اب اس اہلکار کو دیکھ کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ باہمی مقابلے میں سی ایف پی کو برتری حاصل ہو چکی ہے۔

''ورما اس گاڑی میں ہے اور اندر ایک کال گرل موجود ہے۔ اس کے علاوہ مکان میں کوئی اور نہیں ہے۔'' اس نے سی ایف پی کے اہلکار کو اطلاع دی۔

''آپ باہر چل کر گاڑی میں بیٹھیں۔ یہاں کے معاملات ہم لوگ نمٹا لیں گے۔'' اہلکار نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تو وہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ ورما کو چھوڑ کر جانا اس کے لیے مشکل تھا لیکن موجودہ حالات میں خود اس کی پوزیشن خاصی آکورڈ ہو گئی تھی۔ اپنے تئیں وہ نہایت خاموشی سے ایک مشن انجام دینے چلا تھا لیکن یہاں ٹھیک ٹھاک ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا اور ظاہر تھا کہ اگر سی ایف پی والے اس معاملے میں دخل نہ دیتے تو وہ انجانے میں ورما کے ساتھیوں کے ہاتھوں مارا جاتا۔ جوش میں یہاں آتے ہوئے وہ جاننے کے باوجود اس بات کو فراموش کر چکا تھا کہ سی ایف پی کے اہلکار ورما کی نگرانی پر مامور ہیں۔ وہ یہاں پہنچا تھا تو اردگرد کوئی نظر بھی نہیں آیا تھا لیکن یقیناً وہ خود ان لوگوں کی نظروں میں آگیا تھا اور بعد میں انہوں نے سچویشن بگڑتی دیکھ کر دخل اندازی کر کے اسے تحفظ فراہم کیا تھا۔ بالآخر اس نے اہلکار کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا اور باہر کا رخ کر لیا۔ باہر دو تین گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کی ایک گاڑی کی طرف راہنمائی کر دی گئی۔ وہ گاڑی کے قریب پہنچا تو اندر بیٹھے عمر فاروق کو دیکھ کر جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ شاید وہ واحد شخص تھے جن کا بے حد احترام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ دل ہی دل میں ان سے مرعوب بھی تھا اور ان کے سامنے جواب دہی کو آسان نہیں سمجھتا تھا۔

''بیٹھو۔'' انہوں نے اسے دیکھ کر یک لفظی حکم دیا جس کی اس نے پھرتی سے تعمیل کی۔ اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ سفر خاموشی سے کٹنے لگا۔ جانے پہچانے راستوں سے گزرتی ہوئی گاڑی کو دیکھ کر اس نے جان لیا کہ وہ واپس اپنے ٹھکانے کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ بوجھل سی فضا میں آخرکار یہ سفر بھی تمام ہو گیا۔

''کیا تمہیں سی ایف پی پر اعتبار نہیں ہے؟'' گاڑی سے اتر کر وہ عمر فاروق کے پیچھے چلتا ہوا اندر پہنچا تو انہوں نے اسے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی اس کے سامنے نشست سنبھال لی اور اپنی خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے سر! اگر مجھے اعتبار نہ ہوتا تو میں آپ لوگوں کے ساتھ کیوں ہوتا؟'' اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''اگر تمہیں اعتبار ہوتا تو تم ورما کے سلسلے میں اس طرح نہیں کرتے۔'' انہوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''آئی ایم سوری سر! لیکن ورما جیسے موذی کو میں ذرا سی ڈھیل نہیں دینا چاہتا تھا۔''

''تو تمہارے خیال میں ہم نے اسے ڈھیل دی ہوئی تھی اور ہمارے آدمی وہاں اس کی نگرانی کرنے کے بجائے کبڈی کھیل رہے تھے؟'' عمر فاروق تلخ ہو گئے۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں ورما کو آپ لوگوں سے زیادہ بہتر جانتا ہوں۔ اگر اسے ذرا بھی شک ہو جاتا کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے تو وہ آپ کے آدمیوں کو چکما دے کر نکل جاتا اور میں دوبارہ اس کے غائب ہونے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔'' اس نے صفائی پیش کی۔

''تمہارا مسئلہ یہ ہے شہریار کہ تم اس جنگ میں صرف ملکی مفاد میں نہیں، ذاتی انتقام کی خاطر بھی اترے ہو۔ شاید لاشعوری طور پر ورما سے تمہارے عناد میں وہ قلبی نفرت بھی شامل ہے جو تم اپنی بھتیجی اور کزن کی موت کے باعث اس سے کرتے ہو اور وہ نفرت تم سے کہتی ہے کہ ورما کو نیست و نابود کر ڈالو۔'' عمر فاروق نے اس کی دی گئی صفائی کو قبول کرنے کے بجائے نہایت صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں سر!'' شہریار نے احتجاج کرنا چاہا۔

''نہیں، میں غلط نہیں سمجھ رہا بلکہ تم خود اپنے مسئلے کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ تم انسان ہو شہریار اور بے شک ایک اچھے انسان ہو لیکن بشری کمزوریوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ مجھے تمہاری حب الوطنی پر کوئی شک نہیں ہے لیکن تم تسلیم کرو یا نہ کرو، یہ حقیقت ہے کہ تمہارا جذبۂ حب الوطنی بھی تمہارے اندر بھڑکتی ذاتی انتقام کی آگ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا ورنہ تم عقل سے کام لیتے ہوئے اس بات کو سمجھتے کہ ہم نے ورما کو فوری گرفتار کرنے کے بجائے اس کی نگرانی پر کیوں اکتفا کر رکھا تھا۔ ہم کوشش کر رہے تھے کہ اس طرح اور لوگوں کو بھی ٹریس کر سکیں۔ اس کے علاوہ ہمارے سامنے سلّو والا معاملہ بھی تھا۔ موہنی کی موت کو ہم نے چاہے کتنا بھی حادثاتی رنگ دینے کی کوشش کی ہو لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ اس کے آقاؤں نے سو فیصد اس بات کا یقین کر لیا ہو کہ وہ حادثے کا شکار ہوئی ہے۔ ان حالات میں ورما کے خلاف ہونے والی کارروائی انہیں مزید چونکا دے گی۔ ہو سکتا ہے وہ سلّو کو واپس بھجوانے کا ارادہ ہی ملتوی کر دیں اور تم جانتے ہو کہ سلّو کا نظر میں رہنا کتنا ضروری ہے۔'' اس کے احتجاج کو خاطر میں لائے بغیر عمر فاروق بولتے چلے گئے۔ اس بار اس نے کچھ نہیں کہا اور سر جھکا لیا۔ شاید وہ خود بھی دل ہی دل میں اپنا تجزیہ کر رہا تھا اور کسی حد تک ان سے متفق تھا۔ ادھر عمر فاروق کی بات جاری تھی۔

''تم میری بات سے اس لیے بھی اختلاف نہیں کر سکتے کہ میں شروع ہی سے تمہاری کیفیت سمجھ رہا ہوں۔ تم مجھے اپنا ٹرینر ہی نہیں، نبض شناس بھی سمجھو اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب تم یہاں سے نکل کر ورما کی رہائش گاہ کی طرف گئے تھے تو میں مستقل تمہارے پیچھے تھا۔ تم کس طرح اندر داخل ہوئے، میں نے وہ بھی دیکھا اور کون سی غلطیاں کیں یہ بھی میری نظر سے چھپی نہیں رہیں۔ تم جوش میں تھے اس لیے تمہیں ہوش نہیں رہا کہ ورما جیسا ایجنٹ جو پہلے ایک بار تمہارے ہاتھوں زک اٹھا چکا ہے، بغیر کسی قسم کے حفاظتی اقدامات کے کیسے کسی جگہ رہ رہا ہوگا۔ اندر کی سچویشن کا میں تمہارے بتائے بغیر بھی اندازہ لگا سکتا ہوں اور اس بات پر خوش بھی ہوں کہ میری تربیت بالکل رائگاں نہیں گئی اور تم نے مشکل حالات میں بھی اتنی بھرپور طریقے سے جدوجہد کی کہ ورما کو زیر کر لینے میں کامیاب ہو گئے لیکن ساتھ ہی تمہارے اپنے لیے بہت بڑا خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ اگر میں اور دوسرے ساتھی باہر موجود نہ ہوتے تو تم ورما کے ساتھیوں کے ہاتھوں مارے جاتے۔ وہ لوگ پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ خوش قسمتی سے انہیں اندازہ نہیں تھا کہ باہر ہم لوگ موجود ہیں۔ ان کی بے خبری میں ہم نے ان پر حملہ کیا پھر بھی کافی مقابلے کے بعد انہیں زیر کر سکے۔''

''شاید ورما کے پاس کوئی آپریٹس تھا جس کی مدد سے اس نے اپنے ساتھیوں کو کال کر لیا تھا۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں اسے زیر کر لینے کے باوجود وہاں سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔'' عمر فاروق کی تفصیلات بیان کرنے پر اس نے بھی اپنا اندازہ بیان کیا۔

''یقیناً ایسا ہی ہوگا۔'' انہوں نے تائید کی۔ ''یہ جدید ایجادات کا دور ہے اور مختلف ملکوں کے سیکرٹ ایجنٹس سے نمٹتے ہوئے ہم نے بارہا انہیں ایسی ایجادات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، تم نے ورما کو بے بس کر کے باندھنے کے ساتھ اس کی مکمل تلاشی لینا ضروری نہیں سمجھا ہوگا یا اگر تلاشی لی بھی ہوگی تو ہتھیاروں

www.paksociety.com

وغیرہ پر ہی توجہ مبذول رکھی ہوگی۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ ایسے شخص سے اس کے استعمال کی معمولی سے معمولی شے بھی لے لی جائے۔ رسٹ واچ، کف لنکس، والٹ یا پین کسی بھی شے میں ایسی چھوٹی سی ڈیوائس فٹ کر دینا جس کے ذریعے ضرورت کے وقت اپنے ساتھیوں سے رابطہ کیا جاسکے یا انہیں کوئی اشارہ دیا جاسکے، اب ایک عام سی بات ہو چلی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ورما کے ذاتی سامان کا بغور جائزہ لیں گے تو اس کے پاس سے ایسی کوئی نہ کوئی شے ضرور برآمد ہو جائے گی۔''

''آئی ایم ایکسٹریملی سوری سر! آپ کی باتیں سن کر مجھے اپنی غلطیوں کا بھرپور احساس ہو گیا ہے۔ میں ابھی بس خام ہوں جسے کندن بننے کے لیے ابھی آپ سے مزید تربیت لینے کی ضرورت ہے۔'' شرمندہ سے شہریار نے اس بار کھل کر اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا۔

''نہیں ینگ مین، نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری غلطیوں کے پیچھے تمہاری تربیت میں کمی سے زیادہ تمہارے جذبات کے اندھے پن کا زیادہ دخل تھا۔ اگر تم غصے اور طیش میں نہ ہوتے تو اس سے کہیں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے۔ پھر بھی مجھے خوشی ہے کہ تم نے مشکل حالات کے باوجود ورما کو زیر کرلیا تھا۔'' انہوں نے اصل مسئلہ بیان کرتے ہوئے ایک بار پھر اس کی کارکردگی کو سراہا۔

''جو بھی بات ہو لیکن میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ اس لیے کہ میرے رویے کو آپ نے سی ایف پی پر بے اعتباری سے تعبیر کیا حالانکہ میرے ذہن میں دور دور تک ایسا کوئی خیال نہیں تھا۔'' اس نے ایک بار پھر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''جانے دو۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن تمہاری جذباتیت نے ایک بڑا نقصان یہ کیا ہے کہ تم سی ایف پی کے جوانوں کی نظر میں آگئے ہو جبکہ ہماری خواہش تھی کہ مکمل طور پر تبدیلی کا عمل پورا ہو جانے پر ہی تم یہاں سے نکلو اور اپنا کام شروع کرو۔'' وہ بغیر طیش ظاہر کیے اس کی ایک اور حماقت کو سامنے لائے تو وہ حقیقتاً بے پناہ شرمندگی میں ڈوب گیا۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اسے تبدیلی کے مراحل سے گزارنے کے لیے کتنا کثیر سرمایہ خرچ کیا جارہا ہے اور اس کی معمولی سی حماقت اس سرمائے کو ڈبو بھی سکتی ہے۔ شرمندگی اتنی تھی کہ وہ اس بار معذرت بھی نہ کرسکا لیکن دل میں عہد ضرور کیا کہ آئندہ ممکنہ حد تک ان مخلص لوگوں کا تابع دار رہے گا اور کسی بھی حکم یا ہدایت سے روگردانی کرنے کی غلطی نہیں کرے گا۔

''ایک معاملہ بگڑ گیا سو بگڑ گیا۔ ورما کی خفیہ نگرانی سے شاید ہم زیادہ فوائد حاصل کرسکتے تھے لیکن اب جبکہ وہ ہماری کسٹڈی میں ہے تو بھی کچھ نہ کچھ تو اس سے اگلوا ہی لیں گے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس لامحدود وسائل اور نفری نہیں ہے لیکن مسائل ہر طرف ہیں۔ اظفر اور اس کی ٹیم کو ہم نے پیر آباد کے ساتھ والے جنگل میں بھیجا تھا اور وہاں سے ہمیں ان کی لاشیں موصول ہوئیں۔ بظاہر وہ سب حادثے کا شکار ہوئے اور جنگلی جانوروں کا نشانہ بن گئے لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کچھ اور کہہ رہی ہے۔ ان لوگوں کی موت تو بے شک جنگلی کتوں کے حملے سے ہی ہوئی ہے لیکن ایسے آثار ملے ہیں جن سے لگتا ہے کہ موت سے قبل ان پر بے ہوش کر دینے والی کسی گیس یا دوا کا استعمال کیا گیا تھا اور ظاہر ہے یہ کام انسان ہی کر سکتے ہیں۔ یعنی اظفر اور اس کے ساتھیوں کے قتل کو جان بوجھ کر حادثاتی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے ورنہ موت کے وقت وہ بے چارے بے ہوش تھے۔ بے ہوش ہونے کی وجہ سے وہ لوگ اپنے دفاع کے لیے کچھ نہیں کرپائے اور بے بسی کی موت مر گئے۔ ان کے ساتھ جانے والے ڈرائیور کے آخری الفاظ بھی بہت معنی خیز ہیں۔ چودھری اور افیون کے حوالے سے کئی قسم کے اندازے لگائے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے ایک اندازہ یہ ہے کہ شاید شہر والی فیکٹری میں ریڈ کے بعد چودھری نے جنگل میں افیون سازی کے لیے کوئی ٹھکانا بنا لیا ہے اور اس ٹھکانے کی حفاظت کے لیے وہ قتل و غارت گری سے کام لے رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ حالات بڑے پیچیدہ ہیں۔ اظفر اور اس کے ساتھ جانے والے اہلکار بہت ہوشیار اور بہادر تھے اور ان کے اتنی آسانی سے نشانہ بن جانے پر ہم سب کو سخت تشویش ہے۔ ہم اب ان جیسی کوئی ٹیم وہاں بھیجنے کی غلطی نہیں کرسکتے کیونکہ یہ صاف ظاہر ہو چکا ہے کہ تحقیقاتی ٹیم کا کور بھی انہیں محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اس کے بعد ہمارے پاس دو راستے بچتے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کے بھی علم میں لائے بغیر وہاں خفیہ طور پر ٹیم بھیجیں۔ لیکن ایسی ٹیم کے لیے حالات اس لیے زیادہ مخدوش ہوں گے کہ مقامی افراد کی مدد کے بغیر جنگل میں گھسنا خطرے کو دعوت دینا ہے۔ ہمارے لوگوں میں سے فی الحال کوئی ایسا نہیں ہے جو جنگلی حیات کا بھی ماہر ہو اور وہاں کام کرسکے اس لیے میں تو کم از کم کسی ٹیم کو وہاں بھیجنے کی حمایت نہیں کرسکتا۔ اب رہ جاتا ہے دوسرا راستہ یعنی جنگل میں باقاعدہ آپریشن کرنا تو یہ اس لیے مشکل ہے کہ ہم کسی واضح ثبوت

www.paksociety.com

کے بغیر اتنا بڑا آپریشن کروانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس قسم کے آپریشن کے لیے بڑے وسائل اور نفری درکار ہوتی ہے اور ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے جو آپریشن ہوا تھا، اسے اتنا زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ہم پولیس ڈپارٹمنٹ کو دوبارہ اس کام کے لیے آمادہ کر سکیں۔" وہ اپنی ساری ناراضی بھلا کر اب بہت دوستانہ انداز میں مسائل کو ڈسکس کر رہے تھے۔

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ اگر ہماری طرف سے ایسی کوئی درخواست کی گئی تو پولیس ڈپارٹمنٹ کا مؤقف ہوگا کہ حال ہی میں تو جنگل میں آپریشن ہوا تھا اور اگر وہاں کوئی مشکوک سرگرمی جاری تھی تو اسے آپریشن کے دوران نظر میں آجانا چاہیے تھا۔" اس نے عمر فاروق کی بات سے اتفاق کیا پھر کچھ یاد آجانے پر چونک کر بولا۔ "مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس آپریشن کے وقت ایک جوگی نما شخص خود بخود ہی پولیس والوں سے آکر ملا تھا اور اس نے پیشکش کی تھی کہ وہ پولیس والوں کی سیدھے ڈاکوؤں کے ڈیرے تک راہنمائی کر دے گا۔ ایسا ہوا بھی تھا اور پولیس کو ڈاکوؤں تک پہنچنے کے لیے بالکل بھی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ یعنی وہ جنگل میں اِدھر اُدھر بھٹکے بغیر سیدھے مخصوص علاقے میں پہنچے تھے اور سارا جنگل چھان مارنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ بعد میں مفرور ڈاکوؤں کی تلاش میں بھی جو آپریشن ہوا تھا، وہ بھی محدود پیمانے پر ہوا تھا۔ اس وقت تو مجھے کوئی شک نہیں ہوا تھا لیکن اب احساس ہو رہا ہے کہ آپریشن کو محدود رکھنے کے لیے جان بوجھ کر وہ مخبر پولیس تک پہنچایا گیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں ڈاکوؤں کو بلی چڑھا کر کوئی ان سے زیادہ اہم شے چھپائی گئی تھی اور یہ بات بھی واضح ہے کہ جنگل میں بسنے والے ڈاکوؤں کی سرپرستی بھی چودھری کرتا ہے اور وہاں جو گڑبڑ ہے وہ بھی اسی کی سرپرستی میں ہو رہی ہے۔" وہ حالات کا بالکل ٹھیک تجزیہ کر رہا تھا۔

"یو آر رائٹ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ چودھری امریکا جا کر بیٹھا ہوا ہے اس لیے فی الحال ہم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔" عمر فاروق نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

"چودھری پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تو کیا ہوا اس کے گرگے تو ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں سے کسی اہم مہرے کو قابو کریں اور اس کی زبان کھلوائیں۔ اس طریقے سے مجھے امید ہے کہ ہم کسی بڑے جھنجٹ میں پڑے بغیر زیادہ معلومات حاصل کر سکیں گے۔" اس نے مشورہ دیا جو عمر فاروق کے دل کو بھی لگا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں ذیشان سے یہ معاملہ ڈسکس کروں گا۔ تم اب جاؤ اور آرام کرو۔ رات کا بہت تھوڑا حصہ ہی باقی بچا ہے۔ صبح سے پھر تمہیں اپنی روٹین پر عمل کرنا ہوگا۔" اس سے اتفاق کرتے ہوئے انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں حکم دیا تو اس نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دی۔

"شہریار!" وہ ابھی دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ ان کی پکار نے اسے پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

"یس سر!"

"تم ہمارے لیے بہت قیمتی ہو بیٹا! ہم تمہیں میدانِ جنگ میں اتارنے کے لیے تیار ضرور کر رہے ہیں لیکن ہمیں تمہاری سلامتی بھی عزیز ہے۔ تم نڈر اور بہادر ہو، یہ اچھی بات ہے لیکن پھر بھی خود کو اس طرح اندھے خطرے میں ڈالنے کی حماقت نہیں کرنا۔ خصوصاً اس وقت تک جب تک تمہیں اجازت نہیں دی جاتی۔ تمہیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے اور تمہارے جیسا شخص اپنے ٹیلنٹ کے مطابق کام کیے بغیر ضائع ہو جائے، اس سے زیادہ افسوس ناک بات کیا ہوگی۔" ان کے انداز میں اس کے لیے محبت ہی محبت تھی۔ اس محبت پر اس نے اپنا دل گداز ہوتا محسوس کیا۔ بہت سے رشتوں سے محروم ہو جانے کے باوجود وہ خوش قسمت تھا کہ محبت سے کبھی محروم نہیں رہا تھا اور وہ کسی نہ کسی شکل میں اسے ملتی رہی تھی۔

"آپ بے فکر رہیں۔ اب آپ کو ایسی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" اپنے اندرونی جذبات پر قابو پا کر اس نے انہیں جواب دیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

دارالامان کی فضا دم گھونٹ دینے والی تھی اور سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والی شازمین کے لیے یہاں وقت گزارنا خاصا کٹھن تھا لیکن مجبوری تھی۔ یہاں کے سوا کہیں اور رہنا کسی صورت ان کے حق میں بہتر نہیں تھا۔ کہنے کو تو ان کے کئی رشتے دار شہر میں مقیم تھے لیکن ایک تو نواب صاحب کا برسوں سے ان سے ملنا جلنا نہیں تھا، دوسرے وہ خود بھی وہاں جانا مناسب نہیں سمجھ رہی تھی۔ کسی بھی رشتے دار کے گھر جانے کی صورت میں اسے بہت سے سوالوں کے جواب دینے پڑتے اور وہ لوگ کرید کرید کر اس سے پیش آنے والے واقعے کی تفصیلات جاننے کی کوشش کرتے اور ظاہر ہے وہ کسی کے سامنے اپنی قابلِ شرم داستان نہیں بیان کر سکتی تھی۔ زندگی بھر اپنے باپ کے شرمناک کردار سے

نفرت کرنے کے باوجود وہ باپ بیٹی کے رشتے کی فطری محبت میں تو بہرحال جکڑی ہوئی تھی اور مرنے کے بعد اب انہیں کسی کے سامنے موضوعِ گفتگو نہیں بنانا چاہتی تھی اس لیے فی الحال یہیں رہنے میں عافیت تھی۔

اس کی سگی اور سوتیلی دونوں والداؤں میں سے بھی کسی نے یہاں سے جانے کی بات نہیں کی تھی۔ وہ دونوں اپنی جگہ گم صم تھیں۔ انہوں نے بیوہ ہو جانے والی عورتوں کی طرح بین کرنے یا رونے دھونے کی بھی زحمت نہیں کی تھی اور عجیب سے شاک کی کیفیت میں نظر آتی تھیں۔ شازمین کو لگتا تھا کہ وہ تذبذب کا شکار ہیں کہ بیوہ ہونے کے غم میں روایت کے مطابق سوگ منائیں یا برسوں کی ایب نارمل زندگی سے نجات ملنے پر خوش ہوں۔ اس کے بھائی بھی ابھی تک نہیں آسکے تھے البتہ انہوں نے فون پر اس سے بات کر لی تھی۔ موسم کی خرابی اور لینڈ سلائڈنگ کی وجہ سے راستے بند تھے اور کہنا مشکل تھا کہ کب تک وہ کراچی پہنچ سکیں گے۔ فون پر البتہ انہوں نے اسے بہت تسلی دی تھی اور اس نے بھی ان کے اطمینان کے لیے یقین دہانی کروا دی تھی کہ وہ جہاں ہے، وہاں اسے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ گزرنے والے اس حادثے کا دکھ بانٹنے کے لیے وہ کسی اپنے کے شانے پر سر رکھ کر رونا چاہتی تھی۔ سرد خانے میں رکھی باپ کی لاش پر رونے کے سوا ایک اور دکھ بھی اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ ابھی تک وہ جاوید علی کے بارے میں کوئی خیر خبر حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ منہدم ہو جانے والی کوٹھی میں چند لوگ ہی سلامت رہ سکے تھے اور جاوید علی کے بارے میں اسے بڑی مشکل سے صرف اتنی خبر ملی تھی کہ وہ شدید زخمی حالت میں اسپتال میں داخل ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ بھی معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی اور سخت پریشان تھی۔ جاوید علی اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا اور اپنی بہادری اور وجاہت کے باعث اس کے دل میں جگہ بنانے میں بہت تیزی سے کامیاب ہو گیا تھا۔

دل پر پہلی دستک دینے والے اس مرد کے لیے اس کا پریشان ہونا بھی بہت فطری تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے دل ہی دل میں اس کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی اور خواہش مند تھی کہ کسی طرح اس کا جاوید علی سے رابطہ ہو جائے۔ دل کی اس خواہش میں ایسی شدت تھی کہ دوسری طرف ہلچل ہونا لازمی تھا۔ دل سے دل کے رابطے کی کوئی عقلی یا سائنسی توجیح بے شک نہ پیش کی جا سکے لیکن اس انوکھے رابطے کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ شازمین کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ والداؤں سمیت اپنے لیے مختص کمرے میں مغموم و اداس بیٹھی تھی کہ ایک ملازمہ نے آکر اسے اطلاع دی۔

"آپ کے لیے فون ہے۔" اس اطلاع پر وہ معمول کی طرح اٹھ کر وارڈن کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا اندازہ تھا کہ اس کے کسی بھائی نے اسے تسلی و تشفی دینے کے لیے فون کیا ہوگا لیکن فون اٹھاتے ہی دوسری طرف کی آواز سن کر چونک گئی۔ آواز بہت مدھم اور کمزور تھی پھر بھی اس نے اسے شناخت کر لیا تھا اور خوشی کی ایک لہر سی پورے وجود میں دوڑ گئی تھی۔

"آپ..... آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" اس نے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم پریشان نہ ہو۔" دوسری طرف سے جاوید علی نے نرم لہجے میں اسے تسلی دی لیکن اس کی آواز سے تکلیف اور کمزوری مترشح تھی۔

"مجھے تو آپ ٹھیک نہیں لگ رہے۔ آپ مجھے جھوٹی تسلی دے رہے ہیں۔" شازمین نے رندھی ہوئی آواز میں اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔ اب تک وہ بہت ضبط کرتی رہی تھی لیکن اب جاوید علی کی آواز سن کر اس کا ضبط جواب دے گیا تھا اور ساتھ ہی یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے دل میں اس کے لیے جو جذبات محسوس کر رہی تھی، ان کی گہرائی اس کے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔

"جھوٹی تسلی کی بات نہیں ہے شازمین! ان حالات میں، میں زندہ بچ گیا ہوں، یہی ایک بڑا معجزہ ہے۔ آدمی زندہ رہے تو باقی کی ٹوٹ پھوٹ وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جاتی ہے اور تمہاری تسلی کے لیے بھی یہ کافی ہونا چاہیے۔" وہ بہت سبھاؤ سے اسے سمجھا رہا تھا لیکن آواز میں بار بار در آنے والی تکلیف کو چھپانے سے قاصر تھا۔

"مجھے اس وقت تک اطمینان نہیں ہوگا جب تک آپ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لوں گی۔" اس نے آنکھ میں بھر آنے والے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی خواہش بیان کی۔

"ابھی تو یہ بہت مشکل ہے۔ مجھے خفیہ طور پر ایک اسپتال میں رکھ کر میرا علاج کیا جا رہا ہے۔ میں نے محض دل سے مجبور ہو کر تمہیں فون کیا ہے کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ تم میرے لیے پریشان ہوگی۔" بڑی مختصر ملاقات رہی تھی ان دونوں میں، وہ بھی بہت مخدوش حالات میں، سو ایک دوسرے سے دل کی بات کہنے سننے کی ذرا بھی نوبت نہیں آئی

www.paksociety.com

تھی پھر بھی وہ دونوں جیسے بڑے یقین سے ایک دوسرے کے جذبات سے آگاہ تھے اور اقرار و اظہار کی منزل سے گزرے بغیر آگے کے مراحل میں داخل ہو گئے تھے جہاں ایک دوسرے کا خیال اور خوشی سب سے مقدم سمجھی جاتی ہے۔

"میں اب بھی پریشان ہوں اور یہ پریشانی آپ سے ملے بغیر دور نہیں ہوگی۔" اس نے اصرار کیا۔

"ضد نہیں کرو شازمین! اس وقت میں مجبور ہوں۔" جاوید علی نے اسے رسان سے سمجھایا۔

"میں بھی مجبور ہوں۔ میں خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہی ہوں اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ دکھ اور تکلیف کے ان لمحات میں کسی اپنے کے قریب ہوں۔ مجھے تمہاری ضرورت بھی ہے اور فکر بھی۔ پلیز جاوید! مجھے اپنے پاس آنے دو۔" لجاجت سے بولتے ہوئے کئی آنسو اس کی آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرے۔ بظاہر اپنے کام میں مگن وارڈن نے ترچھی نظروں سے یہ منظر دیکھا اور معنی خیزی سے سر ہلانے لگی۔ شازمین کے بارے میں تفصیلات کا اسے علم نہیں تھا لیکن وہ عرصے سے اس دارالامان میں ملازمت کر رہی تھی اور اس نے بے شمار لڑکیوں کو اپنے عاشقوں کے لیے ٹسوے بہاتے دیکھا تھا۔ شازمین کو بھی اس نے ان میں سے ایک تصور کیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم تھوڑی دیر انتظار کرو۔ آدھے گھنٹے میں، میں تمہارے لیے گاڑی بھجواتا ہوں۔ تم تھوڑی دیر کے لیے مجھ سے ملنے آجانا۔ لیکن پلیز اب رونا بند کرو۔ مجھے تمہارے رونے سے تکلیف ہو رہی ہے۔" ادھر جاوید علی نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

"تھینک یو، تھینک یو سو مچ جاوید! تم گاڑی بھیجو، میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" وہ ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے تشکرانہ لہجے میں بولی اور ریسیور رکھ کر وارڈن کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"میڈم! تھوڑی دیر میں مجھے گاڑی لینے آئے گی۔ پلیز آپ گیٹ پر انفارم کر دیں کہ جیسے ہی گاڑی آئے، مجھے فوراً انفارم کر دیا جائے۔" اس نے نہایت مہذبانہ لہجے میں درخواست کی۔

"سوری، فی الحال تم یہاں سے کہیں نہیں جا سکتیں۔" وارڈن نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں؟ میں کیا کوئی مجرم ہوں جو آپ مجھے یہاں قید کر کے رکھیں گی؟" شازمین کے نوابی خون نے جوش مارا اور اس نے تنتنا کر وارڈن کو جواب دیا۔

"میرا دماغ مت کھاؤ بی بی! تم یہاں ہماری حفاظتی تحویل میں ہو اور ہمیں آگے تمہارے لیے جواب دہی کرنی ہے۔ کسی ضمانت کے بغیر میں تمہیں یہاں سے کہیں جانے کی ہرگز بھی اجازت نہیں دے سکتی۔" وارڈن کی نگاہ اس کی انگلی میں موجود خوب صورت و بیش قیمت طلائی انگوٹھی پر جمی تھی۔

شازمین نے فوراً ہی اس کی نیت بھانپ لی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ ضمانت کے طور پر میری یہ انگوٹھی اپنے پاس رکھ لیں۔ یہ بہت قیمتی ہے اور اسے لینے کے لیے مجھے ہر حال میں آپ کے پاس واپس آنا پڑے گا۔" اس نے انگوٹھی اتار کر وارڈن کے سامنے میز پر رکھ دی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جس انگوٹھی کو بطور ضمانت پیش کر رہی ہے، درحقیقت رشوت کا کام دے گی اور واپس آنے پر کسی صورت اسے واپس نہیں ملے گی۔

"اتنی کوئی خاص قیمتی تو نہیں لگ رہی لیکن تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں۔" وارڈن نے انگوٹھی اٹھا کر اس کا جائزہ لیا اور بناوٹی بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی میز کی دراز میں رکھ لی۔

"ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ گاڑی آئے گی تو میں تمہیں اطلاع کروا دوں گی۔" انگوٹھی قبضے میں کر لینے کے بعد اس کا لہجہ ذرا نرم ہو گیا تھا۔ شازمین مطمئن سی ہو کر واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ انگوٹھی بے شک کافی قیمتی تھی لیکن اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ اس کے پاس بیش قیمت زیورات کا بہت بڑا ڈھیر موجود تھا اور ان میں سے ایک انگوٹھی کم ہو جانے پر اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ حالات سنبھلیں گے تو وہ ایک بار پھر اپنی فیملی کے ساتھ ایک آرام دہ اور پُرتعیش گھر میں ہوگی۔ آدھے گھنٹے کا وقت بھی آخر کار گزر گیا۔ اس کے پاس فی الحال ملبوسات وغیرہ موجود نہیں تھے اس لیے تیاری تو کیا کرتی، بس منہ ہاتھ دھو کر بالوں کو سنوارا اور گاڑی پہنچ جانے کی اطلاع سن کر باہر نکل گئی۔ ڈرائیور نے گاڑی کی عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا اور اس کے بیٹھ جانے کے بعد گاڑی آگے بڑھا دی۔ ان کی گاڑی آگے بڑھی تو کئی گھنٹوں سے دارالامان کے قریب کھڑی ایک سیاہ گاڑی بھی فوراً حرکت میں آ گئی اور شازمین والی گاڑی کے پیچھے دوڑنے لگی۔

یہ پُرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

رہائی

مختار آزاد

ہر سزا کا کوئی انت کوئی حد ضرور ہوتی ہے... تبھی قفس سے رہائی ممکن ہوتی ہے... مگر اس کی زندگی ایک لامتناہی قید میں ڈھل چکی تھی... ایک لغزشِ پا نے اسے ہنستی مسکراتی... جیتی جاگتی دنیا سے تاریک راہوں کی دھول بنا دیا تھا... اور وہ کسی بھی صورت اس زنداں سے اسیری کا طلب گار نہیں تھا...

مغرب کی چمکتی دمکتی، روشن خیال دنیا سے الگ دل گداز جذبوں کی ترجمان پُراثر کتھا...

رات کے اس پہلے پہر کچی نیند میں تھا جب ایسا محسوس ہوا کہ کوئی میری کلائی تھام رہا ہے۔ میں نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ ایک پولیس والا کھڑا میری نبض دیکھ رہا تھا۔

"بڈھے... تم ٹھیک تو ہو؟" مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ کر اس نے کلائی چھوڑتے ہوئے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔" میں نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ اب میرے غافل حواس کچھ کچھ کام کرنے لگے تھے۔

www.paksociety.com

مجھے لفظ 'بڈھے' سے سخت چڑ تھی۔ میں یہ سن ہی نہیں سکتا تھا کہ کوئی مجھے بڈھا کہے۔ کوئی اور ہوتا تو میں اس کے منہ پر زور کا مکا جڑ تا مگر یہ پولیس والا تھا۔ میں خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ سچ کہوں تو اب اس لفظ پر میں غصے کا اظہار کم ہی کرتا ہوں البتہ نفرت میں شدت وہی ہے۔ میری عمر ساٹھ سال ہے اور بے گھری میرا مقدر۔ پارکوں کی بینچیں اور فٹ پاتھ میرا ٹھکانا۔ ساٹھ سال کی عمر، پھٹا پرانا لباس اور بے گھری میں لفظ بڈھا روزانہ اتنی بار سنتا ہوں کہ سننے کی عادت سی پڑ گئی ہے مگر اس کے باوجود اب تک اس لفظ کو تسلیم نہیں کر سکا...

''آرام سے۔'' میں اٹھ کر کھڑا ہونے لگا تو اس نے توانا ہاتھ سے میرے کندھے پر وزن ڈالتے ہوئے ہدایت کی۔ اس نے یہ بات بظاہر ہمدردی میں کہی تھی مگر میں جانتا تھا کہ وہ ڈر رہا ہے کہ کہیں میں اس سے بچنے کے لیے دوڑ نہ لگا دوں یا بلیڈ سے حملہ نہ کر دوں۔ سڑکوں کے کنارے، فٹ پاتھوں اور پلوں کے نیچے زندگی گزارنے والے مجھ جیسے بے گھروں پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کئی پولیس والے اس ناخوشگوار تجربوں سے گزر چکے تھے۔ اسی لیے وہ بھی احتیاط برت رہا تھا۔

''کیا اب جا سکتا ہوں؟'' لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہوا اور خود کو سنبھال کر میں نے پولیس افسر سے اجازت طلب کی۔

''جی نہیں، کہیں نہیں جا سکتے۔ مجھ تم سے بات کرنی ہے۔''

یہ سن کر مجھے شدید حیرت ہوئی۔ ایک پولیس والا بے گھر کو پبلک پراپرٹی سے بھگا سکتا تھا، اسے گرفتار کر سکتا تھا مگر وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ یہ پولیس افسر میرے ساتھ کیا کرنے والا ہے۔

''بیٹھو...'' اس نے حکم دیا اور میں سڑک کے کنارے رکھی بینچ پر دوبارہ بیٹھ گیا۔

''میں تمہاری تلاشی لینا چاہتا ہوں۔'' میرے بیٹھنے پر اس نے کہا۔

''آفیسر، بات کیا ہے؟'' میں نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''خاموش۔'' اس نے ڈانٹا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس نے جراثیم سے بچاؤ والے میڈیکل دستانے پہن رکھے تھے۔ ''تمہارے پاس ایسی کوئی شے ہے جس سے تم مجھے نقصان پہنچا سکتے ہو؟'' اس نے میری بغلوں میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے چھری، چاقو، شیشے کا ٹکڑا، سریا، بلیڈ یا اسی طرح کی کوئی اور مہلک شے...''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اب وہ میری جیبوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ ''تمہارے پاس کوئی شناختی دستاویز ہے۔'' اس نے کوٹ کی جیب الٹتے ہوئے دریافت کیا۔

''نہیں۔'' میں نے مختصر جواب دینا ہی بہتر سمجھا۔

''تمہارے کھانے پینے کا حساب کتاب کیا ہے، کیا یہیں سے کھانا مل جاتا ہے؟'' وہ تلاشی کے ساتھ ساتھ تفتیش بھی مکمل کرنا چاہتا تھا۔

یہ سن کر میں نے دائیں بائیں نظریں دوڑائیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ عقب میں پارک کی روشنیاں گل تھیں اور ڈرا دینے کی حد تک ویرانی کا راج تھا۔ ''یقیناً نہیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھے بنا آہستہ سے جواب دیا۔ ''ویسے آفیسر...'' میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''آپ کو یہ کیوں لگتا ہے کہ اس جگہ پر کسی بے گھر کو کھانے کی سہولت حاصل ہو سکتی ہے؟''

''تم نے ایسا کیوں کہا؟'' اس کے لہجے میں ناگواری کی ہلکی سی جھلک تھی۔

''اگر یہاں کہیں پر کھانے کا آسرا ہوتا تو میں بھوک سے بے دم ہو کر بینچ پر پڑا نہ ہوتا اور اس ویرانے میں ہر طرف چوہے کھانے کے لیے ٹوٹے پڑے ہوتے۔'' میرا لہجہ طنزیہ اور تلخ تھا۔

''اوہ...'' میرے چپ ہونے پر اس نے تاسف بھرے انداز میں کہا۔

میں نے پہلی بار نظر بھر کر اسے دیکھا۔ وہ کوئی رنگروٹ تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اسے علاقے میں نہیں دیکھا تھا۔ میں کئی بار پکڑا گیا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ کبھی اس کے ہاتھوں گرفتار نہیں ہوا تھا۔

''تم آج رات کب سے یہاں پر ہو؟'' تلاشی کا عمل اختتام کو پہنچا تو وہ سیدھا کھڑا ہوا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔'' میں نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''میں یہیں بیٹھا تھا کہ اندھیرا بڑھنے لگا۔ تھک کر بینچ پر لیٹ گیا اور پھر نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔''

''تو کیا تم اس جگہ پر اکثر سوتے ہو؟''

''نہیں، مجھے بینچ پر پُرسکون نیند نہیں آتی اور یہاں نیچے کنکریٹ پر لیٹو تو جسم اکڑ جاتا ہے۔ ہڈیوں میں درد ہوتا ہے۔ اسی لیے میں یہاں پر سونا پسند نہیں کرتا۔ یہ تو بس آج اتفاق...'' میں نے یہ سوچ کر بات ادھوری چھوڑ دی کہ اس کا جواب تو مکمل ہو چکا تھا۔

''اوہ... تو پھر رات میں تم کہاں سوتے ہو؟'' میرے چپ ہوتے ہی اس نے نیا سوال جڑ دیا۔

''جہاں نرم زمین مل جائے۔'' میں نے بیزاری سے جواب دیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''جیمز۔''

''جیمز...'' اس نے دہراتے ہوئے کہا۔ ''پورا نام بتاؤ۔''

''جیمز ڈیوس ہیڈلے۔''

''تو یوں کہو نا۔''

اسی دوران میری نظر سامنے پڑی۔ اس کے عقب سے ایک دوسرا پولیس افسر آتا نظر آ رہا تھا۔ وہ قریب کے لیمپ پوسٹ کے نیچے پہنچا تو میں پہچان گیا۔ ''ہیلو مسٹر جے ڈی۔'' وہ قریب آیا تو مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''ہیلو آفیسر کروکر کیسے ہو؟'' میں نے شائستگی سے جواب دیا۔ وہ مجھے کئی بار پرائیویٹ پراپرٹی میں داخل ہونے پر گرفتار کر چکا تھا، مگر وہ جرائم بے دھیانی میں تب سرزد ہوئے جب میں سونے کے لیے کسی کے لان، پورچ وغیرہ میں چلا گیا اور گھر والوں نے پولیس کو اطلاع کر دی۔ اس سے دوستانہ مراسم ہو چکے تھے۔ بے تکلفی کی بنا پر وہ مجھے میرے نام کے مخفف سے پکارتا تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے اپنے پیٹی بند بھائی سے سوال کیا۔

''ڈیوٹی۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ کروکر کے بے تکلف رویے سے مجھ پر اس کی بے اعتمادی کسی حد تک کم ہو چکی تھی۔

''تم آخری بار وہاں شیڈ کے نیچے سونے کے لیے کب گئے تھے؟'' آفیسر نے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''شاید پرسوں رات وہیں سویا تھا۔'' میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''ذرا اپنا ہاتھ دکھاؤ۔'' اس نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے ہدایت کی۔

میں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ اس نے ٹارچ سے میرے ہاتھوں پر روشنی ڈالی اور پھر آستینوں پر اوپر نیچے نظر ڈالتے ہوئے جائزہ لیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جو دیکھنا چاہتا تھا، وہ شے اسے دکھائی نہیں دی۔

''تم پچھلی بار میزی سے کب ملے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ پرسوں رات کی بات ہے۔''

یہ سن کر اس نے مجھے گھورا۔ ''ہم نے کچھ دیر پہلے ہی اس کی لاش دیکھی ہے، وہ مر چکا۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خالی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

''یہ سن کر تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟'' آفیسر نے کہا۔

''لوگ تو سڑکوں پر مرتے ہی رہتے ہیں خاص طور پر نشے باز۔ اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے۔'' میں نے سکون سے جواب دیا۔

''وہ مرا نہیں ہے۔'' اس نے الفاظ چبا چبا کر کہا۔ ''اسے قتل کیا گیا ہے، کسی نے اسے مارا ہے... سمجھے۔'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

اور

میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ایک پاکستانی، ایک ایرانی اور ایک ہندوستانی کی فطرت میں کیا فرق ہے؟''

پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر نے کہا۔ ''ٹرین سے اترتے وقت کوئی بھی پاکستانی مڑ کر یہ دیکھنا گوارا نہیں کرتا کہ اس نے ڈبے میں کوئی سامان تو نہیں چھوڑ دیا۔ ایرانی ہمیشہ یہ دیکھتا ہے کہ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی اور ہندوستانی اترنے سے پہلے بغور اس بات کا جائزہ لیتا ہے کہ دوسرے مسافر کیا کیا بھول گئے ہیں؟''

(حیدرآباد سے ممتاز خانم)

فرمائشی چیز

برنارڈ شا ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ بینڈ اونچے سروں میں بج رہا تھا جس سے موصوف بہت جزبز ہو رہے تھے۔ جب ان سے نہ رہا گیا تو ویٹر کو بلا کر پوچھا۔ ''کیا بینڈ والے کوئی فرمائشی چیز بھی بجا سکتے ہیں؟''

''جی ہاں جناب۔'' ویٹر نے کہا۔ ''حکم کریں۔''

''ان سے کہو کہ خاموشی سے بغلیں بجائیں۔'' برنارڈ شا نے کہا۔

(کراچی سے دور یشم یونس کی شگفتگی)

اس بار بھی میں نے خاموشی میں ہی بہتری سمجھی۔
کروکر ساتھی افسر کی طرف پلٹا۔ اس بار وہ روشنی میں تھا۔ اس کی قمیص پر لگی نیم پلیٹ پر لکھا تھا: ’آفیسر ہالٹ‘۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے مجھے ایک طرف کیا اور ہالٹ کی طرف متوجہ ہوگیا۔
’’اس کے پاس سے کچھ برآمد ہوا؟‘‘
’’نہیں۔‘‘ ہالٹ نے جواب دیا۔
’’تم نے اس کے کپڑوں پر خون کے دھبے دیکھے؟‘‘
اس بار بھی ہالٹ کا جواب نفی میں تھا۔
’’میں وہ نہیں ہوں جس کی تمہیں تلاش ہے۔‘‘ ان کی باتیں سن کر میں نے منمناتے ہوئے کہا۔ مگر دونوں نے سنی ان سنی کردی۔ میزی کی لاش کا سن کر میں ان کے کہے بغیر ہی بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔
’’چلو دیکھتے ہیں، آؤ۔‘‘ کروکر نے ہالٹ سے کہا۔
یہ سنتے ہی ہالٹ نے مجھے بازو سے پکڑا اور ہم دونوں کروکر کے پیچھے پیچھے، سامنے والی پلیا کے قریب سے گزر کر پارک کے عقب کی طرف جانے لگے۔ میں گھسٹتا ہوا ہالٹ کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں کوئی اور بات نہیں تھی ماسوائے خوف کے۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں پولیس مجھے قتل کے جرم میں تو گرفتار کر کے نہیں لے جارہی..... یہ سوچ سوچ کر میں مرا جا رہا تھا۔
کروکر کے پیچھے چلتے چلتے ہم پارک سے گزرتے ہوئے اس سے تھوڑا آگے پہنچے۔ وہاں نیلی اور سرخ جلتی بجھتی بتیوں والی تین کاروں کے اطراف میں کئی لوگ کھڑے تھے۔ کچھ پولیس کی وردی میں تھے اور کچھ سادہ لباس۔ ایک دو نے سوٹ پہنا ہوا تھا۔ دو چار ٹارچ کی روشنی میں جھک کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لے رہے تھے۔
’’یہاں کوئی سراغرساں ہے؟‘‘ کروکر نے ان کے قریب پہنچ کر اونچی آواز میں کہا۔ ’’مجھے فوری طور پر کسی سراغرساں سے بات کرنی ہے؟‘‘
یہ سنتے ہی سوٹ میں ملبوس ایک شخص اپنی نوٹ بک سنبھالتے ہوئے آگے بڑھا۔ میں اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ میرے اندازے سے وہ کروکر سے چھوٹا مگر ہالٹ سے کچھ بڑا ہوگا۔ بظاہر وہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔
’’کہیے..... کیا کہنا چاہ رہے تھے آپ؟‘‘ کروکر کے قریب پہنچ کر اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
’’یہ جے ڈی ہے۔‘‘ کروکر نے کہنا شروع کیا۔ ’’یعنی مطلب جیمز ڈیوس ہیڈلے۔ یہ مقتول کے ساتھ ہی رہتا تھا۔‘‘
’’مگر وہ تو خود بے گھر تھا پھر یہ کس طرح اس کے ساتھ رہ سکتا تھا.....؟‘‘ اس نے سوالیہ نگاہوں سے کروکر کو دیکھا۔
’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔‘‘ کروکر نے یہ سنتے ہی وضاحت کی۔ ’’جے ڈی اور اس جیسے کچھ دوسرے بے گھر لوگ پارک کے کنارے بنے شیڈ میں سوتے تھے اور دن میں بھی زیادہ تر وہیں پڑے رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اس سے تفتیش کرنی چاہیے۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ’’اس کے ناتواں کندھوں پر دھرے سر میں اچھا دماغ ہے۔ ممکن ہے اس کی باتوں سے تمہیں کچھ مل سکے۔‘‘
یہ سن کر سراغرساں نے مجھے اوپر سے نیچے تک اچھی طرح تنقیدی نگاہوں سے گھورا۔ اس وقت میرے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں تھے ورنہ وہ دیکھ لیتا کہ میرے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔
’’آخری بار تم نے میزی کو کب دیکھا تھا؟‘‘ اس نے کچھ توقف کے بعد براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔
’’پرسوں۔‘‘ میں نے لڑکھڑاتی زبان سے جواب دیا۔
’’کیا تم اس بارے کچھ جانتے ہو کہ اسے کون قتل کرسکتا ہے؟‘‘
’’وہ نشہ کرتا تھا۔‘‘ میں نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔
’’تو پھر.....‘‘
’’یہ نشے باز اکثر ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔‘‘ میں نے کسی حد تک خود پر قابو پایا اور تفصیل سے جواب دینا شروع کیا۔ ’’اکثر نشئی ایک دوسرے سے نشے پر لڑتے ہیں، ایک دوسرے کے پیسے چرا لیتے ہیں۔‘‘
’’تو کیا میزی بھی دوسرے نشئی ساتھیوں کا نشہ یا پیسے چرا لیتا تھا؟‘‘ سراغرساں نے میری بات سن کر سوال کیا۔
’’یہ میں نہیں جانتا۔‘‘
’’کبھی اس نے تمہارا کچھ چوری کیا تھا؟‘‘
’’حالیہ دنوں میں تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔‘‘ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔
’’تو تم اور وہ دونوں شیڈ کے نیچے رات کو اکٹھے سوتے تھے؟‘‘ اس نے سوال کیا۔

’’ہر روز نہیں، کبھی کبھار۔‘‘ میں نے وضاحت کی۔
’’اور کون کون سوتا ہے وہاں پر؟‘‘
’’کئی اور لوگ بھی آکر وہاں سو جاتے تھے۔‘‘
’’ان کے نام بتاؤ۔‘‘ سراغرساں نے نوٹ بک کھولتے ہوئے حکم دیا۔
میں بتانا تو نہیں چاہتا تھا مگر اس خوشی میں بتانا شروع کر دیا کہ کم از کم اس کے قتل کے جرم میں، میں گرفتار نہیں ہونے جارہا تھا۔ ’’لکھیے.....‘‘ میں نے سراغرساں کی طرف مڑ کر کہا۔ وہ مستعد نظر آرہا تھا۔ پنسل اس کے ہاتھ میں تھی۔ ’’برین، والٹن، رولس اور کبھی کبھار جیکب بھی۔ یہ لوگ تب وہاں سونے کے لیے آتے تھے، جب انہیں کہیں اور شب بسری کی جگہ نہیں ملتی تھی اور ایسا اکثر ہوتا ہے۔‘‘
’’وہ شیڈ کہاں پر ہے جہاں تم سب سوتے تھے؟‘‘
’’چاہو تو وہ جگہ میں تمہیں دکھا سکتا ہوں۔‘‘ سراغرساں نے سوال مجھ سے کیا تھا مگر جواب آفیسر کروکر نے دیا۔
سراغرساں نے یہ سن کر ہاں میں سر ہلا دیا اور پھر ستائشی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ’’مجھے یقین ہے کہ تمہارا کوئی ایک ٹھکانا تو نہیں مگر پھر بھی میں جاننا چاہوں گا کہ کل رات دس سے دو بجے تک تم کہاں پر تھے؟‘‘
’’اُدھر والی پلیا کے نیچے سو رہا تھا۔‘‘ میں نے ہاتھ کے اشارے سے وضاحت کرتے ہوئے جواب دیا۔
’’ہوں.....‘‘ اس نے ہنکارا بھرا اور نوٹ بک بند کر کے جیب میں رکھی اور پھر میرے برابر کھڑے ہالٹ کی طرف دیکھا۔ ’’اس کا دھیان رکھو، کہیں جانے مت دینا۔‘‘
’’اوکے سر!‘‘
’’تم میرے ساتھ آؤ، کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔‘‘ اس نے کروکر سے کہا اور پھر وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ وہ کیا باتیں کر رہے تھے، یہ میں نہیں سن سکا تھا۔
میں نے ہالٹ کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ پر مستعدی سے نظریں رکھے ہوئے تھا۔ میں نے دھیان بٹانے کے لیے سامنے دیکھا۔ پولیس والے مصروف تھے۔ میں نے سڑک کی طرف نظریں گھمائیں، وہاں کوئی نہیں تھا۔ دن کا وقت ہوتا تو شاید تماش بینوں کا ہجوم لگ جاتا مگر یہ رات تھی۔ لوگ سو رہے تھے۔ سڑک پر بھی سناٹے کا راج تھا۔ ویسے بھی ویک اینڈ کے علاوہ اس سڑک پر بہت جلد خاموشی چھا جاتی تھی۔ میں نے نظریں گھمائیں۔ سامنے ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی۔ وہ غور سے مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں نوٹ بک تھی۔
اسی دوران میں ایمبولینس پہنچ گئی۔ جب اسپتال کا عملہ ایمبولینس سے اسٹریچر نکال رہا تھا تو اسی دوران اچانک میرے کانوں میں سراغرساں کی آواز پڑی۔ وہ کروکر سے پوچھ رہا تھا۔ ’’اس کا کوئی پولیس ریکارڈ ہے۔‘‘
یہ سنتے ہی میں ایک بار پھر پریشان ہوگیا۔ میں نے پوری توجہ ان دونوں کی باتوں پر لگا دی۔
’’نہایت معمولی جرائم میں پکڑا گیا ہے کئی بار۔‘‘ کروکر سراغرساں کو بتا رہا تھا۔ ’’کوئی خاص جرائم نہیں تھے وہ۔ اکثر بے گھر لوگ اس طرح کے الزامات میں پکڑے جاتے ہیں۔‘‘
’’بظاہر تو یہ بوڑھا ہے لیکن میرا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ اپنے سے زیادہ توانا شخص کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔‘‘ سراغرساں کا لہجہ شک سے بھرپور تھا۔
’’اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا..... مگر یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ ان سب سے زیادہ اچھا انسان ہے۔‘‘ کروکر نے میرے دفاع میں کہا۔ ’’میرا خیال ہے کہ اسے مشتبہ نہ سمجھا جائے۔‘‘ یہ سن کر سراغرساں نے کوئی جواب نہیں دیا۔
میں ان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا مگر میرے کان وہیں لگے تھے۔ میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ سراغرساں مجھے گھور رہا ہے۔ کچھ دیر بعد مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کروکر میری طرف آرہا تھا۔ ’’ہم شیڈ کی طرف جارہے ہیں۔ میرے خیال میں باقی رات تم وہیں سکون سے گزار سکتے ہو، چلو..... میں تمہیں وہاں تک لفٹ دے دیتا ہوں۔‘‘ وہ

خوش دامن

’’ڈاکٹر صاحب!‘‘ ایک نوجوان نے کہا۔ ’’میری خوش دامن جب بھی مجھ سے گفتگو کرتی ہیں تو اپنی ناک سے دھوئیں کے چھلے چھوڑنے لگتی ہیں۔ مجھے بڑا خوف محسوس ہوتا ہے۔‘‘
ڈاکٹر صاحب ہنس پڑے۔ ’’ایسی معمولی سی بات پر ڈرنے کی ضرورت نہیں، بے شمار لوگ سگریٹ پیتے ہیں، دھوئیں کے چھلے چھوڑنے کے عادی ہوتے ہیں۔‘‘
’’مگر ڈاکٹر صاحب!‘‘ نوجوان نے کہا۔ ’’میری خوش دامن تو سگریٹ نہیں پیتیں۔‘‘
(کورنگی کراچی سے راحیل احمد کی بے بسی)

www.paksociety.com

دوستانہ لہجے میں مخاطب ہوا۔
''شکریہ آفیسر... میں آج رات وہاں نہیں سونا چاہوں گا۔''
''کیوں؟ تمہیں ڈر لگ رہا ہے۔'' اسی دوران سراغرساں بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ میری بات سن کر کروکر کے بجائے اس نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ اگر تم سے مزید تفتیش کی ضرورت پڑی تو میں تمہیں آسانی سے تلاش کرسکوں گا۔''
''بہت بہتر...''
یہ کہتے ہی میں وہاں سے چل دیا۔ یہ سوچے بنا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ میں ہر حال میں اس جگہ سے دور جانا چاہتا تھا۔ اس وقت میں بہت زیادہ خوف تھا اور ندامت بھی محسوس ہورہی تھی۔ میں تیز تیز چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت میرے عقب میں سراغرساں کی نظریں مجھ پر مرکوز ہوں گی۔ کروکر اور ہالٹ بھی میری طرف ہی دیکھ رہے ہوں گے مگر مجھے کسی کی پروا نہ تھی۔ میں بہت ڈرا ہوا تھا۔
اچانک میرے کانوں میں ایک آواز پڑی۔
''ہیلو سر... ہائے سر!'' یہ کسی لڑکی کی آواز تھی۔ میں چونک گیا۔ یہ آواز سنتے ہی میں رکا مگر پلٹ کر نہیں دیکھا۔
''سر پلیز!'' اس بار یہ آواز میرے بہت قریب سے آئی تھی۔
''معافی چاہتی ہوں، کیا میں آپ سے کچھ پوچھ سکتی ہوں۔'' اس نے میرے بالکل برابر قریب پہنچ کر کہا۔
میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر جو پہلا خیال میرے ذہن میں آیا وہ یہ کہ اگر بیٹی زندہ ہوتی تو اب اتنی بڑی ہی ہوتی۔ اس کی شکل بھی بیٹی سے بہت مماثل تھی۔ درمیانے قد کی کالی آنکھوں والی اس لڑکی کے بھورے بال تھے، بیٹی کی طرح۔ دوسری بات جو میرے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ اسے میں نے پولیس والوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ نوٹ بک ہاتھ میں لیے وہاں کچھ لوگوں سے باتیں کررہی تھی۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھی۔ ''تم پولیس والی تو نہیں لگتی ہو؟''
''ٹھیک سمجھے، میں ڈیلی ہیرالڈ کی رپورٹر ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ ''میرا نام کلیرے پارک مل ہے۔''
''تمہیں بتانے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔''
''مگر میں تم سے کچھ پوچھ تو سکتی ہوں۔''
''نہیں۔'' میں نے اسے کچھ پوچھنے سے روکنا چاہا۔ یہ سن کر اس نے مجھے گھورا مگر میں پروا کیے بنا تیزی سے آگے بڑھا۔ مجھے لگا کہ جیسے وہ میرے پیچھے دوڑ کر آئے گی مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔
میں تیزی سے چلتا ہوا پارک کے دوسری جانب درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو گھٹنوں میں شدید درد ہورہا تھا۔ میں نے ایک درخت کے تنے سے ہاتھ ٹکا کر پھولی سانسیں درست کیں اور پھر اسی کے نیچے بیٹھ گیا۔ میری پشت درخت کے تنے سے لگی ہوئی تھی۔ دور دور تک سناٹے کا راج تھا۔ میرا جسم خوف، درد اور تھکن سے چُور تھا۔ میرے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ نیچے بیٹھتے ہی میں نے اپنے دونوں گھٹنے موڑے اور ان کے بیچ سر دے کر زور زور سے رونا شروع کردیا۔
☆☆☆
میں ساری رات وہیں رہا مگر سکون سے سو نہ سکا۔ میرے تصور میں بار بار میزی کا چہرہ اُبھر رہا تھا، اس کے ساتھ ہی بیٹی کا خیال آجاتا، جس کے بعد میری زندگی، زندگی نہیں صرف سزا بن کر رہ گئی تھی۔ میزی جو مر چکا اور رہی بیٹی تو اسے مرے ہوئے زمانہ ہوچکا تھا مگر اس کے باوجود میرا ذہن ان ہی دونوں میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ میزی کے قتل کے الزام میں دھر لیا جاؤں گا مگر اس سے پہلے کہ میں پکڑا جاؤں، میں اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنا چاہتا تھا۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا، میں اسی کے قابل تھا مگر میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔
میں درخت کے نیچے بیٹھا صبح ہونے کا منتظر تھا۔ میرے منتشر ذہن میں خیالوں کا ہجوم تھا۔ میں کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا مگر پھر بھی سوچنے پر مجبور تھا۔ آخر نئے دن کا سورج نکلا اور میں لڑکھڑاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا کافی پینے کے لیے۔ میرا جسم ٹھنڈ سے اکڑا ہوا تھا۔
میری جیب میں اتنے پیسے تھے کہ بن بیک اسٹور سے اپنے لیے ناشتا خرید سکتا۔ اسٹور کے سامنے لائن لگی ہوئی تھی۔ میں بھی جا کر کھڑا ہوگیا۔ لوگ مجھ سے گھن کھا رہے تھے۔ کئی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں۔ میرے پیچھے کھڑی دو عورتیں انگلیوں سے ناک دبائے کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے پر ناگواری کا تاثر تھا۔ ان میں سے ایک دوسری سے کہہ رہی تھی۔ ''کتنی بدبو آرہی ہے اس بڈھے میں سے۔'' یہ سن کر میں خاموش رہا۔ باری آنے پر ایک سینڈوچ اور کافی کے لیے ادائیگی کی۔ کیشیر نے نوٹ تھاما اور ریزگاری اس طرح میری پھیلی ہتھیلی پر پھینکی کہ اس کی انگلیاں میرے ہاتھ سے مس نہ ہوں۔
میں سارا دن اِدھر سے اُدھر پھرتا رہا۔ ذہنی تھکن

فا۔ دن ڈھل چکا تو مجھے بھوک ستانے لگی۔ جیب میں برگر خریدنے کے پیسے تھے۔ میں اٹھا اور ایک برگر لے کر سڑک کنارے بینچ پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ فارغ ہوا تو نیند ستانے لگی۔ پچھلی رات بھی ٹھیک سے سو نہ سکا تھا، اب نیند کے مارے آنکھیں جل رہی تھیں۔ ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ کہاں جا کر سوؤں گا۔ شیڈ کے نیچے جا کر سو سکتا تھا مگر میں سوچ رہا تھا کہ اگر رات بے رات پولیس والے وہاں موجود لوگوں سے سوال و جواب کرنے پہنچ گئے تو پھر میری دوسری رات بھی برباد ہوگی۔ ممکن تھا کہ ایسا نہ ہو۔ ویسے بھی میزی بے گھر لاوارث شخص تھا وہ بھی نشے کا عادی۔ اس طرح کے لوگوں کے زندہ رہنے کی کسی کو پروا نہیں ہوتی تو مرنے پر پولیس کیا خاص توجہ دیتی۔ ان کے لیے تو کرنے کے کئی اور بھی کام تھے، جن کے نہ ہونے پر جواب طلبی ہوسکتی تھی۔ میزی کے قاتل کی گرفتاری کے لیے پولیس سے پوچھنے والا کون ہوگا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ شیڈ کے بجائے پلیا کے نیچے جا کر سوؤں گا۔
اس وقت آسمان پر سورج ڈوب چکا تھا۔ فضا خاصی سرد تھی۔ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ سردیوں کا موسم شروع ہوچکا تھا۔ میں نے اپنے گرم کوٹ کے سارے بٹن بند کیے اور اٹھنے کا ارادہ کرنے لگا۔ اسی دوران میں سامنے نظر پڑی۔ پچھلی رات والی اخباری رپورٹر کلیرے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے میری طرف آرہی تھی۔
''ہیلو جے ڈی۔'' اس نے میرے قریب پہنچ کر کہا۔
میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی بات سن کر میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے کروکر نے میرا نام اور پتا بتایا ہوگا اور اب یہ پھر نازل ہوگئی سوال و جواب کرنے کے لیے۔ میں اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا تھا مگر وہ بدستور میرے جواب کی منتظر تھی۔ آخر میں نے سر اٹھایا۔
''مجھے پہچانا...'' اس نے استفساریہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ''ہم کل رات ملے تھے۔ میں رپورٹر ہوں ہیرالڈ کی۔'' وہ اپنے تئیں یہ باور کرانے کی کوشش کررہی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔
''مجھے سب کچھ یاد ہے مگر میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔'' میں نے رکھائی سے جواب دیا۔ اسے دیکھ کر مجھے ایک بار بیٹی یاد آنے لگی۔ غضب کی مشابہت تھی دونوں میں مگر یہ بیٹی تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ تو کب کی مرچکی تھی۔
''میں تمہیں کچھ دینا چاہتی تھی۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بیس ڈالر کا نوٹ نکال کر

پیکنگ کاگر

میری طرف بڑھایا۔
میں خاموشی سے نوٹ کو دیکھتا رہا۔ نہ تو میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور نہ ہی لینے سے انکار کیا۔
''کیا تم میرے کچھ سوالوں کے جوابات دینا پسند کرو گے؟'' مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہنا شروع کیا۔ نوٹ بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ ''میں بے گھر لوگوں پر ایک فیچر لکھ رہی ہوں۔ مجھے اس حوالے سے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' اس نے نرم لہجے میں درخواست کی۔
''تم یہاں سے جاتی کیوں نہیں ہو۔'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے گھورا۔ ''یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کل رات اس علاقے میں ایک قتل بھی ہوچکا ہے۔''
''یہ بھی میرے فیچر کا ایک حصہ ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ویسے میں نے سنا ہے کہ تم میزی کو جانتے تھے؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
میں نے یہ سن کر کوئی جواب نہیں دیا۔
''میں تمہیں اس کام کے لیے اچھی خاصی رقم دوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ہاتھ باہر آیا تو اس کی مٹھی میں کئی نوٹ دبے تھے۔

www.paksociety.com

"مجھے رقم میں کوئی دلچسپی نہیں۔" میں نے یہ کہہ کر دوسری طرف منہ موڑ لیا۔
"کیا تم یقین سے یہ بات کہہ رہے ہو؟"
"ہاں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔
"جیسی تمہاری مرضی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے نوٹوں والا ہاتھ واپس جیب میں ڈالا۔ "تم مجھے شیڈ تک ہی پہنچا دو تاکہ میں دوسروں سے بات کرنے کی کوشش کرسکوں۔ اس کام کے لیے بیس ڈالر دوں گی۔"
"نہیں۔"
"تمہاری مرضی۔" اس نے افسردگی سے کہا۔ "میں خود ہی وہ جگہ تلاش کرلوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی مجھ سے بات کرنے پر ضرور رضامند ہوجائے گا۔"
یہ سن کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ میری نگاہوں میں تشویش تھی۔ "تم کیوں خود کو قتل کروانے پر تلی بیٹھی ہو۔"
"اوکے... اگر تم میرے ساتھ چلو تو پھر یقین ہے کوئی خطرہ نہیں ہوگا مجھے۔" اس نے پینترا بدلا اور ایک بار پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر بیس ڈالر کا نوٹ نکال کر میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔
میں بدستور خاموش تھا۔
"کیا کہتے ہو؟" کچھ دیر انتظار کے بعد اس نے پوچھا۔
میں نے کچھ سوچا اور ہاتھ بڑھا کر نوٹ اُچک لیا۔ "وہ تم سے بات نہیں کریں گے۔" میں نے خدشے کا اظہار کیا۔
"ٹھیک ہے، نہ کریں مگر تم مجھے ان تک لے کر تو چلو۔"
"ٹھیک ہے، چلتا ہوں۔" میں اٹھتے ہوئے کہا۔
"یہ ہوئی نا بات۔" کلیرے نے مسکرا کہا۔ "چلو۔"
کچھ دیر بعد ہم شیڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے میرے برابر چلی جارہی تھی۔ شیڈ تک پہنچنے کے لیے تقریباً پندرہ منٹ تک ہمیں پیدل ہی آگے چلنا تھا۔
"تم وہاں پر کب سے رہ رہے ہو؟" کچھ دیر بعد اس نے خاموشی توڑی۔
میں جواب دینے کے بجائے خاموش رہا۔ اس نے چلتے ہوئے کہا تھا کہ وہ میرے بارے میں کوئی سوال نہیں پوچھے گی مگر اب وہ مجھے کرید رہی تھی۔ میں اسے اپنی ذات کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے دوسرا سوال کردیا۔
"تم اصل میں کہاں کے رہنے والے ہو؟"
میں یہ بھی اسے نہیں بتانا چاہتا تھا۔ ویسے بھی ہم سڑک والوں کا ایک غیر تحریری اصول تھا۔ کوئی بھی دوسرے کے ماضی کو جاننے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ حال ہم سب کا ایک تھا مگر ماضی جدا جدا... اس کے باوجود کوئی کسی کے ماضی میں دراندازی کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا مگر یہ سڑک والی نہیں، گھر والی تھی۔ اسے ہمارے اصولوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
جب ہم شیڈ کی چار دیواری میں داخل ہوئے تو رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ شیڈ میں آگ جلتی ہوئی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی نہ کوئی اندر ضرور موجود ہے۔ "تم مجھ سے چند قدم کا فاصلہ رکھ کر پیچھے پیچھے چلو۔" میں نے رک کر کلیرے کو ہدایت کی اور آگے بڑھنے لگا۔
شیڈ میں زرد رنگ کا بلب جل رہا تھا۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہاں پر شب بسری کرنے والے تقریباً سبھی لوگ موجود ہیں۔ جیک بھی بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سب نے ہاتھ اٹھا کر ہیلو ہائے کی۔ "تم سب لوگ یہاں پر۔" میرے لہجے میں حیرت تھی۔
"پولیس نے پابند کیا ہے کہ ان کی اجازت کے بغیر ہم کہیں نہ جائیں۔" جیک نے ہاتھ تاپتے ہوئے میری بات کا جواب دیا۔
اسی دوران میرے پیچھے سے نکل کر کلیرے بھی سب کے سامنے آگئی۔ "ہیلو..." اس نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور ہاتھ ہلا کر کہا۔
"یہ تم کسے لے آئے ہو؟" جیک نے کہا۔
"یہ کلیرے ہے اور ایک اخبار میں رپورٹر ہے۔"
"رپورٹر...!" کئی آوازیں ابھریں۔ "مگر ایک رپورٹر کا یہاں کیا کام۔" جیک نے سوالیہ نظروں سے مجھے گھورا۔
"یہ بے گھروں پر ایک فیچر لکھ رہی ہے۔"
"اسے واپس بھیجو، ہمیں کسی رپورٹر کی یہاں موجودگی گوارا نہیں۔" جیک نے نفرت سے منہ دوسری طرف موڑتے ہوئے کہا۔
"تم اگر مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے تو نہ کرو۔" کلیرے نے ان سب کو مخاطب کرکے نرم لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اگر تم مجھ سے بات کرنا چاہو گے تو مجھے بہت زیادہ خوشی ہوگی۔ میں تم سے تمہاری کہانیاں سننے کے لیے آئی ہوں۔ جن کا انجام خوش گوار ہرگز نہیں۔" اس نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ "مگر پھر بھی وہ کہانیاں کسی کو کچھ سکھا سکتی ہیں۔ میں تم سے تمہارے تجربات سننے کے لیے آئی ہوں۔ میں یہ کہانیاں اُن لوگوں کو سنانا چاہتی ہوں جو

تمہاری زندگیوں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ میں چاہتی ہوں کہ گھروں میں سکون کی زندگی بسر کرنے والے لوگ تمہیں زیادہ بہتر انداز میں سمجھیں اور یہ کام تمہاری مدد کے بغیر نہیں ہوسکتا۔" مختصر تقریر کے بعد اس نے چاروں طرف نظریں ڈالیں۔ اس چھوٹے سے مجمع پر سناٹا طاری تھا۔
کلیرے خاموش ہوئی تو جیک نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا۔ میں اس پر نظریں رکھے ہوئے تھا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ کلیرے کی بات سن کر اس پر کچھ خاص اثر نہیں ہوا تھا۔
کلیرے نے اسی دوران ایک ہماری بوڑھی، بے گھر ساتھی ایلن کو مخاطب کیا۔ "کیا آپ مجھ سے بات کرنا پسند کریں گی؟"
"کیوں نہیں، اگر تم چاہو تو..." ایلن نے لبوں پر دادی اماؤں والی شفیق مسکراہٹ سجاتے ہوئے جواب دیا۔
"بہت بہت شکریہ۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا ٹیپ ریکارڈر نکالا اور نوٹ بک سنبھال کر اس کے قریب ہی فرش پر بچھے میل سے چکٹ پھٹے پرانے قالین کے ٹکڑے پر بیٹھ گئی اور ایلن نے اپنی دکھ بھری کہانی سنانا شروع کردی کہ کیسے اس کی نوکری چھوٹی، کس طرح اس کا گھر گیا اور کس طرح اس کے بچے دور ہوئے اور پھر وہ یہاں کئی سالوں سے کس انداز کی زندگی بسر کررہی ہے۔ میرے خیال میں تھوڑے سے ردّ و بدل کے بعد، یہاں ہر شخص کی ایک جیسی ہی کہانی تھی۔
جب تک ایلن بولتی رہی، سب خاموشی سے اپنی دھن میں مگن رہے۔ کسی نے ان کے بیچ مداخلت نہیں کی۔
ایلن سے بات کرنے کے بعد وہ والٹ کی طرف مڑی مگر وہ اپنی کہانی سنانے میں ہچکچا رہا تھا مگر کچھ پس و پیش کے بعد وہ مان گیا۔ اس کے بعد کلیرے نے جیک کی طرف رخ کیا مگر اس نے بات کرنے سے صاف انکار کردیا۔
کلیرے نے ٹیپ ریکارڈر بند کیا اور ان پر طائرانہ نظر ڈالی۔ "مجھے ابھی آپ لوگوں سے مزید کچھ سوالات کرنے ہیں۔ میرا مقصد یہ جاننا نہیں تھا کہ تم سب یہاں اور اس حال تک کیسے پہنچے۔ مجھے یہ جاننے میں زیادہ دلچسپی ہے کہ تم سب یہاں کس طرح کی زندگی بسر کرتے ہو، تمہارا ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح کا تعلق ہے۔ تم ایک دوسرے کے لیے کیا جذبات رکھتے ہو؟" یہ کہہ کر وہ لحہ بھر کے لیے رکی اور پھر گہری سانس لے کر افسردگی سے کہنے لگی۔ "میں نے سنا ہے کہ تمہارے گروپ کا کوئی ساتھی اب تم میں نہیں رہا۔" وہ سب کچھ جانتی تھی مگر اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا

بڑا شکاری بن رہا تھا... لیکن گوشت مزے دار تھا اس کا!

تھا کہ وہ بالکل انجان ہے۔
"میزی..." کئی آوازیں گونجیں۔
"مجھے اس کے متعلق بتاؤ۔"
"میں بتاتی ہوں۔" کلیرے کی بات سن کر سب خاموش ہوگئے تو کچھ توقف کے بعد ایلن نے ازخود میزی کے بارے میں بتانے پر آمادگی ظاہر کی اور کہنا شروع کیا۔ "وہ ایک اچھا انسان تھا مگر کچھ مشکلات کا شکار تھا۔ اس کے بعد ہم سب مشکلات کا شکار ہیں۔"
"میزی کس طرح کے مسائل کا شکار تھا؟" کلیرے نے چونک کر پوچھا۔
"منشیات... وہ خطرناک حد تک نشے کا عادی تھا۔"
"تم لوگوں سے پوچھ گچھ کے لیے پولیس آئی تھی؟"
ایلن سمیت کئیوں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔
"تم نے پولیس والوں کی کچھ مدد کی؟" کلیرے نے پھر سوال کیا۔
"ہم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" ایلن نے جواب دیا۔ "ہمیں تو کچھ پتا نہیں کہ اسے کس نے مارا ہوگا۔"
"یہ ٹھیک ہے کہ تم لوگ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے مگر تصور تو کرسکتے ہو کہ میزی کو کس نے مارا ہوگا؟" کلیرے

www.paksociety.com

نے سب پر ایک بار پھر طائرانہ نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر ایلن خاموش ہوگئی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ کمرے میں تناؤ بڑھ گیا تھا۔ یہ سوال سن کر ہر ایک پریشان تھا۔ کلیرے نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی کہ اس کے سوال سے یکدم کمرے کی فضا تناؤ سے بوجھل ہوگئی تھی۔ اس نے فوراً بات بدلی۔ ”یہ جگہ بڑی اچھی ہے۔ گرم بھی ہے، خشک بھی ہے اور میرے خیال میں یہاں کوئی دوسرا آتا جاتا بھی نہیں، جس سے تم لوگوں کے آرام میں کوئی خلل پڑے۔ میرا خیال ہے کہ سب بے گھر لوگوں کو شب بسری کے لیے اتنی اچھی جگہ میسر نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرائی اور ان سب کی طرف دیکھا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ کئی بے گھر لوگ تمہارے ساتھ رہنا چاہتے ہوں گے۔“

”ہمارے ساتھ کوئی آکر نہیں رہنا چاہے گا۔“ کچھ توقف کے بعد جیک نے خاموشی توڑی اور کلیرے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”جو بھی یہاں آنا چاہے گا، وہ پہلے سے ہی اچھی طرح جانتا ہوگا کہ میں یہاں رہتا ہوں۔ اسے یہاں رہنے کے لیے مجھ سے نمٹنا ہوگا۔“ اس کا لہجہ گمبھیر اور سنجیدہ تھا۔

جیک خاموش ہوا تو شیڈ میں مہیب سناٹا چھا گیا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کلیرے ہی نہیں، جیک کے سوا باقی دوسرے بھی یہ سن کر پریشان ہوگئے ہوں گے۔ ہم سب اچھی طرح جانتے تھے کہ جیک نہایت بددماغ، جھگڑالو اور ہر کسی سے الجھ پڑنے والا شخص تھا۔ اس نے جس طرح دھمکی آمیز لہجے میں کلیرے سے بات کی تھی، اس سے یقین تھا کہ سب یہی سوچ رہے ہوں گے کہ کہیں وہ کلیرے کے ساتھ کچھ نہ کر بیٹھے۔ میں بھی ڈر رہا تھا کہ کوئی بدمزگی نہ ہو، تاہم اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ اپنی بات کر کے دیوار کی طرف منہ کیے خاموشی سے ہاتھ تاپ رہا تھا۔ اس کی بات سن کر کلیرے بھی خوف زدہ انداز میں خاموش تھی۔

چند لمحے تک تو سب گم صم رہے مگر پھر کلیرے نے ہی خاموشی توڑی۔ ”اچھا دوستو...“ اس نے ٹیپ ریکارڈر اور نوٹ بک سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”مجھ سے بات کرنے اور اپنی کہانیاں سنانے کا بہت بہت شکریہ۔ ان معلومات سے مجھے بے گھروں کے مسائل کو سمجھنے اور ان پر فیچر لکھنے میں خاصی مدد ملے گی۔“ یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی۔

اسے اٹھتا دیکھ کر میں بھی کھڑا ہوگیا۔ ”چلو... میں تمہیں واپس لیے چلتا ہوں۔“ وہ جانے کے لیے مڑی۔

”تم یہاں نہیں رک رہے ہو؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

”واپس چلو...“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”تو کیا یہ سارا دن اسی شیڈ کے نیچے پڑے رہتے ہیں؟“ ہم کافی آگے گئے تو کلیرے نے مجھ سے پوچھا۔

”نہیں... دن نکلتے ہی جس کے سینگ جہاں سمائیں، وہیں چل دیتا ہے چار پیسے کمانے کے لیے ماسوائے رولس کے جو اکثر دن رات یہیں پڑا سوتا رہتا ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔

”عام طور پر جیک کس وقت وہاں پر ہوتا ہے؟“

”رات میں، وہ بھی ہر رات نہیں، اکثر راتوں کو غائب رہتا ہے۔ کسی کو پتا نہیں وہ کیا کرتا پھرتا ہے۔“ ہم اس وقت شیڈ سے کافی دور نکل آئے تھے۔ اچانک میرے دماغ میں ایک بات آئی۔ ”ایک منٹ رکو...“ میں نے ٹھہرتے ہوئے کلیرے سے کہا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”آج جیک بہت اچھے موڈ میں لگ رہا تھا، اس کا لہجہ خاصا نرم تھا مگر اب تم دوبارہ وہاں مت جانا...“

”مگر کیوں؟“ اس نے ایک بار پھر قطع کلامی کی۔

”وہ بہت خطرناک شخص ہے۔“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”آج تو اس کا موڈ اچھا تھا مگر مجھے ڈر ہے کہ اگر اس نے تمہیں دوبارہ وہاں دیکھا تو کہیں تمہیں کچھ نقصان نہ پہنچا بیٹھے۔ وہ بہت خطرناک شخص ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میری تشویش چہرے اور لہجے، دونوں سے صاف عیاں تھی۔

”شکریہ... تمہیں میرا کتنا خیال ہے۔“ اس نے تشکر بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ”تمہارے مشورے کو یقیناً نظر انداز نہیں کروں گی۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔

”یہی مناسب ہوگا۔“ میں نے جواب دیا پر مجھے یقین تھا کہ وہ ہرگز ایسا نہیں کرے گی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اسی بنا پر اسے وہاں دوبارہ نہ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اگر پچھلی رات میں اسے جائے وقوع پر نہ دیکھ لیتا تو اس کی بات پر یقین کر سکتا تھا مگر اب اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ فیچر کی آڑ میں دراصل وہ میزی کے پُراسرار قتل کا معما حل کرنا چاہتی تھی۔ مجھ جیسے بے گھر لوگ نہیں، صرف میزی اس کی اسٹوری کا مرکز تھا۔ وہ کیوں میزی کے قتل میں اتنی دلچسپی لے رہی تھی، یہ بات میرے قیاس سے بھی باہر تھی۔ ممکن ہے کہ وہ اس کے لیے صرف ایک اسٹوری ہو۔ ممکن ہے کہ بات کچھ اور بھی... مگر اس وقت میں یقین سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

☆☆☆

اُس رات میں پھر پلیا کے نیچے سویا۔ کافی رات گئے آنکھ لگی۔ جب تک جاگتا رہا، یہی سوچتا کہ کیا کرنا چاہیے۔ سوچ رہا تھا کہ کہیں اور چلا جاؤں... کسی دوسرے شہر یا دوسری ریاست میں۔ مجھے اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ کیسے جاؤں گا۔ جیب میں کلیرے کا دیا ہوا نوٹ موجود تھا۔ میں بس ٹرمینل جاتا، کاؤنٹر پر وہ نوٹ رکھتا اور کلرک سے کہتا کہ جہاں تک اس بیس ڈالر میں پہنچا جا سکتا ہے، وہاں کا ٹکٹ کاٹ دے۔

اگرچہ دل کہہ رہا تھا کہ چلا جاؤں مگر خدا جانتا ہے کہ میں کہیں اور جانا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے تو اس جگہ کوئی ایسی شے نہیں تھی جو مجھے روکے رکھتی مگر نہ جانے کیوں یہ سوچ رہا تھا کہ میرا یہاں ہونا زیادہ بہتر ہے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ میں گزشتہ کئی سالوں سے یہاں رہ رہا تھا۔ شیڈ اور اس پلیا کا عادی ہوگیا تھا۔

خیر... میں شہر سے تو نہیں گیا البتہ جس شام کلیرے کو لے کر گیا تھا، اس کے بعد شیڈ کی طرف بھی نہیں گیا۔ وہاں نہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ دوبارہ میزی کا زخم تازہ ہو جاتا، ممکن ہے کہ کلیرے بھی وہیں مل جاتی۔ اگر ایسا ہوتا تو پلیا کے نیچے رہنا بھی دوبھر ہو جاتا۔ ممکن تھا کہ میری تلاش میں وہ یہاں بھی پہنچ جاتی۔ میں پلیا کے نیچے تنہا نہیں پڑا رہتا تھا۔ مجرمانہ ذہنیت کے کئی اور بے گھر بھی اکثر وہیں شب بسری کرتے تھے۔ اگر وہ یہاں پہنچتی اور اسے میں نہ ملتا تو ڈر تھا کہ کہیں کوئی اسے نقصان نہ پہنچا دے۔

ایک دن اور گزر گیا مگر نہ تو پولیس نے مجھ سے رابطہ کیا، نہ کلیرے نظر آئی اور نہ ہی کوئی دوسرا مسئلہ پیدا ہوا۔

میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ مجھے کوئی مناسب جگہ تلاش کرنی چاہیے۔ بے گھروں کے لیے اس شہر میں ایک دو ہی ٹھکانے تھے۔ ایک بے گھر سینٹر، چرچ کے زیرِ اہتمام تھا جہاں صرف شراب کے عادی لوگوں کو رکھا جاتا، ان کی دیکھ بھال کی جاتی اور اس لت کو چھڑانے کا علاج ہوتا تھا۔ میں شراب سے بہت دور تھا اس لیے وہاں نہیں گیا البتہ دوسرے کے بارے میں سوچنے لگا۔

وہ ایک فلاحی ادارے کے تحت چلنے والا ادارہ تھا جہاں صرف بوڑھے بے گھروں کو داخلہ مل سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہیں جایا جائے۔ کم از کم نہا دھو کر بدلنے کو کپڑے تو مل جائیں گے۔ اس وقت شام کے چار بجنے والے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر ابھی سے اٹھ کر چل دوں تو اگلے چالیس پینتالیس منٹ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ آخر میں نے اس فیصلے پر فوری عمل کا ارادہ کیا اور صرف چالیس منٹ بعد میں ادارے کے کاؤنٹر پر کھڑا تھا۔

کچھ ہی دیر میں کاؤنٹر کلرک نے خانہ پری مکمل کی اور مجھے داخلہ دے دیا۔ مجھے پلاسٹک کا شناختی کارڈ بھی تھما دیا تھا۔ ساتھ ہی کھانے کے واؤچرز بھی دیے تھے۔ ایک شخص مجھے لے کر ایک کمرے میں گیا۔ وہاں کئی غسل خانے بنے تھے۔ ان کے باہر ہینگر میں ہر ناپ کے کپڑے لٹکے تھے۔

”تم نہا دھو کر کپڑے بدل لو اور چاہو تو یہ جوتے بھی۔“ اس نے میرے سراپا پر تنقیدی نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اندر شیونگ کا سامان بھی ہے۔“ اس نے انگلی سے غسل خانے کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہاں... میلے کپڑوں اور جوتوں کو اس تھیلے میں ڈال کر بند کر دینا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے میرے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک تھیلا پکڑایا اور باہر نکل گیا۔

چھ بجے میں ادارے کے ڈائننگ ہال میں گیا، واؤچر دیا۔ گرم گرم سینڈوچ اور کافی کا مگ لیا اور ڈائننگ میز پر آکر بیٹھ گیا۔ باقی واؤچرز میں نے کوٹ کی جیب میں رکھ لیے تھے۔ نیا نویلا گرم کوٹ کھانے کے دوران میرے زانو پر رکھا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھتا رہا مگر وہاں موجود کوئی بھی شخص میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ یہیں اس خاتون کو بھی دیکھا جس نے استقبالیہ پر میرے کوائف کا اندراج کیا تھا مگر وہ بھی اپنے آپ میں مگن کافی پی رہی تھی۔ میں تھوڑا سا نروس تھا لیکن میں نے کھانے کی آڑ لے کر گھبراہٹ کو بڑی حد تک پوشیدہ رکھا۔ گھبرانے کی وجہ یہ تھی کہ داخلے کے وقت میں نے اپنا نام غلط بتایا تھا۔ میں پلیا سے تو اٹھ کر آگیا تھا مگر یہ نہیں چاہتا کہ اگر پولیس اپنی تفتیش میں میزی کا قاتل مجھے قرار دے تو آسانی سے مجھ تک پہنچ جائے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر پولیس نے مجھے پکڑنا چاہا اور میں انہیں نہ ملا تو وہ لاوارثوں کے لیے قائم اس خیراتی ادارے تک بھی ضرور پہنچیں گے۔ وہ یہاں مقیم لوگوں کا چہرہ دیکھنے کے بجائے کمپیوٹر ریکارڈ کو جانچنا چاہیں گے۔ میں نے درست نام کا اندراج تو کروایا ہی نہیں تھا، اس لیے یقین تھا کہ وہ آسانی سے مجھے گرفت میں نہیں لے سکیں گے۔

کھانے کے بعد میں کامن روم میں آگیا۔ وہاں کئی لوگ موجود تھے۔ میں خاموشی سے ایک کونے میں رکھی آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ کرسی پر جھولتے ہوئے میرا دماغ بدستور منتشر تھا۔ ذہن پر عجیب و غریب خیالات نے مسلسل یلغار کی ہوئی تھی۔ میں برسوں سے سڑکوں پر بے

www.paksociety.com

گھری کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ سڑکوں اور خیراتی اداروں میں ایک فرق ہے اور میں اپنی منتشر سوچوں کا ذمے دار اسی کو قرار دے رہا تھا۔

سڑک پر زندگی بسر کرنے والا... آنکھ کھلتے ہی ناشتے، اس کے بعد لنچ اور پھر ڈنر کی فکر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ منشیات یا شراب کا عادی ہو تو اس کی پریشانی اور بڑھ جاتی ہے۔ وہ صرف اسی پریشانی میں مبتلا رہتا ہے کہ کس طرح دو پیسے ہاتھ لگ سکتے ہیں کہ دن گزر جائے۔ یہ پریشانی اسے کچھ اور سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتی مگر خیراتی ادارے میں شب بسری، کھانے پینے اور پہننے کا معقول اور مفت انتظام ہوتا ہے۔ اس لیے مجھ جیسے سڑک پر بسیرا کرنے والے کے پاس اب اس سے آگے سوچنے کا وقت بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس وقت یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ روٹی، کپڑا اور ٹھکانا مل گیا تو ذہن کئی اور خیالوں میں کھونے لگا تھا۔

تصور میں بار بار بیٹی ابھر رہی تھی لیکن میں نے سر جھٹکا۔ اس وقت میں میزی کو یاد کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی مجھ پر افسردگی طاری ہوگئی۔ میں سڑک پر رہنے والے جتنے بھی لوگوں سے اب تک ملا تھا، ان میں میزی سب سے بہترین انسان تھا۔ وہ اچھا دوست تھا مگر تب جب وہ پیسے نہ ہونے اور نشہ ٹوٹنے پر آپ کی پیٹھ پر گھونسے نہ برساتا کہ جو کچھ جیب میں ہے وہ نکال کر اسے دے دو۔ اس کے سوا اس میں کوئی اور برائی نہیں تھی۔ وہ نشہ کرتا تھا مگر سڑک پر رہنے والے مجھ جیسے دو چار لوگوں کو چھوڑ کر سب ہی نشہ کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ برائی نہیں، بے گھری اور سڑک بسری کرنے والوں کی زندگی کا مشترکہ انداز تھا۔ شیڈ میں میرے اور ایلن کے سوا سب ہی نشہ کرتے تھے مگر وہ سب میزی سے مختلف تھے۔ انہیں دو چار دن منشیات نہ ملے، تب بھی وہ گزارا کر لیتے تھے مگر میزی سے تو ایک دن بھی برداشت نہیں ہوتا تھا۔ وہ نشہ پورا کرنے کے لیے سب کچھ کرنے پر تل جاتا تھا اور اکثر میری پیٹھ پر اس کے مکے برستے تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ نشہ پورا ہو جانے پر وہ مجھ سے اپنے کیے کی معافی بھی مانگ لیتا تھا۔

"عمدہ کوٹ۔" میں آنکھیں موندے خیالوں میں گم تھا کہ کسی نے اونچی آواز میں کہا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ تین آدمی سامنے کھڑے میرے زانو پر رکھے کوٹ کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک وہ دراز قد تھا جو کچھ دیر پہلے کھڑکی میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔

میں چپ چاپ انہیں دیکھ رہا تھا۔ جب میں کچھ نہ بولا تو دو میرے دائیں اور ایک بائیں طرف آ کر کھڑا ہو گیا۔ ان کی نظریں کوٹ پر جمی ہوئی تھیں۔

"یہ تم نے کہیں سے لیا ہے؟" دائیں کھڑے دراز قد شخص نے پوچھا۔

میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔

"کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟"

یہ سن کر مجھے انکار کر دینا چاہیے تھا مگر میں اٹھا اور اس شخص کے چہرے پر تھپڑ مار دیا۔ اس کے بعد تینوں مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ اس وقت کمرے میں کئی اور لوگ تھے مگر کوئی بیچ بچاؤ کرانے نہ آیا۔ میں پٹتے ہوئے یہ سمجھ گیا تھا کہ وہ تینوں یہاں کے بدمعاش ہیں اور جسے میں نے تھپڑ مارا، وہ یقیناً ان کا باس ہوگا۔ میں نے ان کی بالادستی کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ فرش پر پڑا مار کھا رہا تھا مگر پھر بھی کوٹ دبوچ رکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ مجھے وہ سنگین نقصان پہنچاتے، میں نے لیٹے لیٹے کوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے مجھے مارنے کے لیے اٹھے ہاتھ سے کوٹ پکڑا اور مجھے چھوڑ دیا۔ اس کے ہٹتے ہی باقی دونوں بھی سیدھے کھڑے ہو گئے۔ میں فرش پر پڑا ہڈیاں سہلا رہا تھا۔

دراز قد بدمعاش نے کوٹ کی جیبیں ٹٹولنا شروع کر دیں۔ "محنت فضول گئی۔" اس نے اندر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بیس ڈالر کا نوٹ نکال کر اپنے دونوں ساتھیوں کو دکھایا۔ وہ نوٹ مجھے کلیرے نے دیا تھا۔

"لعنت ہو، خوامخواہ ہاتھ دکھائے۔" اس کے ساتھی نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

"اس میں سے تو مرے چوہے جیسی بدبو آ رہی ہے۔" دراز قد نے کوٹ کو سونگھنے کے بعد برا سا منہ بنا کر کہا۔

"تو واپس کر دو۔" میں نے فرش کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے التجا کی۔

"اگر ہم نہ دیں تو کیا کر لو گے؟" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"یہ مجھے واپس کر دو۔" میں نے منمناتے ہوئے مطالبہ کیا۔

اگرچہ انہوں نے صرف چند سیکنڈ ہی میری پٹائی کی تھی مگر میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا۔ میں کھڑا ہوا اور ہڈیاں سہلانے لگا۔ دراز قد بدمعاش کوٹ تھامے مجھے گھور رہا تھا۔

"یہ لو پکڑو۔" چند سیکنڈ کے بعد اس نے میرے منہ پر کوٹ دے مارا۔ "یہاں رہنا ہے تو اوقات میں رہو۔" اس نے انگلی دکھاتے ہوئے دھمکی دی۔ "تمہاری سزا یہ ہے کہ

بستر کے بجائے رات بھر تم یہیں فرش پر پڑے رہو گے۔" اس نے کچھ اس انداز سے یہ الفاظ ادا کیے جیسے میں اس کا زرخرید غلام اور بے گھروں کا یہ مرکز اس کی جاگیر ہو۔ مجھے حیرت تھی کہ کس طرح ادارے کے منتظمین اس بدمعاش کو وہاں برداشت کرتے ہیں۔

وہ رات میں نے فرش پر لیٹ کر گزاری۔ ایک تو سردیاں اور اوپر سے ٹھنڈا فرش۔ میرے گھٹنے سینے سے لگے ہوئے تھے اور جو تھوڑی بہت حرارت مل رہی تھی وہ اوپر پڑے اس کوٹ کی بدولت تھی، جس کی وجہ سے میں اس حال کو پہنچا تھا۔

جیسے تیسے رات کٹ گئی۔ صبح ہوتے ہی میں ڈائننگ ہال میں گیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ واؤچر نکال کر کلرک کو دیا۔ ڈبل روٹی، مکھن اور انڈے سے ناشتا کیا۔ کافی کا پیپر مگ تھاما اور باہر آ گیا۔ کھانے کے بقایا واؤچر اور شناختی کارڈ میں نے مرکز سے باہر نکلتے ہوئے کچرے کے ڈبے میں ڈال دیے۔ ان بدمعاشوں کے ساتھ گزارا کرنا کم از کم میرے لیے ناممکن تھا۔ میری بوڑھی ہڈیاں ان مسٹنڈوں کی مار جھیلنے کے قابل نہیں تھیں۔ رات کی مار اور ٹھنڈے فرش پر پڑے رہنے کے باعث میری ہڈیوں اور کمر میں شدید درد تھا۔

اس دن کافی تیز بارش ہو رہی تھی۔ سردی بھی بڑھ چکی تھی۔ ایک دکان کے شیڈ کے نیچے کھڑے ہو کر کافی پی۔ اس دوران میں بدستور یہی سوچتا رہا کہ کہاں جانا چاہیے۔ مجھے یقین تھا کہ اس بارش میں پارک جانا فضول ہوگا۔ اگر بارش نہ ہوتی تو وہاں جا کر درختوں کے نیچے لیٹ کر سو سکتا تھا مگر اس وقت مجھے ایسی جگہ کی تلاش تھی جو خشک ہو اور ہوا بھی وہاں کم سے کم پہنچے۔ کافی دیر سوچنے کے بعد بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر پلیا کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں میں بارش اور ہوا سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ ویسے بھی مجھے اس پلیا سے اُنسیت تھی۔ جگہ نئی ہو تو نیند بھی دیر سے آتی ہے مگر پلیا تو میرا ٹھکانا تھی۔ اجنبیت کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ مجھے لگا کہ وہیں جا کر نیند پوری کرنی چاہیے۔ میں دکانوں کے آگے لگے چھجوں کی آڑ لے کر خود کو بھیگنے سے بچاتا ہوا پلیا کی طرف چل پڑا۔

سارا دن سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ میں پلیا کے نیچے سے نکلا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ مجھے کافی کی سخت طلب تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ مفت میں کافی کہاں سے مل سکتی ہے۔ اسی دوران سامنے سے کلیرے آتی دکھائی دی۔ اس نے اوورکوٹ پہن رکھا تھا اور دونوں ہاتھ اس کی جیبوں میں تھے۔

"تم کہاں چلے گئے تھے؟" قریب پہنچتے ہی اس نے کہا۔ "میں کل بھی یہاں آئی تھی مگر تمہارا کوئی پتا نہ چلا۔ میں کئی جگہوں پر تمہیں ڈھونڈتی رہی۔ تمہیں نہ پا کر میری پریشانی بڑھ گئی۔" وہ بے تکان بولے چلی جا رہی تھی۔ اس کے لہجے سے اس کے لفظوں کی سچائی ظاہر ہو رہی تھی۔

میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔

"کہاں غائب تھے تم؟" جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے پیار بھرے لہجے میں ڈانٹا۔

"بتانے کی کوئی بات نہیں۔" میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

"میزی پراسرار انداز میں قتل ہو چکا، تم غائب تھے۔" وہ تشویش بھرے لہجے میں کہنے لگی۔ "کل رات میں بہت پریشان تھی۔ سوچ رہی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم بے گھروں کے پیچھے کوئی لگ گیا ہے جو تم سب کو یہاں سے نکالنا چاہتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "مسٹر جے ڈی، یہ نیویارک ہے۔ یہاں سب کچھ ممکن ہے... خدا کا شکر ہے کہ تم صحیح سلامت ہو ورنہ میں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں تمہارے ساتھ..." اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

میں اس کے ادھورے فقرے کا مطلب سمجھ چکا تھا مگر پھر بھی خاموش رہا۔ سچ پوچھو تو اس کی تشویش بھری باتوں میں جواب دینے کے لائق کوئی بات ہی نہیں تھی۔

اس نے کچھ دیر تک میرے منہ کھولنے کا انتظار کیا لیکن جب میں کچھ نہ بولا تو اس نے بات شروع کر دی۔ "مجھے امید ہے کہ اب تک تمہارا ذہن تبدیل ہو چکا ہوگا اور تم بھی ایلن کی طرح مجھے اپنی بپتا ضرور سناؤ گے۔"

"ہرگز نہیں۔"

"تم مجھے اپنی ساری کہانی سنا دو، اس طرح تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ تم خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرو گے۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ نفسیاتی وار کر رہی ہے۔

"تم میرے ساتھ کیوں مذاق کرنے پر تلی ہو۔" میں نے اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ اصل میں تم کیا بات معلوم جاننا چاہتی ہو۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" یہ سن کر اس نے غصے سے جواب دیا۔

"تم میزی کے قتل کے بارے میں کھوج کر رہی ہو۔" میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "تم پولیس سے پہلے یہ کیس حل کرنا چاہتی ہو۔ سمجھتی ہو کہ پولیس اب تک صرف

www.paksociety.com

اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ تم نہیں چاہتے کہ پولیس یا پھر کوئی اور اس کیس کو حل کرے۔“ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم اور میزی صرف شیڈ کے نیچے رات بسر نہیں کرتے تھے بلکہ تم دونوں بہت اچھے دوست بھی تھے۔“

اس کی بات سن کر میں چند لمحوں تک سوچتا رہا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔ ”میں اور میزی بہت اچھے دوست تھے۔ یہ بات تو میں نے تم سے نہیں کہی تھی۔ جب میں تمہیں شیڈ میں رہنے والے دوسرے لوگوں سے ملوانے لے کر گیا تھا، تب ان میں سے بھی کسی نے یہ ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ تم میری غیر موجودگی میں بھی شیڈ والوں کے پاس گئی تھیں۔“

میری بات سن کر اس نے نہ تو انکار کیا اور نہ ہی اقرار بلکہ خاموشی سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ اس کی خاموشی سے لگ رہا تھا کہ میں نے ٹھیک کہا تھا۔

”تم کیا سوچتی ہو، اب کیا ہونے والا ہے؟“ اسے خاموش پا کر میں نے ناراض لہجے میں کہا۔

”تم چاہتے کیا ہو؟“ میری بات سن کر وہ بھی بھڑک گئی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو اور کس لیے۔ ذرا ایک منٹ کے لیے اس قاتل کے بارے میں سوچو، جس نے میزی کو قتل کیا تھا۔ وہ اس وقت بھی آزاد گھوم رہا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ قاتل میں ہوں اور اب تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔ ممکن ہے کہ میں تمہیں قتل کرنا چاہتی ہوں۔ تمہارے کوٹ کی جیبوں میں ایسا کچھ ہے جو ایک قاتل سے تمہیں بچا سکے۔ ایسا قاتل جو پوری تیاری اور منصوبہ بندی کر کے آیا ہے اور تم اس کے ارادوں سے لاعلم ہو تو کیسے بچو گے اس سے۔“ وہ بھی اب خاصی غصے میں نظر آرہی تھی۔

”میرے پاس بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہیں۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے بھی تمہیں اپنے سامنے پا کر خوف زدہ ہونے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ جانتا ہوں کہ تم قاتل نہیں ہو۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ تم قاتل کے بارے میں جانتے ہو۔“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”بتاؤ... قاتل کون ہے؟“ یہ کہہ کر وہ مجھے گھورنے لگی۔

”مجھے نہیں پتا۔“

”تم کچھ نہ کچھ ضرور جانتے ہو۔“

”یہ تمہارا خیال ہے مگر واقعی میں میزی کے قاتل کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ میری بات کا یقین کرو۔“

میری بات سن کر وہ خاموش رہی مگر اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ میری بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں!

”تم یہاں بالکل محفوظ نہیں ہو۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے اس سے کہا۔ میری آواز خاصی اونچی تھی۔ وہ بدستور اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ ”خدا کے لیے یہاں سے چلی جاؤ۔ اگر تم میری بات سن رہی ہو تو یہاں سے جلد از جلد چلی جاؤ۔ تم یہاں محفوظ نہیں ہو۔“ میں نے ہذیانی انداز میں اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ اسے خاموش اپنی جگہ بت بنا کھڑا دیکھ کر میرا غصہ اور بھی زیادہ ہو گیا۔

میں خاموش ہوا تو وہ تیزی سے پلٹی اور بنا کچھ کہے لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی واپس چل دی۔ میں نے غصے میں آکر اسے ڈانٹ کر بھگا تو دیا تھا لیکن اس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد مجھے احساس ہو گیا کہ انجانے میں کتنی بڑی غلطی کر بیٹھا ہوں۔ وہ اپنے طور پر مجھے میزی کا قاتل سمجھ رہی تھی اور میری خاموشی نے اس کے شک کو اور بڑھا دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے دیکھ کر مشتعل ہو جانے اور یہ کہنے کے بعد کہ تم قاتل نہیں ہو، اس کا شک اور مضبوط ہو جائے گا۔ یہاں سے جانے کے بعد وہ دوسرے لوگوں سے میرے بارے میں پوچھ گچھ کرے گی۔ گڑے مردے اکھاڑنے میں لگ جائے گی۔ ممکن ہے کہ وہ میرے ماضی کو جان جائے۔ یہ سوچ کر ہی میں لرز اٹھا۔ مجھے یقین تھا کہ ایسا ہوا تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ مجھے پچھتاوا ہونے لگا کہ اس پر غصہ ہو کر کے میں نے اپنے حق میں کچھ بہتر نہیں کیا۔ اب وہ پوری جانفشانی سے میرے پیچھے پڑ جائے گی۔

کافی سوچ و بچار کے بعد میں نے اپنی مرضی کے خلاف قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسروں سے میرے بارے میں پوچھے میں نے خود یہ خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ اس کا مطلب میرے پرانے زخموں کا ہرا ہونا تھا مگر پھر بھی میں نے کلیرے کا ساتھ دینے کا نہایت مشکل فیصلہ تھا۔

دوسرے دن صبح میں پے فون بوتھ گیا۔ ڈائریکٹری سے ہیرالڈ اخبار کا نمبر ڈھونڈا اور سکہ ڈال کر دفتر کا نمبر ملایا۔ وہ موجود نہیں تھی۔ آپریٹر نے بتایا کہ وہ سہ پہر کو دفتر آتی ہے۔

میں پلیا کی طرف واپس جانے کے بجائے اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ مجھے سہ پہر کا انتظار تھا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا

تھا آخر دوپہر ڈھلی اور پھر شام کے چار بجے کے قریب میں کلیرے کے دفتر کی طرف چل دیا۔ کچھ دیر بعد میں ’ہیرالڈ‘ کے دفتر کے نیچے کھڑا تھا۔

وہ چار منزلہ پرانے طرز کی عمارت تھی، جس کی تیسری منزل پر اخبار کا دفتر تھا۔ میں عمارت کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ وہاں کوئی خاص سیکورٹی نہیں تھی۔ میں سیڑھیوں کے ذریعے تیسری منزل پر پہنچا۔ وہاں کئی لوگ تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان سے جب میں نے رپورٹر کلیرے کے بارے میں پوچھا تو اس نے انگلی سے سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اندر جانے کو کہا۔ میں ہال میں داخل ہوا۔ وہاں کئی میزیں تھیں، جن پر لوگ بیٹھے کمپیوٹر پر کام کر رہے تھے۔

میں نے ہال میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ وہ ایک کونے میں بیٹھی کمپیوٹر پر کچھ لکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا اور کانوں پر ہیڈ فون چڑھا ہوا تھا۔ میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

”تم اور یہاں...“ میں قریب پہنچ کر کھنکھارا تو اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور حیرانی سے کہا۔ ”یہاں کیا کرنے آئے ہو؟“ اس نے نیچی آواز میں کہا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”کیا تم مجھے یہ کچھ وقت کے لیے ادھار دے سکتی ہو؟“ میں نے انگلی سے منی ٹیپ ریکارڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”او کے۔“ یہ سنتے ہی میں نے ٹیپ ریکارڈر اٹھایا۔ کھینچ کر ہیڈ فون کی تاریں نکالیں اور بنا ایک لفظ کہے پلٹ گیا۔

”سنو تو سہی۔“

پیچھے سے اس نے پکارا مگر میں نہیں رکا۔ ایک بار ایسا لگا کہ جیسے وہ پیچھے پیچھے بھاگتی ہوئی آرہی ہے لیکن وہ میری غلط فہمی تھی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے ٹیپ ریکارڈر جیب میں ڈال لیا۔ باہر نکلنے تک نہ تو کسی نے مجھے روکنے کی کوشش کی اور نہ ہی وہ میرے پیچھے آئی۔

میں واپس پلیا کی طرف لوٹنے کے بجائے پارک کے قریب سے گزرنے والی ایک سڑک پر جا کر بیٹھ گیا۔ شام ہونے والی تھی مگر مجھے رات کا انتظار تھا۔ اندھیرا ہونے پر پارک کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن اس کے اندر نہیں۔ ویسے تو دن کی روشنی میں بھی اس طرف جا سکتا تھا لیکن خدشہ تھا کہ کہیں مجھے ڈھونڈتے ہوئے کلیرے نہ پہنچ جائے۔ اس لیے

حسنِ تقسیم

شیر شکار کو نکلا تو ایک لومڑی اور گیدڑ اس کے ساتھ چلے۔ شیر نے تھوڑی دیر کے اندر ہی ایک گدھا، ایک ہرن اور ایک خرگوش کا شکار کر لیا۔ اس نے گیدڑ سے کہا۔ ”میاں گیدڑ! ذرا اس شکار کو تقسیم تو کرنا۔“

گیدڑ نے گدھا، شیر کی طرف بڑھا دیا اور بولا: ”یہ سب سے بڑا اور زیادہ ہے اسے آپ نوش فرمالیں۔ ہرن میں لے لیتا ہوں اور خرگوش لومڑی کا حق ہے۔“ شیر کو غصہ آگیا۔ اس نے گیدڑ کے ایک تھپڑ رسید کیا جس سے اس کی ایک آنکھ جاتی رہی۔ اس کے بعد شیر نے لومڑی سے کہا: ”اب تم تقسیم کرو۔“

لومڑی نے کہا۔ ”یہ خرگوش آپ کے ناشتے کے لیے ہے، ہرن کو دوپہر میں کھا لیجیے گا اور گدھا جب بھی بھوک لگے، نوش فرما لیجیے گا۔“

شیر نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”بی لومڑی اتنی اچھی تقسیم تم نے کس سے سیکھی؟“

لومڑی نے جواب دیا۔ ”گیدڑ کی ایک آنکھ سے۔“

(اسلام آباد سے شکیل کاظمی کا تحفہ)

نجومی

ایک نجومی نے ایک نوجوان عورت کا ہاتھ دیکھ کر کہا۔ ”کیا آپ اپنے ہونے والے شوہر کے بارے میں کچھ جاننا چاہیں گی؟“

”جی نہیں!“ عورت چونک کر بولی۔ ”البتہ میں اپنے موجودہ شوہر کے ماضی کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہوں۔“

(فاطمہ سعید قریشی، کراچی)

بہترین کافی

گاہک بے چارہ کافی کا انتظار کرتے کرتے تنگ آگیا تو ہوٹل سے اٹھ کر جانے لگا۔ اتنے میں بیرا دوڑا دوڑا آیا اور میز پر کافی رکھتے ہوئے بولا۔

”ناراض نہ ہوں جناب! بڑی مزے دار کافی لایا ہوں۔ جنوبی امریکا کی ہے۔“

گاہک نے بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ ”معاف کرنا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میری خاطر اتنی دور چلے گئے ہو۔“

(حمیرا اقبال کی آمد کراچی سے)

www.paksociety.com

ایسی جگہ بیٹھا تھا، جہاں وہ مجھ تک نہ پہنچ سکے۔ میرا منصوبہ سیدھا سادہ تھا مگر میں یہ بات نہیں جانتا تھا کہ اسے کس طرح کامیابی سے مکمل کروں گا۔

رات کا اندھیرا پھیل گیا تو میں پارک کی طرف چلا۔ وہاں سے ہوتے ہوئے میں شیڈ کی طرف جانا چاہتا تھا۔ شیڈ کی طرف جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہاں جیک نہ ملا تو پھر وہ کہاں مل سکے گا لیکن خوش قسمتی ساتھ تھی۔ جب میں شیڈ کے قریب پہنچا تو مجھے جیک کی آواز سنائی دی۔ وہ چلّا چلّا کر باتیں کر رہا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو سرخ روشنی نے بتا دیا کہ وہاں کئی لوگ الاؤ کے گرد بیٹھے ہیں۔ میں سیدھا ان کی طرف جانے کے بجائے درختوں کے سائے میں رکا۔ جیب سے ٹیپ ریکارڈر نکال کر ریکارڈنگ بٹن دبایا اور واپس اسے جیب میں ڈال لیا۔

میں نے قدم آگے بڑھائے اور جب ان کے قریب پہنچا تو جیک نے مجھے دیکھ لیا مگر اس کے باوجود وہ مجھے نظر انداز کر کے بدستور بولتا رہا۔ وہاں موجود دوسروں نے مجھ پر نظر ڈالی مگر نہ جانے میرے منہ پر کیا لکھا تھا کہ کسی نے مجھے خوش آمدید نہیں کہا۔ وہ چپ چپ مجھے گھورتے جا رہے تھے۔ چند لمحے وہیں کھڑا رہا اور پھر قدم آگے بڑھائے اور جیک کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' اس نے مجھے دیکھا تو درشت لہجے میں کہا۔

''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے میزی کو کیوں قتل کیا؟''

''لعنت ہو تم پر۔'' وہ چلّایا۔

''تم نے یہ سب کیوں کیا؟'' میں نے اطمینان بھرے لہجے میں پوچھا۔

جواب میں ایک بار پھر اس نے مجھ پر لعنت بھیجی۔

''تم بتا سکتے ہو یہ کیوں کیا؟'' مجھے اس کے غصے کی کوئی پروا نہ تھی۔

یہ سنتے ہی جیک غصے کے مارے لرزتا ہوا کھڑا ہوا اور میرے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔ میں لڑکھڑا کر رہ گیا مگر کوئی مزاحمت نہیں کی۔ ''اسے کیوں مارا؟'' میں نے گال سہلاتے ہوئے پھر اپنی بات دہرائی۔

''اس نے میرے پیسے چرائے تھے۔ میری جمع پونجی چوری کر لی تھی اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے۔'' وہ غصے سے دھاڑا۔

''تو تم نے اسے مار دیا؟''

''میں نے اسے صرف مارا ہی نہیں۔'' وہ چلّایا۔ ''میں نے اس پر گھونسے برسائے تھے، میں نے خالی ہاتھوں سے ہی اس کی جان لے لی تھی مکے مار مار کر۔'' وہ ہذیانی انداز میں اپنے جرم کا اعتراف کر رہا تھا۔ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں تک مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتا رہا اور پھر مکا تان کر آگے بڑھا۔

''اور اب تم مجھے مارنا چاہتے ہو؟'' خود کو اس کے مکے کی زد سے بچانے کے لیے میں دو قدم پیچھے ہٹا۔

''تم میرے معاملات میں خوامخواہ ٹانگ کیوں اڑا رہے ہو؟'' جیک ایک بار پھر چلّایا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بدستور وہیں کھڑا تھا۔

''اپنے کام سے کام رکھو ورنہ میں تمہیں بھی جہنم رسید کر دوں گا۔'' وہ اپنے آپے سے باہر تھا۔ چلّاتے ہوئے اس کے منہ سے تھوک کے چھینٹے اُڑ رہے تھے۔ ''مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں۔ جو میرے معاملات کے بیچ آئے گا، اسے جان سے مار دوں گا۔'' ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہے۔

میں اسے خاموشی سے گھور رہا تھا۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ تمہیں میزی کو قتل نہیں کرنا چاہیے تھا، تم نفسیاتی مریض ہو، تم پاگل ہو چکے ہو مگر میں نے اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ خاموشی سے مڑا اور واپس پلٹ گیا۔ میں جیک کے اعترافِ جرم کی یہ ٹیپ کلیرے تک پہنچانا چاہتا تھا مگر سچ کہوں مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ میں بزدل آدمی ہوں اور اس وقت بھی خوف نے مجھے جکڑا ہوا تھا۔

مختلف وسوسوں میں گھرا، پیدل چلتے چلتے میں ہیرالڈ کے دفتر پہنچ گیا۔ اندر داخل ہوا تو سامنے استقبالیہ پر ایک بوڑھا شخص بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

''یہ رپورٹر کلیرے تک پہنچا دیں۔'' جیب سے ٹیپ ریکارڈر نکال کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے میں نے کہا۔

''اوکے۔'' یہ سنتے ہی میں پلٹ گیا۔

''سنو...'' اس نے پیچھے سے پکارا۔ ''مس کلیرے دفتر میں ہی ہیں اگر تم چاہو تو خود...''

اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ میں کوئی جواب دیے بنا ہی باہر آ گیا۔

☆☆☆

میں نے کلیرے تک وہ سب کچھ پہنچا دیا جس کی اسے تلاش تھی۔ اس کے بعد تین دن گزر گئے۔ نہ تو وہ مجھے دکھائی دی اور نہ ملنے آئی۔ میں مطمئن تھا کہ چلو قصہ ختم ہوا۔ اس نے

کیا کیا، جیک کا کیا ہوا، پولیس نے کیا کارروائی کی... مجھے اب کسی بات کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ایک بار پھر پلیا کے نیچے راتیں اور سڑکوں پر میرا دن بسر ہونے لگا تھا پہلے کی طرح۔

چوتھے دن وہ مجھ سے ملنے آئی۔ میں سڑک کنارے بینچ پر بیٹھا تھا۔ ''ہیلو جے ڈی۔'' اس نے گرمجوشی سے کہا مگر میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

''میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔'' کچھ دیر تک کلیرے نے میرے جواب کا انتظار کیا مگر مجھے بدستور خاموش پا کر اس نے ازخود بات شروع کر دی۔ ''مجھے اندازہ تھا کہ شاید تم جانتے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے رکی اور پھر خود ہی بتانے لگی۔ ''پولیس نے جیک کو میزی کے قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا ہے۔ اس نے قتل کا اعتراف بھی کر لیا۔ پولیس نے تمہاری اور اس کی آواز کا سائنسی تجزیہ کروایا۔ آوازیں اصلی تھیں۔ پولیس کو جیک کے کپڑوں پر خون کے دھبے ملے، جن کے تجزیے سے پتا چلا کہ وہ میزی کا خون تھا۔ اس کو سزا دلوانے کے لیے پولیس کے پاس ٹھوس ثبوت ہیں۔ وہ بچ نہیں پائے گا۔''

مجھے یقین تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہوگی۔ بے گھر لوگوں کو تو ویسے ہی کپڑے بدلنے کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب وہ پھٹنے لگیں مگر جیک کی بات کچھ اور تھی۔ وہ تو ہفتوں ہاتھ منہ نہیں دھوتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ صرف اس کے کپڑوں پر ہی نہیں، ہاتھوں پر بھی اب تک میزی کا خون لگا ہوگا۔

''اِدھر دیکھو۔'' کلیرے نے مجھ سے کہا۔

''مجھے تمہارے پیسے نہیں چاہئیں۔'' میں بدستور سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''دیکھو تو سہی۔'' اس نے پیار بھرے لہجے میں دوسری بار کہا۔ ''یہ پیسے نہیں ہیں۔''

یہ سن کر میں نے آہستہ سے سر اوپر اٹھایا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار کا بڑے سائز کا تراشہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔

''یہ بیٹی کی تصویر ہے۔'' اس نے تراشہ میری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں کچھ دینا چاہتی ہوں مگر میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ تمہیں کیا دوں۔''

میں نے ہاتھ بڑھایا اور تراشہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ میں یہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ میری نگاہوں کے سامنے بیٹی کی تصویر کسی اور کے ہاتھ میں ہو۔

''میں نے شیڈ میں موجود تمہارے سب ساتھیوں کی کہانیاں سن لی ہیں مگر میں تمہاری کہانی سننا چاہتی ہوں، تمہارا دکھ جاننا چاہتی ہوں۔'' اس نے کچھ توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''تم مجھے اپنی کہانی سناؤ تم پر کیا گزری ہے؟''

''میں نہیں سنا سکتا۔''

''اگر تم اپنے منہ سے اپنی کہانی نہیں سنانا چاہتے تو تمہاری مرضی مگر میں سچ جانتی ہوں۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے وہ فیچر پڑھ لیا ہے جو تمہارے بارے میں شائع ہوا تھا۔ اسی سے یہ تصویر میں نے کاٹی ہے۔ میں سب کچھ جان چکی ہوں۔ تم اپنے منہ سے کہو یا نہ کہو مگر میں تم پر کوئی فیچر نہیں لکھ رہی۔ میں چاہوں گی کہ تم میری بات کا اعتبار کرو۔ میں تمہارے پرانے زخموں کو کرید کر انہیں دوبارہ ہرا نہیں کرنا چاہتی۔''

''مجھے کوئی پروا نہیں۔'' اس کی بات سنتے ہی میں چونک کر بولا۔ ''جس فیچر کا تم ذکر کر رہی ہو، اس میں مجھے نفسیاتی مریض لکھا گیا تھا۔ اس جیسے ہزاروں فیچر آئے دن اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔ اب مجھے ان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' یہ کہتے ہوئے میرا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ مجھے اپنے دل میں درد کی ہلکی سی لہر اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔

''فیچر میں لکھا تھا کہ تمہاری دس سالہ بیٹی نمونیا سے موت کا شکار ہوئی مگر تم اسے اسپتال لے جانے کے بجائے چرچ میں جا کر اس کی زندگی کی دعائیں مانگتے رہے۔'' کلیرے نے کہنا شروع کیا۔ میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ''اس کے مرنے کے بعد تم پر اس کے قتل کا مقدمہ چلا۔ تم پر جان بوجھ کر اسے اسپتال نہ پہنچانے کا الزام لگایا گیا مگر عدالت نے تمہیں بے قصور قرار دے کر بری کر دیا۔ اس کے بعد اچانک تم غائب ہو گئے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔ ''جب عدالت نے تمام الزامات سے بری کر دیا تھا تو پھر تم کیوں روپوش ہوئے؟ یہی وہ سوال ہے جس کا جواب میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔''

''یہاں سے چلی جاؤ۔''

''میں کہانی کا صرف ایک رخ جانتی ہوں۔'' کلیرے نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''دوسرا رخ صرف تم جانتے ہو اور میں یہ تم سے سننا چاہتی ہوں۔''

''تم یہاں سے جاتی کیوں نہیں ہو۔''

کلیرے کچھ دیر تک کھڑی خاموشی سے مجھے تکتی رہی اور پھر اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر میرے برابر رکھا۔ ''اگر تم کبھی اپنی کہانی مجھے سنانا چاہو یا میری کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت ہو، پلیز مجھے فون ضرور کرنا۔'' اس کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے واپس چل دی۔

اس کے جانے کے بعد میں وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ میرے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے وہ تہ شدہ اخباری تراشہ کھولنا شروع کیا جو کلیر نے مجھے دیا تھا۔ یہ بیٹی تھی، میری اکلوتی بیٹی... مجھے گمان نہیں یقین تھا کہ میں اپنی چہیتی بیٹی کا قاتل ہوں۔ عدالت نے مجھے اس کی موت کے الزام سے بری الذمہ قرار دیا تھا مگر خود کو اس الزام سے بری نہ کرسکا۔ سڑکوں پہ زندگی بسر کرنا میری مجبوری نہیں میری وہ سزا ہے جس کا انتخاب میں نے خود اپنے لیے کیا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود میری سزا اب تک پوری نہیں ہوئی۔

میرا باپ پادری تھا۔ میں بھی بچپن سے ہی بہت مذہبی واقع ہوا تھا۔ جب بیٹی کو نمونیا ہوا تو میں اس کی حالت بگڑنے پر اسپتال لے جانے کے بجائے چرچ چلا گیا اور گڑگڑا کر خدا سے اس کی زندگی کی بھیک مانگنے لگا مگر جب لوٹ کر آیا تو وہ دنیا سے جا چکی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ ”وہ میری وجہ سے موت کا شکار ہوئی۔“ یہ بات اسی لمحے میرے دل میں خنجر کی طرح پیوست ہوگئی۔ جب میری بیوی نے بیٹی کی موت پر میرے خلاف غفلت سے ہلاکت کا مقدمہ درج کرایا تو مجھے ذرا سا بھی برا نہ لگا۔ میں سمجھتا تھا کہ عدالت نے سزا دی تو میرے ضمیر کا بوجھ ہلکا ہوجائے گا مگر عدالت نے مجھے ہر الزام سے بری کردیا۔

بریت کے بعد میں عدالت سے سیدھا گھر لوٹا اور کافی دیر تک بیٹی کی تصویر کے آگے کھڑا... معافی مانگتا رہا اور پھر اچانک میں نے ایک فیصلہ کیا۔ میری بیوی جینی ابھی تک نہیں لوٹی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ گھر آئے عدالت سے سیدھی قبرستان گئی ہوگی۔ میں نے گھر کھلا چھوڑا اور باہر نکل گیا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ ویسے بھی مجھے اب کسی شے کی ضرورت نہ تھی۔ میں مرنا چاہتا تھا۔ خودکشی کے لیے کسی تیز رفتار کار کے آگے خود کو ڈال دینے کی کوشش کی مگر بزدل تھا، اپنے ہاتھوں موت کو گلے نہ لگا سکا۔ بہت دنوں تک یونہی آوارہ گردی کرتا رہا، بھوکا پیاسا رہا۔ سمجھتا تھا کہ فاقوں سے مرجاؤں گا مگر بے ہوشی کی حالت میں مجھے اسپتال پہنچانے والے خیراتی ادارے نے بچالیا۔ میں شہر چھوڑ چکا تھا مگر بیٹی کی یاد اور احساسِ ندامت ہر وقت مجھے تڑپاتے تھے۔ آج میں نے برسوں بعد بیٹی کی تصویر دیکھی تو ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ میں سڑک کنارے بیٹھا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اب تو مجھے ٹھیک سے یہ بھی یاد نہ رہا کہ بیٹی کی موت کو کتنے سال گزر چکے تھے۔

ایک دن یونہی سڑک پر گھومتے ہوئے میزی ملا۔ وہ میری بیوی کا دور کا رشتے دار تھا۔ وہ بچپن سے ہی نشے کی لت کا شکار ہوچکا تھا۔ ایک صرف میں تھا، جو اس سے نفرت نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا۔ اسی سے پتا چلا کہ میرے گھر چھوڑنے کے کچھ عرصے بعد ہی جینی نے خودکشی کرلی تھی۔ دنیا میں صرف میزی ہی وہ واحد شخص بچا تھا جو میری پتا جانتا تھا۔ وہ جب تک زندہ رہا، میری دلجوئی کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی موت کے بعد اب میں بالکل نہیں چاہتا تھا کہ کوئی میری دکھ بھری زندگی سے واقف ہو۔

میں زار و قطار رو رہا تھا۔ تصویر میرے ہاتھ میں تھی اور زرد لیمپ پوسٹ کی روشنی میں ماحول نہایت افسردہ تھا۔ اسی دوران زور سے بادل گرجے، بجلی چمکی اور میرے خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو آسمان سیاہ بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک یخ بستہ ہوا کا جھونکا آیا۔ میرے رگ و پے میں ٹھنڈ کی لہر اتر گئی۔ اسی دوران دو موٹی موٹی بوندیں میرے سر پر پڑیں۔ اچانک ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پلاسٹک کی تھیلی نکالی۔ تصویر کو چوما اور تراشہ تہ کرکے قمیص کی اوپری جیب میں رکھ لیا عین دل کے اوپر۔ اسی دوران موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔

میں نے رہائی کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ خود ساختہ سزا سے بریت کا اختیار بھی صرف مجھے ہے۔ تیز بارش ہوتی رہی۔ میں بھیگتا رہا۔ لگ بھگ پون گھنٹے کے بعد بارش رکی۔ میں پانی میں شرابور تھا۔ سردی کے مارے میرا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ سانس پھول رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اگر اسی طرح میں رات بھر پلیا کے نیچے پڑا رہا تو جلد ہی تیز بخار مجھے آن گھیرے گا۔ پلیا کے نیچے ویسے بھی ویران کونے میں پڑا رہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ صبح تک مجھے نمونیا ہوجائے گا۔ میں نمونیا کی وہی شدت محسوس کرکے اپنی بیٹی کے پاس جانا چاہتا تھا جو اُس نے تب اٹھائی، جب میں اسے اسپتال لے جانے کے بجائے چرچ میں تھا اور اس کی ماں فیکٹری میں اپنی ڈیوٹی کررہی تھی۔ یقین تھا کہ اس ویرانے میں ایسا کوئی نہیں جو مجھے اسپتال پہنچانے کی فکر کرے گا۔

بخار چڑھنے لگا تھا۔ سانسیں بے ترتیب ہورہی تھیں۔ پسلیاں چلنے لگی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اب سزا پوری ہونے میں صرف چند گھنٹے ہی باقی رہ گئے ہیں۔ میں نے آنکھیں موند لیں، تصور میں بیٹی کا چہرہ تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ میرے تخیل میں وہ پہلی بار مسکرائی تھی۔

بوجھ

بابر نعیم

کوئی بھی شے جو تاریخی سند رکھتی ہو... بعض اوقات ہمارے لیے انتہائی معتبر اور قیمتی بن جاتی ہے... کیونکہ ان سے ہمارے جذبات و احساسات وابستہ ہوتے ہیں... ماضی کی ایک ایسی ہی شے میں الجھی پیچ در پیچ تحریر... جس کے کرداروں نے ان چیزوں کو اپنے مستقبل کا دار و مدار بنالیا تھا...

ازدواجی زندگی کی چاہتوں میں حائل ہونے والی رنجش کا فسانہ

ویلی فانگ سے میری پرانی جان پہچان تھی۔ جنگ سے پہلے وہ پیراماؤنٹ میں کیمرا اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتا تھا جہاں میں بھی اداکاری کی تربیت لے رہا تھا۔ تربیت کے دوران میں ہی ہم دونوں کو محاذ پر بھیج دیا گیا اور جب جنگ ختم ہونے کے بعد واپس آئے تو ہمارے لیے ہالی ووڈ میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں نے گزر اوقات کے لیے ایک سیکیورٹی کمپنی ”ہالی ووڈ سیکیورٹی“ میں ملازمت اختیار کرلی جبکہ فانگ مختلف نوعیت کے کام کرنے لگا۔ وہ سارا دن اسٹوڈیوز کے

www.paksociety.com

چکر لگاتا رہتا اور لوگوں کے لیے مختلف نوعیت کی خدمات سرانجام دیتا جن میں چھوٹی کمپنیوں کے لیے سرمائے کی فراہمی، اداکاروں سے رابطے، اسٹوڈیوز کے لیے مشینری کی خریداری اور نئے لوگوں کے لیے کام کی تلاش وغیرہ شامل تھیں۔ ان سرگرمیوں کے سبب وہ ہالی ووڈ میں خاصا مشہور ہو گیا تھا اور چھوٹے بڑے سب اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ گشت کے دوران میں اس سے اکثر ملاقات ہو جاتی تھی لیکن وہ پہلی بار روز اسٹریٹ پر واقع ہمارے دفتر دسمبر 1954ء کے آخری دنوں میں آیا تھا۔

ہم سب کرسمس کے سلسلے میں دفتر سجانے میں مصروف تھے۔ فرم کا مالک پیڈی ایک کرسی پر بیٹھا یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا جبکہ اس کی بیوی پیگی اور میں، استقبالیہ کے ساتھ رکھے ہوئے کرسمس کے درخت پر رنگ برنگے قمقموں کی جھالر لگا رہے تھے۔ فانگ نے اندر آنے سے پہلے سامنے کے دروازے میں لگے ہوئے شیشے سے جھانکا اور دروازہ کھول کر جھجکتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ اس کے سوٹ پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور جوتوں پر بھی پالش نہیں کی گئی تھی، صاف نظر آ رہا تھا کہ اس نے شیو بھی بڑی جلدی میں کی ہے۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے باس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

کوئی اور دن ہوتا تو شاید پیگی اسے انتظار کرنے کے لیے کہتی یا ایک ہفتے بعد اسے آنے کے لیے کہتی لیکن کچھ ہی دیر پہلے پیڈی نے اس کے بنائے ہوئے مصنوعی درخت پر تنقید کی تھی چنانچہ اس نے پیڈی سے بدلہ لینے کے لیے فانگ کو اس کے کمرے کا راستہ دکھا دیا، حالانکہ وہ جانتی تھی کہ پیڈی ملاقات کا وقت طے کیے بغیر کسی سے نہیں ملتا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی پیڈی کا ردِعمل دیکھنے کے لیے فانگ کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ تجسس بھی تھا کہ فانگ نے کس سلسلے میں ہمارے دفتر کا رخ کیا ہے۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی اپنے کوٹ کی جیب سے ایک گن نکالی۔ گو کہ اس کی نال کا رخ کسی خاص سمت میں نہیں تھا لیکن جس انداز میں وہ ٹریگر پر انگلی رکھے کھڑا تھا، وہ خاصا تشویش ناک تھا۔ میں کسی ممکنہ حادثے سے بچنے کے لیے اس پر چھلانگ لگانے والا ہی تھا کہ پیڈی اپنا ایک ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے بولا۔

”اگر تم سالویشن آرمی کے لیے چندہ جمع کر رہے ہو تو تمہیں گھنٹی بجا کر اندر آنا چاہیے تھا۔“

فانگ نے پلکیں جھپکاتے ہوئے اپنے ہاتھ کی جانب دیکھا اور گن برابر والی کرسی پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں اس سے جان چھڑانا چاہتا ہوں۔“

پیڈی نے کوئی جواب نہیں دیا اور سگار سلگا کر فانگ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ پوری بات سنے بغیر کوئی تبصرہ نہیں کرتا تھا۔ اب بھی وہ یہی چاہ رہا تھا کہ فانگ اشاروں کنایوں میں بات کرنے کے بجائے اسے اصل ماجرا بتائے پھر بھی وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ”کیا تمہیں ڈر ہے کہ یہ ہتھیار خودکشی کے لیے استعمال ہو سکتا ہے؟“

”مجھے یہ ڈر نہیں ہے کہ میں اس سے خود کو ہلاک کر لوں گا۔“ فانگ نے کہا۔ ”مجھے خطرہ ہے کہ کہیں اس کی وجہ سے میری جان نہ چلی جائے۔ یہ پہلے ہی ایک کروڑ لوگوں کو زمین پر لٹا چکی ہے۔“

فانگ کی اس بات پر ہم دونوں نے گن پر ایک نظر ڈالی۔ وہ اعشاریہ تین، دو کا ایک عام سا پستول تھا اور دیکھنے میں بالکل نیا لگ رہا تھا یا پھر بہت کم استعمال ہوا ہوگا اور شاید اس سے سو فائر بھی نہیں ہوئے ہوں گے۔

پیڈی بھی کچھ اسی انداز میں سوچ رہا تھا۔ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تمہاری بات پر یقین کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

فانگ جلدی سے اس کرسی پر بیٹھ گیا جہاں گن رکھی ہوئی تھی اور بولا۔ ”یہ براؤننگ کا انیس سو دس کا ماڈل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی گن سے سراجیوو کے آرک ڈیوک فرڈیننڈ کو 1914ء میں ہلاک کیا گیا ہو اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم کا آغاز اسی گن کے فائر سے ہوا ہو۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ پیڈی نے کہا۔ ”یہ کمپنی ابھی تک اس طرح کی معمولی بندوقیں بنا رہی ہے۔ یقیناً آج بھی ایسی سیکڑوں بندوقیں موجود ہوں گی۔“

”ان میں سے صرف چار کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔“ فانگ نے کہا۔ ”جن دو افراد نے آرک ڈیوک کو قتل کیا تھا، ان کے پاس اسی ماڈل کی چار بالکل نئی گنز تھیں جن کے سیریل نمبر بھی ترتیب میں تھے۔ ان میں سے صرف ایک اس قتل میں استعمال ہوئی لیکن کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون سی تھی۔ بعد میں یہ پستول آسٹرین کے ہاتھ لگ گئے جنہوں نے ان کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا اور سالسبرگ کے عجائب گھر میں رکھ کر بھول گئے۔“

مجھے اس کی معلومات اور اندازِ بیاں پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ کسی کامیاب اور ہوشیار سیلز مین کی طرح اس گن کی تاریخ بیان کر رہا تھا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں پوچھ ہی بیٹھا۔ ”تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟“

”تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ یہ گن انہی چار میں سے ایک ہے؟“ پیڈی نے پوچھا۔

”جنگ کے دوران سالسبرگ پر امریکی فوجیوں نے قبضہ کر لیا اور انہوں نے عجائب گھر سے تمام قیمتی اور نادر اشیا لوٹ لیں۔ انہی میں یہ چار گنز بھی تھیں۔“

”تم بھی ان فوجیوں میں شامل تھے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہم میں سے کوئی بھی جرمن زبان سے واقف نہ تھا۔ اس لیے ان کی تاریخی اہمیت نہ جان سکے۔ ہمارے لیے صرف یہ معمولی گنز تھیں جنہیں ہم جنگ کی یادگار سمجھ کر ساتھ لے آئے پھر یہ کہ ان کی اچھی قیمت مل سکتی تھی۔“

”پھر تم نے اسے بیچا کیوں نہیں؟“ پیڈی نے پوچھا۔

”یہ میرے بیگ میں پڑی رہی۔ جنگ سے واپس آنے کے بعد میں دوسرے مسائل میں الجھ گیا اور اس کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا۔“

پہلی بار اسے خیال آیا کہ دفتر کی کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے ہیں۔ اس نے جلدی سے گن اٹھائی اور اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”کوئی شخص ان گنز کی خاطر ہمیں مارنا چاہتا ہے۔ ایک ایک کر کے ہم چاروں کو... میرا نمبر دوسرا ہے۔“

☆☆☆

پیڈی نے اس کے لیے کافی منگوائی۔ فانگ نے پہلا گھونٹ لیا اور بولا۔ ”میرے چار ساتھیوں میں سے ایک نے دو ہفتے قبل مجھے فون کر کے بتایا کہ اسے ایک میگزین میں شائع ہونے والے مضمون کے بارے میں معلوم ہوا ہے جس میں ان چار پستولوں کا ذکر ہے جو 1945ء میں سالسبرگ کے عجائب گھر سے غائب ہوئی تھیں۔ اس مضمون میں اس حملے کے بارے میں بھی تفصیل شائع ہوئی ہے جس میں یہ پستول استعمال کیے گئے تھے اور ان کے سیریل نمبر بھی دیے گئے ہیں۔ ان میں وہ پستول بھی شامل ہے جو میرے دوست کے پاس ہے۔“

”تمہارے دوست کا نام کیا ہے؟“ پیڈی نے پوچھا۔

”پیٹ اسکڈمور۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس شخص سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس نے یہ مضمون لکھا تھا۔ وہ کسی کالج میں پروفیسر ہے۔ میری معلومات کے مطابق پیٹ، فرینکفرٹ میں رہتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ اب بھی وہیں ہے یا کہیں اور چلا گیا۔“

یہ کہہ کر اس نے کافی کا ایک اور گھونٹ لیا اور بولا۔ ”میں نے پیٹ سے کہا تھا کہ وہ انتظار کرے۔ اگر ہم یہ گنز آسٹرین کو واپس کر دیتے ہیں تو وہ اس کے عوض ہمیں کچھ نہیں دیں گے۔ مجھے کچھ وقت چاہیے تاکہ کوئی بہتر ڈیل کر سکوں۔ لیکن پیٹ شاید انتظار نہ کرے۔ اس نے بقیہ دو ساتھیوں کو بھی اس سلسلے میں فون کیا تھا۔ ان میں سے ایک باب ولسن گن واپس کرنے کے لیے تیار ہے جبکہ جون ریڈ اس سے متفق نہیں تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ آسٹرین بھی نازیوں سے کم نہیں ہیں اور وہ انہیں چوری کے الزام میں الٹا لٹکا سکتے ہیں۔ اس بات کو دو ہفتے گزر چکے ہیں لیکن اس کے بعد پیٹ نے مجھ سے دوبارہ رابطہ نہیں کیا اور اب تو مجھے بھی اپنی گن سے ڈر لگنے لگا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جنگ کے بعد میرے ساتھ جتنے بھی ناخوش گوار واقعات پیش آئے ہیں، ان کا تعلق اس گن سے نہ جوڑ دیا جائے۔“

”گویا یہ تمہارے لیے بھی بدقسمت ثابت ہو سکتی ہے؟“ پیڈی نے اس سے پوچھا۔

”بالکل... اس گن سے جتنے بھی لوگوں کو مارا گیا ہوگا، وہ سب میرے کھاتے میں ڈال دیے جائیں گے۔ اس کی وجہ سے میں کسی بڑی مصیبت میں پھنس سکتا ہوں۔“

”تم نے دوبارہ پیٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟“ پیڈی نے کہا۔

”جب میری پریشانی بڑھ گئی تو میں نے اسے فون کیا تھا، اس کی بیوی نے بتایا کہ پیٹ لاپتا ہے۔ وہ فون پر بُری طرح رو رہی تھی۔ اس کی باتوں سے میں یہی سمجھ سکا کہ کوئی اجنبی شخص پیٹ سے ملنے آیا تھا اس کا لہجہ جرمنوں جیسا تھا۔“

”گویا تمہارے خیال میں پیٹ مر چکا ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔ میں نے ولسن اور ریڈ سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ پیٹ نے بتایا تھا کہ ولسن ٹیکساس اور ریڈ جرسی میں رہتا ہے۔ نہ جانے ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہوگا۔“

”او کے۔“ پیڈی نے کہا۔ ”پہلے ہم تمہارے مفروضوں پر بات کرتے ہیں۔ تمہارے خیال میں پیٹ نے مضمون کے مصنف سے رابطہ کر کے اسے ان گنز کے بارے میں معلومات فراہم کر دی ہوں گی پھر اس پروفیسر یا خود پیٹ کا رابطہ غلط لوگوں سے ہو گیا ہوگا جو ان گنز کو کسی بھی طرح سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے یہ سارا چکر غیر قانونی لگتا ہے۔ تم نے خود بتایا ہے کہ وہ اپنی گن آسٹرین کو واپس کرنا چاہ رہا تھا اگر ان سے رابطہ کیا ہوتا تو وہ بھی اسے اغوا نہیں کرتے۔“

www.paksociety.com

میں نے کہا۔ ”جس کسی نے بھی پیٹ کو اغوا کیا ہے، اس نے اس سے گن کے علاوہ ولسن اور ریڈ کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرلی ہوں گی۔“

”اور یقیناً میرے بارے میں بھی۔“ فانگ نے کہا۔

”کیا کوئی شخص تم سے بھی ملنے آیا تھا جس کا لب و لہجہ جرمنوں جیسا ہو؟“ پیڈی نے پوچھا۔

”ہاں، کل ایک آدمی آیا تھا لیکن میں اس وقت اپنے کام کے سلسلے میں گھر سے باہر نکلا ہوا تھا اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔ میرے پڑوسی نے بعد میں مجھے اس کے بارے میں بتایا۔“

”تمہارے خیال میں وہ کون ہو سکتا ہے؟“

”یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے کہ وہ انہی میں سے ایک ہو جنہیں میرے پاس اس گن کی موجودگی کا علم ہو گیا ہے یا پھر فاسانو کا کوئی آدمی میری تلاش میں آیا ہو۔“

فاسانو کے نام پر میں اور پیڈی دونوں ہی چونک پڑے۔ وہ جوئے کا اڈا چلاتا تھا اور اس کی اچھی خاصی دہشت تھی۔ پیڈی نے پوچھا۔ ”فاسانو سے تمہارا کیا لینا دینا ہے؟“

”مجھے اس کا کچھ ادھار واپس کرنا ہے۔ شاید اس نے کسی کو میری نگرانی پر لگا دیا ہو۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد اس گن کو فروخت کردوں ورنہ وہ اجنبی یا فاسانو کے آدمی اسے چھین لیں گے۔ اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ ڈیل کے دوران ایلیٹ میرے ساتھ ہو جو میری گن لے کر جائے۔“

اس کا اشارہ میری جانب تھا۔ پیڈی نے پوچھا۔ ”ہمیں اس خدمت کا کیا معاوضہ ملے گا؟“

”گن کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کا دس فیصد۔“

پیڈی سودے بازی کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا لہٰذا اس نے پندرہ فیصد کا مطالبہ کیا اور بارہ فیصد پر معاملہ طے ہو گیا۔

فانگ نے پیڈی کی اس تجویز کو مسترد کر دیا کہ ہم اس گنز کو اپنے پاس رکھ لیں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس گن کو اپنے پاس ہی رکھنا چاہتا ہے تاکہ اگر کوئی پارٹی اس تک پہنچ جائے تو وہ اپنی جان بچانے کی خاطر اسے فوراً ہی ان کے حوالے کر دے۔ پیڈی نے پوچھا کہ ہمارے درمیان رابطے کی صورت کیا ہوگی تو وہ کوئی واضح جواب نہ دے سکا۔ پیڈی نے اسے ہدایت کی کہ وہ کہیں بھی جانے سے پہلے پیگی کو اس کے بارے میں ضرور بتا دے۔ یہ اطلاع ملتے ہی وہ مجھے اس کی کار کا تعاقب کرنے کے لیے کہے گا۔

فانگ کے جانے کے بعد پیڈی نے مجھ سے پوچھا۔

”فانگ نے جو کہانی سنائی ہے، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”مجھے تو کافی دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ ہم فانگ کا تعاقب کرتے ہوئے اس شخص تک پہنچ سکتے ہیں جو ان گنز کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسے نادیدہ لوگ ہمیشہ میری توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ تم نے اس پہلو پر بھی غور کیا؟“

”اس بارے میں پیٹ اسکڈمور سے معلومات حاصل ہو سکتی ہیں لیکن وہ خود غائب ہے۔ اب وہ مصنف ہی باقی رہ جاتا ہے جس نے ان گنز کے بارے میں مضمون لکھا تھا۔“

”پھر تو تمہیں اس پروفیسر سے رابطہ کرکے اس بارے میں تفصیل پوچھنی چاہیے۔“

میں تیزی سے باہر آیا۔ فانگ ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ میں نے اس کو کار تک پہنچنے سے پہلے ہی پکڑ لیا اور پوچھا۔

”وہ آرٹیکل کس میگزین میں شائع ہوا تھا؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ یہ بات پیٹ ہی بتا سکتا ہے۔“

میں دفتر واپس آیا اور پیگی کے فون سے اپنی بیوی ایلا کا نمبر ملایا۔ وہ ان دنوں اسکرین پلے رائٹر کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ کسی زمانے میں وہ وارنر برادرز سے بھی وابستہ رہ چکی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ان کے ریسرچ ڈیپارٹمنٹ میں اس کی کسی سے واقفیت ہے۔

”ہاں، ایک لڑکی ہے لیکن میں اسے اپنے اسکرپٹ کے لیے استعمال کر رہی ہوں۔ میرا تو خیال تھا کہ تم لوگوں کے اپنے ذرائع بھی ہوں گے۔ کیا پیڈی کسی لائبریرین کی خدمات حاصل نہیں کرتا؟“

میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے مختصراً فانگ کی کہانی کے بارے میں بتایا تو وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور بولی۔ ”گویا تم اس میگزین کا نام معلوم کرنا چاہتے ہو جس میں یہ آرٹیکل شائع ہوا ہے؟ ٹھیک ہے، میں دیکھوں گی کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں۔“

میں وقت گزاری کے لیے لائبریری چلا گیا۔ وہاں میں نے گزشتہ چند ہفتوں میں شائع ہونے والے رسالوں پر نظر ڈالی۔ مجھے ان میں سے کسی میں بھی مطلوبہ مضمون نظر نہیں آیا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں رات کے کھانے سے کچھ دیر قبل گھر پہنچ گیا۔ میں چاہتا تھا کہ بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزاروں۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ ہوم ورک بھی کرنا تھا۔ تبھی ایلا نے مجھے دی جنٹلمین کوارٹرلی کا ستمبر کا شمارہ پکڑا دیا۔ کھانے کے بعد ایلا تو اپنا کام کرنے بیٹھ گئی اور میں اس میگزین کی

ورق گردانی کرنے لگا۔ اس میں مجھے مطلوبہ مضمون مل گیا جس کا عنوان تھا ”چار بندوقیں جنہوں نے دنیا کو بدل دیا۔“ مجھے عنوان مبالغہ آرائی کی حد تک گمراہ کن لگا کیونکہ آرک ڈیوک اور اس کی بیوی کے قتل میں صرف ایک براؤننگ استعمال ہوئی تھی۔ مضمون میں تخت کے وارث فرانز فرڈیننڈ کا پس منظر اور قتل کے بعد ہونے والی تحقیقات کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔ مضمون پڑھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ تحقیقات محض ایک کارروائی تھی اور انہوں نے اصل آلۂ قتل کی نشان دہی کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ فانگ اور اس کے دوست کی معلومات درست تھیں۔ مثلاً یہ کہ ان چار گنز کے سیریل نمبر ترتیب میں تھے۔ اسی طرح اس مضمون میں ان گنز کے غائب ہونے کے بارے میں مختلف قیاس آرائیوں کا ذکر بھی کیا گیا تھا لیکن مضمون کے مصنف نے جو اسٹیڈ کالج جانسن سٹی میں پروفیسر تھا، ان کے بارے میں تفصیل نہیں بتائی۔

☆☆☆

میں دوسرے دن دفتر پہنچا تو پیگی نے بتایا کہ پیڈی میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں فوراً ہی اس کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اپنی میز کے پاس کھڑا تھا اور اس کے سامنے دو اجنبی چہرے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔ ”اسکوفی! ذرا ان مہمانوں کو اپنی فن کا کمال تو دکھاؤ۔“

میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا لیکن باس کی بات کا بھرم رکھنا بھی ضروری تھا لہٰذا میں نے اپنی آستین اوپر کرتے ہوئے کہا۔

”اس وقت میں خالی ہاتھ ہوں لیکن کسی ہتھیار کے بغیر بھی کئی کمالات دکھا سکتا ہوں۔“

میری یہ بات سن کر ان کی دلچسپی بڑھ گئی۔ وہ میری طرف بڑھے ہی تھے کہ پیڈی نے عقب سے ان دونوں کو پکڑا اور ان کے سر آپس میں ٹکرا دیے۔ ایک کو تو اس نے سنبھال رکھا اور دوسرے کو میری جانب دھکیل دیا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے سنبھالتا، اس کے ایک ساتھی نے مجھے عقب سے قابو کر لیا۔ وہ سیدھا مجھ سے آ کر ٹکرایا اور دوسرے ہی لمحے ہم تینوں ہی کمرے کے دروازے کے باہر پڑے ہوئے تھے۔ پیگی دوڑتی ہوئی آئی اور میرا نام لے کر زور زور سے چیخنے لگی۔ اس کی آواز سن کر دو سیکیورٹی گارڈز آگئے اور میدان کارزار سج گیا جس میں جیت ہماری ٹیم کو ہوئی۔ سبھی کو تھوڑی بہت چوٹیں آئی تھیں۔ البتہ پیڈی بالکل محفوظ رہا جبکہ آنے والے مہمانوں کا تیسرا ساتھی بھی اس کی میز کے نیچے دبکا پڑا ہوا تھا۔

پیڈی نے مجھے اور ایک سیکیورٹی گارڈ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہم ان شریف آدمیوں کو ان کے مالک فاسانو کے پاس لے کر جائیں گے۔ چلنے کی تیاری کرو۔“

”پولیس کو فون کیوں نہیں کرتے؟“ پیگی نے کہا۔

”پولیس اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکے گی۔ بہتر ہوگا کہ تم فانگ کے دیے ہوئے ایمرجنسی نمبر پر رابطہ کرکے اس سے میٹنگ طے کرلو۔“

پیڈی کی بات پر یاد آیا کہ مجھے بھی ایک فون کرنا ہے۔ میں نے پیگی کو پروفیسر کیری کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ سہ پہر میں میری اس سے بات کروا دے۔

☆☆☆

کسی زمانے میں ٹپ فاسانو، ایک باربر شاپ چلاتا تھا اور خود بھی لوگوں کے بال کاٹنے کا فریضہ انجام دیتا تھا۔ اب وہ یونیورسل اسٹوڈیو کے نزدیک ایک شان دار دفتر میں بزنس ایگزیکٹیو بنا بیٹھا تھا۔ بظاہر اس کا کاروبار باربر شاپ اور بیوٹی سیلون کو ان کی ضرورت کی اشیا سپلائی کرنا تھا لیکن درپردہ وہ جوئے کا بہت بڑا اڈا چلاتا تھا۔ استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے ہمیں فوراً ہی اس کے کمرے کا راستہ دکھا دیا۔ وہ کوئی ہینڈسم شخص نہیں تھا لیکن گزشتہ سات آٹھ سالوں سے اس کی عمر جیسے ایک جگہ ٹھہر گئی تھی۔ کالے بال، چمک دار جلد اور آنکھوں میں ایک مخصوص چمک... جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اگر ایک بار کسی کو نظر بھر کر دیکھ لے تو اس کا خون رگوں میں جمنے لگتا ہے۔ میں بھی انہی لوگوں میں شامل تھا۔

پیڈی پر البتہ اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بے دھڑک انداز میں بولا۔ ”تمہارے تین جانباز راستہ بھٹک کر میرے دفتر چلے آئے تھے۔ میں نے سوچا کہ خود ہی انہیں تمہارے حوالے کر دوں۔ کہیں یہ کسی اور کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔“

”شکریہ۔“ فاسانو نے نخوت سے کہا۔ ”تمہیں ان کے آنے کی وجہ تو معلوم کرنی چاہیے تھی۔“

”ان کا خیال تھا کہ ہم نے فانگ کا قرض ادا کرنے کی ذمے داری قبول کر لی ہے لہٰذا مجھے ان کی خام خیالی دور کرنا پڑی۔“

فاسانو نے غور سے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”واقعی، تم نے تو ان کی اچھی خاصی مرمت کر دی۔ میرا خیال ہے کہ فانگ نے اپنی کوئی قیمتی چیز تمہارے پاس رکھوائی ہے اور خود غائب ہو گیا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ فانگ پر جو رقم واجب الادا ہے، اس کے عوض ہم وہ چیز تم سے لے لیں۔“

پیڈی نے کہا۔ ”اس کے پاس صرف ایک پرانی گن ہے جس کے بارے میں اس کا دعویٰ ہے کہ اسے اس کی بھاری قیمت مل سکتی ہے لیکن اس نے وہ گن ہمارے پاس نہیں رکھوائی۔ شاید اسے ہم پر بھروسا نہیں تھا۔“

”کیا ایک گن کی اتنی قیمت ہو سکتی ہے؟ اس میں ایسی کیا خاص بات تھی؟“ فاسانو نے حیرت سے پوچھا۔

”ممکن ہے۔“ پیڈی نے کہا۔ ”کوئی شخص اسے خریدنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ ہمیں صرف اس ڈیل کے دوران اسے ایک محافظ فراہم کرنا ہوگا۔ اس سے زیادہ ہمارا اس معاملے میں کوئی دخل نہیں ہے۔“

”اب میری باری ہے کہ تمہاری غلط فہمی دور کر دوں۔“ فاسانو غراتے ہوئے بولا۔ ”تم اس معاملے میں پوری طرح شامل ہو چکے ہو۔ تم میرے لڑکوں کی مرمت کر سکتے ہو، میرے دفتر تک دندناتے ہوئے آسکتے ہو لیکن مجھ سے نہیں جیت سکتے۔ تمہارے مقابلے میں میری تنظیم بہت بڑی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ تمہیں کب اور کہاں تلاش کیا جا سکتا ہے۔“ پھر اس نے میری طرف ترچھی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ”اور تم... تمہارے تو شاید بیوی بچے بھی ہیں۔“

پیڈی نے ایک قدم آگے بڑھایا اور ہم دونوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ فاسانو کو اس کی یہ حرکت ناگوار گزری اور وہ تیز لہجے میں بولا۔ ”تم اپنے لیے گڑھا مت کھودو۔ میں آج کی حرکت بھولنے کے لیے تیار ہوں لیکن فانگ کا قرض معاف نہیں کر سکتا۔ یہ کاروباری معاملہ ہے، اگر میں نے ایسا کیا تو بڑی مچھلیاں مجھے کھا جائیں گی۔ لہٰذا میں تمہیں ایک پیشکش کر رہا ہوں۔ تم وہ قیمتی گن یا میری رقم مجھے واپس کر دو ورنہ فانگ کو میرے حوالے کر دو۔ میں تمہیں چوبیس گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

☆☆☆

ہم اس کے کمرے سے باہر نکلے تو استقبالیہ پر موجود لڑکی نے ہمیں روک لیا۔ پیگی کا فون تھا، وہ پیڈی سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ پیڈی نے ریسیور ہاتھ میں لیا اور کان لگا کر پیگی کی بات سننے لگا۔ اس نے بولنے سے احتراز کیا۔ باہر آ کر اس نے بتایا۔

”وہ نمبر اس کی گرل فرینڈ کا تھا جس کے پاس آج کل فانگ ٹھہرا ہوا ہے۔ لگتا ہے کہ رات ایک شخص اس سے ملنے آیا تھا۔ فانگ اس کے ساتھ چلا گیا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ ہمیں پہلے وہیں چلنا چاہیے تاکہ پوری بات معلوم ہو سکے۔“

گرل فرینڈ کا نام ڈولی پالمر تھا اور وہ اس عمارت کی تیسری منزل پر رہتی تھی۔ اس نے روتے ہوئے بتایا۔

”میں جانتی ہوں کہ فانگ گزشتہ دو ہفتوں سے پریشان تھا۔ میں نے اس سے کئی بار پوچھا لیکن اس نے ہمیشہ ٹال دیا۔ کیا میں تمہارے لیے کافی کا انتظام کروں؟“

”ابھی نہیں، شاید بعد میں اس کی ضرورت محسوس ہو۔“ پیڈی نے کہا۔ ”ہمیں اس شخص کے بارے میں بتاؤ جو رات یہاں آیا تھا۔ کیا اس نے کام کی نوعیت بتائی تھی؟“

”جب میں نے دروازہ کھولا تو اس نے فانگ کے بارے میں پوچھا۔ میں اس سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی کیونکہ فانگ میرے عقب میں ہی کاؤچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ فانگ نے مجھے کچن میں جانے کے لیے کہا اور درمیانی دروازہ بند کر دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھے کچھ معلوم ہو۔“

”پھر بھی تمہیں کچھ نہ کچھ تو سنائی دیا ہوگا؟“ پیڈی نے کہا۔

”تھوڑا بہت۔ وہ کسی گن کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ یہ سن کر میں خوف زدہ ہو گئی اور اپنے آپ کو کچن کے کاموں میں مصروف کر لیا۔ اس کے علاوہ میں نے کچھ نہیں سنا۔ جب مجھے بیرونی دروازہ بند ہونے کی آواز نہیں آئی تو میں باہر نکلی۔ وہ دونوں جا چکے تھے۔ وہ شخص فانگ کو بھی ساتھ ہی لے گیا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ چیزیں غائب تھیں۔ میں نے صبح اٹھ کر اپنا زیورات کا ڈبا دیکھا۔ اس میں وہ بریسلیٹ نہیں تھا جو فانگ نے مجھے سالگرہ پر دیا تھا۔ اس میں اصلی ہیرے جڑے ہوئے تھے۔“

”کیا تم اس شخص کا حلیہ بتا سکتی ہو؟“

”وہ لمبے قد کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ اس کے بال سنہری اور دیکھنے میں وہ خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ شاید اسی لیے میں نے اسے اندر آنے دیا ورنہ میں دروازہ اس کے منہ پر مار دیتی۔“

”کیا یہاں فانگ کے کچھ کاغذات ہیں۔ شاید ان سے کچھ مدد مل سکے۔“ پیڈی نے کہا۔

پالمر نے ایک چھوٹی سی میز کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ایک فون رکھا تھا۔ ”وہ اس میز پر بیٹھا کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا۔ شاید کسی بڑی فلم کے سلسلے میں ڈیل ہونے والی تھی لیکن کل سے میں نے وہاں کوئی کاغذ نہیں دیکھا۔ شاید اس نے کام مکمل کرنے کے بعد وہ کاغذات ضائع کر دیے ہوں۔“

”ان حالات میں عقل مندی کا تقاضا یہی تھا۔“ پیڈی نے پُرخیال انداز میں کہا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس میز تک گیا۔ وہاں سے ایک پیڈ اٹھایا اور اسے دیکھنے کے بعد میرے حوالے کر دیا۔ اس کے تمام صفحات سادے تھے اور ان پر کچھ نہیں لکھا ہوا تھا اور نہ ہی یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اس میں سے کوئی ورق پھاڑا گیا ہے۔

اب پیڈی کو کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے پالمر سے کہا تو وہ فوراً ہی کچن میں چلی گئی۔ جیسے ہی کچن کا دروازہ بند ہوا، پیڈی نے گارڈ سے کہا۔ ”اس گھر کی تلاشی لو۔ ہمیں براؤننگ گن، دو یا اس سے متعلق کسی چیز کی تلاش ہے۔ وہ کوئی چیک بھی ہو سکتا ہے یا پھر کسی لاکر کی چابی جہاں وہ گن رکھی گئی ہے۔“

”تم نیچے جا کر دیکھو۔ شاید کوڑے دان میں کوئی کاغذ بچ گیا ہو۔“ پیڈی نے مجھ سے کہا۔

وہ ایک لوہے کا بڑا سا بکس تھا جس میں فالتو کاغذ اور ناکارہ اشیا جلائی جاتی تھیں۔ مجھے وہاں کوئی گن نظر نہیں آئی۔ البتہ کاغذ کا ایک ٹکڑا ضرور مل گیا جو جلنے سے رہ گیا تھا اور اس پر دو الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ فلائٹ اور اس کے نیچے لکھا ہوا تھا میکسیکو سٹی۔

پیڈی اور گارڈ عمارت سے باہر نکل رہے تھے کہ میں نے پیڈی کو وہ کاغذ پکڑا دیا۔ اس نے فوراً ہی لینچ کو ائرپورٹ جانے کے لیے کہا اور تاکید کی کہ وہ گزشتہ شب سے اب تک میکسیکو جانے والی پروازوں کا ریکارڈ چیک کرے پھر اس نے مجھے ہدایت کی کہ اسے دفتر چھوڑ کر سیدھا پان شاپ چلا جاؤں جہاں زیور گروی رکھے جاتے ہیں۔

”ہم زیور کے بجائے اس آسٹرین کو کیوں نہیں تلاش کرتے؟“ میں نے پیڈی سے پوچھا۔

”میں جاننا چاہ رہا ہوں کہ کیا واقعی اس کے پاس ایسا کوئی بریسلیٹ تھا۔“

”تمہارے خیال میں وہ جھوٹ بول رہی ہے؟“ لینچ نے پوچھا۔

”نہیں لیکن میرے خیال ہے کہ اگر مس پالمر کسی ٹی وی شو میں کام شروع کر دے تو اسے اچھے خاصے ناظرین مل جائیں گے۔“

باتیں کرتے کرتے ہم سڑک پر آ چکے تھے۔ پیڈی نے ہاتھ کے اشارے سے ایک ٹیکسی کو روکا اور لینچ کو اس میں بٹھا کر وہ اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تو یہ سارا معاملہ ہی بالکل عجیب سا لگ رہا ہے۔ مس پالمر کا کہنا ہے کہ فانگ کسی بڑی مووی ڈیل پر کام کر رہا تھا جبکہ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ ان دنوں اس کے پاس کوئی کام نہیں ہے۔ فاسانو کی وجہ سے وہ اپنے گھر پر سو بھی نہیں سکتا تھا۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ 1945ء میں وہ سالسبرگ میں تھا یا نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے ان چار پستولوں کی کہانی اپنے کسی پرانے ساتھی سے سن لی ہو۔ بہرحال اس نے اسی بہانے اپنے آپ کو دھوئیں کے پردے کے پیچھے چھپانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے کہیں سے 1910ء ماڈل کی ایک براؤننگ حاصل کر لی اور ہمیں اس کے بارے میں کہانی سنا دی پھر اس نے اسی کہانی کا ایک حصہ کسی نہ کسی طرح فاسانو تک پہنچا دیا اور خود روپوش ہو گیا۔ اس نے ہمیں ایک طرف تو فاسانو سے بھڑا دیا تو دوسری جانب ہمیں سایوں کے تعاقب میں لگا کر چلا گیا... مثلاً یہی آسٹرین۔“

”پان شاپ جانے سے کیا حاصل ہوگا؟“ میں نے پیڈی سے پوچھا۔

”استعمال شدہ گن کی خریداری کے لیے اس سے اچھی اور کوئی جگہ نہیں۔ اس نے یقیناً بریسلیٹ دے کر وہاں سے گن خریدی ہوگی۔ اس لیے اگر تمہیں وہ بریسلیٹ وہاں مل گیا تو شاید گن کا معما بھی حل ہو جائے۔“

”اس سے تو لگتا ہے کہ تمہیں گن کے معاملے میں پہلے سے یقین ہے۔“

”تقریباً۔“ پیڈی نے کہا۔ ”لیکن ایک فیصد یہ امکان بھی ہے کہ شاید وہ سچ کہہ رہا ہے اور یہ وہی گن ہے جس کی کہانی اس نے ہمیں سنائی تھی۔“

☆☆☆

جب میں پیڈی کو دفتر چھوڑنے گیا تو مجھے پیگی کا پیغام ملا۔ اس نے پروفیسر کیری سے رابطہ کر کے طے کر لیا تھا کہ میں پروفیسر کو تین بجے کے قریب فون کروں گا۔ میں نے اس کا نمبر اپنے پاس نوٹ کر لیا اور پان شاپ کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں نے ابتداء ان دکانوں سے کی جو بڑے بڑے اسٹوڈیوز کے قریب واقع تھیں اور جہاں سے فانگ کا عموماً گزر ہوتا تھا۔ کرسمس کی وجہ سے ان دکانوں پر بہت رش تھا اور لوگ پرانی چیزیں فروخت کر کے اپنے پیاروں کے لیے نئی چیزیں خرید رہے تھے۔ اسی وجہ سے مجھے پہلی دو دکانوں سے معلومات حاصل کرنے میں وقت لگ گیا۔ پھر میں نے ایک نسبتاً پرانی دکان پر کوشش کی جس کا نام ”ڈیکن ہارسٹ جیولری اینڈ لون کمپنی“ تھا۔ نام کے برعکس ان کے یہاں فروخت ہونے والی اشیا عام نوعیت کی تھیں جن میں ایک ریک گنز کا بھی تھا۔ میں نے زیورات کے ڈبے دیکھنا شروع کیے لیکن جس بریسلیٹ کی تلاش تھی، وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ میرے گرد منڈلانے والا سیلز مین لمبا، دبلا اور سنہری بالوں والا تھا۔ مس

www.paksociety.com

پالمر نے بھی فانگ کے پاس آنے والے اجنبی کا یہی حلیہ بتایا تھا۔ میں نے اس کا لہجہ آزمانے کے لیے جرمن زبان میں کہا۔ ”کیسا چل رہا ہے؟“

اس نے بھی جرمن زبان میں جواب دیا۔ ”کیا میں تمہاری کچھ مدد کرسکتا ہوں؟“ شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اس لیے فوراً ہی اس نے یہی جملہ انگریزی میں بھی دہرا دیا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں کسی نے اس کے پاس کوئی بریسلیٹ تو گروی نہیں رکھوایا کیونکہ وہ چوری شدہ ہے۔

میری بات سنتے ہی وہ نوجوان خوف زدہ ہوگیا اور اس کی زبان پر لکنت طاری ہوگئی۔ اچانک ہی دکان کا مالک سامنے آگیا اس نے میرا جملہ سن لیا تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر عقبی کمرے میں لے گیا جہاں ایک میز پر مختلف قسم کے زیورات رکھے ہوئے تھے۔ انہی میں ایک عمدہ بریسلیٹ بھی تھا جس میں نیلے پتھر جڑے ہوئے تھے۔ دکان کا مالک اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں اپنے مستقل گاہکوں کو تو خوب پہچانتا ہوں لیکن یہ شخص...“

”ویلی فانگ!“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ بریسلیٹ اس کی گرل فرینڈ کا ہے۔ تمہارا سیلز مین...“

”وہ میرا بھتیجا ہے کرٹ...“

”کرٹ گزشتہ رات اس سے ملنے آیا تھا اور اس نے یہ بریسلیٹ چرانے میں فانگ کی مدد کی۔“

”تم کون ہو اور تمہیں اس بریسلیٹ سے کیا دلچسپی ہے؟“

میں نے جواب میں اسے اپنا بزنس کارڈ دکھا دیا اور کہا۔ ”مجھے اس بریسلیٹ سے نہیں بلکہ اس گن سے دلچسپی ہے جو فانگ نے حال ہی میں خریدی ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہ رہا ہوں کہ کیا اس نے وہ گن اسی دکان سے خریدی تھی؟“

”ہاں، یہ ایک بہت ہی خاص آرڈر تھا۔ اسے ایک ایسی براؤننگ چاہیے تھی جو نئی نہ ہو لیکن دیکھنے میں نئی جیسی لگتی ہو۔“

☆☆☆

میں نے دفتر واپس آکر پیڈی کو بتا دیا کہ فانگ کے پاس جو گن ہے، وہ اصلی نہیں بلکہ اس نے بریسلیٹ گروی رکھ کر پان شاپ سے خریدی ہے اور اب وہ اس کی تاریخی حیثیت کا ڈھنڈورا پیٹ کر اس کے اچھے دام وصول کرنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ گن فروخت ہو جانے کے بعد وہ بریسلیٹ واپس لے لے گا۔ پیڈی نے بتایا کہ فانگ صبح ساڑھے دس بجے کی پرواز سے میکسیکو سٹی چلا گیا ہے۔

اس کے جانے کی خبر سن کر مجھے شدید مایوسی ہوئی اور میں نے پوچھا۔ ”اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“

”میں نے لیبخ کو اس کے تعاقب میں میکسیکو سٹی بھیجا ہے۔ تم چاہو تو آج کا بقیہ دن گھر پر آرام کرسکتے ہو۔“

یہ میرے لیے ایک اور غیر متوقع خبر تھی جسے سن کر میری مایوسی مزید بڑھ گئی کیونکہ فانگ کا تعاقب کرنا یا اس کی حفاظت کرنا میری ذمے داری تھی لیکن پیڈی نے میرے بجائے لیبخ کو ترجیح دی۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ میرے دل میں فانگ کے لیے نرم گوشہ ہے اور میں وقت پڑنے پر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرسکوں گا۔ میں نے گھر جانے کے ارادے سے قدم بڑھایا ہی تھا کہ بیکی نے یاد دلایا کہ مجھے پروفیسر کیری کو فون کرنا ہے۔ ویسے تو اب اس فون کال کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی کہ فانگ کی کہانی کی طرح اس نادیدہ شخص کا بھی کوئی وجود نہیں ہوگا جو بقول اس کے وہ تاریخی گن حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن میں نے پروفیسر کو صرف اس امید پر فون کرلیا کہ شاید اس سلسلے میں کوئی نیا انکشاف سامنے آجائے۔

”اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد مجھے لاتعداد فون آچکے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ سیریل نمبر دینے کے بعد غیر ضروری کالوں کا سلسلہ رک جائے گا لیکن لوگ اس طرح کے فون کر کے میرا وقت ہی ضائع کر رہے ہیں۔ تم بتاؤ مسٹر ایلیٹ! کیا تمہارے پاس ان میں سے کوئی گن ہے؟“

”نہیں لیکن ایک شخص یہ دعویٰ کر رہا ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے مضمون میں جو یہ بات لکھی گئی ہے کہ فوجیوں نے وہ گنز سالسبرگ کے عجائب گھر سے چرائی تھیں تو اس میں کتنی صداقت ہے؟ کیونکہ تم نے کچھ دوسرے مفروضات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔“

”کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اصل واقعہ کیا ہے کیونکہ وہاں کا سارا ریکارڈ ہی تقریباً ضائع ہو چکا ہے اور ہم صرف مفروضوں اور اندازوں پر ہی بات کر رہے ہیں لیکن عجائب گھر والی بات سب سے زیادہ قرین قیاس لگتی ہے۔ جو شخص یہ دعویٰ کر رہا ہے، کیا تم نے اس کے پاس وہ گن دیکھی ہے؟“

”نہیں، تمہیں ویلی فانگ نامی کسی شخص کی کال تو موصول نہیں ہوئی؟“

”نہیں۔“

”اچھا، ذرا سوچ کر بتاؤ کہ فرینکفرٹ سے کیا پیٹ اسکڈمور کا فون تو نہیں آیا؟“

”ہاں۔“ پروفیسر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”لیکن وہ تو ڈینور میں رہتا ہے۔“

”وہ کیا کہہ رہا تھا؟“ مجھے یہ اطمینان ہوگیا تھا کہ فانگ کم از کم ایک بات تو درست ثابت ہوئی۔

”اس نے بھی ایسی ہی ایک گن کے بارے میں دعویٰ کیا لیکن یہ ماننے سے انکار کردیا کہ اس نے یہ گن میوزیم سے چرائی تھی بلکہ اس کا کہنا تھا کہ اس نے یہ گن کسی دوسرے سپاہی سے خریدی تھی۔ اس پر میں محتاط ہوگیا۔ اب اگر مسٹر اسکڈمور یہ اعتراف کرلیتے ہیں کہ انہوں نے یہ گن میوزیم سے چرائی تھی تو میں ان کا دعویٰ تسلیم کرسکتا ہوں۔“

”میرے خیال میں اس کا مناسب حل یہی ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کردیا۔

☆☆☆

اب مجھے پیٹ اسکڈمور سے بات کرنے کی ضرورت محسوس ہورہی تھی۔ میرے پاس اس کا فون نمبر نہیں تھا لیکن ڈینور کے ایکسچینج نے میری یہ مشکل حل کردی اور میں کسی نہ کسی طرح اس سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے اپنا تعارف کروایا اور کہا کہ ویلی فانگ نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔

”تم... تم اسے کیسے جانتے ہو؟“

”ہم دونوں کسی زمانے میں ایک ساتھ ہی کام کرتے تھے۔ کیا تم نے اسے کسی گن کے بارے میں فون کیا تھا؟“

”تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اس لیے کہ میرا بھی اس معاملے سے گہرا تعلق ہے۔ ہمارے درمیان ایک معاہدہ ہوا ہے جس کے تحت وہ مجھے اس گن سے فروخت ہونے والی رقم میں سے حصہ دے گا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس نے تو بتایا تھا کہ اس کے پاس کوئی گن نہیں ہے بلکہ وہ اسے پہلے ہی بیچ چکا ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ وہ گن کتنی قیمتی تھی تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا اور اب تم کہہ رہے ہو کہ اس کے پاس گن ہے۔“

”مجھے تو اس نے یہی بتایا تھا۔“

”وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بہرحال، اگر اس نے تم سے کوئی سودا کیا ہے تو اس میں میرا بھی حصہ ہے کیونکہ ہم نے وہ گن جوئے میں جیتی تھی۔“

”گویا فانگ نے وہ گن میوزیم سے نہیں چرائی تھی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں بلکہ واپسی کے سفر کے دوران اس نے جہاز پر جوا کھیلتے ہوئے وہ گن جیت لی تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ یہ ایک اہم گن ہے جس سے کئی بڑے لوگوں کو مارا گیا ہے۔ اس لیے ہم یہی سمجھے کہ یہ بھی انہی گمشدہ گنز میں سے ایک ہے۔“

میں نے اس سے فانگ کے دوسرے ساتھیوں جوئے ریڈ اور باب ولسن کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ دونوں جنگ میں ہی مارے جاچکے تھے۔

دوسرے دن میں دفتر پہنچا تو ایک اور بری خبر سننے کو ملی۔ لیبخ نے علی الصباح فون کر کے بتایا تھا کہ فانگ اپنے ہوٹل کے کمرے میں مردہ پایا گیا ہے۔ اس نے اسی براؤننگ سے خودکشی کرلی جو اس نے ہمیں دکھائی تھی۔ پیڈی نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”لیبخ کو معلوم ہوا ہے کہ فانگ کی نیشنل فلم اسٹوڈیو کے نمائندوں سے ملاقات طے تھی۔ ڈولی پالمر نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ کسی بڑی فلم کے پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ اس فلم کی نمائش کے حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ یہ ملاقات اسی سلسلے میں ہونے والی تھی لیکن یوں لگتا تھا کہ اسٹوڈیو کے نمائندوں کو فانگ کی حقیقت کا پتا چل گیا تھا۔ اس لیے وہ نہ تو مقررہ وقت پر ملاقات کے لیے پہنچے اور نہ ہی انہوں نے کوئی فون کیا۔ اس وجہ سے فانگ کی پریشانی میں اور اضافہ ہوگیا کیونکہ یہ میٹنگ اس کے لیے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ثابت ہوتی۔ مجھے اس کی خودکشی کی خبر سن کر بہت غصہ آیا۔ میں اسے اتنا بزدل نہیں سمجھتا تھا۔“

”ہم فاسانو کو کیا جواب دیں گے؟“

”تم شاید بھول رہے ہو کہ اسے فانگ زندہ یا مردہ چاہیے تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ہے کہ فانگ کی لاش کہاں پہنچائی جائے لیکن اس کا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔ بس اس کی موت کا سرٹیفکیٹ ہی کافی ہوگا۔“

یہ سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ فانگ کی موت نے ہمیں ایک بڑی مشکل سے بچالیا تھا۔ پیڈی نے مجھے ایک کام کے سلسلے میں کولمبیا بھیجا۔ واپسی پر میں بلا ارادہ ہی ”ٹیکن ہارسٹ جیولری اینڈ لون کمپنی“ کے سامنے رک گیا۔ جب میں بستر پر سونے کے لیے لیٹا تھا تو یہی بات ذہن میں آئی تھی کہ وہ گن کہاں گئی جو فانگ 1945ء میں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس نے اسکڈمور کو بتایا تھا کہ اس نے وہ گن بیچ دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی یاد آیا کہ جب میں پہلی بار ٹیکن ہارسٹ کی شاپ میں گیا تھا تو اس نے میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بتا دیا کہ وہ فانگ کو جانتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان

www.paksociety.com

دونوں کے درمیان کافی عرصے سے لین دین چل رہا ہو۔ جب میں نے ان دونوں باتوں کو ملایا تو بہت کچھ واضح ہو گیا جس کی تصدیق کے لیے ایک بار نیکن ہارسٹ سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔

وہ حسبِ معمول شاپ کے پچھلے حصے میں بیٹھا حساب کتاب میں مصروف تھا۔ جب میں نے فانگ کی موت کے بارے میں بتایا تو اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی پھر میں نے اس سے پوچھا کہ وہ فانگ کو کتنے عرصے سے جانتا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ اس کا پرانا اور مستقل گاہک تھا اور برسوں سے اس کے پاس چیزیں بیچنے اور خریدنے کے لیے آتا رہتا تھا۔

"دو دن پہلے وہ تمہارے پاس آیا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ اسے کوئی پرانی گن خریدنے سے زیادہ اس گن کی تلاش تھی جو وہ بہت عرصے پہلے تمہارے ہاتھ فروخت کر چکا تھا۔"

"ہاں، تمہارا اندازہ درست ہے۔" بوڑھے نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نے اسے بتا دیا کہ وہ گن تو اسی وقت فروخت ہو گئی تھی، تب اس نے خریدار کا نام اور پتا جاننا چاہا لیکن ہمارے پاس ایسا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا۔ مجبوراً اس نے مایوس ہو کر اس جیسی دوسری گن خرید لی۔"

"تم مجھے اصلی گن کے خریدار کا نام بتا سکتے ہو؟"

"میں کہہ چکا ہوں کہ ہمارے پاس گاہکوں کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا۔" وہ درشتی سے بولا۔

"تم فانگ کو بے وقوف بنا سکتے ہو لیکن مجھے نہیں۔" میں نے اس کی گردن دبوچتے ہوئے کہا۔ "اگر ایک منٹ کے اندر تم نے اس خریدار کا نام نہیں بتایا تو میں پولیس کو تمہاری غیر قانونی سرگرمیوں کے بارے میں بتا دوں گا۔"

میری دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور اس نے میرے ہی دیے ہوئے بزنس کارڈ کی پشت پر ایک نام لکھ کر مجھے پکڑا دیا۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پوچھا۔ "یہ فانگ کی ماں ہے؟"

"نہیں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ "یہ اس کی سابقہ بیوی ہے۔ کئی سال پہلے ہم دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا۔ یعنی یہ کہ جب بھی فانگ میرے ہاتھ کوئی چیز بیچے گا تو وہ اسے خرید لے گی۔"

"ٹھیک ہے لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اتنے سال گزر جانے کے باوجود تمہیں اس کے گھر کا پتا کیسے یاد رہ گیا؟"

"جب فانگ میرے پاس اس گن کی تلاش میں آیا تو میں نے پرانے رجسٹروں میں سے اس عورت کا پتا ڈھونڈ نکالا۔ میں اسے فون کر کے بتانا چاہتا تھا کہ فانگ اس گن کو ڈھونڈ رہا ہے۔ چونکہ اس عورت نے کئی برس پہلے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ کسی کو اس معاہدے کا علم نہ ہونے پائے اس لیے میں نے فانگ کو یہ نہیں بتایا کہ اصلی گن کس کے پاس ہے۔ میں اس عورت سے خود ملنا چاہ رہا تھا لیکن کرسمس کے رش کی وجہ سے نہ جا سکا۔ اب سوچتا ہوں کہ اگر اس سے مل لیتا تو شاید فانگ کی جان بچ جاتی۔"

میرا مقصد پورا ہو چکا تھا اس لیے میں نے وہاں مزید ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ بوڑھے دکان دار نے جو پتا مجھے دیا تھا، وہ عورت اب وہاں نہیں رہتی تھی لیکن وہاں کے کسٹوڈین کے پاس اس عورت کا موجودہ پتا تھا لہٰذا مجھے مزید تلاش میں وقت ضائع کرنا نہیں پڑا۔ وہ ایک پارک کے قریب ایک کاٹیج میں رہتی تھی۔ کرسمس کے تہوار کی مناسبت سے اس سڑک پر واقع تمام مکانات کو خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ میں نے جس مکان کے دروازے پر دستک دی، اس کی بھی ہر کھڑکی میں رنگین موم بتیاں روشن تھیں۔

مسز فانگ کا اصل نام روز میری تھا۔ اس نے سر کے بالوں میں پونی ٹیل باندھ رکھی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے چھوٹی نظر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر سختی چھا گئی لیکن میرا کارڈ دیکھ کر وہ نرم پڑ گئی۔ اس کے لباس اور میک اپ سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی پارٹی میں جانے والی ہے لہٰذا میں نے اسے اطمینان دلانے کے لیے کہا۔

"میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"میں بھی شاید تمہیں اتنا وقت نہ دے سکوں۔ آج مجھے کرسمس لنچ میں جانا ہے۔ میں ان دنوں ایک انشورنس کمپنی میں کام کر رہی ہوں۔ پہلے پیراماؤنٹ میں تھی اور تمہیں اس وقت سے جانتی ہوں جب تم پر ایکٹر بننے کی دھن سوار تھی۔ میرا خیال تھا کہ تم..." وہ بولتے بولتے لمحہ بھر کے لیے رکی اور پھر کہنے لگی۔ "کیا تم فانگ کے بارے میں کچھ پوچھنے آئے ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ تمہاری اس سے پہلی ملاقات بھی پیراماؤنٹ میں ہی ہوئی تھی؟"

"ہاں، اسے امید تھی کہ وہ بہت جلد کوئی مقام حاصل کر لے گا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔"

"کیا تمہاری علیحدگی کی یہی وجہ تھی؟" میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

"نہیں۔" اس نے افسردہ آواز میں کہا۔ "میں نے کبھی اس سے کچھ نہیں مانگا اور میرا خیال ہے کہ جب ہماری شادی

ہوئی تو فانگ بھی اپنی زندگی سے مطمئن تھا لیکن جنگ کے بعد اسے یہ احساس ہونے لگا کہ زندگی میں اس کے ساتھ دھوکا ہی ہو رہا ہے۔ بس وہیں سے ہمارے راستے جدا ہونا شروع ہو گئے۔"

اب تک وہ کھڑکی پر نظریں جمائے بول رہی تھی پھر اس نے اپنا چہرہ میری طرف کر لیا اور بولی۔ "کیا وہ کسی مشکل میں ہے؟"

"اب وہ ہر مشکل سے آزاد ہو گیا ہے۔" پھر میں نے اسے پوری کہانی سنا دی۔ فانگ کی موت کا سن کر وہ رونے لگی تھوڑی دیر بعد اسے کچھ خیال آیا اور وہ معذرت کر کے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک باکس تھا۔ پھر اس نے گلوگیر آواز میں اپنی کہانی سنانا شروع کر دی۔

"جنگ سے واپس آنے کے بعد فانگ کے حالات خراب ہوتے گئے اور اس نے اپنا سامان بیچنا شروع کر دیا۔ میں نے مسٹر نیکن ہارسٹ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ فانگ ان کے پاس جو بھی چیز فروخت کرے، وہ مجھے مطلع کر دیں... میں اسے خرید لوں گی۔ مجھے یقین تھا کہ جب وہ کسی قابل ہو جائے گا تو دوبارہ ان چیزوں کو خریدنے کی کوشش کرے گا۔ اس وقت میں ہی اس کے کام آؤں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے وہ باکس میرے حوالے کر دیا۔ اس میں دیگر اشیا کے علاوہ اعشاریہ تین، دو کا ایک پستول بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے نوٹ بک نکال کر ان چار گنز کے سیریل نمبر چیک کیے جو سالسبرگ کے عجائب گھر سے چوری ہوئی تھیں اور انہیں اس گن کے سیریل نمبر سے ملایا جو اس باکس میں رکھی ہوئی تھی۔ اس کا سیریل نمبر مختلف تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے جوئے میں جو گن جیتی تھی، وہ بھی اصلی نہیں تھی۔

"تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔" روز میری نے کہا۔

"یہ وہ گن نہیں ہے۔" میں نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "کوئی بھی اس کے پیچھے نہیں آئے گا۔"

"کچھ بھی ہو، میں اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتی۔ اسی کی وجہ سے فانگ کی جان چلی گئی۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"میں بھی نہیں سمجھ سکی۔" روز میری نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ فانگ نے ایک ایسے شہر میں اپنی زندگی کیوں گزار دی جہاں اسے ناکامیوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔ وہ کسی بھی دوسرے شہر میں جا کر قسمت آزمائی کر سکتا تھا۔ اس نے وہ سب کچھ کیوں گنوا دیا جو اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اس لیے کہ وہ ایک ناکام شخص تھا اور چیزیں بیچ بیچ کر اپنا گزارہ کرتا تھا اور اسی لیے میں اس سے محبت کرنے کے باوجود اس کے ساتھ نہ رہ سکی۔ پلیز! تم یہ گن لے جاؤ۔"

میں نے وہ گن اپنی جیب میں رکھ لی۔ وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ فانگ کی لاش لانے کے لیے وہ کس کو فون کرے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ یہ انتظام کرنا میری ذمے داری ہے۔ مجھے امید تھی کہ فانگ کی تدفین کے ساتھ ہی روز میری بھی ماضی کی تکلیف دہ یادوں سے پیچھا چھڑا لے گی۔ فانگ کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن اس نے ہمیشہ مستقبل سنوارنے کے بجائے عارضی سہاروں پر تکیہ کیا۔ اس بار بھی اس سے یہی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ کباڑیے کی دکان سے خریدی ہوئی گن کو تاریخی ظاہر کر کے وہ ایک خطیر رقم حاصل کر لے گا۔ اسے چاہیے تھا کہ اس نقلی گن کو سانتا مونیکا کی خلیج میں پھینک کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو ماضی سے آزاد کرا لیتا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کے حصے کا کام میں کروں گا۔ شاید اس طرح میرا احساسِ جرم جاتا رہے جو فانگ کا ساتھ دینے کی وجہ سے مجھ پر چھا گیا تھا۔ گو کہ جنگ سے واپس آنے کے بعد ایلا اور پیڈی کی وجہ سے میری زندگی مکمل طور پر تبدیل ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود مجھے اپنے ماضی پر پچھتاوا تھا۔

مجھے اس خلیج تک پہنچنے میں کافی وقت لگ گیا۔ وہاں ایک فلائی اوور بن رہا تھا جس کی بنیادیں کھڑی ہو چکی تھیں اور اس راستے کو زنجیر باندھ کر بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے اپنی گاڑی اس رکاوٹ سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور زنجیر کے نیچے سے جھک کر اپنا راستہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ پختہ فرش کے آخری سرے پر مجھے ایک بہت بڑا گڑھا نظر آیا جس میں لوہے کا جال بچھا دیا گیا تھا۔ کچھ فاصلے پر سیمنٹ اور بجری کے ٹرک کھڑے ہوئے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ کرسمس کی چھٹیوں کے بعد اس ستون میں کنکریٹ کی بھرائی کی جائے گی۔

میں نے احتیاط سے اطراف کا جائزہ لیا۔ دور دور تک کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی پھر میں نے اپنی جیب سے وہ گن نکالی اور اسے اس گڑھے میں پھینک دیا۔ لوہے کے جال سے اس کے ٹکرانے کی آواز سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور مجھے یوں لگا کہ فانگ کے ساتھ ساتھ میں بھی ایک بوجھ سے آزاد ہو چکا ہوں۔

paksociety.com

منزل

سرور اکرام

ہر شخص اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے زندگی گزارنا چاہتا ہے... مگر بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ بہت کچھ اپنی مرضی اور منشا کے بغیر زندگی میں در آتا ہے... اور یہ مداخلتِ بے جا زندگی کے معمولات میں ہلچل مچا دیتی ہے... ایک تاریخی و ثقافتی شہر کی گلیوں میں بھٹک جانے والے شخص کا المیہ... اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیسے... کیوں اور کس طرح ایک ایسی جگہ پہنچ گیا... جہاں انسانی زندگی کی قیمت انتہائی ارزاں تھی... حالات کے ہیر پھیر کی ایک عبرت آموز کہانی

پست اور گمراہ ذہنیت کے مالک افراد کا شاخسانہ جو علم و عرفان کی آگہی سے نابلد تھے...

میں اس گلی میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

میرے عقب میں ہنگامے ہو رہے تھے۔ بوتلیں چل رہی تھیں۔ ایک بار گولیوں کی آوازیں بھی آئی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں یہاں سے کیسے نکلوں گا۔

یہ کچھ ہندو مسلم فساد کا سا ماحول تھا۔ اس شہر میں عام طور پر ایسے واقعات ہوا کرتے تھے۔ ذرا سی بات پر بلوا ہو جاتا تھا اور لوگ مارے جاتے تھے۔

میں اپنے ایک دوست کے کہنے پر کلکتہ چلا گیا تھا جو آج کل کول کتہ کہلانے لگا ہے۔ میں نے اس سے پہلے اتنا بڑا شہر نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی زندگی میں کبھی اتنے لوگ دیکھے ہوں گے۔

ہر طرف سر ہی سر نظر آتے تھے۔ پارکوں میں، فٹ پاتھوں پر، گلیوں میں، بازاروں میں انسان ہی انسان۔ نہ جانے اس شہر کی آبادی کتنی ہوگی؟

دھرم پورہ، گول میدان، ذکریا اسٹریٹ، موہن گیان اور نہ جانے کتنے محلے اور کتنی سڑکیں تھیں۔ کاریں تو اتنی زیادہ نہیں تھیں لیکن سائیکل رکشا، پیدل رکشا، ٹرام، بسیں، یہ سب بے تحاشا تھیں اور چلنے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔

میں سوچ میں پڑ گیا تھا کہ آخر اتنے لوگ کس طرح ایک ہی شہر میں زندگی گزارتے ہوں گے۔ میں اس زمانے میں پٹنہ یونیورسٹی میں پڑھا کرتا تھا لیکن انتہائی بدقسمت حالات میں زندگی گزار رہا تھا۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ بھائی بہن بھی کوئی نہیں تھا۔

یعنی ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا جو مجھے پٹنہ سے باندھ کر رکھ سکتا۔ لیکن اپنی تعلیم کی وجہ سے مجبور تھا۔ اخراجات بھی اس طرح پورے ہو جاتے تھے کہ سبزی باغ میں والد صاحب چھ دکانیں چھوڑ گئے تھے۔ ان کا اچھا خاصا کرایہ آ جایا کرتا اور بڑی آسانی سے گزر بسر ہو جاتی۔

پٹنہ ایک چھوٹا سا شہر ہے اور بہت دنوں سے یہ خواہش ہو رہی تھی کہ میں کول کتہ دیکھ آؤں۔ کچھ دن وہاں تفریح کروں۔ لہٰذا یونیورسٹی سے چھٹی لے کر میں اپنے دوست کے ساتھ کول کتہ آ گیا۔ یہ سفر بہت رومانٹک سا تھا۔

میرے سامنے والی سیٹ پر ایک ہندو بنگالی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جسے حسین بنگالی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے چہرے پر

کی صباحت اور ملاحت تھی۔

میرا خیال ہے کہ حسن کے ترازو میں گوری رنگت کا زیادہ وزن نہیں ہوا کرتا بلکہ چہرے کی دلکشی اور کشش کچھ اور ہی چیز ہوا کرتی ہے۔

بہرحال، اس سفر میں اس لڑکی کے خوب صورت چہرے سے سیراب ہوتے ہوئے ہم کول کتہ پہنچ گئے۔ یہاں کا ریلوے اسٹیشن بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

یہاں بھی اتنی بھیڑ تھی جیسے پورا شہر ریلوے اسٹیشن پر جمع ہو گیا ہو۔ ہم لوگوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے باہر آ گئے۔

ہمارا قیام رحمانیہ ہوٹل میں تھا۔ ہم نے کول کتہ میں پہلی بار ہاتھ رکشا دیکھا تھا۔ پٹنہ میں سائیکل رکشا چلا کرتے تھے۔ بہرحال، ہمیں رحمانیہ ہوٹل میں جگہ مل گئی اور ہم نے ایک کمرا کرائے پر لے لیا۔ سامنے ایک عظیم الشان مسجد تھی۔ سیکڑوں کی تعداد میں نمازی اپنے رب کو یاد کر رہے تھے۔

یہ سب دیکھنا اور اس ماحول کے درمیان رہنا بہت اچھا لگ رہا۔ دوسرے دن میرے دوست کے ماموں ہوٹل چلے آئے۔ وہ میرے دوست کو زبردستی اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے تھے۔ وہ مجھ سے بھی ضد کر رہے تھے لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان کے گھر جا کر آزادی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے میں نے منع کر دیا۔

دوست نے رخصت ہوتے ہوئے کہا تھا کہ وہ روزانہ ملنے کے لیے آیا کرے گا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آسکی۔ زندگی مجھے اپنے ساتھ بہا کر نہ جانے کہاں لے گئی۔ وہ سب کچھ ہو گیا جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔

شام کا وقت تھا جب میں بھٹکتا ہوا اس گلی کی طرف جا نکلا تھا جس گلی میں راتیں جاگتی اور دن سویا کرتے ہیں۔ ہر دروازے پر عورت اپنا بازار سجائے کھڑی تھی۔

یہ سب دیکھنے کا اتفاق پہلی بار ہو رہا تھا۔ کم عمر لڑکیاں بھی تھیں۔ اس وقت مجھے ساحر کی مشہور نظم یاد آنے لگی تھی۔

ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں۔

اشارے ہو رہے تھے۔ وہ مجھے اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ وقت گزارنے کی دعوتیں دے رہی تھیں لیکن میں جلد از جلد اس گلی سے نکل جانا چاہتا تھا۔ میں بازار سے گزر تو رہا تھا لیکن خریدار ہرگز نہیں تھا۔

اور اچانک ہنگامہ شروع ہو گیا۔ شاید کوئی فساد ہو گیا تھا اور وہ بھی سنگین نوعیت کا۔ دروازوں پر کھڑی ہوئی عورتیں دروازے بند کر رہی تھیں۔

لوگ بھاگ رہے تھے۔ ”مارو مارو، جانے نہ دو“ جیسی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور میں حیران کھڑا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں کہاں جاؤں؟ راستے میرے لیے بالکل انجان تھے اور میں بلوائیوں کے درمیان پھنس گیا تھا۔

اچانک ایک لڑکی نے آواز دی۔ ”بابو! سوچتا کیا ہے۔ جلدی سے اندر آ جا۔ ورنہ کاٹ کر رکھ دیں گے۔“

اس نے اپنے گھر کا دروازہ کھول رکھا تھا۔ میں جلدی سے کھلے ہوئے دروازے سے اندر چلا گیا۔ اس نے فوراً ہی دروازہ بند کر لیا۔

میں ایک صحن میں کھڑا تھا جس میں کئی کمرے تھے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر داہنے کمرے میں لے آئی۔ صرف ایک چارپائی، ایک کرسی اور ایک سنگھار میز کے سوا اس کمرے میں کچھ بھی نہیں تھا۔

”اب اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہاں کوئی نہیں آئے گا۔“

میں اس وقت بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ اس نے

www.paksociety.com

ایک جگ سے پانی نکال کر گلاس میری طرف بڑھا دیا۔ ''یہ لو۔ پانی پی لو۔ جان میں جان آجائے گی۔''

اس کی زبان بہت صاف تھی۔ واقعی پانی کا ایک گلاس پی لینے کے بعد میں نے اطمینان محسوس کیا۔ باہر سے لوگوں کے شور اور چیخنے کی آوازیں ابھی تک آرہی تھیں۔

''کیا اس شہر میں نئے آئے ہو؟'' اس نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے گردن ہلا دی۔

''اسی لیے تمہیں یہاں کے راستے نہیں معلوم۔'' اس نے کہا۔ ''تم جس گلی میں آگے بھاگے جارہے تھے' وہ گلی آگے جاکر بند ہوجاتی ہے۔ پھر وہ لوگ تمہیں پکڑ لیتے اور تمہارا جھٹکا ہوجاتا۔''

''کون لوگ پکڑ لیتے؟'' میں نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''موہن گپتا اور اس کے ساتھی۔'' اس نے بتایا۔

''کیوں پکڑ لیتے؟ میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ تم مسلمان ہو۔'' اس نے کہا۔

''ارے۔'' میں چونک گیا۔ ''تمہیں کیسے معلوم کہ میں مسلمان ہوں؟''

''بہت آسانی سے۔'' وہ مسکرا دی۔ ''تم نے پاجامہ تو پہن رکھا ہے لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ مسلمانوں، ہندوؤں کے پاجامے کی سلائی میں فرق ہوتا ہے۔''

''اوہ۔'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''میں نے اس پر تو غور ہی نہیں کیا تھا۔''

''یہ تو ایک پہچان ہوئی۔ اس کے علاوہ تمہارا چلنا پھرنا، تمہارا چہرہ سب مسلمان ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔''

میں اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے خاموش ہوجانے کے بعد میں نے کہا۔ ''لیکن اس گلی میں آنے والوں کو کسی مذہب سے کیا لینا۔ وہ تو پیسے لے کر آتے ہیں۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارا کسی مذہب سے لینا دینا نہیں ہونا چاہیے لیکن یہاں ہے۔ ٹھہرو، میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔ پتا نہیں تم کسی ملیچھ عورت کے ہاتھ کی چائے پیو گے یا نہیں؟''

''نہیں، ایسا مت کہو۔'' میں جلدی سے بولا۔ ''تم میری محسن ہو۔ تم نے میری جان بچائی ہے اور تم دوسروں سے بہت الگ بھی دکھائی دے رہی ہو۔''

''ہاں کیونکہ میں اندر سے طوائف نہیں ہوں۔ ایک لڑکی ہوں۔ کالج جانے والی سیدھی سادی لڑکی جسے یہاں لاکر طوائف بنا دیا گیا ہے۔''

اب جاکر میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ تیکھے نقوش کی ایک جاذب نظر لڑکی تھی۔ اس کی عمر بھی اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی اور اس کا صاف لہجہ بھی بتا رہا تھا کہ وہ ضرور کالج جاتی ہوگی۔

''گھبرانا نہیں بابو۔'' اس نے کہا۔ ''میں باہر سے زنجیر لگا دوں گی، کچن صحن میں ہے۔''

میں تن بہ تقدیر ہوکر بیٹھا رہا۔ وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس نے دروازہ بھی بند کردیا تھا۔ اب تو میں پھنس ہی چکا تھا۔ ویسے نہ جانے کیوں اس لڑکی پر بھروسا ہونے لگا تھا۔

کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جو اعلان کر دیتے ہیں کہ وہ بے ضرر ہیں۔ ان سے نقصان کا اندیشہ نہیں ہے بلکہ وہ تمہاری مدد کریں گے۔ اس لڑکی کا چہرہ بھی ایسا ہی تھا۔ انتہائی مہربان، محبتوں سے بھرا ہوا۔

اس کی واپسی دس پندرہ منٹ کے بعد ہوئی۔ وہ چائے کے ساتھ ساتھ بسکٹ بھی لے آئی تھی۔ اس دوران باہر کی آوازیں اور چیخ و پکار بھی ختم ہوچکی تھی۔

''اب بتاؤ، کون ہو تم؟'' اس نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''اور ایسی گندی جگہ کیوں آئے ہو جبکہ تم ایسے آدمی معلوم نہیں ہوتے۔''

''ہاں، میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اس شہر میں کل ہی آیا ہوں پہلی مرتبہ۔ اور یونہی ٹہلتا ہوا اس طرف آنکلا تھا کہ یہ مصیبت گلے پڑ گئی۔ ویسے یہ چکر کیا ہے؟''

''یہ بہت عجیب دنیا ہے بابو۔'' اس نے کہا۔ ''یہ گلی موہن گپتا کی ہے۔ اس گلی میں صرف ہندو تماش بین آیا کرتے ہیں۔ موہن گپتا ایک بہت بڑا بدمعاش ہے۔ یہاں کی پولیس اس کے اشارے پر چلتی ہے۔ تم نے جو ہنگامے کی آوازیں سنی تھیں، وہ اس لیے تھیں کہ ایک مسلمان تماش بین اس گلی میں آنکلا تھا۔ وہ بھی شاید تمہاری طرح اجنبی تھا۔ اب اس کی لاش کچرے کے ڈھیر پر پھینک دی گئی ہے۔''

''میرے خدا! کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟'' میں کانپ گیا۔

''ہاں، ایسا ہی ہوتا ہے۔ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ تم اس طرف آنکلے۔'' اس نے کہا۔

''اب بتاؤ، اس مسلمان کے مرنے کے بعد کیا ہو

''ہونا کیا ہے، کرامت کی گلی سے کسی ہندو کی لاش نکلے گی۔'' اس نے بتایا۔

''اور یہ کرامت کون ہے؟''

''وہ بھی موہن گپتا کی طرح کا ایک مسلمان بدمعاش ہے۔ اس کی بھی گلی ہے اور اس گلی میں مسلمان تماش بین جایا کرتے ہیں۔ اگر غلطی سے کوئی ہندو چلا جائے تو اس کی بھی لاش باہر آتی ہے۔''

''یہ تو بہت عجیب بات بتائی تم نے۔ کیا ان دونوں کو کوئی نہیں جانتا؟'' میں نے پوچھا۔

''کون پکڑے گا؟ ان دونوں نے پولیس کو قابو میں کر رکھا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور گلی میں آنے کی سزا پاتا تو دوسرا ہندو ملتی ہے یا مسلمان کو۔''

''لاش بن کر؟''

''ہاں، لاش بن کر۔''

اور اسی وقت دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ لوگوں کی آوازیں آئیں۔ ایک آدمی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ''کھول دروازہ... تو نے کس کو چھپا رکھا ہے؟''

میں سہم کر رہ گیا۔ ایک ذلت بھری موت سر پر آچکی تھی۔

☆☆☆

بہت ہی دہشت ناک صبح تھی۔

اور میں نے جو رات گزاری، وہ اس صبح سے بھی زیادہ دہشت ناک تھی۔ اس لڑکی کی حکمت عملی نے جان بچالی تھی۔ اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں فوراً بستر پر لیٹ جاؤں اور چادر اوڑھ لوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر اس لڑکی نے دروازے کے پاس جاکر کہا۔ ''کیا بات ہے... کیوں تنگ کرنے آئے ہو؟ میں اس وقت گاہک کے ساتھ ہوں۔''

''کون ہے وہ؟'' باہر سے پوچھا گیا۔

''انسان ہے اور کون ہوگا؟''

''میں پوچھتا ہوں، ہندو ہے یا مسلمان؟''

''کیا پاگل ہوگئے ہو۔ میں نے آج تک کسی مسلمان کو بٹھایا ہے اپنے ساتھ؟''

باہر خاموشی ہوگئی۔ پھر وہ لوگ آپس میں باتیں کرتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئے۔ شاید اس لڑکی کے اس جواب نے انہیں مطمئن کردیا تھا۔

پھر وہ رات باتوں میں گزری۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا۔ ''میرا نام چندا ہے۔ میرا تعلق ایک اچھے ہندو گھرانے سے ہے۔ لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ابھی تک نہیں جا سکا ہوں۔''

''میں وہیں کی رہنے والی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''وہاں ایک محلہ ہے حضرت گنج، میں اسی محلے کی ہوں۔ کالج میں پڑھا کرتی تھی میری زبان اسی لیے صاف ہے کہ میری دوست مسلمان لڑکیاں تھیں اور وہ خالص اردو بولا کرتیں۔ پھر یہ ہوا کہ میں ایک دن پاگل ہوگئی۔''

''پاگل ہوگئیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔''

''مجھ پر ایک راجپوت زادے کی محبت کا بھوت سوار ہوگیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''موہن نام تھا اس کا۔ وہ مجھ سے شادی کی بات کرتا تھا لیکن میں جانتی تھی کہ میرے والدین کبھی اس شادی کے لیے تیار نہیں ہوں گے کیونکہ وہ برہمن تھے۔ دوسری طرف موہن بھی مجھے بھڑکاتا رہا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس خبیث آدمی کے دل میں کیا ہے۔ مختصر یہ کہ اس کی باتوں میں آکر میں اس کے ساتھ فرار ہوکر کولکتہ آگئی۔ اس نے کہا تھا کہ یہاں آتے ہی وہ مجھ سے شادی کرلے گا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ دولت اور ہوس کی دنیا میں سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مذہب، انسانیت اور معاشرے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس نے میرے جسم سے فائدہ اٹھانے کے بعد مجھے فروخت کردیا اور آج میں تمہارے سامنے اس بازار میں موجود ہوں۔''

مجھے اس کی کہانی سن کر افسوس ہوا۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی، ایک بہتر گھرانے کی۔ اس نے محبت کی خاطر قربانی دی تھی لیکن یہ قربانی اسے ہوس کے بازار میں لے آئی تھی۔ اس نے ایک محبوب کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش کی تھی لیکن اب اس کی ہر رات کسی نئے محبوب کے ساتھ گزرتی ہوگی۔

ایک ذرا سی لغزش، ذرا سی غلطی کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ وہ گھر سے نکلتے ہی کسی پتنگ کی طرح کٹ چکی تھی اور اب ڈولتی ہوئی اس بازار کی چھت پر جا اتری تھی۔

چندا اس کا نام تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا نام کچھ اور ہو۔ یہ تو ایسا نام تھا جس کا تعلق ہندو اور مسلمان دونوں سے ہوسکتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اس نام کی آڑ میں چھپا رکھا

www.paksociety.com

تھا۔

"چندا! کیا تمہیں اپنے گھر والے یاد آتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "خاص طور پر مجھے اپنا چھوٹا بھائی ورما بہت یاد آتا ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔"

"کیا تم نے یہاں سے نکلنے کی کوشش نہیں کی؟"

"کیا کرنا ہے نکل کر؟" اس نے کہا۔ "یہاں مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ میں جب چاہے، یہاں سے نکل سکتی ہوں۔ کہیں بھی جا سکتی ہوں لیکن انہوں نے میرے پاؤں میں میری رسوائیوں کی زنجیر ڈال دی ہے۔"

"اگر میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں تو؟" میں نے پوچھا۔

"تم۔" اس کے ہونٹوں پر ایک غم آلود سی مسکراہٹ آگئی۔ "نہیں بابو! میں تمہاری زندگی برباد کرنا نہیں چاہتی۔ تم مجھے لے جا کر کیا کرو گے؟ میں تو ایک طوائف ہوں۔ میری اس سماج میں اب کیا حیثیت ہے؟"

"نہیں چندا! میری نگاہوں میں تمہاری بہت بڑی حیثیت ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے تمہارے اندر کی عورت کو دیکھ لیا۔ وہ ابھی تک پاکیزہ اور معصوم ہے۔ کالج میں پڑھنے والی کسی شرارتی لڑکی کی طرح۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ "بابو جی! تم اس وقت جذبات میں آکر یہ سب کہہ رہے ہو۔"

"خیر، جذبات بھی اپنی جگہ ہیں لیکن میں سچ بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "چندا! اس گلی میں آنے سے پہلے میں ایک عام سا ہندوستانی نوجوان تھا۔ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والا جس کے پاس زندگی کے زیادہ تجربات نہیں ہوتے۔ لیکن ان حالات سے گزرنے کے بعد میں ایک دم سے بہت بڑا ہو گیا ہوں۔ میں نے بہت کچھ جان لیا ہے۔ میری بزدلی، حوصلے میں تبدیل ہو گئی ہے۔ میں اسی لیے تم سے یہ وعدہ کر رہا ہوں کہ تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔"

"لیکن کہاں لے جاؤ گے؟"

"اپنے شہر پٹنہ۔" میں نے بتایا۔ "وہاں میرا گھر ہے۔ میرا کاروبار ہے۔ سب کچھ ہے میرے پاس۔"

"اور تمہارے گھر والے؟"

"بدقسمتی سے میرا کوئی بھی نہیں ہے۔" میں نے بتایا۔ "مجھے زندگی میں کبھی محبت بھی نہیں ملی۔ کسی کی مہربان محبت کا سہارا نہیں ملا ہے مجھے۔ میں نے تمہاری شکل میں اپنی محبت پالی ہے۔"

"اتنی بڑی بات مت بولو بابو!" اس نے کہا۔ "اپنے آپ کو سنبھالو اور صبح ہوتے ہی نکل جاؤ یہاں سے اور مجھے بھولنے کی کوشش کرو۔"

"اب یہی تو نہیں ہو سکتا۔ دیکھو چندا! قدرت کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ کیا ضروری تھا کہ میں تفریح کے لیے کول کتہ آتا۔ کیا ضروری تھا کہ میں بھٹکتا ہوا اس طرف آنکلتا اور یہاں فساد ہو جاتا اور تم مجھے پناہ دیتیں۔ لیکن یہ سارے کام پلاننگ کے تحت ہوئے ہیں اور یہ پلاننگ قدرت کی ہے۔ قدرت ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ملوانا چاہتی تھی اس لیے اس نے یہ بندوبست کیا ہے۔"

"کیسی عجیب بات ہے کہ میں نے ابھی تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا، صرف بابو جی کہتی رہی ہوں۔"

"میرا نام صفدر ہے۔" میں نے بتایا۔ "اب تم کہو، تمہارا کیا فیصلہ ہے؟"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں تم سے کیا کہوں، کیا جواب دوں۔"

"تم یہ بتاؤ، کیا تم اس گلی سے نکل سکتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو جب چاہے نکل سکتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "ہم پر کوئی پہرا نہیں ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جس کے دامن پر داغ لگ جائے وہ اور کہیں نہیں جا سکتی۔"

"بس تو یہاں سے نکل کر کل دس بجے تک میرے پاس آجانا۔ میں رحمانیہ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"نہیں، وہاں نہیں۔"

"تو پھر تم ہی بتا دو۔"

"کالج اسٹریٹ پر ایک انڈین کافی ہاؤس ہے۔" اس نے بتایا۔ "میں وہاں آجاؤں گی لیکن تمہارا اس گلی سے نکلنا مشکل ہوگا۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ وہ لوگ کسی ایسے مسلمان کو ڈھونڈ رہے ہوں گے جو اس گلی میں داخل ہونے کے بعد باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا گیا ہے۔"

"تو پھر تم بتاؤ، میں یہاں سے کیسے نکلوں؟" میں نے پوچھا۔

"میں تمہیں ہندو بنا کر نکالوں گی۔" اس نے بتایا۔ "میرے پاس ایک دھوتی پڑی ہوئی ہے۔ تمہیں وہ دھوتی باندھنی ہوگی اور کرتہ پہننا ہوگا۔ اور ماتھے پر تلک لگا کر یہاں سے نکل جاؤ۔"

"مجھے دھوتی باندھنی نہیں آتی۔"

"وہ میں سکھا دوں گی۔"

صبح ہو چکی تھی۔ چندا نے میرے لیے بستر کے نیچے رکھے ہوئے ٹرنک سے ایک دھوتی اور ایک کرتہ نکال کر دے دیا۔ پھر اس نے دھوتی باندھنے میں میری مدد کی اور اچانک مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ "جاؤ صفدر! میں نہیں جانتی کہ میں تم سے دوبارہ مل سکوں گی یا نہیں... لیکن یہ رات مجھے زندگی بھر یاد رہے گی۔ میں نے اس رات میں بہت کچھ حاصل کر لیا ہے۔ میں اب مر بھی جاؤں تو مجھے کوئی غم نہیں ہوگا۔"

"نہیں چندا! ایسی باتیں نہیں کرتے۔ ہم دونوں کو ساتھ رہنا ہے۔ یاد رکھو، قسمت نے ہمیں ایک بندھن سے باندھ دیا ہے۔ اسی لیے میں پورے یقین کے ساتھ تمہارا انتظار کروں گا۔"

"جاؤ۔" وہ مجھ سے الگ ہو گئی۔ "ابھی گلی میں زیادہ لوگ نہیں ہیں۔ تم اِدھر اُدھر دیکھے بغیر نکلتے چلے جاؤ۔"

اس نے دروازہ کھول کر اِدھر اُدھر جھانکا۔ پھر مجھے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے اشارے پر نکلتا چلا گیا۔

گلی میں بہت کم لوگ تھے۔ کسی نے میری طرف دھیان نہیں دیا۔ اس گلی کی ریت ہی یہی رہی ہوگی۔ لوگ اسی طرح راتیں گزار کر خاموشی سے نکل جاتے ہوں گے۔

میں اس گلی سے باہر آگیا۔ چندا نے میرے اتارے ہوئے کپڑے میرے ساتھ کر دیے تھے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اگر دھوتی میں دشواری محسوس کر رہا ہوں تو پینٹ قمیص خرید لوں۔ پینٹ شرٹ ایک ایسا مشترکہ لباس تھا جس کو ہندو اور مسلمان دونوں ہی استعمال کرتے تھے۔

میں ٹرام پکڑ کر سونا گاچی سے نیو مارکیٹ پہنچ گیا۔ یہ بھی چندا ہی نے سمجھایا تھا۔ وہ بے چاری بہت دیر تک مجھے کول کتہ کے راستے اور روٹس وغیرہ سمجھاتی رہی تھی تاکہ میں بھٹک نہ جاؤں۔

وہاں میں نے ایک اچھی بات یہ دیکھی ہے کہ دکانیں وغیرہ بہت سویرے کھل جاتی ہیں۔ یہاں کی طرح نہیں ہوتا کہ ایک بجے دن تک مارکیٹ کی دکانیں بند ہی ہیں۔

میں نے اپنے سائز کی ایک پینٹ شرٹ خرید لی اور ٹرائل کے بہانے اپنا لباس تبدیل کر لیا۔ پھر فالتو کپڑے میں نے ایک طرف پھینک دیے۔

اب میں بے فکر ہو کر گھوم سکتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ میں اب کیا کروں؟ کیا واقعی میں چندا کے لیے اتنا سنجیدہ ہو گیا ہوں؟

کہیں میں کوئی غلطی تو نہیں کر رہا ہوں؟ نہیں، کوئی غلطی نہیں تھی۔ میں نے اس سے پیار کا رشتہ استوار کر لیا تھا۔ اس نے میری جان بچائی تھی۔ اس نے ایک ہی رات میں مجھے اتنی توجہ اور اتنی محبت دی تھی کہ جس منزل تک پہنچنے کے لیے صدیاں بیت جاتی ہیں۔

میں نے اس کے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا اور مجھے ہر حال میں اپنے عہد پر قائم رہنا تھا۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ محبت شاید اسی پاگل پن کا نام ہوتا ہے۔ انسان کو سوچنے سمجھنے نہیں دیتا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ بزدل کو بھی شیر جیسی محبت اور بہادری دے دیتا ہے۔ یہ پاگل پن ایسا ہی ہوتا ہے۔

میں سوائے چندا کے اور کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ اس کی محبت اور انسانی ہمدردی کی شدت نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

اب چاہے کچھ بھی ہو جائے، مجھے اس کا ساتھ دینا تھا۔ اس نے گیارہ بجے انڈین کافی ہاؤس پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ میں ساڑھے دس بجے سے وہاں جا کر بیٹھ گیا۔

میرے آس پاس بھی کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انسان بظاہر ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ ایک جیسے ہاتھ پاؤں، آنکھیں، زبان، سب کچھ ایک جیسا لیکن اس کے اندر کتنی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ زبان اور نسل کی تبدیلیاں۔ مذہب اور قومیت کی تبدیلیاں... سوچنے اور محسوس کرنے کی تبدیلیاں۔

وہ جو میرے سامنے ایک دبلی پتلی خوب صورت سی بنگالی لڑکی بیٹھی تھی، نہ جانے اس کی کیا کہانی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے بھی کسی سے پیار کیا ہو اور یہاں بیٹھی اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہو۔ یا ممکن ہے کہ اس کی کوئی سہیلی اسے یہاں بٹھا کر کچھ خریدنے چلی گئی ہو۔

یا ممکن ہے کہ کچھ اور ہو۔ انسان تو ایک ہی جیسا ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ کہانیاں کتنی مختلف ہوتی ہیں۔ میں نے اپنے لیے کافی منگوائی تھی اور ابھی کافی ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ دو آدمی میرے سامنے آکر بیٹھ گئے۔ وہ دونوں صورت ہی سے خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔ ایک کے گال پر چاقو کے زخم کا بڑا سا نشان بھی تھا۔ دونوں بہت

www.paksociety.com

خونخوار نگاہوں سے میری طرف دیکھے جا رہے تھے۔

"چلو اٹھو۔" ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا۔ "میرے ساتھ چلو، تمہیں موہن گپتا صاحب نے بلایا ہے۔"

"کون، کون موہن گپتا؟" میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

"وہی، جس کی گلی سے تم ہندو بن کر نکلے ہو۔" اس نے بتایا۔ "اگر تم نے انکار کیا تو یہیں پر تمہاری آنتیں باہر آ جائیں گی۔ موہن صاحب کے آدمیوں کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔"

"لیکن... تم..." میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"اوہ..." دوسرا ہنس پڑا۔ "بابو جی... تمہاری چھمک چھلو نے تمہارے بارے میں ساری خبر دی ہے۔ اسی نے بتایا تھا کہ تم کہاں اور کس وقت ملو گے۔ چلو جلدی۔ ہمارے پاس فالتو ٹائم نہیں ہوتا۔"

☆☆☆

میرے خدا! کیا اذیت تھی۔

مجھے مارا جا رہا تھا۔ وہ چاہتے تو ایک ہی وقت میں چاقو یا گولی مار کر میرا خاتمہ کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے ایک پرانے مکان کے پرانے ستون سے باندھ کر مارا جا رہا تھا۔

وہ مجھے چمڑے کے ہنٹر سے مار رہے تھے اور ہر چوٹ پر میں بلبلا کر رہ جاتا۔ میری کھال ادھڑنے لگی تھی۔ میں نہ جانے کس عذاب میں مبتلا ہو گیا تھا جبکہ شروع سے ہی اب تک میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

میں بھٹکتا ہوا ایک گلی کی طرف جا نکلا تھا اور وہاں سے یہ کہانی شروع ہوئی تھی۔ چندا نے رات بھر مجھے کتنے پیار سے رکھا تھا اور صبح ہوتے ہی مجھے ان بے رحم لوگوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اس نے میرے ساتھ یہ کیسا کھیل رچایا تھا؟ کیوں دھوکا دیا تھا اس نے؟

میں تو اس کے لیے اتنا سنجیدہ ہو گیا تھا۔ یہ جاننے اور دیکھنے کے باوجود کہ وہ ایک طوائف ہے، میں نے اس کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس نے کیسی حرکت کی تھی۔

انڈین کافی ہاؤس سے وہ دونوں مجھے اپنے ساتھ کسی دور افتادہ علاقے کے ایک پرانے سے مکان میں لے آئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا اسی لیے انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھنے یا مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

وہ مجھے کسی بچے کی طرح اٹھا کر اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اس مکان میں دو آدمی اور بھی تھے۔ لیکن شاید وہ اردو یا ہندی نہیں جانتے تھے۔ وہ بنگالی میں باتیں کر رہے تھے۔

مجھے لانے والوں نے ان دونوں کی مدد سے مجھے ایک ستون سے باندھ دیا تھا اور ہنٹر سے مارنے لگے تھے۔ میری چیخیں پورے مکان میں گونج رہی تھیں لیکن ان پر دھیان دینے والا کوئی نہیں تھا۔

پھر شاید میں مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہی ہو گیا۔ زندگی میں پہلی بار میرے ساتھ یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ شاید سب کچھ پہلی بار ہی ہوا کرتا ہے۔

پہلی بار میں نے محبت کی اور پہلی بار ہی ایسا دھوکا ہوا جس نے مجھے زندگی سے مایوس کر دیا۔ انسان سے میرا بھروسا ہی ختم کر دیا تھا اس دھوکے نے۔ طوائف پھر طوائف ہی ہوتی ہے۔

نہ جانے کتنی دیر بعد میرے چہرے پر کسی نے پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ مجھے ہوش آ گیا تھا لیکن بے پناہ کمزوری تھی۔ پورا بدن بری طرح درد کر رہا تھا۔

انتہائی بے رحمی کا سلوک ہوا تھا میرے ساتھ۔ میں اب ستون سے بندھا ہوا نہیں تھا بلکہ ایک کمرے کے فرش پر پڑا ہوا تھا اور میرے قریب چندا بیٹھی ہوئی تھی۔

میں نے اسے دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن پورے بدن میں درد کی چنگاریاں اترنے لگیں۔ اس نے نرمی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر لٹا دیا۔ "لیٹے رہو بابو۔" وہ رو رہی تھی۔ "ان کم بختوں نے بہت ظلم کیا ہے تمہارے ساتھ۔"

"چندا! اور یہ ظلم تم نے کروایا ہے۔" میری آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔ "تم نے بتایا تھا کہ میں کہاں ہوں۔"

"نہیں بابو نہیں، یہ جھوٹ ہے۔ مجھے ایسا مت سمجھو۔ جب تم گلی سے باہر نکلے تو اس وقت موہن گپتا کے آدمیوں نے تم کو دیکھ لیا تھا۔ تم سے دھوتی سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ تم وہی ہو۔ انہوں نے تمہارا پیچھا کیا اور تمہیں پکڑ لائے۔"

"اوہ۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "اور انہوں نے یہ بتایا کہ تم نے پتا بتایا ہے۔"

"بابو! تم ذرا اٹھ کر میرے زخموں کو تو دیکھو۔" چندا نے کہا۔ "انہوں نے مجھے بھی بہت بری طرح مارا ہے، یہ دیکھو۔"

اس نے اپنی قمیص اوپر اٹھا دی۔ میرے خدا! اس لڑکی کی پوری پشت لہولہان ہو رہی تھی۔ "دیکھ لیا تم نے؟"

www.paksociety.com

اس نے بلکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں چندا!" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "دیکھ لیا۔"

"بہت مارا ہے ان لوگوں نے لیکن میں نے تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا پھر جب میں بے ہوش ہو گئی تو مجھے بھی یہیں اٹھا کر لے آئے۔"

"لیکن کیوں، ہم دونوں کو ایک ساتھ کیوں رکھا گیا ہے؟"

"میں نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ ہم دونوں کو ایک ساتھ مار کر ہماری لاشیں دریائے ہگلی میں بہا دیں گے۔"

"اوہ۔" میں کانپ کر رہ گیا۔ "چندا! میں نے اپنی زندگی کا اتنی جلدی ایسا انجام نہیں سوچا تھا۔"

"اب ہم دونوں کو ایک ساتھ ہی مرنا ہے بابو جی۔"

"چندا! یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ تم تو کسی طرح اپنی زندگی گزار ہی رہی تھیں کہ میں نہ جانے کہاں سے تمہارے پاس آ گیا اور تم پر بدقسمتی کے دروازے کھل گئے۔"

"ایسا مت کہو، تم نے خود کہا تھا کہ خدا کی کوئی مصلحت تمہیں اس گلی میں لے آئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی ہمیں زندہ رہنا ہو اور جہاں تک میری زندگی اور موت کا سوال ہے تو میں تو مر ہی چکی ہوں۔ کیا زندگی ہے میری۔ گوشت کا ایک لوتھڑا۔ جس کو جو چاہے روند کر چلا جاتا ہے۔"

"چندا! تمہارے آ جانے سے میری ہمت بڑھ گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "اب ہم اتنی آسانی سے تو نہیں مریں گے۔"

اسی وقت دروازہ کھلا اور وہی دونوں اندر آ گئے جو مجھے کافی ہاؤس سے اٹھا کر لائے تھے۔ "چلو اٹھو، جلدی کرو۔" ایک نے کہا۔

"تم کہاں لے جا رہے ہو ہمیں؟" میں نے پوچھا۔

"موہن صاحب کے پاس۔" وہ ہنس کر بولا۔ "وہی تمہارا فیصلہ کریں گے۔"

چندا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ میرے ہاتھ کو دبا کر اس طرح اشارے کر رہی تھی جیسے سمجھانا چاہ رہی ہو کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ ہمیں مارنے کے لیے لے جا رہے تھے۔ میں بھی پوری طرح کھٹک گیا تھا۔

ہم اس کمرے سے باہر آ گئے۔ اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہم ایک بہت بڑے احاطے میں تھے۔ وہاں شاید لکڑیوں کا کام ہوتا تھا۔ ہر طرف لکڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس پورے احاطے میں ان دونوں کے سوا کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ دو تھے لیکن دونوں ہی مسلح تھے۔ اس لیے وہ جانتے تھے کہ ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ ان میں سے ایک کے پاس چاقو تھا جبکہ دوسرے نے اپنے ہاتھ میں ایک پستول لے رکھا تھا۔

"آگے بڑھو۔" چاقو والے نے کہا۔ "گیٹ کی طرف۔"

اندھیرا تھا۔ البتہ گیٹ پر ایک ہلکے پاور کا بلب جل رہا تھا۔ اس کی زرد روشنی ماحول کو سوگوار بنا رہی تھی۔ چندا نے ابھی تک میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

اچانک کوئی چیز میرے پاؤں سے ٹکرائی۔ وہ شاید کوئی ڈنڈا یا لکڑی تھی جو راستے میں گری ہوئی تھی۔ بس وہی ایک لمحہ تھا کچھ کر گزرنے کا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے جھک کر وہ ڈنڈا اٹھا لیا اور اسی انداز سے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر پستول والے کے ہاتھ پر پوری قوت سے وہ ڈنڈا رسید کر دیا۔ ایک مکروہ چیخ کے ساتھ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔ میرا دوسرا وار چاقو والے پر تھا جو سکتے کے عالم میں کھڑا ہی رہ گیا تھا۔

اس کا بھی یہی حال ہوا۔ اتنی دیر میں چندا نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پستول اٹھا لیا۔ وہ دونوں چوٹ کھائے ہوئے پلوں کی طرح بلبلا رہے تھے۔ میں نے چندا کے ہاتھ سے پستول لیتے ہوئے اسی کوٹھری کی طرف اشارہ کیا جہاں سے یہ دونوں مجھے نکال کر لائے تھے۔ "چلو، جلدی کرو۔ جلدی کرو۔"

وہ گالیاں بکتے ہوئے اس کوٹھری کی طرف بڑھ گئے۔

ہم نے دونوں کو اس کمرے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی۔ اندر سے دونوں کے بُرا بھلا کہنے اور دھمکیاں دینے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"چلو چندا! جلدی نکلو۔" میں نے چندا کا ہاتھ تھام لیا۔

"اس پستول کا کیا ہوگا؟"

"یہ ہمارے کام آئے گا۔" میں نے کہا۔ "آؤ۔"

ہم گیٹ سے باہر نکل آئے۔ باہر ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی جس میں کوئی ڈرائیور نہیں تھا۔ ہم احتیاطاً اس ٹیکسی سے کتراتے ہوئے ایک طرف نکل آئے۔ ہر طرف گہری

تاریکی تھی۔ اس علاقے کی لائٹ یا تو گئی ہوئی تھی یا یہاں کا یہی حال ہوتا ہوگا۔

ہمارے سامنے کول کتہ کی سڑکیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔

''چندا! یہ شہر میرا دیکھا ہوا نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایسا نہ ہو کہ ہم کہیں سے کہیں پہنچ جائیں۔''

''نہیں، تم اس کی فکر مت کرو۔ میں جانتی ہوں اس شہر کو۔'' اس نے بتایا۔ ''ہم اس وقت نارائن گڑھ کے پاس ہیں جو مین سٹی سے ذرا فاصلے پر ہے۔ میرے ساتھ ساتھ چلتے رہو۔ ہم ایک محفوظ جگہ پہنچ جائیں گے۔''

ہم اس وقت ایک گلی سے گزر رہے تھے۔ اچانک ہر ہر مہادیو کی گونجیلی آوازوں کے ساتھ کچھ لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔

☆☆☆

یہ بہت سے لوگ تھے۔

عورتیں، مرد، بچے، سوانگ رچائے ہوئے۔ پورے بدن پر رنگ کیے ہوئے۔ عجیب بھیانک شکلیں ہو رہی تھیں۔ اس وقت چندا خوف زدہ ہو کر بری طرح مجھ سے چمٹ گئی تھی۔

پھر ایک نعرہ گونجا۔ ''جے ہو کالی ماتا کی۔''

میں نے محسوس کیا کہ چندا بری طرح کانپنے لگی تھی۔ میں پریشان ہو کر ان لوگوں کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس بھیڑ میں سے ایک بوڑھا نکل کر ہمارے سامنے آ گیا۔ وہ ایک خبیث صورت آدمی تھا۔ اس نے صرف ایک لنگوٹی باندھ رکھی تھی۔ اس کے کالے برہنہ جسم پر تیل چمک رہا تھا۔ اور ہاتھ میں ایک چھڑی تھام رکھی تھی۔ اس نے ہم سے مخاطب ہو کر بنگالی میں کچھ کہا۔ جو میری سمجھ میں تو نہیں آسکا لیکن چندا نے اس کا جواب دیا۔ اس نے پھر کچھ کہا اور چندا اس سے باتیں کرتی رہی۔ پھر اس نے مجھے بتایا۔ ''یہ کالی دیوی کے پجاری ہیں۔''

مجھے اتنا معلوم تھا کہ بنگال میں اس دیوی کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس کے سوا میں اور کچھ نہیں جانتا تھا۔

''یہ بول کیا رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ کالی کے مہمان بنا کر۔''

''ان سے کہو کہ ہمیں ضروری کام سے جانا ہے۔''

''نہیں بچو!'' پجاری نے اس بار اردو یا ہندی میں مخاطب کیا تھا۔ ''تم اس طرح تو نہیں جا سکتے۔ یہ ہماری صدیوں پرانی پرم پرا ہے۔ کالی کی پوجا کل ہونے والی ہے۔ ہم ایک دن کالی کے مہمان ڈھونڈنے کے لیے نکلتے ہیں اور جو سب سے پہلے دکھائی دے جائے، ہم اسے اپنا مہمان بنا کر لے جاتے ہیں۔ ہمارا مندر اسی علاقے میں ہے۔ ہم مندر سے نکلے تھے کہ تم لوگ دکھائی دے گئے۔ اب انکار مت کرو۔ ہمارے ساتھ چلو۔ ایک دن ہمارے ساتھ رہو۔ کل جہاں دل چاہے چلے جانا۔''

''دیکھیں مہاراج! ہمیں آج ہر حال میں کول کتہ سے واپس جانا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم ایک رات آپ کے ساتھ رہ جائیں۔ ہمیں اپنے راستے پر جانے دیں۔''

''میں تمہاری بنتی کرتا ہوں نوجوان۔'' پجاری جلدی سے بولا۔ ''ہمیں اپنی پرم پرا نبھانے دو ورنہ کالی کا شراپ ہم سب کو برباد کر کے رکھ دے گا۔''

یہ ایک عجیب صورتِ حال تھی۔ کالی سے میرا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ ہم ایک قید سے نکلے تھے اور دوسری قید میں پھنس گئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

اسی وقت چندا نے سرگوشی کی۔ ''صفدر! ان کا مہمان بن کر ان سے فائدہ اٹھاؤ۔''

''وہ کس طرح؟''

''ان سے کہو کہ وہ ہمیں ہمارے دشمنوں سے بچا کر کول کتہ سے باہر نکال دیں۔''

چندا کی بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ ایک طرح کا سودا ہو سکتا تھا۔ میں نے پجاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مہاراج! مسئلہ یہ ہے کہ ہم دونوں بہت بڑی مصیبت میں گھرے ہوئے ہیں۔ کچھ خطرناک دشمن ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ ہمیں مار دینا چاہتے ہیں۔''

''اطمینان رکھو، کالی کا مہمان بننے کے بعد کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔'' پجاری نے کہا۔ ''کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوگی کہ وہ تم سے کچھ کہہ سکے۔''

''مہاراج! ہم مہمان بننے کو تیار ہیں لیکن ہماری ایک شرط ہے۔''

''چلو شرط بتا دو۔''

''تم کل ہم دونوں کو بہ حفاظت کول کتہ سے باہر نکال دو گے۔'' میں نے کہا۔

''ارے، بس اتنی سی بات۔'' پجاری مسکرا دیا۔ ''میں نے بتایا نا کہ اب کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ اب آ جاؤ ہمارے ساتھ۔''

اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ ان کے ساتھ جانا ہی پڑ گیا۔ وہ سب خوشی کے بلند آہنگ نعرے لگاتے ہوئے ہمارے ساتھ چلنے لگے۔ یہ جلوس ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی راج کمار کا جلوس جا رہا ہو۔ ہماری حیثیت ان سب میں نمایاں تھی۔ وہ سب ہمارے آگے آگے اشلوک پڑھتے ہوئے چل رہے تھے۔

اور میں جیسے خواب دیکھ رہا تھا۔

ایسا خواب جس کا سلسلہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کہاں کہاں سے ہوتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔

صرف دو دن... اور ان دو دنوں میں صدیوں کے واقعات پیش آ گئے تھے۔ ایسے تجربات جن کا تصور بھی محال تھا۔ وہ میرے ساتھ پیش آ رہے تھے۔

بہر حال، ہمارا یہ سفر کچھ دیر جاری رہا۔ پھر ایک گلی کا موڑ کاٹتے ہی انتہائی سیاہ رنگ کی ایک عمارت سامنے آ گئی۔ یہی کالی کا مندر تھا۔

یہ مندر سیاہ رنگ کے پتھروں سے بنایا گیا تھا۔ سیاہ رات کے آنچل میں لپٹا ہوا وہ مندر انتہائی بھیانک اور ہولناک دکھائی دے رہا تھا۔

اس مندر کی کئی سیڑھیاں تھیں۔ وہ بھی سیاہ تھیں اور ان سیڑھیوں پر مٹی کے دیے جل رہے تھے۔ اس روشنی نے اس مندر کی ہولناکی کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔

پجاری نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''آؤ بابو! سنبھل سنبھل کر اوپر آتے جاؤ۔''

کئی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ہم ایک بڑے ہال میں پہنچ گئے۔ یہاں روشنی کا معقول انتظام تھا۔ لیکن جو کچھ میرے سامنے تھا وہ بدن پر لرزہ طاری کرنے کے لیے کافی تھا۔

کالی دیوی کا ایک بہت بڑا بت۔

بہت بھیانک۔ خون آشام۔ ہولناک۔ جس کے کئی ہاتھ تھے۔ ہر ہاتھ میں ایک کٹا ہوا سر جس سے خون ٹپک رہا تھا۔ لال لال آنکھیں اور باہر نکلی ہوئی زبان۔ اس کے قدموں کے پاس ایک آدمی پڑا ہوا تھا جس کے سینے پر کالی کا ایک پیر رکھا ہوا تھا۔

میں نے پٹنہ میں بھی کالی کے کئی بت دیکھے ہیں لیکن یہ بت ان سب سے کہیں زیادہ خوف زدہ کرنے والا تھا۔ بت کے پاس ایک تخت بچھا ہوا تھا جس پر سیاہ رنگ کی چادر

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

پڑی ہوئی تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" پجاری نے اس تخت کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تخت کالی کے مہمانوں کے لیے بچھایا جاتا ہے۔"

اس پجاری کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم دونوں ہی اس تخت پر بیٹھ گئے۔ چندا کالی کی اس مہیب دیوی کو دیکھ دیکھ کر خوفزدہ ہو رہی تھی۔ میں نے تسلی دینے کے لیے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"ہاں اب بتاؤ، کون ہو تم دونوں؟" پجاری نے پوچھا۔ "تمہیں کس سے خطرہ ہے؟"

"مہاراج! تم نے ہمیں کالی کا مہمان بنایا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس لیے مجھے امید ہے کہ ہم نے اگر اپنے بارے میں بتا دیا تو پھر تم ہمارا ساتھ دو گے۔"

"کیوں نہیں؟" پجاری جلدی سے بولا۔ "مجھے اتنا اندازہ ہو گیا ہے کہ تم مسلمان ہو۔"

میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

پجاری مسکرا دیا۔ "حیران کیوں ہو رہے ہو؟ تمہارے بات کا انداز، تمہارا لہجہ اور تمہاری صاف زبان یہ بتا رہی ہے کہ تم مسلمان ہو۔ دیکھو، دل کا حال کہہ دینے سے مصیبت کم ہوتی ہے۔ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے میں تم دونوں کے کام آ جاؤں۔ اسی لیے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو۔"

میں نے چندا کی طرف دیکھا۔ چندا نے گردن ہلا دی۔ یعنی اس نے مجھے اجازت دے دی تھی۔ میں نے پٹنہ سے یہاں تک آنے کا سارا حال بتا دیا کہ میں کس طرح اس گلی میں گیا اور کس طرح چندا نے پناہ دی اور کس طرح ہم وہاں سے نکل بھاگے وغیرہ وغیرہ۔

ہماری کہانی سن کر پجاری خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک طشت لا کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس طشت میں مٹھائیاں تھیں۔ "لو، پہلے کچھ کھا لو۔ پھر تم سے باتیں ہوں گی۔"

ہم صبح سے بھوکے ہی تھے۔ بھاگ دوڑ کے دوران کچھ کھانے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے توانائی کی بھی ضرورت تھی۔ اسی لیے ہم نے کھانا شروع کر دیا۔

"نوجوان!" کچھ دیر بعد پجاری نے مجھے مخاطب کیا۔ "تم نے بہت بڑا کام کر دکھایا ہے۔ تم نے اپنے دل میں محبت کی آگ جلائی ہے۔ اسی آگ کی روشنی نے تمہیں بہادر بنا دیا ہے۔ تمہیں ہمت دے دی ہے اور تم اس بے چاری کو ان ظالموں کے پنجے سے نکال کر لے آئے ہو۔ یہ بہت ظالم اور بے رحم لوگ ہیں۔ ان میں ایک ہندو ہے موہن گپتا اور دوسرا ایک مسلمان ہے کرامت۔ لیکن دونوں نہ تو ہندو ہیں اور نہ ہی مسلمان بلکہ ان دونوں کا دھرم ایک ہے اور وہ ہے پیسا۔"

"جی مہاراج! آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔"

"تم نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا ہے۔ اب پیچھے نہیں ہٹنا۔ تم اس لڑکی کو لے کر کول کتہ سے چلے جاؤ۔ ہم یہاں سے تمہیں باہر نکال دیں گے۔ تم اب بے فکر ہو جاؤ۔ تمہاری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔"

"مہاراج! میں نے کالی دیوی کے پجاریوں کے لیے نہ جانے کیا کیا سن رکھا تھا۔"

"ٹھیک سنا تھا تم نے۔" مہاراج ہنس پڑا۔ "لیکن وہ پہلی باتیں تھیں۔ تمہیں معلوم ہے ہماری کالی دیوی کیا ہے۔ یہ شکتی کی نمائندہ ہے۔ یہ شیوا سے منسلک سمجھی جاتی ہے۔ شیوا جس کا رنگ کالا سمجھا جاتا ہے۔ کالی کا تعلق دوسری دیویوں سے بھی ہے۔ ہم اس دیوی کی مدد سے کالے جادو کا عمل جگاتے ہیں۔"

"مہاراج! میں نے یہ سنا تھا کہ کالی دیوی پر انسانوں کو بھینٹ چڑھایا جاتا ہے؟" چندا نے پوچھا۔

"ہاں، ایک زمانے میں یہ بھی ہوتا تھا۔" پجاری نے کہا۔ "لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ پہلے چوروں اور ڈاکوؤں نے بھی رسم شروع کر دی تھی لیکن مہاراج بیر دل نے آ کر سب بدل دیا۔ بھینٹ اب بھی ہوتی ہے لیکن خنزیروں کی۔ بہرحال، اب تم لوگ آرام کرو۔ تمہیں یہاں کوئی کشٹ نہیں ہو گا۔ کل ہماری پوجا کا جشن ہے۔ اس کے بعد میں خود تمہیں کول کتہ سے باہر لے جاؤں گا۔"

"مہاراج! آپ کا اس طرح ملنا ہماری خوش نصیبی ہے۔" میں نے کہا۔

"پریشان مت ہو۔ یہ سب اوپر والے کا چمتکار ہے۔ وہ تم دونوں کو کسی خاص موقع کے لیے زندہ اور سلامت دیکھنا چاہتا ہے۔ موہن گپتا جیسے دس بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اب تم دونوں آرام کرو۔ صبح ہوتے ہی ہم یہاں سے پوجا کے لیے چل دیں گے اور تم دونوں ہمارے ساتھ رہو گے۔"

"مہاراج! ہمیں کہاں جانا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"کالی گھاٹی۔" اس نے بتایا۔ "یہاں سے بیس پچیس کوس پر ہے۔ ہندوستان بھر کے کالی کے پجاری وہاں جمع ہو گئے ہیں۔"

پجاری اور دوسرے لوگ اس کمرے سے باہر چلے گئے۔ ہم دونوں اس خطرناک کمرے میں ایک خطرناک دیوی کے ساتھ اکیلے رہ گئے تھے۔ باہر سے پجاریوں کے اشلوک پڑھنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کمرے میں چراغ جل رہے تھے جن کی روشنی کالی دیوی کے مجسمے کو عجیب روپ دے رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اچانک چلنا شروع کر دے گی۔ اس کے ان گنت ہاتھوں میں دبے ہوئے نیزے ہمارے سینوں میں اتر جائیں گے اور وہ ہمارا خون چوس لے گی۔

"صفدر۔" چندا بری طرح کانپ رہی تھی۔ "مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"پریشان نہ ہو۔" میں نے تسلی کے لیے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ "اگر ہم ابھی تک سلامت ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا ہمیں زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ ہم نے اتنی بھاگ دوڑ اس لیے نہیں کی کہ ہم کالی کے پجاریوں کے ہاتھوں بے بسی کی موت مر جائیں۔ ہمیں ہر حال میں زندہ رہنا ہے۔"

میں اگرچہ اسے تسلی دے رہا تھا لیکن خود اندر سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ پتا نہیں کیا ہونے والا تھا۔ قسمت میں اور کتنی پریشانیاں لکھی ہوئی تھیں۔

ہم دونوں نے اپنے طور پر بہت کوشش کی کہ ہمیں نیند نہ آئے۔ ہم اس بھیانک کمرے میں سونا نہیں چاہتے تھے لیکن تھکن سے پورا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ بالآخر ہم نہ جانے کس وقت سو گئے۔

گھنٹیوں کی آوازوں سے میری آنکھ کھل گئی۔

چند لمحوں تک سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں۔ یہ کون سی جگہ ہے۔ پھر آہستہ آہستہ سب یاد آتا چلا گیا۔ ہم اسی مندر میں تھے۔ چندا بھی جاگ چکی تھی۔ مندر میں گھنٹیاں بج رہی تھیں اور ہمارے سامنے ایک قوی ہیکل آدمی کھڑا ہوا تھا۔

چندا کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ وہ باقاعدہ کانپ رہی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "صفدر! یہ... یہ موہن گپتا ہیں۔"

☆☆☆

موہن گپتا۔ وہ شخص جس کے خوف سے ہم بھاگتے پھر رہے تھے۔ جس نے ہمیں اپنے آدمیوں کے ذریعے ٹھکانے لگوانے کی کوشش کی تھی۔ جو طوائفوں کا اڈا چلاتا تھا۔ جو اتنا بے رحم تھا کہ چندا اس کے سامنے خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ اس کے خوف نے ہمیں اس حال کو پہنچایا تھا۔

وہ اس وقت اپنی تمام تر مکاری اور بے رحمی کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ میں اسے نہیں جانتا تھا لیکن چندا نے بتا دیا تھا کہ وہی موہن گپتا ہے۔

اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ ہم ایک اور بڑے عذاب کے لیے تیار ہو جاتے اور اس بار شاید موت ہی ہمارا مقدر بنتی۔ اس پجاری نے دھوکا ہی ایسا دیا تھا۔

ایک اطمینان تھا کہ چلتے ہوئے میں نے موہن گپتا کے آدمی کا پستول اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اگر مرنے مارنے کی نوبت آتی تو کم از کم موہن گپتا کو تو ٹھکانے لگا ہی دیتا۔

میں نے آہستہ آہستہ اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بوکھلا کر رہ گیا۔ پستول غائب تھا۔ یہ کاریگری اسی وقت ہوئی ہو گی جب ہم گہری نیند میں تھے۔

موہن گپتا زیرِ لب کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر وہ دو قدم آگے بڑھا اور اسی وقت ایک طرف سے وہ پجاری نمودار ہو گیا۔ وہ بھی ہمارے پاس آ گیا تھا۔ "کیوں بیٹی!" خلافِ توقع پجاری نے انتہائی نرم انداز میں چندا کو مخاطب کیا۔ "یہی ہے نا تمہارا موہن گپتا؟"

"جی مہاراج!" چندا نے اپنی گردن ہلا دی۔

"مجھے معاف کر دو۔" موہن نے اپنے ہاتھ جوڑ لیے۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ تم کالی دیوی کی مہمان بننے والی ہو۔ کالی ماتا نے تمہیں پسند کر لیا ہے۔"

میں حیرت سے اس آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے ہمارے سامنے اپنی گردن جھکا رکھی تھی۔ اس معمے کو پجاری ہی نے حل کیا۔ "میں نے کل تمہیں نہیں بتایا تھا کہ موہن گپتا کالی ماں کا سچا بھگت ہے۔"

بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ سب کالی مائی اور پجاری کا کرشمہ تھا۔ میرے خدا نے کتنی آسانی کے ساتھ یہ مشکل آسان کر دی تھی۔

موہن گپتا ہم سے ایک بار اور معافی مانگ کر باہر چلا گیا۔ پجاری کے کہنے پر ہم مندر سے ملحقہ غسل خانوں کی طرف چلے گئے۔

ہمیں بہت اچھا ناشتا دیا گیا۔ حالات اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے کہ کسی ایک پل کا اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔

www.paksociety.com

صرف دو دن ہوئے تھے چندا سے ملاقات کو لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم دونوں کو ساتھ رہتے ہوئے صدیاں گزر چکی ہوں۔

ناشتے سے فارغ ہوئے تھے کہ پجاری میرے پاس آ گیا۔ ”بابو جی! تمہاری ایک امانت میرے پاس ہے۔“

”کیسی امانت؟“

”تمہارا پستول۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے تمہاری جیب سے اس وقت نکال لیا تھا جب تم سو رہے تھے۔ معاف کرنا۔ دیوی کے کمرے میں ہتھیار لے کر جانا منع ہے۔“

”اوہ۔“ میں نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ ”میں تو کچھ اور سمجھ رہا تھا مہاراج!“

”کیوں پریشان ہوتے ہو..... جب امان دے چکا ہوں تو پھر تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔“

پجاری کمرے سے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد دو لڑکیاں دو بڑی سینیاں لیے داخل ہوئیں جن میں گیروے رنگ کے لباس تھے۔ ایک میرے لیے دوسرا جوڑا چندا کے لیے تھا۔ ان لڑکیوں نے بتایا کہ یہ جوڑے پجاری نے بھیجے ہیں اور ہم دونوں کو یہی پہننا ہے۔

ہم نے وہ جوڑے لیے۔ دونوں لڑکیاں وہیں کھڑی رہیں۔ چندا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”صفدر! ان کی روایت کے مطابق ہمیں یہ لباس ان کے سامنے ہی تبدیل کرنا ہوگا۔“

”کیسی بات کر رہی ہو... ان کے سامنے کیسے ہو سکتا ہے؟“

”دیوی جی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”کالی ماتا کے مہمانوں کو شرم نہیں کرنی چاہیے۔ ہم سب اماوس کی رات میں لباس کے بنا ہی اگنی کے چاروں طرف ناچا کرتے ہیں۔“

”لیکن ہم تو یہ نہیں کر سکتے۔“ میں پریشان ہو کر بولا۔ ”جا کر پجاری مہاراج کو بتا دو۔“

دونوں مایوس ہو کر واپس چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد پجاری کی طرف سے ہمیں اجازت مل گئی کہ ہم جس طرح لباس بدلنا چاہیں بدل لیں۔

لباس کی تبدیلی کے بعد ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ بہت ہی عجیب سفر تھا۔ ہم دونوں کے لیے ایک سجی ہوئی گھوڑا گاڑی لائی گئی تھی۔ اس گاڑی کے آگے ایک بڑا سا تخت تھا جس پر کالی کی ایک بڑی سی مورتی رکھی ہوئی تھی اور بہت سے لوگ اس تخت کو اٹھائے ہوئے چل رہے تھے۔

چاروں طرف کالی دیوی کے پجاری تھے جو دیوی کی شان میں بھجن گاتے ہوئے چل رہے تھے۔ دو رویہ لڑکیاں اور عورتیں بھی تھیں۔ یہ ہماری بگھی پر گیندے کے پھول پھینک رہی تھیں۔ اس بھیڑ میں وہ پجاری دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہی اس جلوس کی قیادت کر رہا ہو۔

ہم بازاروں اور سڑکوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ ہر طرف ”کالی ماتا کی جے“ کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ان کا دیوتا ہو گیا ہوں۔

اچانک کسی کی آواز سنائی دی۔ ”صفدر!“

یہ آواز سڑک کے کنارے سے آئی تھی اور آواز دینے والا میرا وہ دوست تھا جس کے ساتھ میں پٹنہ سے کول کتہ آیا تھا۔

وہ پاگلوں کی طرح مجھے دیکھ دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا کہ میں کہاں غائب ہو گیا تھا اور کالی دیوی کے اس جلوس سے میرا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔

میں نے اشارہ کیا کہ وہ اس جلوس کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دے۔ اس نے میرا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ وہ ہجوم میں شامل ہو کر چلنے لگا۔ راستہ چلتے ہوئے وہ مڑ کر میری طرف بھی دیکھ لیا کرتا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس وقت ہجوم کے درمیان سے ہوتا ہوا میرے پاس پہنچ جاتا۔ لیکن اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔

وہ ساتھ ساتھ چل تو رہا تھا لیکن ہجوم کا حصہ بن کر۔ اس نے یقیناً یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں کسی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ میرے ساتھ بگھی پر چندا کی موجودگی بھی اسے حیران... کر رہی ہوگی۔

یہ جلوس کول کتہ کے مختلف علاقوں سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا۔ پارس ناتھ مندر، مدن پور، بیش تلہ اور نہ جانے کون کون سے علاقے۔

ہر جگہ کالی دیوی کے چاہنے والے موجود تھے جو اس دیوی کے مجسمے اور بگھی پر گل پاشی کر رہے تھے۔ کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد بالآخر ہم کالی گھاٹی پہنچ گئے۔

یہ ایک بہت بڑا علاقہ تھا۔ دریا کے کنارے اور یہاں سے دور بہت دور ہاوڑا کا تاریخی پل بھی دکھائی دے رہا تھا۔

ہمیں بگھی سے اتار کر ایک خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں ہر طرف خیمے لگائے گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس جلوس کے شرکا کو اسی جگہ رات گزارنی ہے اور رات

www.paksociety.com

قدرتی حفاظت، حسن کی بقا اور جوانی کے دوام کیلئے نباتاتی مرکبات سب سے بہترین ہیں (یورپین ہیلتھ کونسل)

دنیا میں قدرتی جڑی بوٹیوں پر تحقیق کرنیوالے ادارے کے نامور اور سینئر ترین ماہرین کی شبانہ روز کاوش کی بدولت سائنسی اصولوں پر تیار کردہ خالص نباتاتی مرکبات، قدرت کی تخلیق اور ہماری تحقیق کا شاندار نتیجہ

اب..... پُر مسرت اور صحت مند زندگی سب کیلئے، سدا کیلئے بھرئیے اپنی بے رنگ زندگی میں قوس قزح کے رنگ اور پھیکی زندگی میں گھولئے خوشیوں کا رس

پھیلائے مسکراہٹوں کی خوشبو اور صحت یابی کے بعد دیجئے ڈھیروں دعائیں ہمارے ماہرین اور کارکنوں کیلئے ہوئی جن کی کاوشوں کی بدولت آپ کو حاصل خوش و خرم زندگی، حسن و صحت کے تمام مسائل کے حل

دویات کی ترسیل اور آن لائن مشورد کی سہولت، رابطے کیلئے ابھی فون کیجئے 0345-8881931

نباتاتی جوہر کستوری کورس ہیرے والا
قیمت کورس 20 دن -/5000 روپے

نباتاتی جوہر کستوری اسپیشل کورس
ماں باپ بننے میں حائل رکاوٹوں کو دور کرتا ہے، جرثوموں کی تعداد میں اضافہ کرتا ہے۔ بڑی عمر اور شوگر میں مبتلا حضرات کے لئے خاص الخاص تحفہ
قیمت مکمل کورس 1 ماہ 10 ہزار روپے

نباتاتی اکسیر موٹاپا کورس
قیمت دوا 1 ماہ -/3000 روپے

نباتاتی اکسیر مفاصل کورس درد اور سوجن سے فوری آرام
قیمت دوا 1 ماہ -/2500 روپے

نباتاتی بریسٹ کورس
اب نسوانی حسن جتنا آپ چاہیں۔
قیمت دوا 1 ماہ -/3000 روپے

نباتاتی نکھار کورس
قیمت دوا 1 ماہ -/3000 روپے

ہوم ڈلیوری کیلئے ابھی رابطہ کریں

ادارہ تحقیق نباتات پاکستان

ملی پلازہ معصوم شاہ روڈ ملتان فون: 32-061-6771931، موبائل: 0345-8881931

بھران کا پوجاپاٹ چلتا رہے گا۔

خیمہ بھی بہت آرام دہ تھا۔ وہاں کوئی تخت تو نہیں تھا لیکن موٹا قالین بچھا ہوا تھا اور ایک طرف طشت میں بہت سے پھل رکھے ہوئے تھے۔

''صفدر بابو! آخر ہمارے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' چندا نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔ حالات جو کچھ دکھا رہے ہیں، ہم دیکھتے رہنے کے لیے مجبور ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم یہ دیکھ لو کہ ابھی تک خدا ہمارا ساتھ دے رہا ہے اور وہ اسی طرح ہماری حفاظت کرتا رہے گا۔''

خیمے کا پردہ ہٹا کر پجاری داخل ہوا۔ اس کے ساتھ میرا دوست ناصر بھی تھا۔ ''بابوجی! تمہارا یہ دوست تمہارے لیے بہت پریشان ہو رہا تھا۔'' پجاری نے کہا۔

''ہاں مہاراج! میں اسی کے ساتھ کول کتہ آیا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''اس نے مجھے راستے میں دیکھ لیا تھا۔ اسی لیے جلوس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا یہاں تک آ گیا ہے۔''

''صفدر! آخر یہ سب کیا ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔ ''یہ کیا چکر ہے؟ تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں بعد میں سناؤں گا۔''

''بابو! اب میری ایک بات سنو۔'' پجاری نے کہا۔ ''تم دونوں اپنے کپڑے اتار کر اپنے پرانے کپڑے بدل لو۔ میں وہ کپڑے ساتھ لے آیا ہوں اور یہاں سے بھاگ لو۔''

''کیا؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہاں سے بھاگ لوں؟''

''ہاں کیونکہ اب شاید میں تم دونوں کی حفاظت نہیں کر سکوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''یہ ساری آگ اسی موہن گپتا کی لگائی ہوئی ہے۔ وہ مجھ سے تو کچھ نہیں کہہ سکا بلکہ میرے سامنے اس نے تم دونوں سے معافی مانگ لی تھی لیکن اس نے کالی کے بچھ اور پجاریوں کو تمہارے خلاف بھڑکا دیا ہے۔''

''میں نہیں سمجھا مہاراج! کیا بھڑکایا ہے اس نے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے یہ کہا ہے کہ تم دونوں کالی دیوی کی مانگ ہو۔'' پجاری نے کہا۔ ''اور اگر تمہیں بھینٹ چڑھا دیا جائے تو کالی بہت خوش ہوگی۔''

''کیا؟'' میری آنکھوں کے آگے اندھیرے آنے لگے۔ ''مہاراج! یہ کیا کہہ رہے ہو۔ تم نے تو یہ بتایا تھا کہ تمہارے یہاں سے یہ رسم ختم ہو چکی ہے۔''

''ہاں بیٹا! رسم ختم ہو چکی تھی لیکن اس کم بخت موہن گپتا نے دوسروں کو بھینٹ کی یہ رسم یاد دلا دی ہے۔ میں نے تمہیں پناہ دی تھی۔ وہ براہِ راست تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اسی لیے اس نے یہ خطرناک چال چلی ہے کہ تم دونوں کو کالی کے نام پر بھینٹ چڑھا دیا جائے۔''

''مہاراج! اب کیا ہوگا؟'' چندا نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''بھاگ لو یہاں سے۔'' پجاری نے کہا۔ ''معاف کرنا، میں تم دونوں کی حفاظت نہیں کر سکوں گا۔ میں خود مجبور ہو گیا ہوں۔'' پھر اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ ''یہ رکھ لو۔ یہ بیس ہزار روپے ہیں۔ تمہارے کام آئیں گے۔''

''مہاراج!'' میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس بوڑھے نے وہ نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیے۔ ''دیر مت کرو، اس سے پہلے کہ تم پر پہرے لگ جائیں۔ تم پچھلی طرف سے بھاگ لو۔''

میرا دوست ناصر بری طرح کانپ رہا تھا۔ ''صفدر! مہاراج کی بات مانو... نکلو، ایسا نہ ہو کہ ہم پھنس جائیں۔''

''مہاراج! ایک بات بتائیں، ہمارے جانے کے بعد آپ کا کیا ہوگا؟ کیا آپ پر الزام نہیں آئے گا کہ آپ نے ہمیں بھگا دیا ہے؟''

''الزام تو آئے گا لیکن میں کسی نہ کسی طرح سنبھال لوں گا۔'' پجاری نے کہا۔ ''بس تم لوگ نکل لو۔ بھگوان تمہاری رکھشا کرے گا۔''

ہم کپڑے بھی تبدیل نہیں کر سکے۔ پجاری نے خود ہی آگے بڑھ کر خیمے کی پچھلی دیوار ہٹا دی تھی۔ ''جاؤ اس طرف سے نکل جاؤ۔ اس طرف دور تک میدان ہے۔ میدان سے نکل کر ہگلی کے کنارے پہنچ جاؤ گے۔ وہاں سے اسٹیمر پکڑ کر اگلے گھاٹ تک چلے جانا۔ پھر وہاں سے کول کتہ کی میٹرو مل جائے گی۔ وہاں سے ٹکٹ کٹا کر جہاں جانا چاہو چلے جانا۔''

اور ہم تینوں خیمے کی پچھلی دیوار سے باہر نکل گئے۔ اس طرف واقعی دور تک کانٹے دار جھاڑیوں سے بھرا ہوا میدان تھا۔ ہم تینوں اپنی جانیں بچانے کے لیے بے تحاشا دوڑتے چلے جا رہے تھے۔

نہ جانے ہماری قسمت میں کیا لکھا تھا۔ بے چارہ ناصر تو ابھی ابھی آ کر پھنسا تھا۔ اگر اسے ان حالات کا علم

ہوتا تو شاید مجھے آواز دے کر اپنی طرف متوجہ ہی نہیں کرتا لیکن اب وہ بھی ہمارے ساتھ اس عذاب سے گزر رہا تھا۔

ہم اس میدان میں دوڑتے چلے گئے کیونکہ ہمیں اندازہ تھا کہ جیسے ہی ہمارے غائب ہونے کا علم ہوگا۔ ہماری تلاش شروع کر دی جائے گی۔

ہم کانٹے دار جھاڑیوں سے الجھ رہے تھے، زخمی ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود دوڑتے رہنے پر مجبور تھے۔ کسی وقت بھی کوئی اور بلا ہم پر نازل ہو سکتی تھی۔

ہم دوڑتے رہے۔ بے چاری چندا بری طرح تھک چکی تھی۔ اس سے اب چلا بھی نہیں جا رہا تھا لیکن جان کے خوف سے ہمارے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔

ہم بہت دیر تک دوڑنے کے بعد بالآخر ایک گھاٹ تک پہنچ ہی گئے جہاں ایک چھوٹا سا اسٹیمر بھی کھڑا ہوا تھا۔

ہمارے پاس رقم موجود تھی۔ ہم ٹکٹ لے کر اسٹیمر میں بیٹھ گئے اور ایک انجانے سے خوف کی طرف ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

یہاں اتنا موقع مل گیا کہ میں نے اپنے دوست ناصر کو اپنی ساری کہانی سنا دی۔ وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھتا رہ گیا۔ ''میرے خدا! تمہارے ساتھ دو دن کے اندر یہ سب کچھ ہو گیا۔''

''ہاں بھائی اور مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے کئی برس گزار دیے ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اور اب بھی ڈر ہی لگ رہا ہے کہ نہ جانے کیا ہو جائے۔''

اسی وقت چندا بول پڑی۔ ''صفدر بابو! میں تم سے ایک بات کہوں؟''

''ضرور کہو۔''

''تم میرا خیال چھوڑ دو۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے یہ جان لیا ہے کہ یہ ساری مصیبتیں میری وجہ سے آ رہی ہیں۔ تم مجھے جہاں لے کر جاؤ گے، تمہارے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوتا رہے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ مجھے اپنے راستے پر جانے دو۔''

''کیسی بات کر رہی ہو چندا! اب میرے اور تمہارے راستے دو نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''جب ایک ساتھ نکلے ہیں تو پھر ایک ساتھ ہی رہیں گے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

''صفدر! یہ بتاؤ کہ تم نے سوچا کیا ہے، کہاں جاؤ گے؟ پٹنہ یا کہیں اور؟''

میرے جواب دینے سے پہلے چندا بول پڑی۔ ''ہم لکھنؤ جائیں گے جہاں میرے گھر والے ہیں۔''

''کیا تمہارے گھر والے تمہیں قبول کر لیں گے؟''

''نہیں۔'' چندا نے اپنی گردن ہلا دی۔ ''اب مجھے کوئی قبول نہیں کرے گا۔ میں اب اپنے سماج کے لیے اچھوت ہو چکی ہوں۔''

''تو پھر تم لکھنؤ کیوں جا رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں میری ایک دوست مالتی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''کوئی اور قبول کرے یا نہ کرے لیکن مالتی ضرور قبول کر لے گی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم مالتی کے ساتھ رہیں گے؟''

''نہیں، ہمیں وہاں بھی نہیں رہنا۔'' اس نے کہا۔ ''مالتی کی مدد سے ہم کسی ایسی جگہ ضرور آباد ہو سکتے ہیں جہاں موہن گپتا یا کالی کے ماننے والوں کا خوف نہ ہو... کسی دور کی جگہ۔''

''تو پھر پاکستان کیوں نہ چلیں؟'' میں بے ساختہ بول پڑا۔

''کیوں، پاکستان میں کیا ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''میرے بہت سے رشتے دار ہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''اور میں نے سنا ہے کہ وہاں وہ بہت اچھے عہدوں پر ہیں۔ وہ مجھے سیٹل ہونے میں بہت مدد دیں گے۔''

''لیکن پاکستان جانا اتنا آسان نہیں ہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''پاسپورٹ، ویزا پھر وہاں کی شہریت۔ یہ سب کیسے حاصل کرو گے؟''

''دیکھو دوست! اب میں نے زندگی کے تجرباتی راستوں پر اپنے قدم اٹھا دیے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اگلا موڑ کیسا ہوگا یا وہاں کیسے خطرات پوشیدہ ہوں گے۔ اسی لیے کوشش کر لینے دو۔ اور ایک بات کا مجھے ابھی تک نہ جانے کیوں یہ یقین سا ہے کہ قدرت نے چندا کو یونہی نہیں ملوایا، کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہے۔ تم نے خود اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہم کیسے کیسے مرحلوں سے گزرتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں۔ قدرت نے قدم قدم پر مشکلیں آسان کی ہیں۔ آخر کیوں؟ کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ قدرت ہم سے کوئی کام لینا چاہتی ہو جو فی الحال ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''پھر پاکستان جانے کا خیال تمہارے ذہن میں کیسے آیا؟'' ناصر نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔ ''بس جیسے کسی نے

www.paksociety.com

کان میں سرگوشی کی ہو کہ یہاں مت رہو، پاکستان جاؤ۔"

"اور آپ کیا کہتی ہیں؟" ناصر نے چندا سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ میں نے تو خود کو صفدر صاحب سے باندھ لیا ہے۔ یہ جہاں لے جائیں گے، میں ان کے ساتھ رہوں گی۔"

"اور اب میرا ابھی ایک مشورہ سن لو۔" ناصر نے کہا۔ "تم ڈائریکٹ پاکستان جانے کی بات مت کرو بلکہ پٹنہ چلو۔ وہاں تمہارا گھر ہے۔ کچھ دن وہاں رہ کر حالات کا جائزہ لو۔ اس دوران تم چندا کو مسلمان کر کے ان سے شادی کر سکتے ہو بلکہ مسلمان کرنے کے لیے پٹنہ پہنچنے کی بھی شرط نہیں ہے۔ یہ یہاں اسی وقت کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو سکتی ہیں۔ پٹنہ پہنچ کر تم ان سے سیدھی سیدھی شادی کر لینا۔ وہاں ان کو کوئی نہیں جانتا۔ اس لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" میرے کچھ بولنے سے پہلے چندا بول پڑی۔ "میں اسی وقت مسلمان ہونے کو تیار ہوں۔"

ہم اس وقت اسٹیمر کے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس لیے ہماری باتیں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ عرشے پر طرح طرح کے لوگ بھرے ہوئے تھے۔ ہندو، مسلمان، بنگالی، بہاری، بھانت بھانت کی بولیاں، طرح طرح کے لباس، لیکن سب اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ کسی کو کیا معلوم ہو سکتا تھا کہ جہاز کے اس گوشے میں بیٹھے ہوئے دو مرد اور عورت کیا کر رہے ہیں۔

"چلیں ناصر بھائی! مجھے کلمہ پڑھوا دیں۔" چندا نے کہا۔

ناصر نے چندا کو کلمہ پڑھوا دیا۔ اس کے ساتھ ہی چندا مسلمان ہو گئی... اور اب میں زندگی کے ہر موڑ پر اسے اپنے ساتھ رکھ سکتا تھا۔ وہ اب مسلمان تھی۔

"بہن، بہت مبارک ہو۔" ناصر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بہن!" چندا رونے لگی۔ "کیا میں کسی کی بہن ہونے کے قابل رہ گئی ہوں؟ میں تو ایک غلیظ عورت ہوں جسے صفدر بابو گندگی سے اٹھا کر اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔"

"یہ سب پرانی باتیں ہیں۔" ناصر نے کہا۔ "جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ اب تمہارے سامنے ایک نئی زندگی ہے اور کلمہ پڑھ لینے کے بعد تم کسی بھی مسلمان لڑکی کی طرح صاف اور پاک ہو گئی ہو۔"

میں نے چندا کا ہاتھ تھام لیا۔ "بے وقوف! روتے نہیں ہیں، یہ بہت خوشی کا موقع ہے۔"

☆☆☆

ایک بار پھر میرا اپنا شہر میرے سامنے تھا۔

کچھ دن پہلے ہی میں یہاں سے عام سی حالت میں سیر کی غرض سے کول کتہ گیا تھا لیکن واپسی کتنے بڑے انقلاب اور کتنے تجربات کے ساتھ ہوئی تھی۔ کیسے کیسے مراحل سے گزرتا رہا تھا۔ چار پانچ دنوں میں چار پانچ صدیاں بیت گئی تھیں۔

پٹنہ آتے ہی ناصر نے ہماری شادی کا بندوبست کر دیا۔ وہ بے چارہ ہمارے بہت کام آ رہا تھا۔ حاجی گنج کی ایک مسجد کے امام صاحب نے ہمارا نکاح پڑھوا دیا۔

چندا اب سائرہ ہو گئی تھی۔ سائرہ صفدر۔ اب ہم دونوں کے سامنے زندگی کے نئے رنگ تھے۔ میں نے اپنے مکان میں ضرورت کی بہت سی چیزیں خرید کر رکھ لیں۔ سائرہ کو گھر داری کا بھی بہت سلیقہ تھا۔ اس نے بڑے اعتماد اور سلیقے کے ساتھ گھر چلانا شروع کر دیا۔

جیسے سب کچھ پہلے ہی کی طرح ہو گیا تھا۔

لیکن ابھی حادثے ہمارے انتظار میں تھے۔ ابھی بہت کچھ ہونا باقی تھا۔ اس دوران میں نے اپنی زندگی میں اتنی خوشیاں حاصل کر لیں کہ اب تک جتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں، ان کا تدارک بھی ہو گیا تھا۔

سائرہ نے مجھے بے پناہ محبت دی۔ اس دنیا میں ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے تھے۔ میرا تو خیر ویسے بھی کوئی نہیں تھا اور سائرہ کے جو رشتے دار وغیرہ تھے، وہ اس کے لیے گویا مر چکے تھے۔

وہ لکھنؤ میں تھے اور لکھنؤ، پٹنہ سے بہت دور تھا۔ میں نے اپنی زندگی کے معاملات دوبارہ شروع کر دیے تھے۔ سائرہ ہی کے کہنے پر اپنی یونیورسٹی جوائن کر لی تھی۔

سائرہ دن بھر گھر میں اکیلی ہوا کرتی اور ویسے بھی ہمارا گھر مسلمانوں کے محلے میں تھا۔ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اس لیے ایک طرح کی بے فکری بھی تھی۔

یونیورسٹی گھر کے قریب ہی تھی، اسی لیے میں کھانے کے وقت بھی گھر آ جایا کرتا۔ سائرہ مزے مزے کے کھانے بنا کر رکھا کرتی۔

بنگال میں رہ کر اس نے بنگالی کھانے سیکھ لیے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں لذت بھی بہت تھی یا پھر اس کی محبت لذت پیدا کر دیا کرتی۔

اور ایک دوپہر جب میں یونیورسٹی سے واپس آیا تو

سائرہ غائب ہو چکی تھی۔

☆☆☆

بہت دیر تک اس گمان میں رہا کہ وہ بازار گئی ہوگی یا پڑوس کے کسی گھر میں چلی گئی ہوگی لیکن جب شام تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تو میں نے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر معلوم کرنا شروع کر دیا۔ پڑوس کے ایک گھر سے معلوم ہوا کہ سائرہ دوپہر کے وقت کسی آدمی کے ساتھ گھر سے نکلی تھی۔

وہ آدمی کون ہو سکتا تھا؟ شاید ناصر! وہی ہو سکتا تھا۔ اس شہر میں سائرہ کی جان پہچان تو کسی سے نہیں تھی۔

میں پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا ناصر کے پاس پہنچ گیا۔ ناصر بھی یہ سن کر دنگ رہ گیا۔ اس بے چارے کو بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔

میں نے بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا۔ کون اس کو لے گیا تھا؟ کیا موہن گپتا یا اس کا کوئی آدمی یا کالی کا پجاری؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ "ناصر! بتاؤ میں اسے کہاں تلاش کروں؟ کس کے پاس جاؤں؟"

"پریشان مت ہو۔ وہ مل جائے گی۔"

"کہاں سے ملے گی؟ وہ تو کسی کے ساتھ گئی ہے۔"

"یہی تو حیرانی کی بات ہے کہ وہ کس کے ساتھ گئی ہوں گی۔" ناصر نے کہا۔ "یہ تو طے ہے کہ انہیں زبردستی نہیں لے جایا گیا بلکہ اپنی مرضی سے گئی ہیں۔ پڑوسیوں کا کہنا ہے کہ وہ اس آدمی کے ساتھ پیدل ہی نکلی تھیں۔ اگر کوئی زبردستی لے جا رہا تھا تو انہیں احتجاج کرنا چاہیے تھا لیکن انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔"

یہ واقعی ایک معما تھا۔ سمجھ میں نہ آنے والا۔ ایسا کون تھا جس کے ساتھ وہ اتنی ہنسی خوشی چلی گئی تھی۔ میں کسی طور بھی اس کے کردار پر شبہ نہیں کر سکتا تھا۔

"ناصر! لوگ چاہے کچھ بھی کہتے رہیں، حالات چاہے کوئی تصویر دکھائیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ سائرہ کے ساتھ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ یا تو وہ زبردستی گئی ہے یا دھوکے سے لے جائی گئی ہے۔"

"لیکن کہاں؟"

"یا تو وہیں، جہاں سے وہ لائی گئی تھی یا پھر کہیں اور... کسی اور جگہ۔ میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کچھ نہیں جانتا ہوں میں۔"

"میرے دوست! ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ اسے کہاں کہاں تلاش کرو گے؟" ناصر نے کہا۔ "دو چار دن ٹھہر جاؤ۔ ہو سکتا ہے کوئی سراغ مل ہی جائے۔"

دو چار دنوں میں تو اس کے ساتھ بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا اسی لیے خاموش رہا۔ میں نے سائرہ کے بغیر بہت تکلیف دہ رات گزاری۔

اب احساس ہو رہا تھا کہ وہ میری زندگی کا کتنا لازمی حصہ بن کر رہ گئی ہے۔ وہ میرا سب کچھ ہو گئی تھی اور اب میرا سب کچھ چلا گیا تھا۔

بہت ہی بے قراری میں رات گزری۔ میں ایک لمحے کے لیے نہیں سو سکا پھر فجر کے وقت تھوڑی دیر کے لیے نیند آ ہی گئی۔

میری آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک سے کھلی۔ شاید وہ آ گئی تھی۔ میں دوڑتا ہوا دروازے پر پہنچا، ناصر کھڑا ہوا تھا۔ "کیا ہوا ناصر... کوئی خبر لے کر آئے ہو؟ کچھ پتا چلا اس کا؟"

"ہاں، تھوڑا سا تو سراغ ملا ہے۔" ناصر نے بتایا۔

"بتاؤ، کیا سراغ ملا ہے... کہاں ہے وہ؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔" ناصر نے بتایا۔ "لیکن وہ رکشے والا مل گیا ہے جو ان دونوں کو اسٹیشن تک پہنچانے گیا تھا۔"

"ان دونوں کو؟"

"ہاں، وہ آدمی بھی ان کے ساتھ تھا۔" ناصر نے بتایا۔ "رکشے والے کا یہ کہنا ہے کہ وہ دونوں اسٹیشن کے اندر داخل ہوئے تھے۔ اس کے بعد کا وہ نہیں بتا سکتا۔"

"آخر کیوں، وہ کسی غیر کے ساتھ کیوں چلی گئی؟"

"بچوں جیسی باتیں مت کرو جو شخص کسی عورت کو اتنی آسانی سے اپنے ساتھ بٹھا کر لے جائے، وہ اس کے لیے غیر تو نہیں ہو سکتا۔"

"تو پھر کون تھا وہ؟"

"اب یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔" اس بار ناصر کے لہجے میں بیزاری تھی۔ "جس عورت کا پچھلا ریکارڈ ایسا ہو، اس کے سیکڑوں جاننے والے ہو سکتے ہیں۔"

"خاموش ہو جاؤ ناصر... پلیز۔" میں غصے سے بولا۔ "میں اس کے خلاف کچھ نہیں سننا چاہتا۔ وہ پاک اور صاف ہے۔ اسے تم دنیا کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہو۔ میری نگاہوں سے نہیں دیکھ رہے۔"

"تمہاری مرضی، تم اس کے لیے پاگل ہوتے رہو۔"

"تم مجھے اس رکشے والے سے ملوا دو جو انہیں اسٹیشن تک لے گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"آؤ میرے ساتھ، میں ملوا دیتا ہوں۔"

رکشے والا اپنے اڈے ہی پر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سے درجنوں سوالات کر ڈالے۔ اس کا یہی کہنا تھا کہ کسی طرح بھی یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ عورت اس مرد کے ساتھ زبردستی جا رہی ہو۔ دونوں ہنس بول رہے تھے۔

"کوئی خاص بات... کوئی ایسی بات جو تمہیں یاد رہ گئی ہو؟" میں نے پوچھا۔

رکشے والے نے اپنے ذہن پر زور دینے کے بعد کہا۔ "ہاں، عورت نے ایک بار اس آدمی سے کسی مالتی کی خیریت پوچھی تھی۔ جس کے جواب میں اس آدمی نے کچھ کہا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔"

مالتی... مالتی... میں یہ نام سن چکا تھا۔ شاید سائرہ ہی نے یہ نام لیا تھا لیکن کس حوالے سے لیا تھا۔ اچانک یاد آ گیا کہ مالتی اس کی سہیلی کا نام تھا جو لکھنؤ میں رہتی تھی اور خود سائرہ بھی وہیں کی رہنے والی تھی۔ تو کیا سائرہ کو لکھنؤ لے جایا گیا ہے؟ لیکن کون لے گیا ہوگا؟

مالتی نام نے میرے ذہن کے دریچے کھول دیے۔ اس کے علاوہ کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس وقت لکھنؤ میں ہوگی۔

"ناصر! میں لکھنؤ جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرا دل کہہ رہا ہے کہ سائرہ لکھنؤ میں ہوگی۔"

"یہ کیسے اندازہ لگایا تم نے؟"

"سائرہ نے ایک بار مجھ سے اپنی سہیلی مالتی کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ لکھنؤ ہی میں رہتی ہے۔ سائرہ نے اس آدمی سے مالتی کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود وہ آدمی بھی لکھنؤ ہی کا رہنے والا ہے اسی لیے بہتر ہے کہ میں لکھنؤ جا کر اسے تلاش کروں۔"

"دیکھو، لکھنؤ تمہارے لیے ایک اجنبی شہر ہوگا۔"

"تو کیا ہوا؟ کول کتہ بھی تو اجنبی شہر تھا۔" میں ایک پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔

"وہاں رہو گے کہاں؟"

"بہت بڑا شہر ہے، ہوٹل تو مل ہی جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اور تھوڑے بہت پیسے بھی ہیں میرے پاس۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

"کب جاؤ گے؟"

"ابھی اور اسی وقت۔ میرے پاس اب اتنا وقت نہیں رہ گیا ہے۔"

"جاؤ، خدا حافظ۔"

میں فوری طور پر گھر واپس آیا، وہ گھر جہاں کل تک سائرہ تھی، اب اس کے بغیر ویران ہو گیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی کچھ ضروری چیزیں ایک سوٹ کیس میں بھریں اور اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گیا۔

لکھنؤ جانے والی ٹرین شام سات بجے تھی اور ابھی صرف تین بجے تھے۔ اس کے باوجود میں واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے انتظار کرنا تھا۔ وہیں اس پلیٹ فارم پر یا اسٹیشن کے باہر... کہیں بھی۔ میرے قدم واپسی کے لیے نہیں اٹھے تھے۔

میں چائے پینے کے لیے اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ صرف چائے کی خواہش ہو رہی تھی۔ بھوک کا احساس تو ختم ہی ہو گیا تھا۔

باہر بھی مسلمانوں کا ایک ہوٹل ہے جہاں کے سموسے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میں نے اس ہوٹل کی راہ لی۔ اس وقت میں بے قراری کی انتہا پر تھا۔ کاش وقت سمٹ جاتا اور ابھی سات بج جاتے۔

میں لکھنؤ پہلی بار گیا تھا۔

راستے میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ ویسے ٹرین کے ڈبے میں ایک شور برپا تھا۔ قیامت تھی۔ لوگ چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کو اپنے دکھ سکھ سنا رہے تھے لیکن میری دنیا کچھ اور تھی۔ میری سوچ میں کچھ اور تھا۔ راستہ کیسا تھا؟ کیا تھا؟ وہاں پہنچ کر کیا ہونے والا تھا؟ مجھے ان سب باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میرے لیے تو صرف سائرہ تھی۔ اس کا دھیان تھا۔

میری دنیا اسی پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔

مجھے تو یہ بھی اندازہ نہیں ہوا کہ یہ سفر کتنی دیر کا تھا۔ میں ٹرین رکنے کے بعد میں اپنا سوٹ کیس سنبھال کر... ... ریلوے اسٹیشن سے باہر آ گیا۔

یہاں بھی ایک ہجوم تھا۔ لوگ جا رہے تھے۔ بھانت بھانت کی بولیاں، خوانچے والوں کی آواز .... ریلوے اسٹیشن کی عمارت قدیم فنِ تعمیر کا شاہکار ہے۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں جاؤں؟

اتنے بڑے شہر میں بغیر پتے کے کسی کو تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ میں نے ایک رکشے والے کو حضرت گنج چلنے کے لیے کہا اور راستے بھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آتی جاتی لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھتا رہا کہ شاید سائرہ کہیں دکھائی دے جائے۔

حضرت گنج میں دہلی دربار جیسا ایک ہوٹل مل گیا جہاں میں سائرہ کے ملنے تک قیام کر سکتا تھا۔

ایک چھوٹا سا کمرا تھا لیکن ضرورت کی چیزیں موجود تھیں۔ شام ہونے کو تھی لیکن شامِ اودھ بھی میرا دل نہیں بہلا سکی تھی۔

شام کی چائے پی کر میں ہوٹل سے باہر آ گیا۔ کہاں جاتا؟ اپنی تلاش کی مہم کا آغاز کہاں سے کرتا؟ اتنا بڑا شہر نگاہوں کے سامنے تھا۔

سوچتا رہا کہ سائرہ نے اپنے گھر والوں کے بارے میں اور مالتی کے بارے میں کیا بتایا تھا۔ یہ لوگ کہاں رہتے تھے۔

یاد آ گیا کہ سائرہ نے حضرت گنج ہی کا نام لیا تھا۔ وہی جگہ جہاں میں اس وقت موجود تھا۔ یہ یاد آتے ہی ایک خوش گوار سا احساس ہوا۔

لیکن یہ تو بہت بڑا علاقہ تھا۔ میں یہاں کس سے اس کے بارے میں معلوم کرتا۔ اس نے یہ بتایا تھا کہ وہ کالج کی طالبہ تھی۔ کالج کون سا تھا؟ لکھنؤ میں تو درجنوں کالج ہوں گے۔

میں اپنی یادداشت پر زور دیتا رہا لیکن کالج یاد نہیں آیا۔ حضرت گنج میں بہت دیر تک گھومنے پھرنے کے بعد میں ہوٹل واپس آ گیا۔

رات کا کھانا کھاتے ہوئے اچانک کالج کا نام بھی یاد آ گیا۔ لا مارٹینئر کالج۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ لکھنؤ کا بہت بڑا کالج ہے۔

رات ہو چکی تھی۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ اسی وقت کالج کی طرف نکل جاؤں۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور میں کالج کی طرف چل پڑا۔

قدیم طرز کی یہ ایک شاندار عمارت تھی۔ اس کے اردگرد کئی پارکس تھے اور احساس ہو رہا تھا کہ اس کالج میں اونچے طبقے کی لڑکیاں ہی پڑھتی ہوں گی۔

سائرہ اس زمانے میں چندا تھی، جب وہ یہاں آیا کرتی ہوگی۔ اپنی دوستوں کے درمیان ہنستی مسکراتی ہوئی۔ پھر اس کی بدقسمتی اسے کسی مکار اور دھوکے باز شخص کے پاس لے گئی اور وہ اپنے گھر سے فرار ہو گئی۔ کاش اس نے ایسا نہیں کیا ہوتا۔

لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ یہ سب تو اس کی تقدیر میں لکھا جا چکا تھا۔ اگر اس کے ساتھ ایسا حادثہ نہیں ہوتا تو پھر مجھ سے ملاقات کہاں ہو پاتی۔

پھر جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے، وہ سب کیسے ہوتا۔ ہم تو شطرنج کے مہرے تھے جن کو نادیدہ ہاتھ اپنی مرضی کے مطابق آگے پیچھے کرتے جا رہے تھے۔

میں لا مارٹینئر کے گیٹ پر کھڑا ہو گیا۔ میں کالج کی کلاسز ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد چھٹی ہو گئی۔ لڑکے اور لڑکیاں باہر نکلنے لگے۔

ہنستے مسکراتے ہوئے چہرے۔ کبھی سائرہ بھی ان لڑکیوں کے درمیان ہوتی ہوگی۔ میں بہت دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ پھر ہمت کر کے گیٹ تک پہنچ گیا۔ کالج کے گیٹ پر ایک گورکھا کھڑا ہوا تھا۔ "کدھر جاتا بھائی؟"

"پرنسپل کے پاس۔"

اس نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ایک طالب علم سے پرنسپل کا دفتر دریافت کیا اور پرنسپل کے پاس پہنچ گیا۔ پرنسپل ایک ادھیڑ عمر عورت تھی جس کے نام کی تختی بھی لگی تھی۔ کوشیلا سری واستو۔

میں اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں بھائی، کیا کام ہے مجھ سے؟" اس نے پوچھا۔

"میڈم، پلیز! آپ مجھے صرف دس منٹ دے دیں۔ آپ سے اطمینان کے ساتھ بات کرنی ہے اور یہ بہت ضروری ہے۔"

"چلو بیٹھ جاؤ۔" اس نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں اس کا شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔ "ہاں، اب بتاؤ کیا کام ہے؟"

"میڈم! آپ مجھے اجازت دیں کہ میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں اور جو کچھ کہنا ہو بے جھجک کہہ دوں۔" میں نے کہا۔

"ہاں، اجازت تو دے دی ہے، کہو کیا کہنا ہے؟"

"میڈم! میرا تعلق پٹنہ بہار سے ہے۔" میں نے بتایا۔ "صفدر نام ہے میرا۔" پھر میں نے اسے بتا دیا کہ میں کس طرح کول کتہ کی ایک گلی میں پھنس گیا تھا اور چندا نام کی ایک لڑکی نے مدد کی تھی اور میں کن حالات میں اسے وہاں سے نکال کر پٹنہ لے آیا تھا۔ ہم نے شادی کر لی تھی اور اب وہ اچانک غائب ہو چکی ہے۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن تمہاری اس کہانی کا ہم سے کیا تعلق ہے؟"

"میڈم! وہ لڑکی آپ ہی کے کالج میں پڑھا کرتی تھی۔" میں نے بتایا۔

"میرے کالج میں۔" پرنسپل سنبھل کر بیٹھ گئی۔ "کیا نام ہے اس لڑکی کا؟"

"میڈم! اس کا نام چندا ہے۔" میں نے بتایا۔

www.paksociety.com

"چندا۔" وہ سوچ میں پڑ گئی پھر اسے یاد آ گیا۔ "ہاں یاد آ گیا۔ اس نام کی ایک لڑکی ہمارے یہاں ہوا کرتی تھی جو غائب ہو گئی تھی۔ ایک منٹ۔" اس نے انٹرکام پر کسی کو مخاطب کیا۔ "مسز بمل کو بھیج دینا۔"

کچھ دیر بعد ایک خاتون کمرے میں داخل ہوئی جس نے ساڑی باندھ رکھی تھی۔ "جی میڈم!" اس نے مجھ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے کے بعد پرنسپل سے پوچھا۔

"مسز بمل! آپ کو یاد ہوگا ہمارے کالج میں چندا نام کی ایک لڑکی پڑھا کرتی تھی جو غائب ہو گئی تھی۔"

"یس میڈم! وہ تو ہمارے ہی محلے میں رہتی ہے۔" مسز بمل نے بتایا۔

"رہتی تھی، کہیں۔"

"نہیں میڈم! رہتی ہے کیونکہ کچھ دن ہوئے، وہ واپس آ گئی ہے۔ اس کا بھائی اسے واپس لے آیا ہے۔"

"اوہ۔" میڈم نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تو آپ اس کو جانتی ہیں؟"

"جی ہاں میڈم۔" مسز بمل نے کہا۔ "پرسوں اس کا بیاہ بھی ہونے والا ہے۔"

"میرے خدا!" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ میری بیوی ہے۔ اس کے ساتھ زبردستی نہیں ہو سکتی، وہ اپنی مرضی سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"آخر بات کیا ہے اور تم کون ہو؟" مسز بمل نے پوچھا۔

"یہ بہت الجھا ہوا معاملہ ہے مسز بمل۔" میڈم نے کہا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ "آپ مسز بمل کو ساری اسٹوری سنا دیں۔ اس کے بعد سوچتے ہیں کیا کیا جائے۔"

میں نے ایک بار پھر پوری داستان دہرا دی۔ مسز بمل بھی سوچ میں پڑ گئیں۔ "یہ تو واقعی بہت الجھی ہوئی کہانی ہے اور بہت سیریس معاملہ ہے۔"

"پلیز! آپ میری مدد کریں۔" میں نے مسز بمل سے کہا۔ "سائرہ کو دھوکے سے لایا گیا ہے۔ اس کے بھائی نے کسی طرح پٹنہ میں اسے دیکھ لیا ہوگا اور وہ اسے دھوکا دے کر یہاں لے آیا اور اب زبردستی اس کی شادی کی جا رہی ہے۔"

"نوجوان! اس وقت جوش سے نہیں ہوش سے کام لو۔" میڈم نے کہا۔ "تمہارا معاملہ اس لیے الجھا ہوا ہے کہ تم مسلمان ہو اور وہ لڑکی ہندو ہے۔ ویسے تو آج کل ہندوستان میں اس قسم کی شادیاں ہونے لگی ہیں لیکن رکاوٹیں ڈالنے والے تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔"

"میڈم! میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح سائرہ تک یہ پیغام پہنچ جائے کہ میں لکھنؤ ہی میں ہوں اور اس سے یہ معلوم کر لیا جائے کہ کیا یہ شادی اس کی مرضی سے ہو رہی ہے۔ بس میں صرف یہ چاہتا ہوں۔"

"مسز بمل! یہ دو دلوں کے درمیان پیار کا معاملہ ہے۔" میڈم نے مسز بمل سے کہا۔ "کیا آپ یہ کام کر سکیں گی؟"

"ہاں، میں ضرور کروں گی۔" مسز بمل نے کہا۔ "میرا اس گھر میں آنا جانا بھی ہے اور میں چندا کو پڑھا بھی چکی ہوں۔"

"مسز بمل! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ وہ میرے لیے سب کچھ ہے۔ میری زندگی ہے۔ میں اسے پاگلوں کی طرح تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ پلیز آپ میری مدد کریں۔"

"فرض کرو، اگر اس نے یہ کہہ دیا کہ وہ اپنی مرضی سے یہ شادی کر رہی ہے تو پھر تم کیا کرو گے؟"

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا میڈم! کبھی نہیں... اور اگر ایسا ہوا تو شاید اس کے بعد میری زندگی کا سفر ہی ختم ہو جائے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد میں کیا کروں گا۔"

"مسز بمل! پھر آپ کیا کہتی ہیں؟" میڈم نے مسز بمل سے پوچھا۔

"یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے میڈم۔ میں آج شام ہی کو اس کے پاس چلی جاؤں گی۔" پھر مسز بمل نے میری طرف دیکھا۔ "تم کل آ جاؤ۔ جو صورتِ حال ہوگی، تمہارے سامنے آ جائے گی۔"

"مسز بمل! یہ تو بتا دیں کہ آپ کہاں رہتی ہیں اور اس کا گھر کہاں ہے؟ اس نے حضرت گنج بتایا تھا۔"

"وہ لوگ پہلے حضرت گنج میں رہتے تھے لیکن اب وہاں سے مہانگر کالونی میں شفٹ ہو گئے ہیں۔" مسز بمل نے بتایا۔ "اور میں بھی وہیں رہتی ہوں لیکن تم اس کالونی میں مت آنا۔ ایسا نہ ہو معاملہ خراب ہو جائے یا تمہیں دیکھ لیا جائے۔"

"لیکن وہ لوگ مجھے کیسے جانتے ہوں گے؟"

"بے وقوف ہو تم۔" مسز بمل نے کہا۔ "بالکل سامنے کی بات ہے۔ اس کے بھائی نے تمہارے شہر میں کسی طرح چندا کو دیکھ لیا ہوگا۔ اس نے دو چار دن تمہارے گھر کی نگرانی کی ہوگی۔ تمہارا پیچھا کیا ہوگا، تب ہی وہ اتنی آسانی کے ساتھ تمہارے گھر پہنچ کر اپنی بہن کو وہاں سے نکال لایا ہے۔"

"اوہ... میں نے تو اس طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔"

"اسی لیے کہتی ہوں کہ ایسے معاملے میں جوش کی نہیں، ہوش کی ضرورت ہوتی ہے۔" مسز بمل نے کہا۔ "اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ یاد رکھو۔ اگر چندا بھی تم سے محبت کرتی ہے اور تم دونوں میں واقعی پیار ہے تو پھر تم دونوں کو ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہم خود تمہارے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکالیں گے۔"

"میں آپ لوگوں کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

میں وہاں سے اپنے ہوٹل واپس آ گیا۔ کل تک میرے سامنے صرف اندھیرے تھے لیکن آج بہت کچھ تھا۔ بہت سی باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ یہ پتا چل گیا تھا کہ وہ لکھنؤ میں ہے اور اس کو پٹنہ سے لانے والا اس کا اپنا بھائی ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی شادی کی جا رہی ہے۔

یہ اگرچہ بہت مایوس کن اور پریشان کر دینے والی خبر تھی لیکن لاعلمی سے تو بہتر تھی۔ پتا تو چل گیا تھا کہ وہ کہاں ہے پھر قدرت نے مجھے میڈم اور مسز بمل جیسی مہربان اور سمجھ دار خواتین سے ملوا دیا تھا جو میرے کام آ رہی تھیں۔ ورنہ میں سائرہ کی تلاش میں بھٹکتا ہی رہ جاتا۔

میں بہت بے چینی سے دوسرے دن کا انتظار کر رہا تھا۔ اس رات سلیقے سے نیند بھی نہیں آ سکی۔ بس یہ دل چاہ رہا تھا کہ صبح ہو اور میں اڑتا ہوا کالج پہنچ جاؤں۔

دوسرے دن ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں ایک بار پھر لا مارٹینئر کالج کی طرف چل پڑا۔ ابھی دن کے دس ہی بجے تھے۔ اس وقت وہاں جانا مناسب نہیں تھا۔ اس وقت کالج میں کلاسز ہو رہی ہوں گی۔ وہ دونوں خواتین مجھ سے ملاقات کا وقت نہیں نکال سکتی تھیں۔ اسی لیے بہتر تھا کہ میں کچھ وقت اِدھر اُدھر گزاروں۔

میں وقت گزارنے کے لیے دل کشا گارڈن میں داخل ہو گیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں لکھنؤ کو دل بھر کے دیکھتا۔ یہ ایک تاریخی شہر تھا۔ نہ جانے کتنی داستانیں یہاں کی مٹی میں موجود تھیں لیکن میں تو کسی مہم پر تھا اور مہم بھی ایسی جو میرے لیے زندگی اور موت کی طرح تھی۔

دل کشا گارڈن ایک خوب صورت گارڈن ہے۔ یہاں بہت سے پیار کرنے والے جوڑے گھوم رہے تھے۔ گھاس پر، بینچوں پر، ہر جگہ بیٹھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے ہوئے۔ پیار بھری باتیں کرتے ہوئے۔ کاش میرا بھی کوئی ساتھی ہوتا۔ ایک ساتھی تھا لیکن وہ خود زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا۔

دوپہر تک میں یونہی گھومتا رہا اور دوپہر کے وقت کالج کی طرف روانہ ہو گیا۔ آج بھی وہ گورکھا گیٹ پر موجود تھا۔ اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

میڈم اپنے کمرے میں موجود تھیں۔ میں انہیں سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میری حالت اس وقت قابلِ رحم ہو رہی تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" میڈم نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں ان کا شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔ میڈم نے مسز بمل کو بلا لیا تھا۔ مسز بمل کچھ دیر بعد کمرے میں آئی۔ میں نے بے چین نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "مسز بمل! کیا سائرہ سے آپ کی ملاقات ہوئی؟"

"ہاں، ملاقات ہوئی۔" اس نے بتایا۔ "اور اس نے تمہیں پہچان بھی لیا۔"

"میں نے کہا تھا ناکہ وہ مجھے بھول نہیں سکتی۔"

"لیکن اس نے تو مجھے کچھ اور کہانی سنائی ہے۔"

"کچھ اور کہانی؟" میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا کہا اس نے؟"

"اس کا کہنا ہے کہ تم زبردستی اسے اپنے ساتھ لیے گھومتے رہے ہو اور تم نے زبردستی اسے مسلمان کر کے اس سے شادی کی تھی۔"

☆☆☆

میں شاید مر ہی گیا تھا۔

اب میرے لیے کیا رہ گیا تھا۔ سائرہ کے ساتھ میں نے تو کوئی زبردستی نہیں کی تھی۔ اس پر کوئی زور نہیں دیا تھا۔ اس کو تو پیار دیا تھا میں نے۔ ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ مسلمان بھی وہ اپنی خوشی سے ہوئی تھی۔ پھر اس نے میرا ساتھ دینے سے کیوں انکار کر دیا؟

اس نے یہ کیوں کہا؟ میرے خدا! میری اتنی بھاگ دوڑ، اتنی ریاضت بیکار ہی گئی تھی۔ میں تو بالکل خالی ہاتھ ہو گیا تھا۔

میں ایک جنون کے عالم میں لکھنؤ کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ ہوٹل جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا نہ جانے ان پیروں نے کہاں کہاں کی دھول سمیٹی ہوگی۔

کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ میں ایک جنون اور جوش

کے عالم میں کہاں تک چلا آیا ہوں۔ میرے سامنے اس شہر کی پوری رونقیں تھیں لیکن میرے لیے تو کچھ نہیں تھا۔ بس ایک کلیجا چیرتی ہوئی بے پناہ مایوسی تھی۔

اے غم دل کیا کروں۔ وحشت دل کیا کروں۔ مجاز نے اپنی مشہور زمانہ نظم تو اسی شہر میں لکھی ہوگی۔ شاید اس وقت اس کی بھی وہی کیفیت ہوگی۔

سڑکوں پر آوارہ پھرنے والی کیفیت۔

مجھے ہوش اس وقت آیا جب کسی کی آواز نے مجھے روک لیا۔ وہ فٹ پاتھ کنارے ایک بڑے سے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا ایک مجذوب تھا جس کی سرخ سرخ آنکھیں میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ ''ادھر آ۔'' اس نے اشارہ کیا۔

میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ ''جی مرشد۔''

''شاید تو اپنے ہوش میں نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''جی ہاں مرشد! میرے پاس ہوش نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔''

''شاید کچھ کھو دیا ہے تو نے؟'' مجذوب نے پوچھا۔

''جی ہاں مرشد! زندگی گم ہوگئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور صرف گم ہی نہیں ہوئی بلکہ دھوکا دے کر چلی گئی ہے۔''

''پاگل ہے تو۔ آنکھوں پر پٹی باندھ لے تو سامنے کی چیزیں بھی نظر نہیں آتیں۔ جا اندر جا۔'' اس نے ایک عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ''ایک چکر لگا کر میرے پاس آجا۔''

''یہ کیا ہے مرشد؟''

''آنکھیں کھول کر دیکھ لے۔ یہ چھوٹی امام بارگاہ ہے۔'' مجذوب نے بتایا۔ ''اندر جا اور جو چیز پہلی نظر میں تجھے اپنی طرف کھینچ لے، اس کو دھیان میں رکھ اور مجھے آکر بتا... جا۔''

اس مجذوب نے مجھے مرعوب کر دیا تھا۔ اس کی بات پر عمل کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ شاید اس نے کوئی اشارہ دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے اسی لیے جھوٹ اور سچ کی پہچان گم کر بیٹھا ہوں۔

بہرحال میں امام بارگاہ میں داخل ہوگیا۔

مجذوب نے کہا تھا کہ جو چیز میری توجہ اپنی طرف کھینچ لے، میں اس کے بارے میں آکر بتاؤں۔ چھوٹی امام بارگاہ کافی پرانی عمارت تھی۔ اسلامی فن تعمیر کا شاہکار۔ وہاں زیارت کرنے والے موجود تھے لیکن میری توجہ کس کی طرف ہو سکتی تھی... کس کی طرف؟ اور اچانک مجھے کسی پرانے اخبار کا ایک صفحہ سیڑھیوں کے پاس ہوا کے زور سے پھڑ پھڑاتا ہوا دکھائی دے گیا۔ حالانکہ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس کے باوجود اخبار کے اس صفحے نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ ایک ہی صفحہ تھا اور اس پر کسی قدیم مسجد کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔

اخبار کے اس صفحے کے علاوہ وہاں اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو مجھے متوجہ کر سکتی۔ میں وہی اخبار لے کر امام بارگاہ سے باہر آ گیا۔

وہ مجذوب اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ ''کیا لے کر آیا ہے؟'' اس نے گونجتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''مرشد! بس اخبار کا یہ ٹکڑا ملا ہے۔'' میں نے اخبار اس کے سامنے کر دیا۔ ''اور کوئی خاص چیز نہیں ملی۔''

''سب کچھ تو مل گیا ہے تجھے اور تو کہہ رہا ہے کچھ نہیں ملا۔'' اس نے مسجد کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ''جا... آباد کر اس کو اور اس کو بھی ساتھ لے جا جس کو ڈھونڈ رہا ہے۔ لے جا اس کو ساتھ۔''

''مرشد! میں اسے کہاں سے پاؤں گا؟'' میں جلدی سے بولا۔

''میں نے کہہ دیا۔ لے جا اسے ساتھ۔'' مجذوب نے کہا۔ ''جا... آگے جامع مسجد ہے۔ دو رکعت نماز پڑھ اور اس کو ساتھ لے جا۔'' اس نے اخبار میری طرف بڑھا دیا۔

پتا نہیں، کس قسم کے اشارے تھے۔ جامع مسجد بھی وہاں سے قریب تھی۔ نہ جانے کیوں دل چاہ رہا تھا کہ اس کی باتوں پر عمل کرتا جاؤں۔ میں نے اس اخبار کو تہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ کوئی نہ کوئی بھید ضرور تھا۔

میں نے جامع مسجد پہنچ کر دو رکعت نماز ادا کی جس کی ہدایت کی گئی تھی۔ پھر مسجد سے باہر آ کر وہاں پہنچ گیا جہاں مجذوب بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اب کہاں تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن مجذوب کا کوئی سراغ نہیں تھا۔

میں وہاں کھڑا سوچتا رہ گیا کہ اب میں کیا کروں؟ کس کے پاس جاؤں؟ اگر مجذوب نے کسی قسم کے اشارے ہی دیے تھے تو وہ اشارے میری سمجھ سے باہر تھے۔

اخبار میں چھپی ہوئی مسجد کی تصویر، اس سے کیا سراغ مل سکتا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں اس اخبار کو سنبھال کر رکھوں لیکن اس سے کیا ہونے والا تھا؟

ایک بار پھر بددلی اور مایوسی نے مجھے گھیر لیا۔ شاید سائرہ سے ملنا میرے نصیب میں نہیں تھا۔ یہ تو سامنے کی بات تھی لیکن میرا دل کچھ اور کہہ رہا تھا۔

کوئی مجھ سے یہ کہہ رہا تھا کہ مجذوب نے یونہی مجھے

paksociety.com 042-35788144

آواز نہیں دی تھی۔ اس نے یونہی ہدایات نہیں دی ہوں گی۔ کوئی نہ کوئی رمز ضرور تھا۔

شاید مجھے سائرہ کی تلاش سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

میں بہت بوجھل ہو کر ہوٹل واپس آ گیا۔ اپنے کمرے میں بیٹھ کر میں نے وہ اخبار نکالا۔ اس مسجد کی تصویر میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ ایک قدیم طرز کی عمارت تھی۔ زیادہ بڑی مسجد نہیں تھی لیکن ایک خاص بات یہ تھی کہ اس کی چھت پر کائی... جمی ہوئی تھی۔ جس طرح بارش زدہ علاقوں میں دیواروں اور چھتوں پر کائی جم جاتی ہے، اس مسجد کی چھت پر تھی جس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مسجد جہاں ہے وہاں بہت بارش ہوتی ہوگی۔

اخبار میں مسجد کی صرف تصویر تھی۔ یہ نہیں لکھا ہوا تھا کہ وہ مسجد کہاں کی ہے۔ خیر، تصویر چاہے جہاں کی بھی ہو، سائرہ تو اسی شہر میں تھی۔

مہانگر میں، گرچہ مسز بمل نے مجھے اس طرف جانے سے منع کیا تھا لیکن میں اس کی بات کیسے مان سکتا تھا۔ مجھے تو ہر حال میں اس کا سراغ لگانا تھا۔

میں نے دوسری صبح مہانگر کے بارے میں معلوم کیا۔ ہمارے ہوٹل سے اس کا فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ میں نے مہانگر جانے والی بس پکڑ لی۔

میں لکھنؤ کی سڑکوں سے گزر رہا تھا۔ بس لکھنؤ یونیورسٹی سے ہوتی ہوئی ازابیلا کالج کو کراس کر کے اور آگے جا رہی تھی۔

ازابیلا کالج کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے۔ اسی روڈ پر امام بارگاہ شاہ بخت بھی واقع ہے۔ ازابیلا کالج کے ماحول میں خوب صورت لڑکیاں ادب اور موسیقی پر گفتگو کرتی ہیں۔ یہاں ہندوستان بھر کی ذہین اور دولت مند لڑکیوں کا میلا لگا رہتا ہے۔

یہاں ہر طرف زندگی مسکراتی ہے.... یقین اور امید سے دمکتے ہوئے چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ بالآخر مہانگر آ گیا اور میں اس کے اسٹاپ پر اتر گیا۔

دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ یہیں کہیں کسی مکان میں سائرہ ہوگی۔

یہ بہت بڑا علاقہ تھا اور یہاں مجھے ایک ایسا گھر تلاش کرنا تھا جس کا پتا بھی مجھے نہیں معلوم تھا۔ بس مجھے بھٹکتے رہنا تھا۔ کہیں نہ کہیں شاید میں اس کی صورت دیکھ لیتا۔ وہ مجھے دکھائی دے جاتی۔

لیکن دن بھر آوارہ گردی کے باوجود کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں وہاں کے بازاروں میں جا کر کھڑا رہا۔ گلیوں میں گھومتا رہا لیکن سائرہ نہیں ملی۔

اس کا پتا مسز بمل کو تھا اور مسز بمل مجھے اس کا پتا کبھی نہیں بتاتی۔ اس نے تو مجھے اس طرف آنے ہی سے منع کیا تھا۔

میں مہانگر سے چلتا ہوا کپور پارک کی طرف آ گیا۔ اس پارک میں بھی رونق لگی ہوئی تھی۔ مرد، عورتیں گھومتے پھر رہے تھے۔ میں اپنی قسمت کو روتا ہوا ایک بینچ پر آ کر بیٹھ گیا اور اسی وقت کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے چونکا دیا۔

میرے سامنے مجذوب کھڑا تھا۔ ''نادان! کیوں بھٹکتا پھر رہا ہے۔'' مجذوب نے غصے سے پوچھا۔

''مرشد! سراغ نہیں ملتا۔''

''نادان، اس کا پتا تیری جیب میں ہے۔'' مجذوب نے کہا۔ ''وقت مت برباد کر اور تصویر کو دیکھتا رہ۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا یا کوئی اور بات کرتا، مجذوب پارک کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں سکتے میں کھڑا رہا۔ پھر میں نے بھی مجذوب کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

لیکن اب وہ کہاں تھے۔ وہ تو غائب ہو چکے تھے۔ مجھے پھر ایک اشارہ دے گئے تھے لیکن یہ کیسا اشارہ تھا؟ اس مسجد سے کیا ظاہر ہو رہا تھا؟

کیا مجھے یہ مسجد تلاش کرنی چاہیے؟ شاید وہ یہی کہنا چاہتے ہوں۔ حالانکہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن میں اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

میں نے اس مسجد کی تصویر اتنی بار دیکھی ہوگی کہ وہ میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسی مسجد کہیں نہ کہیں ضرور ہوگی۔ ورنہ مجذوب بار بار اس مسجد کی طرف اشارہ کیوں کرتے؟

میں نے اس مسجد کی تلاش شروع کر دی۔ پیدل چلتا رہا۔ لکھنؤ کی گلیوں میں۔ لکھنؤ کی سڑکوں پر۔ امین آباد۔ اندرا نگر کالونی، حضرت گنج، رومی دروازہ۔

اور میں یہ تلاش پیدل کر رہا تھا۔ لوگوں کو مسجد کی تصویر دکھاتا، وہ یا تو لاعلمی کا اظہار کر دیتے یا کسی غلط مسجد کا پتا بتا دیتے۔

اور میں ڈھونڈ رہا تھا۔ دو دن، چار دن۔ بھٹکتا ہی رہا۔ رام لیلا پارک کے پاس۔ وہاں بھی ایک مسجد تھی۔ لکشمن گراؤنڈ کے قریب۔ بڑی امام بارگاہ کے پاس بھی ایک قدیم مسجد تھی لیکن یہ وہ مسجد نہیں تھی۔

گومتی نگر جیسے علاقے میں بھی ایک مسجد ملی جس کے گنبد پر کائی جمی ہوئی تھی لیکن یہ وہ مسجد نہیں تھی۔ میں مسجد کے ساتھ ساتھ ان مجذوب کو بھی تلاش کرتا پھر رہا تھا لیکن وہ بھی دکھائی نہیں دیے تھے۔

ایک دن میں بہت مایوس اور بددل ہو گیا۔ شاید میری قسمت میں سائرہ سے ملنا نہیں لکھا تھا۔ مجذوب کے اشارے بھی بس یونہی تھے۔ یہ لوگ بس اسی قسم کی باتیں کر دیتے ہیں اور ان کو تلاش کرتے پھرو۔

میں نے ہوٹل واپس آنے سے پہلے ایک مسجد میں نماز ادا کی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ ''یا خدا! مجھے روشنی دے۔ اگر واقعی اس مسجد سے میری مراد پوری ہونے والی ہے تو اس مسجد کا سراغ دے دے۔''

اور اچانک مجھے وہ روشنی مل گئی جس کے لیے میں نے دعا کی تھی۔

کتنے سامنے کی بات تھی۔ نہ جانے کیوں اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا جس اخبار میں اس مسجد کی تصویر چھپی تھی، اس اخبار کے دفتر سے تو مسجد کے بارے میں معلوم ہو سکتا تھا۔

میں نے جلدی سے اخبار نکالا۔ وہ لکھنؤ ہی سے شائع ہونے والا اردو کا اخبار صدائے لکھنؤ تھا اور اس کا پتا تھا۔ وہ پتا اوشا سا گر میوزیکل انسٹی ٹیوٹ کے قریب کا تھا۔

لکھنؤ کی خاک چھاننے کے دوران میں کئی بار اس اخبار کے دفتر کے سامنے سے بھی گزر چکا تھا۔ میں ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر رکشا کر کے صدائے لکھنؤ کے دفتر پہنچ گیا۔

اس وقت وہاں ایڈیٹر کے سوا بس دو چار آدمی تھے۔ میں نے جب ایڈیٹر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو مجھے ایڈیٹر سرور عالم صاحب کے پاس پہنچا دیا گیا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر مہربان چہرے والے انسان تھے۔

''ہاں بھئی، کیسے آنا ہوا؟''

''جناب! آپ کے اخبار میں ایک مسجد کی تصویر چھپی تھی۔ خدا کے لیے اس کا پتا بتا دیں؟''

''کون سی مسجد؟''

میں نے وہ اخبار نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔

''جناب! یہ ہے وہ مسجد۔'' میں نے بتایا۔

''اوہ، یہ تو ہمارا ایک تصویری سلسلہ ہے۔ ہندوستان کی قدیم مساجد۔'' ایڈیٹر نے بتایا۔ ''اس مسجد کا مکمل تعارف دوسرے صفحے پر ہے۔''

''بدقسمتی سے میرے پاس اخبار کا یہی صفحہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''اسی لیے تم پریشان ہوتے پھر رہے ہو۔'' ایڈیٹر مسکرا دیے۔ ''میاں، یہ تصویر مسجد علی کی ہے۔''

''مسجد علی... کہاں ہے یہ؟'' میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''یہ مسجد گوا میں ہے۔'' ایڈیٹر نے بتایا۔

''گوا میں!'' میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''ہاں میاں، گوا سمجھتے ہو نا؟ ہندوستان کی ایک ریاست ہے۔''

''بالکل وہی۔ گوا کا کیپٹل ہے۔ پناجی۔ یہ مسجد وہیں کے ساحل پر بنائی گئی ہے۔ میرامار بیچ کہتے ہیں اس جگہ کو۔ بہت قدیم مسجد ہے۔ AD554 میں سید علی نام کے ایک ترک مصنف نے گوا کے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ مسجد ان ہی کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔ اسی لیے اس مسجد کا نام مسجد علی ہے۔''

ایڈیٹر نے ذرا سی دیر میں اس مسجد کے بارے میں پوری معلومات دے دی تھیں۔ میں ان کا شکریہ ادا کر کے دفتر سے باہر آ گیا۔

مسجد کا پتا تو چل گیا تھا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سائرہ کا تعلق اس مسجد سے کیا ہو سکتا ہے۔ گوا تو بہت دور تھا۔ وہ لکھنؤ کی رہنے والی تھی۔ اسے دھوکے سے لکھنؤ لایا گیا تھا۔ پھر وہ لکھنؤ سے گوا کیسے چلی گئی؟ اگر اس کی شادی ہو چکی تھی پھر بھی گوا جانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

ایک سراغ تو ملا تھا لیکن یہ ایسا سراغ تھا جس پر یقین کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھ پر ایک بار پھر بے پناہ مایوسی کا غلبہ طاری ہو چکا تھا۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ کیا گوا چلا جاؤں؟ لیکن گوا تو بہت دور تھا۔ اس کے لیے پہلے مجھے ممبئی جانا ہوگا۔ وہاں سے روڈ کے ذریعے یا اسٹیمر کے ذریعے گوا جاتا۔

میں تو ایک بار پھر الجھا دیا گیا تھا۔

کیا مجھے جانا چاہیے تھا؟ یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سائرہ کی تلاش میں وقت کی بربادی میرے مقدر میں لکھ دی گئی ہو۔

دوسرا خیال یہ تھا کہ مجذوب صاحب بار بار مجھے اشارے کیوں دے رہے تھے؟ وہ کیوں چاہتے تھے کہ میں اس مسجد پر اپنی توجہ مرکوز کر دوں؟ اور جب میں نے مسجد پر اپنی توجہ مرکوز کی تو مجھے اس مسجد کا سراغ مل گیا تھا۔ یقیناً اس

www.paksociety.com

میں خدا کی کوئی مصلحت ہوگی۔ مجھے گوا جا کر دیکھ لینا چاہیے۔
اور میں گوا پہنچ گیا۔

☆☆☆

گوا تک پہنچنے کی داستان بہت طویل ہے۔

یہ ہندوستان کی سب سے خوبصورت اسٹیٹ ہے۔ ایک عرصے تک اس پر پرتگالیوں کا قبضہ رہا۔ 1961ء میں آزادی ملی اور اس پر ہندوستان کا قبضہ ہوگیا۔

گوا کو ہندوستان میں سیاحوں کی جنت بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں بڑی مشکلوں سے آنے دیا جاتا ہے۔ میں لکھنؤ سے دوسرے دن ممبئی کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔

میرے پاس اتنی رقم موجود تھی کہ میں سائرہ کی تلاش میں پورے ہندوستان کی خاک چھان سکتا تھا۔ میں ممبئی پہلی بار آیا تھا۔ بہت بڑا شہر ہے لیکن میں یہاں تفریح کرنے نہیں آیا تھا۔ ایک دن رک کر دوسرے دن مجھے گوا کے لیے روانہ ہوجانا تھا۔

میں نے بھنڈی بازار کے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ یہ بھی مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ دوسری صبح میں نے گوا کے لیے معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ گوا کے لیے اسٹیمر جایا کرتے ہیں جن کا کرایہ دو سو روپے ہوتا ہے۔

میں نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور گوا کے لیے روانہ ہو گیا۔ حالانکہ میں مسلسل سفر میں تھا۔ اصولاً مجھے تھک کر بیٹھ جانا چاہیے تھا لیکن ایک جنون مجھے چین نہیں لینے دے رہا تھا اور وہ جنون تھا سائرہ سے ملنے کا۔۔۔ اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ میں کیوں جا رہا ہوں۔

بظاہر تو گوا میں اس کے ہونے کا امکان ہی نہیں تھا لیکن ان مجذوب کا حکم مجھے دوڑائے لیے جا رہا تھا۔ بہرحال میں پیناجی پہنچ گیا۔ کیا خوب صورت جگہ ہے۔

یہ شہر کوئی زیادہ بڑا نہیں ہے۔ یہاں کی آبادی بھی زیادہ نہیں ہے اس کے باوجود یہاں کے ساحلوں کے لیے سیاحوں کا رش لگا رہتا ہے۔

اسی بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں چالیس کے قریب خوب صورت ہوٹلز ہیں۔ میں نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں اپنا سوٹ کیس رکھا اور میرامار کے ساحل کی طرف روانہ ہوگیا۔

ساحل پر دور تک خوب صورتی بکھری ہوئی تھی۔ یہ خوب صورتی قدرتی بھی تھی اور انسانی بھی۔ دور دور تک پھیلا ہوا نیلگوں پانی اور ساحل پر آرام کرتے ہوئے نیم عریاں غیر ملکی اور ملکی سیاح۔ اور طرح طرح کی چیزیں فروخت کرنے والے لوگ۔

ان میں عورتیں زیادہ تھیں۔

یہ سب کچھ تو تھا لیکن وہ مسجد کہاں تھی۔ یہاں تو کوئی مسجد نہیں تھی۔ میرا سر پھر چکرانے لگا۔ کیا اتنی جدوجہد بیکار ہی ہوئی تھی۔ میں اتنی دور سے جس مسجد کی تلاش میں آیا تھا، وہ مسجد یہاں دکھائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ ایک بوڑھا مقامی بھٹے فروخت کر رہا تھا۔ صورت سے وہ مسلمان ہی دکھائی دے رہا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔

''بابا! آپ سے ایک بات پوچھنی ہے۔''

''ہاں بیٹا پوچھو۔'' اس کا لہجہ مقامی تھا۔ پرتگیزی اثرات والا لہجہ۔

''بابا! میں یہاں ایک مسجد کی تلاش میں آیا ہوں۔ مسجد علی۔ لیکن وہ مسجد یہاں دکھائی نہیں دے رہی؟''

''ہے بیٹا، وہ اس طرف۔'' اس نے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔ ''ان درختوں کے دوسری طرف وہ مسجد ہے۔ میں اس کے پاس ہی رہتا ہوں۔''

''بابا! مجھے وہ مسجد دیکھنی ہے۔''

''کیا مسلمان ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں بابا! مسلمان ہوں اور بہت دور سے آیا ہوں۔''

''الحمدللہ۔'' بوڑھا خوش ہوگیا۔ ''میں بھی مسلمان ہوں۔ نوردین نام ہے میرا۔ آؤ میرے ساتھ۔ میں تمھیں مسجد تک لے چلتا ہوں۔''

''آپ تو یہاں اپنا کام کر رہے ہیں بابا۔'' میں نے کہا۔

''کام تو ہوتا رہے گا۔ تمہاری خدمت میرا فرض ہے۔ آجاؤ۔''

اس نے بھٹے والی گاڑی آگے دھکیلنا شروع کردی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ کچھ فاصلے پر درختوں کا جھنڈ تھا جن کے درمیان ایک راستہ بنا ہوا تھا۔

ہم اس راستے پر چلتے رہے اور ایک موڑ مڑتے ہی وہ مسجد سامنے آگئی۔ میرے خدا! یہ وہی مسجد تھی، بالکل وہی۔ وہی تصویر والی مسجد۔ وہی کائی سے ڈھکا ہوا گنبد اور قدیم طرزِ تعمیر۔ اس کے پتھر کے گیٹ گرچہ شکستہ ہوچکے تھے لیکن ایک ستون پر مسجد علی کی تختی بھی لگی ہوئی تھی جس پر انگریزی میں مسجد کا نام لکھا ہوا تھا۔

''بیٹا! تم اس مسجد میں کیا دیکھنے آئے ہو؟'' بوڑھے نے پوچھا۔ ''یہ مسجد تو ویران پڑی ہے۔''

''بابا! کیا یہاں نماز نہیں ہوتی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں گنتی کے چند مسلمان ہیں۔'' بوڑھے نے بتایا۔ ''اس مسجد کے امام زین العابدین صاحب ہیں۔ وہ تھے تو اذان بھی ہوتی تھی اور نماز بھی ہوا کرتی۔''

''تو امام صاحب کہاں چلے گئے؟''

''پندرہ بیس دن ہوئے، وہ یہاں سے پاٹھ کالونی کی طرف چلے گئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن بات کیا ہے؟ بتاؤ مجھے۔ شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔''

''بابا! میں نہیں جانتا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن کسی غیبی طاقت نے بھیجا ہے مجھے۔ اس کے علاوہ میں آپ کو کیا بتاؤں۔ کہاں ہے یہ پاٹھ کالونی؟''

''چلو، میں تمھیں امام صاحب کے پاس لے کر چلتا ہوں۔'' بابا نے کہا۔ ''ورنہ تم بھٹکتے ہی رہو گے۔''

''بہت مہربانی ہوگی بابا۔''

بابا مجھے اپنے گھر لے گیا۔ چھوٹا سا دو کمروں کا کچا گھر تھا جہاں اس کی بیوی اور دو لڑکیاں تھیں۔ اس نے گھر والوں کو بتایا کہ ایک مہمان آیا ہے۔

میرے منع کرنے کے باوجود انہوں نے میرے لیے چائے بنادی تھی۔ گھر میں بسکٹ بھی پڑے ہوئے تھے۔ وہ بھی میرے سامنے رکھ دیے گئے۔

پھر ہم پاٹھ کالونی کی طرف چل پڑے۔

بابا مجھے راستوں کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔ میں ان کی باتیں سن سن کر صرف سر ہلا رہا تھا۔ وہاں گرجا گھر بڑی تعداد میں تھے۔ بابا نے بتایا کہ یہاں عیسائی بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں۔

پاٹھ کالونی بھی ایک اچھی آبادی تھی۔ یہاں زیادہ تر ایک منزلہ مکانات ہوا کرتے ہیں۔ بابا مجھے پیدل گلیوں میں گھماتا ہوا ایک ایسے مکان کے سامنے رک گیا جو دیکھنے ہی سے قدیم معلوم ہو رہا تھا۔

''امام صاحب اسی مکان میں رہتے ہیں۔'' بابا نے بتایا۔

دروازے پر دستک کے جواب میں ایک ایسے آدمی نے دروازہ کھولا جس کی صورت بھی نورانی تھی اور جن کو دیکھ کر احساس ہو رہا تھا کہ اللہ والے ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔

وہ بابا سے بہت گرم جوشی سے ملے۔ پھر مجھ سے بھی بہت تپاک سے ہاتھ ملایا اور ہم دونوں کو اندر لے گئے۔ یہ ایک سادہ سی بیٹھک تھی جہاں فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے اور الماریوں

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت

ستمبر 2012ء کی جھلکیاں

روحِ مناظر
اس پیکرِ علم عرفان کا تذکرہ جو فقیرانہ روش پر گامزن تھا

خونخوار لڑکیاں
ایسی ظالم لڑکیاں تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتیں

شوبھوگیان
پاکستان کے ایک ولولہ انگیز لیڈر کی کتھا

سفیرِ موسیقی
بولی ووڈ کے نامور موسیقار کا عکسِ زندگی

سحر و ساحری
جادو ٹونے پر ایک معلومات بھرا مضمون

اس کے علاوہ
بھی بہت ساری سچ بیانیاں، سچے واقعات، دلچسپ حقائق، فلمی الف لیلہ اور معرکتہ الآرا قسط وار روداد ''سراب''

ایک ایسا خاص شمارہ جسے آپ محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

www.paksociety.com

میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔
دیکھنے ہی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں کوئی اہلِ علم ہی رہتا ہے۔
''امام صاحب! یہ نوجوان بہت دور سے مسجد علی کو تلاش کرتا ہوا آیا ہے۔'' بابا نے بتایا۔
''کیوں بھائی، خیریت تو ہے نا؟'' امام صاحب نے پوچھا۔
''جناب! میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں آپ کو کیا بتاؤں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ میری اس حماقت پر ہنسیں کہ میں کہاں سے کہاں آگیا ہوں۔''
''نہیں نہیں، بتاؤ مجھے۔ دل میں بات نہیں رکھنی چاہیے۔''
میں ایک بار پھر وہی کہانی دہرا رہا تھا جو میں پہلے کئی بار سنا چکا تھا۔ وہ دونوں بہت خاموشی سے سنتے رہے تھے۔ پھر میرے خاموش ہونے کے بعد امام صاحب نے کہا۔ ''صفدر میاں! خدا تمہاری مشکلیں آسان فرمائے۔ بہرحال کچھ کھا پی لو اور پریشان نہ ہو۔''
''نہیں امام صاحب! اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ میری تو بھوک پیاس سب ختم ہوچکی ہے۔''
''ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ میں اپنی بیٹی سے بول کر آتا ہوں۔''
میرے منع کرنے کے باوجود امام صاحب اٹھ کر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں بسکٹ وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ ''لو میاں، شروع ہوجاؤ۔'' امام صاحب نے کہا۔ ''بیٹی چائے لے کر آرہی ہے۔''
میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن امام صاحب کے خلوص اور اصرار کو دیکھ کر کچھ کھانا ہی پڑا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ امام صاحب نے کہا۔ ''آجاؤ بیٹا! یہاں سب اپنے ہیں۔''
ایک لڑکی چائے کی ٹرے لے کر داخل ہوئی اور وہ لڑکی سائرہ تھی... وہی سائرہ۔

☆☆☆

ہوسکتا ہے کہ اوروں کے لیے سکتے میں رہ جانے کا کوئی مفہوم نہ ہو۔ لیکن میں سکتے میں رہ گیا تھا۔ میری سانسیں تک رک گئی تھیں۔ وہ سائرہ ہی تھی جس نے ٹرے ایک طرف رکھ کر قالین پر بیٹھ کر رونا شروع کردیا۔
امام صاحب نے بابا کو کچھ اشارہ کیا اور وہ دونوں کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان کے باہر جاتے ہی سائرہ اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ خود میں بھی رو رہا تھا۔ جو کچھ بھی سامنے آیا تھا، وہ کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔
سائرہ تو لکھنؤ میں تھی۔ پھر وہ یہاں کیسے آگئی؟ ہندوستان کے اتنے دور افتادہ علاقے میں۔ میں اسے ٹٹول رہا تھا، چھو رہا تھا، پیار کررہا تھا۔ اپنے آپ کو یقین دلا رہا تھا کہ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا اور میرے سامنے سائرہ ہی ہے۔
نہ جانے کتنی دیر تک ہم اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے ہوئے کھڑے رہے۔ ہمیں کوئی ہوش نہیں رہا۔
سائرہ یہاں کیسے آگئی؟ کیوں آگئی؟ یہ سب معلوم کرنے کا مجھے ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ میں تو صرف روئے جارہا تھا۔ سائرہ بھی رو رہی تھی۔
ہمیں ہوش اس وقت آیا جب باہر سے امام صاحب کی آواز آئی۔ ''ارے بھائی! ہم لوگ آرہے ہیں۔'' ہم ایک دوسرے سے الگ ہوکر بیٹھ گئے۔
امام صاحب اور بابا مسکراتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے۔ ''ہاں بھائی! میں نے کہا تھا نا کہ تم پریشان مت ہو۔ خدا ضرور مدد کرے گا۔ اس کی مصلحت ہی ہوگی جو تمہیں یہاں بھیجا گیا ہے۔''
''امام صاحب! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ سب کیا ہے اور کس طرح ہے؟''
''پریشان مت ہو۔ اب اس کہانی کو سائرہ بیٹی پورا کرے گی۔'' امام صاحب نے کہا پھر سائرہ کی طرف دیکھا۔ ''چلو بیٹا! اب تم بتاؤ، پھر میں بتاؤں گا کہ میں نے تمہیں کہاں سے پایا ہے۔''
اس کے بعد کی کہانی میں سائرہ کی زبانی بیان کررہا ہوں۔ تحریر میری ہے لیکن داستان سائرہ کی ہے۔

☆☆☆

صفدر پٹنہ والے مکان میں مجھے چھوڑ کر یونیورسٹی چلے گئے تھے۔
وہ محلہ مسلمانوں کا تھا۔ سب ایک دوسرے کو نہ صرف جانتے تھے بلکہ ایک دوسرے کا احترام بھی کرتے تھے۔ سب کو یہ معلوم ہوچکا تھا کہ میں پہلے ہندو تھی پھر مسلمان ہوگئی اور اب صفدر کی بیوی بن چکی ہوں۔ اس حوالے سے میرا احترام اور بڑھ گیا تھا۔
صفدر کے جانے کے بعد میں گھر کے کاموں میں مصروف تھی کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میں نے سمجھا

شاید صفدر واپس آگئے ہیں۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔
میرے سامنے میرا بڑا بھائی راجن کھڑا ہوا تھا۔ میں اسے دیکھ کر سکتے میں رہ گئی۔ میں نے اس کے آنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ راجن مجھے تلاش کرتا ہوا یہاں تک بھی آسکتا ہے۔
''بھائی تم!'' میں نے حیران ہوکر پوچھا۔ ''تم یہاں کیسے آگئے؟''
راجن روتا ہوا مجھ سے لپٹ گیا۔ ''چندا! تو نے چھوڑ دیا تھا ہم سب کو۔ بھول گئی نا اپنے ماں باپ اور بھائی بہن کو۔ تو کیسی بے وفا نکلی چندا... بتا خون کے رشتوں نے تیرا کیا بگاڑا تھا؟''
''بھائی! میرے ساتھ جو کچھ گزری ہے، اس کے بعد میں گھر واپس کیسے آسکتی تھی۔'' میں نے کہا۔ سچ یہ ہے کہ اپنے بھائی کو دیکھ کر میں خود بھی رونے لگی تھی۔
''ہاں، یہ ایک فطری بات ہے بیٹی۔'' امام صاحب نے کہا۔ ''میں تمہاری کیفیت کو محسوس کرسکتا ہوں۔''
راجن نے بتایا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں لکھنؤ سے پٹنہ آیا ہوا ہے۔ وہ پٹنہ سے مال خرید کر لکھنؤ لے جاتا ہے اور لکھنؤ سے سامان لا کر پٹنہ میں فروخت کردیتا ہے۔ وہ برسوں سے یہی کام کررہا ہے۔ میں جانتی تھی کہ اس کا یہی کاروبار ہے۔ اسی لیے اس کی بات سن کر مجھے حیرت نہیں ہوئی تھی۔
پھر اس نے کہا۔ ''چندا! میں نے تجھے پرسوں بانک پور میں دیکھا تھا۔ تو شاید اس مسلمان کے ساتھ تھی جس کا نام صفدر ہے۔''
''ہاں بھائی! ہم شام کے وقت ہوا خوری کے لیے پلٹن میدان چلے جاتے ہیں۔'' میں نے بتایا۔
''تو میں نے وہاں تجھے دیکھ لیا اور خاموشی سے تم دونوں کا پیچھا کرتا رہا۔ تم دونوں کو پتا بھی نہیں چلا ہوگا۔ میں نے یہ گھر دیکھ لیا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ تو اس کے ساتھ اپنی مرضی سے رہ رہی ہے یا تجھے زبردستی رکھا گیا ہے لیکن زبردستی والی کوئی بات دکھائی نہیں دی۔ میں نے دوسری شام بھی تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھا اور مجھے اندازہ ہوگیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ تو اس مسلمان کے ساتھ اپنی مرضی سے رہ رہی ہے۔''
''ہاں بھائی! میں اس مسلمان کے ساتھ اپنی مرضی سے رہ رہی ہوں کیونکہ وہ میرا شوہر ہے۔'' میں نے بتایا۔
''شرم آنی چاہیے تجھے... تو ایک مسلمان کو اپنا شوہر کہہ رہی ہے۔''
''بھائی! میری بات تو سنو، ایک ہندو نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے، کیا تم وہ سننا پسند کرو گے؟''
میں نے اسے بتادیا کہ میں جس ہندو راجپوت کی محبت کے دھوکے میں آکر گھر سے فرار ہوئی تھی، اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس نے مجھے فروخت کردیا تھا۔
میں نے اسے بتایا کہ میں کس طرح طوائف بن کر زندگی گزار رہی تھی کہ صفدر وہاں آنکلے اور کس طرح صفدر مجھے نکال کر لائے اور کس طرح انہوں نے میرا ساتھ دیا۔ قدم قدم پر میری حفاظت کی اور کس طرح میں ان کے اخلاق اور کردار سے متاثر ہوکر مسلمان ہوئی ہوں اور کس طرح میں نے اسلام قبول کیا ہے۔ غرضیکہ میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا اور پٹنہ آنے کی ساری کہانی سنادی۔
میری یہ داستان سن کر راجن بہت دیر تک خاموش رہا تھا پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''چل یہ سب تو ہوگیا، اب بتا تیرا کیا ارادہ ہے؟''
''اب میرا کیا ارادہ ہوسکتا ہے بھائی! صرف یہ کہ میں صفدر کے قدموں سے لپٹ کر اپنی زندگی گزار دوں۔'' میں نے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہارا ہندو معاشرہ مجھے قبول نہیں کرے گا کیونکہ میں طوائف رہ چکی ہوں اور تم لوگ اونچی ذات سے تعلق رکھتے ہو... اور دوسری بات یہ ہے کہ میں مسلمان ہوچکی ہوں۔ یہ بات اور بھی برداشت نہیں ہوگی اور تیسری بات یہ ہے کہ صفدر میرے شوہر ہوچکے ہیں۔ ان کے ساتھ میرا جنم جنم کا رشتہ ہوگیا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں صفدر سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ ان سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔''
راجن میری یہ دوٹوک بات سن کر خاموش ہوگیا پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ ''ٹھیک ہے جو تمہاری مرضی۔ اب تم میری ایک بات سنو اور میں سمجھتا ہوں کہ تم میری یہ بات ضرور مان لوگی۔ میں تمہارا سگا بھائی ہوں، چاہے تم سمجھو یا نہ سمجھو۔''
''ہاں بھائی، اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے۔ یہ رشتہ تو ہمیشہ رہے گا۔''
''تو پھر یہ سنو کہ میں ابھی ایک ہفتے تک پٹنہ میں ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''اس دوران میں ایک دو بار تم سے ملنے آؤں گا۔ بس میری یہ بنتی ہے کہ تم اپنے شوہر کو مت بتانا کہ میں تم سے ملنے آتا ہوں۔''
اس نے اتنی خوشامدیں کیں، اتنی منت کی کہ میں نے اس سے وعدہ کرلیا کہ میں نہیں بتاؤں گی۔ وہ ایک بار اور

www.paksociety.com

آیا۔ اس کے بعد وہ ایک بار آیا تو اس نے بتایا۔ ''چندا! میں نے تمہارے پوچھے بغیر ماتا جی کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ ماتا کی ماری تجھے دیکھنے کے لیے لکھنؤ سے اکیلی پٹنہ چلی آئی ہے۔''

اب ظاہر ہے کہ ماں پھر ماں ہوتی ہے۔ اس کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ اس کی پیار بھری باتیں یاد آنے لگیں۔ آخر میں انسان ہی تو ہوں۔

ماں کے آنے کی خبر نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ راجن نے بتایا کہ انہیں اسٹیشن کے پاس ایک ہوٹل میں ٹھہرایا ہوا ہے۔ میں اس وقت تک راجن کی سازش کو سمجھ نہیں سکی تھی۔ بس اس نے کہا اور میں ماں کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی خوشی میں اس کے ساتھ چل پڑی۔

وہ بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔ اور میری سمجھ میں آگیا کہ وہ گھر سے کسی مرد کے ساتھ کس طرح کہیں جانے کے لیے نکل گئی تھی۔

یہ معما اب جا کر حل ہوا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ نکلی تھی۔

میں نہیں جانتی تھی کہ راجن نے میرے لیے کیسی گھناؤنی سازش تیار کر رکھی ہے۔ سائرہ نے پھر بتانا شروع کیا۔ میں ہنسی خوشی اس کے ساتھ اسٹیشن تک آگئی اور یہاں ہوٹل کے ایک کمرے میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے آیا۔ یہاں دو آدمی پہلے سے موجود تھے جو راجن نے بلا کر رکھے ہوئے تھے۔ یہاں زبردستی مجھے بے ہوش کرنے والی کوئی دوا کھلائی گئی اور جب مجھے ہوش آیا تو میں لکھنؤ کے اپنے گھر میں تھی۔

''سائرہ! اب پتا چلا ہے کہ تمہارے ساتھ کیا گزری تھی۔'' میں نے کہا۔

''میں اپنے گھر میں تھی۔'' سائرہ نے بات آگے بڑھائی۔ ''لیکن میری کیا حیثیت تھی، کچھ بھی نہیں۔ میں تو اس گھر میں ایک اچھوت سے بھی بدتر ہوگئی تھی۔ میرے اپنے ماں باپ، بھائی بہن سب حقارت سے مجھے دیکھتے۔ میرے کمرے سے باہر نکلنے پر پابندی تھی۔ کھانا بھی جھوٹا دیا جاتا۔ میں رو رو کر کہتی کہ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہارے کام کی نہیں ہوں۔ مجھے دھوکے سے کیوں لایا گیا ہے لیکن میری بات کا کوئی جواب نہیں ملتا۔''

''لیکن مسز بمل نے تو تمہارے لیے یہ بتایا تھا کہ تمہاری شادی ہوگئی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''ہاں، مسز بمل میرے گھر آئی تھی۔ اس نے یہ بتایا تھا کہ تم مجھے تلاش کرتے ہوئے لکھنؤ تک پہنچ گئے ہو۔ اس نے تمہارے پاس جا کر جھوٹ بولا تھا کیونکہ وہ بھی مجھ سے نفرت کر رہی تھی۔ کیونکہ میں مسلمان تھی اور یہ بات کسی کو گوارا نہیں ہو سکتی تھی۔''

''اب سمجھا، یعنی اس نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، جان بوجھ کر۔'' سائرہ نے بتایا۔ ''وہ چاہتی تھی کہ تم میری تلاش سے مایوس ہو کر واپس چلے جاؤ۔ اس کے بعد دو دن اور گزر گئے پھر گھر والوں نے مجھے کوئی ایسی چیز کھلا دی جس سے میں بے خبر ہوگئی۔ میں کچھ نہیں جانتی تھی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے مجھے سارے بندھن توڑ کر یہ سوچ کر دریا میں پھینک دیا کہ میں ڈوب کر مر جاؤں گی۔''

''لیکن میاں، جس کو اللہ زندہ رکھنا چاہے اسے کون مار سکتا ہے۔'' امام صاحب نے کہا۔ ''اب آگے کی کہانی مجھ سے سن لو۔ میرا تعلق گرچہ لکھنؤ سے ہے لیکن میں بہت پہلے گوا آکر آباد ہوگیا۔ مسجد علی اس وقت ویران پڑی ہوئی تھی جب میں نے اذان دی اور آس پاس کے مسلمان نماز کے لیے آنے لگے۔ اس طرح مسجد میں پانچ وقت کی نمازیں ہونے لگیں۔ میں نے پاٹھ کالونی کا یہ مکان بہت پہلے خریدا تھا اور اسے کرائے پر دے رکھا تھا۔ اسی سے میری گزر بسر ہوا کرتی۔ بہرحال میں کچھ دنوں کے لیے اپنے کسی کام سے لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ وہاں دریا کنارے میں نے اس لڑکی کو دیکھا۔ یہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ دریا کی لہروں نے اسے قبول نہیں کیا تھا کیونکہ اس کی زندگی ابھی باقی ہے۔ میں نے اس بچی کو اٹھا لیا اور اپنے آبائی گھر لے گیا جو امین آباد میں ہے۔ وہاں اسے ہوش میں لایا۔ اس کا علاج کرتا رہا اور اپنے ساتھ گوا لے آیا۔''

''صفدر! یہ امام صاحب میرے بابا ہیں۔'' سائرہ نے کہا۔ ''میں بھول چکی ہوں ان ظالم لوگوں کو جنہوں نے مجھے جنم دیا تھا، میں نے جس گھر میں پرورش پائی تھی۔ اب یہی میرے سب کچھ ہیں۔ انہوں نے مجھے اتنا پیار دیا ہے کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی۔''

''بیٹا! یہ بچی ہر حال میں اپنے ایمان پر قائم رہی ہے۔'' امام صاحب نے کہا۔ ''یہ بہت عظیم لڑکی ہے۔ اس نے ثابت کر دیا ہے کہ جس دل میں ایک بار ایمان داخل ہو جائے تو پھر اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں نکال سکتی۔ کوئی ظلم اسے جھکا نہیں سکتا لیکن اس کہانی کا سب سے حیرت انگیز پہلو تمہارا یہاں پہنچ جانا ہے۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ بچی یہاں رہ رہی ہے؟''

''امام صاحب! میرے خدا نے مجھے راستہ دکھایا۔'' میں نے بتایا۔ ''میں تو سائرہ کی تلاش میں پاگلوں کی طرح بھٹکتا پھر رہا تھا۔'' پھر میں نے مجذوب صاحب کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ''اور اس طرح میں ان کی راہنمائی میں یہاں تک چلا آیا۔''

''سبحان اللہ، مرحبا۔'' امام صاحب بول پڑے۔ ''بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ بچھڑے ہوؤں کو اسی طرح ملا دیا کرتا ہے۔ اب تمہارے ذہن میں کیا ہے؟ تم نے کیا سوچا ہے؟''

''مجھے کیا سوچنا ہے بابا؟'' میں نے کہا۔ ''میری زندگی میں اب سائرہ اور آپ لوگوں کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ میں اتنی جدوجہد کے بعد یہی سوچا کرتا تھا کہ خدا نے کتنی آزمائشوں سے نکالا ہے ہمیں۔ اس میں بھی اس کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوگی۔ وہ ہم سے کوئی کام لینا چاہتا ہوگا۔ ورنہ آج ہم یہ داستان سنانے کے لیے آپ کے سامنے نہیں ہوتے۔''

''بے شک۔'' امام صاحب اور بابا نے تائید کی۔ ''کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہے۔ بہرحال، تو اب تم دونوں یہیں رہنا چاہتے ہو؟''

''ہاں بابا۔'' سائرہ بول پڑی۔ ''ہمیں کہیں نہیں جانا۔ پورے ہندوستان میں ہمارے لیے عافیت کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہر طرف تعصب سے بھرے ہوئے لوگ ہیں۔ ہزار دعوؤں کے باوجود یہاں کی ذہنیت وہی ہے۔ وہ یہ برداشت کر ہی نہیں سکتے کہ کوئی ہندو اپنا دھرم چھوڑ دے۔ یہاں ہمیں کوئی نہیں جانتا۔ اس لیے ہم بہت سکون کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکتے ہیں۔''

''بابا! میں ایک پڑھا لکھا آدمی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں یہاں کوئی نوکری کر سکتا ہوں۔ کوئی کام کر سکتا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' امام صاحب جلدی سے بول پڑے۔ ''اس شہر میں ہمارے مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن جو ہیں بھی، وہ دینی تعلیم سے بہت دور ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم دونوں اس کام میں میرا ساتھ دو۔''

''ہمارے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن باقاعدہ دینی تعلیم تو میں نہیں دے سکتا۔ مجھے آتا ہی کیا ہے۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔ تم دونوں کو تعلیم میں دوں گا اور تم دونوں اس تعلیم کو آگے تک پہنچاؤ گے۔ بلکہ ایسا کرو، تم ابتدا میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دو۔ انگریزی، اردو

کی تعلیم دو۔ خاص طور پر مسلمان بچوں اور بچیوں کو۔ ساتھ میں دینی تعلیم بھی حاصل کرتے رہو۔''

''مجھے منظور ہے جناب۔'' میں نے کہا۔ ''جب خدا نے میری راہنمائی کرتے ہوئے مجھے آپ تک بھیجا ہے تو یونہی نہیں بھیجا ہوگا۔ اس سے زیادہ باخبر اور کون ہوگا۔''

''بے شک۔'' امام صاحب نے اپنی گردن ہلا دی۔ ''یہ سمجھ لو کہ یہاں سے تمہیں اپنی زندگی کا آغاز کرنا ہے۔ جو کچھ ہو چکا اسے ذہن سے جھٹک دو، بھول جاؤ اور آگے کی طرف دیکھو۔''

''یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی بابا کہ ہم آپ کے سائے میں زندگی گزار سکیں۔'' سائرہ نے کہا۔

☆☆☆

اور اس طرح گوا کے شہر پناجی میں مدرسہ رحمانیہ کا قیام عمل میں آگیا۔

اس شہر کے لیے اس قسم کا مدرسہ بالکل نئی بات تھی۔ امام صاحب نے لکھنؤ سے استاد شمس العارفین کو بلا لیا تھا جو حدیث و فقہ کے بہت بڑے عالم تھے۔

میں اور سائرہ درس لینے لگے۔ شروع شروع میں تو چھ سات بچے آئے۔ اس کے بعد تعداد بڑھتی چلی گئی۔

مدرسہ رحمانیہ کی شہرت آہستہ آہستہ پورے ہندوستان میں ہوتی گئی۔ سائرہ نے شعبۂ خواتین سنبھال لیا تھا۔ ہندوستان کے دوسرے شہروں سے بھی بچے آنے لگے اور مدرسہ بڑھتا چلا گیا۔

چند برسوں کے بعد امام صاحب کا انتقال ہوگیا۔ امام صاحب کا جدا ہونا ہمارے لیے بہت بڑا سانحہ تھا لیکن ہم نے اپنی ساری توانائی مدرسے کے لیے وقف کر دی۔ اب یہ مدرسہ ہندوستان کے بہترین مدارس میں سے ہے۔ پورے ہندوستان کے طالب علم یہاں آیا کرتے ہیں۔ ایک بہت بڑا ہاسٹل بھی ہے۔ اساتذہ کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے۔ اس سے مدرسے کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید علوم بھی سکھائے جاتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم دونوں کی کاوشوں سے یہاں کئی عیسائی اور ہندو گھرانے مسلمان ہو چکے ہیں۔ شاید خدا نے ہمیں اسی دن کے لیے زندہ رکھا تھا۔

خدا ہم سے یہی کام لینا چاہتا تھا۔ واقعی وہ اپنی مصلحتوں کو خود ہی جان سکتا ہے۔

ٹشو پیپر

احمد اقبال

اتفاقات وحادثات کی ہمراہی میں زندگی تمام ہوجاتی ہے... مگر بعض اتفاقات اس قدر حسین ودلربا ہوتے ہیں کہ ہاریں بھی توبازی مات نہیں...ایک ایسی ہی داستانِ تحیرکے منفرد اوراق...جس کے کرداروں کے گرد ایک بیکراں محرومی کا احساس جاگزیں تھا مگر اچانک ہی ایک حادثے نے وقت کی گردشوں کا محور بدل ڈالا...اوران کے دلوں کی آرزوئوں میں نئی جوت جگادی...!

ناکامی اور کامیابی کے سمندر میں ڈوبتی ابھرتی بے پتوار ناؤ کا سفرِ رائگاں

رانا عبدالغنی غمگین (ایم اے) آف کاموںکے منڈی کو شدت سے احساس تھا کہ اس کی زندگی میں جو بھی ہوا غلط ہوا، ذمے دار ہرگز وہ خود نہیں تھا مگر خمیازہ اسے ہی بھگتنا پڑ رہا تھا۔ وہ غلط وقت پر غلط جگہ اور غلط گھر میں پیدا ہوا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ احساس قوی سے قوی تر ہوتا جارہا تھا۔ پہلے اسے تقدیر سے شکوہ تھا کہ وہ کاموںکے منڈی میں عبدالحمید کے گھر میں کیوں پیدا ہوا۔ حالات کتنے مختلف ہوتے اگر وہ لندن جیسے کسی شہر میں نہ سہی لاہور یا کراچی میں سہگل یا داؤد فیملی میں جنم لیتا۔

ابھی کچھ دن پہلے اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو پاکستانی نژاد برطانوی شہری تھا۔ سو سال پہلے اس کے دادا، پردادا میں سے کوئی کسی انگریز کپتان کا اردلی تھا جو اسے جاتے وقت اپنے ساتھ ہی لندن لے گئے۔ اب یہ کوئی جانتا بھی نہ تھا چونکہ نسل، رنگ اور نسل کے فرق کے باوجود رہن سہن اور طور طریقے میں کسی برطانوی شہری سے کم نہ تھی۔ وہ خوش حال زندگی بسر کررہے تھے اور ان کے بچے صرف اتنا جانتے تھے کہ ویسٹ انڈیز یا انڈیا کی طرح پاکستان بھی کرکٹ کھیلنے والے ممالک میں شامل ہے اور 1992ء میں ورلڈکپ جیت چکا ہے۔

چنانچہ رانا عبدالغنی غمگین نے اس رات اپنے دلی جذبات کو ایک ترمیم شدہ صورت میں ڈھال کے ایک نئی دردناک نظم لکھی کہ اے خدا... آخر میں سو سال پہلے اس میر پور میں پیدا کیوں نہیں ہوسکتا تھا جو منگلا ڈیم میں غرق ہوا لیکن اس کے مکین سات سمندر پار پہنچ گئے...اور وہ چاول کاشت کرنے والے رانا عبدالحمید کا بیٹا کیوں ہوا۔ میر پور کے کسی بٹلر یا اردلی کے گھر میں کیوں پیدا نہیں ہوا...کیا یہی اس کی قسمت تھی کہ وہ دکان پر بیٹھ کے چاول بیچے یا اپنی ایم اے کی ڈگری بغل میں دبائے نوکری تلاش کرتا پھرے اور اسے کلرکی بھی نہ ملے۔

لندن سے آنے والا جان محمد لاہور کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں مقیم تھا۔ وہ اسکاٹ لینڈ کی کسی یونیورسٹی کا نمائندہ بن کے آیا تھا جس کا عبدالغنی نے نام تک نہیں سنا تھا۔ اس نے اخبار میں اشتہار دیا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو ویزا دلوانے کے ساتھ اسکالرشپ اور دوران تعلیم

ملازمت بھی دلوا سکتا ہے۔ تعلیم مکمل ہوجانے کے بعد دو سال کا جاب ویزا یقینی ہے اور دو سال میں برطانوی شہریت ملنا بھی اتنا ہی یقینی ہے۔ اشتہار میں اس کا نام جان محمد عباسی نہیں... ڈاکٹر جے ایم عباسی ڈین فیکلٹی آف فارن ایجوکیشن (ساؤتھ ایشیا افیئرز) لکھا گیا تھا۔

☆☆☆

آٹھ سال قبل جب اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا تو جاہلوں کا ٹولہ جس کو رانا عبدالحمید اپنا خاندان کہتا تھا، مبارک باد دینے آیا تھا۔ اس میں غنی کے چاچے، مامے، خالہ، پھوپی اور ان کی اولادیں شامل تھیں۔ کم وبیش سو افراد نے اسے گلے لگا کے یوں دبایا جیسے وہ کوئی لیموں ہے اور وہ نچوڑ کے اس کا رس نکالیں گے۔ بیشتر جوان بیٹوں کے باپ ہونے کے باوجود صحت مند تھے۔ خالص دیسی گھی، خالص مکھن دودھ کے ساتھ ہل چلانے اور فصل پر پوری جسمانی محنت کے ساتھ وہ جانوروں کے ساتھ رہتے رہتے خود بھی جانور ہوگئے تھے۔ ان میں تعلیم کے اعلیٰ ترین مدارج طے کرنے والا ایک ہونہار کزن آٹھویں جماعت میں کامیابی کے بعد عملی زندگی کے زیادہ سنسنی خیز تجربات میں مصروف ہوگیا تھا۔ وہ کبڈی کا چیمپئن تھا چنانچہ گاؤں کی بیشتر الھڑ مٹیاریں اس پر فریفتہ ہونے کو تیار تھیں۔ اس نے باری باری سب کو موقع دیا۔ غنی شیدا کا ہم زاد ہونے کے ساتھ اس کا لنگوٹیا یار بھی تھا۔ اس نے ہر عشق کی بازی میں جیت کا احوال سب سے پہلے غنی کو سنایا۔ اس کے بیان کو سچ مان لیا جاتا تو گاؤں میں شاید کوئی ہی کنواری تھی تو محض اس لیے کہ ابھی جوان نہیں ہوئی تھی۔

غنی بھی اس چار کے ٹولے میں شامل تھا جو ایڈونچر کی سنسنی خیزی کے لیے بہت کچھ کرتے تھے۔ مثلاً ہفتے میں ایک دو بار کوئی خفیہ طور پر پیغام پہنچاتا تھا کہ روسٹ کرنے کے لیے دو عدد مرغیاں دستیاب ہیں... مہینے دو مہینے میں کوئی بکرا بھی اغوا ہوکے ان کے پیٹ میں پہنچ جاتا تھا۔ ان کا اڈا گاؤں سے باہر ایک ٹیلے پر بنا ہوا کسی پرانے مندر کا کھنڈر تھا جہاں لوگ دن میں بھی جاتے ہوئے ڈرتے تھے اور اکثریت قسمیں کھا کے بتاتی تھی کہ ایک بھوت نے اس کا پیچھا کیا تھا جس نے کفن پہن رکھا تھا اور وہ درخت سے لٹکا ہوا تھا۔ یہ ڈرامائی کرتب شیدا دکھاتا تھا تاکہ ان کی خفیہ کارروائی کا اڈا نظر بد سے محفوظ رہے۔ ایک بار انہیں یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا اور غصہ آیا کہ اس جگہ پر ایک لنگوٹی پوش ہٹا کٹا ملنگ قابض ہے جو وہاں اپنا جن اتارنے اور تعویذ گنڈے کا بزنس کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے مل کر اسے بہت مارا اور پھر پولیس چوکی والوں کے حوالے کردیا کہ یہ فلاں کی بکری چرا کے لے جارہا تھا۔ رات بھر کی تفتیش میں اس نے سات بکرے اور ستائیس مرغیاں پہلے بھی چوری کرنے کا اعتراف کرلیا تو پولیس نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ دوبارہ نظر نہیں آیا۔ آئے دن غائب ہونے والی مرغیوں اور بکروں کا پراسرار معما حل ہوگیا۔ غنی کا کردار ان معاملات میں ایک مبصر یا مشیر کا رہتا تھا کیونکہ عقل کی فراوانی کے باعث وہ افلاطون کہلاتا تھا۔

رشتے داروں کے رخصت ہونے کے بعد غنی کے والد ماجد نے اس کے مستقبل کا نقشہ اس کے سامنے رکھا جو اس نے غنی کی اماں کے ساتھ مل کر بنایا تھا۔ ”بس اب کل سے تو بیٹھ دکان پر... زمین پر کام کرنا تیرے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ تو مجھ پر اور اپنے بھائیوں پر چھوڑ دے۔“

ماں نے اور آگے کی بات کی۔ ”اللہ نے چاہا تو اگلے سال میں تیرا بیاہ پھوپی صغراں کی بیٹی سے کروں گی۔ بات تو میں نے پہلے ہی کرلی تھی مگر وہ کچھ نخرے دکھا رہی ہے۔ اپنی

www.paksociety.com

خالہ صغراں کی بیٹی کیا کم ہے۔''

غنی نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ ''بس اماں! یہ سب بہت دور کی بات ہے۔ ابھی تو مجھے پڑھنا ہے۔''

ابا نے سر ہلایا۔ ''جو آج تک کسی نے نہیں پڑھا..... اور اسی لیے میں نے بہتر سمجھا کہ دکان پر تو گاہکوں سے نمٹے اور حساب کتاب رکھے۔''

''نہیں ابا! مجھے لاہور جا کے کالج میں داخلہ لینا ہے۔ بی اے کرنا ہے۔''

میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ''وہ کیوں؟ نوکری کرنا چاہتا ہے تو؟''

''وہ بعد کی بات ہے۔ میرا مقصد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہے۔''

حصولِ علم کی اہمیت اور فضیلت پر غنی کا لیکچر شروع ہونے سے پہلے ہی رانا حمید نے برہمی سے کہا۔ ''آخر کس چیز کی کمی ہے یہاں..... سب مل کے محنت کرتے ہیں..... اللہ کے فضل سے اچھی گزر رہی ہے۔''

''خاک اچھی گزر رہی ہے..... تم اور میرے سارے بھائی سارا سال محنت کرتے ہو..... حاصل کیا ہوتا ہے تمہیں؟ زندگی جیسے پچاس برس پہلے گزر رہی تھی، آج شاید اس سے بدتر گزر رہی ہے۔''

''فضول بکواس مت کر۔''

''میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں ابا..... پہلے ہم زیادہ خوش حال تھے۔ زمیندار کہلاتے تھے۔ پھر زمین تقسیم ہو گئی چار بھائیوں میں..... اب جو ہمارے پاس ہے اس کے کتنے حصے دار ہیں؟ مجھ سمیت پانچ... جیسے تم نے اپنے حصے کی زمین پر یہ گھر بھی بنایا... کیا میرے بھائی نہیں بنائیں گے؟ اس گھر میں تو اب جگہ نہیں رہی۔ پتا نہیں دو بھائی اپنی بیویوں کے ساتھ ایک کمرے میں کیسے سوتے ہیں۔ ان کے بچے سردی گرمی کھلے آسمان کے نیچے رہتے ہیں۔ بارش میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح اندر گھس جاتے ہیں۔ کتنی زمین آئے گی ہر ایک کے حصے میں؟ اور اس پر مکان کھڑا کرنے کے بعد کاشت کے لیے کتنی ہوگی... تمہارے بعد.....؟''

ابا نے مشتعل ہو کے بیوی کو دیکھا۔ ''دیکھ یہ سور کا بچہ ابھی سے میرے مرنے کی بات کر رہا ہے۔''

ماں نے صورتِ حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''پتر غنی! آخر تم مل کے بھی تو کاشت کر سکتے ہو... اور رہنے کا کیا ہے، او پر دو کمرے ڈال دیں تو بہت جگہ۔''

''یہ کام اب تک کیوں نہیں ہو سکا؟ اور میرے چاچے، تائے کیوں ابا کے ساتھ مل کے زمین پر کام نہ کر سکے؟ روایت تو بہت پہلے خود تم نے ڈال دی تھی ابا... اب ہم سے کہتے ہو کہ مل کے رہو... میں نے فیصلہ کر لیا ہے کالج جانے کا۔''

ابا نے چلا کے کہا۔ ''کالج کا خرچ تیرا باپ دے گا۔''

غنی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''نہ دے باپ... میں خود پورا کر لوں گا۔'' اس نے دروازے کی طرف دوڑتے ہوئے خود کو ابا کے فلائنگ جوتے کا نشانہ بننے سے بچانا چاہا مگر غوطہ لگانے سے جوتا کمر کے بجائے اس کے سر پر لگا۔ وہ اس رات لوٹ کے گھر نہیں گیا۔ اس کے یاروں نے غنی کی اطلاع پر ملے جلے جذبات کا اظہار کیا۔ شیدے کو غنی سے سو فیصد اتفاق تھا۔

''یار! کیا رکھا ہے یہاں... میں خود بہت جلد دبئی چلا جاؤں گا۔''

''دبئی کیسے چلا جائے گا؟'' ایک دوست نے سوال کیا۔

''اوئے دنیا جاتی ہے پھر شیدا کیوں نہیں جا سکتا؟'' اس نے سوال کرنے والے کی گدی پر ایک ہاتھ مارا اور پھر غنی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''مگر پتر افلاطون! مانا لاہور، لاہور ہے لیکن تو بی اے کر کے کیا کرے گا؟''

''ایم اے۔'' غنی نے طے شدہ جواب دیا۔ ''پھر بن جاؤں گا پروفیسر... پہلے کالج میں پھر یونیورسٹی میں... ایک دن کسی کالج کا پرنسپل یا یونیورسٹی میں وائس چانسلر... تم سب آؤ گے میرے پاس اپنے بچوں کو داخل کرانے... یا ہو سکتا ہے میں وزیرِ تعلیم بن جاؤں... میرے پاس دس گز لمبی کار ہو... لش پش کرتی جس پر پاکستان کا جھنڈا لگا ہو۔''

وہ سب دم بخود مرعوب بیٹھے سنتے رہے۔ اس قسم کے دعوے پہلے کسی نے بھی نہیں کیے تھے اور خود ان کی پروازِ تخیل بہت محدود تھی۔ سب کو اپنے پروگرام سے باخبر کرنے کے بعد غنی کا خیال ایک پختہ ارادہ بن گیا تھا کہ اسے لاہور جا کے پہلے کسی کالج میں داخلہ لینا چاہیے۔ باقی قسمت پر چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ دن میں پڑھے گا۔ رات کو کام کرے گا یا ٹیوشن پڑھائے گا۔ نیت صاف ہو تو ہمت میں برکت اللہ دیتا ہے۔ رات تک وہ شیدے کے گھر میں سویا کیونکہ اسے واپس گھر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ شیدے نے اسے سمجھایا تھا کہ رات بھر میں ابا کا غصہ اتر جائے گا۔ ماں باپ کا دل بڑا نرم ہوتا ہے۔ وہ دو چار دن کے لیے غائب ہو جائے تو خود ہی روتے دھوتے سارے زمانے میں اس کو تلاش کرتے نظر آئیں گے۔

غائب ہونے کے پروگرام سے غنی نے اتفاق نہیں کیا۔ صبح وہ گھر جا کے دیکھے گا کہ رات بھر ان کے خیالات بدلے ہیں یا نہیں۔ ہر صورت میں وہ سب کو بتا کے لاہور جائے گا۔ حسبِ توقع حالات اگر موافق نہیں ہوئے تھے تو خلاف بھی نہیں رہے تھے۔ غنی کا باپ اس سے بات کرنے کا روادار نہ تھا۔ اس نے نافرمانی کی تھی اور باپ کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ ماں اس کے لاہور جانے کے خیال سے افسردہ تھی اور چاہتی تھی کہ وہ اپنے ارادے پر نظرِ ثانی کرے۔ اس کے بھائی حاسدانہ انداز میں باپ کی طرف ہو گئے تھے۔ غنی کو کسی طرف سے بھی مالی مدد یا حمایت کی امید نہ تھی۔ سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ غنی گھر چھوڑ کے بی اے کرنے لاہور جا رہا ہے۔

ایک صبح وہ سورج نکلنے سے بھی پہلے ہوا خوری کے لیے باہر نکلا۔ رات کو یہ طے کر لینے کے بعد کہ آنے والا دن اس گاؤں میں اس کا آخری دن ہوگا، وہ جاگتا ہی رہا تھا۔ اپنے کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذہن ایسے ہی خیالوں میں مگن تھا۔ اچانک ایک...... پتھر اس کے سر پر لگا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں تارے سے چمک اٹھے... پھر ایک گالی دے کر اس نے پیچھے دیکھا۔ اپنے گھر کی چھت پر اس کی خالہ زاد بڑے فلمی انداز میں کھڑی تھی۔

''کیا ہوا؟ بڑے زور سے لگا ہے؟'' وہ شوخی سے منڈیر پر جھک آئی۔

غنی نے بھنا کے کہا۔ ''نہیں... مجھے تو پھول کی طرح لگا ہے۔ ایک اور مار اس سے دگنا بڑا۔''

''اچھا سوری... مگر میں کیا کرتی۔ آواز بھی دی تجھے مگر تو پتا نہیں کس کے خیال میں مگن جا رہا تھا۔ تجھے متوجہ کرنے کے لیے... یہ پھول پھینک دیا۔'' وہ ہنس پڑی۔

''اچھا اب بات کر، کیوں روکا ہے مجھے؟''

''ایسے؟ میں اوپر کوٹھے پر اور تو نیچے گلی میں...'' اس نے بڑی ادا سے دانتوں میں انگلی دبائی۔

''پھر؟ میں اوپر آ جاؤں یا تو نیچے آئے گی؟ میرے پاس وقت کم ہے ممتاز۔''

''ہائے، ایسی باتیں تو نہ کر جیسی بڈھے وصیت کرتے وقت کرتے ہیں۔ ابھی تو خیر سے بہت دن جیے گا تو... تیرے بیٹے، بیٹیاں اور نواسے پوتے ہوں گے۔ اچھا رات کو آ جا چاند نکلنے کے بعد۔''

وہ بھونچکا رہ گیا۔ ''کہاں آ جاؤں؟ یہاں تیرے کوٹھے پر تا کہ تیرے جنگلی بھائی میری ہڈیاں توڑ دیں۔''

''چل پھر میں آ جاؤں گی تیرے خفیہ ٹھکانے پر... بھوتوں والے مندر میں۔''

''جو کہنا ہے ابھی کہہ دے ممتاز... ایسی کیا بات ہے؟''

اس نے ایک بار پھر منڈیر پر جھک کر اپنے لمبے سیاہ بال نیچے لٹکا دیے۔ ''سنا ہے تو گھر سے بھاگ کے لاہور جا رہا ہے... مجھے چھوڑ کے؟''

غنی نے طنز سے کہا۔ ''نہیں... تو بھی چل میرے ساتھ ہمت ہے تو۔''

''ہمت کی بات مت کر... بتا کہاں ملے گا... ممتاز آ جائے گی... ملا ہاتھ۔'' اس نے اوپر سے ہاتھ کو مصافحے کے انداز میں ہلایا۔ ''آج رات بھوت مندر میں... چن چڑھنے کے بعد... میرا خیال ہے ابا جاگ گیا ہے۔''

اس سے پہلے کہ غنی کچھ کہتا، وہ غائب ہو گئی۔ غنی کچھ دیر بے وقوفوں کی طرح کھڑا رہا۔ اسے نہ تصدیق کا موقع ملا، نہ تردید کا۔ اپنی اس خالہ زاد سے وہ خوب واقف تھا۔ تمام کالی پیلی چھپکلی جیسی مریل یا بھینس لگنے والی ہر کزن کے مقابلے میں وہ قیامت تھی۔ حسن و رعنائی میں بھی اور ناز و ادا میں بھی۔ آدھے گاؤں کے سترہ سے ستر سال والے اس کے دیوانے تھے اور ممتاز یہ بات جانتی تھی۔ چنانچہ باقی آدھے گاؤں پر وہ اسی طرح اپنی اداؤں کے جال پھینکتی تھی اور چاہتی تھی کہ اس کے آگے کسی کا چراغ نہ جلے۔ وہ بدکردار نہیں تھی۔ شوخی اور شرارت میں ایسا کرتی تھی تاہم اس سے بلاوجہ اس کے گرد بدنامی کا ہالا سا بنتا جا رہا تھا۔ اس کے یارانِ غار میں سے شیدا عادت کے مطابق برملا اس سے تعلقات کا دعوے دار تھا اور شرط لگاتا تھا کہ وہ ممتاز کا دو بار بوسہ لے چکا ہے۔ بے شک اس سے پوچھ لو... مگر یہ ممتاز سے پوچھے کون؟

غنی نے ممتاز کے باپ کو گلی میں نمودار ہوتے دیکھا۔ وضو کے بعد وہ چہرے کو کندھے پر پڑے رومال سے صاف کر رہا تھا۔ ''اوئے غنی پتر! خیر سے تو نے بھی آج نیت کر لی فجر کے لیے نماز باجماعت کی... ماشاء اللہ... آ جا میرے ساتھ۔''

غنی انکار کیسے کرتا لیکن نماز کے دوران اس کے خیالات کا مرکز ممتاز رہی۔ اس کے مختلف پوز بار بار اس کے تصور میں آتے تھے۔ لڑکیوں کے معاملے میں غنی شرمیلا اور بزدل ہونے کی شہرت رکھتا تھا لیکن شیدے جیسے استاد کی حوصلہ افزائی سے وہ دو معاشقے کر چکا تھا۔ ایک تو مسلسل طور پر لڑکی ہی تھی لیکن وہ ممتاز کا پاسنگ بھی نہ تھی۔ شاید اسے بھی اور کوئی ملا

www.paksociety.com

نہ تھا کہ غنی نے امتحان سے پہلے والی سہ ماہی اس کے ساتھ گزار دی۔ امتحان سر پر آ گئے تو اس نے ایک مہینے کی چھٹی کی اور جب امتحان ختم ہوا تو اسے پتا چلا کہ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔ وہ پیا گھر سدھار چکی تھی۔ دوسرے عشق کو ناجائز تعلق کا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ ایک موچی کی زوجہ ثانی تھی جس نے صرف دو ہفتے بعد غنی سے مایوس ہو کے ایک زیادہ خوش حال عاشق تلاش کر لیا تھا۔

دن بھر غنی پر ممتاز کا بھوت سوار رہا۔ اسے اپنی لاہور روانگی کا پروگرام مزید ایک دن آگے بڑھانا پڑا۔ ممتاز جیسی قیامت خیز حسینہ کے لیے تو وہ اپنا جانا ہمیشہ کے لیے بھی ملتوی کر سکتا تھا۔ اچانک اس پر جیسے خوشی اور خوش بختی کے سارے در کھل گئے تھے۔ اس نے ایسا خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ اس کی دنیا میں چھپر پھاڑ کے کوئی کوہِ قاف کی پری اتر آئے گی۔ وہ جس نے ایک عالم کو دیوانہ کر رکھا تھا، وہ اسے مل جائے گی۔ اسے بار بار خیال آتا تھا کہ بقول شاعر... میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں، یہ تبسم یہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو۔ اور ممتاز کی ایسی ہی عادت تھی، یہ غنی جانتا تھا پھر بھی نہ جانے کیوں اس کے اندر کی آواز کہتی تھی کہ ممتاز نے بلاوجہ اس کا راستہ نہیں روکا تھا۔ وہ اس کی منتظر تھی۔ دوسروں کی بات مختلف تھی۔ وہ ممتاز کا راستہ روکتے تھے۔ وہ انتظار کرتے تھے۔

اس نے بہت سوچ بچار کے بعد اپنے یارِ خاص شیدے کو شریکِ راز کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے مشورے کی ضرورت بھی تھی اور یہ خبر کسی کو سنائے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ کسی کو لاٹری کے انعام میں کروڑوں مل جائیں اور وہ اتنی بڑی خوشی کو دبا لے... یہاں تک کہ اپنی بیوی یا ماں تک کو نہ بتائے، یہ ناممکن تھا۔ اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔

شیدے کا پہلا تاثر بے یقینی کا اور اس کے بعد شاک کا تھا۔ ''یہ ممتاز نے خود کہا... تجھ سے؟''

''نہیں، اپنے باپ سے کہلوایا۔'' غنی جھلا کے بولا۔ ''اور کیا بھونک رہا ہوں اتنی دیر سے۔''

''تو واقعی بھونک رہا ہے۔ وہ تو ہے کتیا۔ ہر کتے کو پیچھے لگا لیتی ہے۔''

غنی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں سمجھا تھا تو عقل کی بات کرے گا مگر تو مشورہ دینے کے بجائے گالیاں دے رہا ہے مجھے بھی اور ممتاز کو بھی۔''

شیدے نے اسے بٹھا لیا۔ ''بُرا مت مان پتر... آزما کے دیکھ لے۔ ہمیں شیدا استاد نہیں کھوتے دا کھر کہنا اگر یہ بات غلط ثابت ہو... تو رات بھر بھوت مندر میں اکیلا بیٹھا...''

شیدے کی باقی بات فضول اور فحش تھی۔ وہ رات کو چاند نکلنے سے پہلے بھوت مندر میں جا بیٹھا اور اگرچہ یہ جگہ اس کے لیے دن رات میں ایک سی تھی لیکن نہ جانے کیوں وہ اندر سے شدید اضطراب کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ ایک خوف سے بھرا سوال تھا جو بے جواب تھا۔ اگر وہ سچ مچ آ گئی اور اس نے کہا کہ چلو... میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ لاہور... تو وہ کیا کرے گا؟ ممتاز کو ساتھ لے جا سکے گا؟ ابھی تو خود اس کا نہ آسرا تھا اور نہ ٹھکانا۔ ممتاز کو وہ کہاں رکھے گا اور کیسے... رہنے کے لیے جگہ چاہیے اور آمدنی... اکیلا آدمی فٹ پاتھ پر یا پارک میں کسی بینچ پر سو سکتا ہے۔ مگر ممتاز جیسی لڑکی ہو تو پھر سونے کے لیے چھت چاہیے اور چھت کے نیچے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ بیوی ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ پہلے شادی کرے، کہاں؟ کیسے؟ اور یہ معرکہ سر کر لے تب بھی زندگی گزارنے کی صورت کیا کرے؟ وہ اتنا پریشان اور مایوس تھا کہ اس کی عقل بھی گھاس چرنے چلی گئی تھی۔ یہ بھی اس کے لیے ناقابلِ تصور تھا کہ وہ ممتاز کو نصیحت کر کے واپس گھر بھیج دے اور گھر سے بھاگنے والی لڑکیوں کے شرمناک، عبرتناک، خوفناک انجام پر لیکچر دے کر اسے آنسو بہاتا چھوڑ کر لاہور روانہ ہو جائے۔

اس کے بعد جو ہوا... غنی نے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایسا کرنا بھی غنی کے لیے ناممکن تھا۔ اچانک رات کے نیلگوں دھندلکے میں ایک سایہ نمودار ہوا۔ دل کی آنکھ سے غنی نے اس سائے کو پہچان لیا۔ اس کی ہر دھڑکن نے کہا۔ ممتاز... ممتاز... وہ پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا اور وہ سایہ واضح طور پر ممتاز کے پیکرِ حسن میں ڈھل گیا۔ وہ سچ مچ آ گئی تھی۔ بے خطر آتشِ عشق میں کود پڑی تھی۔ لڑکی ہونے کے باوجود اس نے عشق کو ایک چیلنج کی طرح غنی کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اب اس کی باری تھی۔ یہ اچانک ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ خطرات اور انجام کے بارے میں سوچے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا، جو گزرے گی ہم پر ایک ساتھ گزرے گی۔ وہ لڑکی ہو کے خوفزدہ نہیں تو مجھے کچھ مردانگی ضرور دکھانی چاہیے۔

ابھی وہ اٹھا ہی تھا کہ عقب کے درختوں سے تین سائے اور نمودار ہوئے۔ ایک نے چیخ کے کہا۔ ''رک جا بے غیرت... کہاں جا رہی ہے؟''

دوسرے نے جو چیز لہرائی وہ کلہاڑی تھی۔ ''ہم سب کی عزت کا جنازہ نکالے گی؟ اس سے پہلے ہم تیرا قصہ پاک کر دیں گے۔'' یہ آواز اس کے باپ کی تھی۔

ممتاز چیخ مار کر بھاگی مگر ناہموار زمین پر وہ موت کے ان فرشتوں سے زیادہ تیز نہیں بھاگ سکتی تھی جو اس کے تعاقب میں تھے۔ دس بیس گز پر انہوں نے ممتاز کو جا لیا۔ غنی کی پھٹی آنکھوں نے یہ منظر کسی مُردے کی طرح دیکھا۔ وہ بلاشبہ اس خونی لمحے میں مر چکا تھا۔ اس کا وجود ایک لاش کی طرح پتھر ہو گیا تھا اور اس کے احساس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہی تھی۔ کلہاڑی کا وار ممتاز کے شانے پر ہوا۔ پھر ایک ڈانگ اس کے سر پر پڑی۔ اس نے قتل کرنے والوں کی آوازیں بھی سنیں اور قتل ہونے والی ممتاز کی بھی جو اپنی زندگی کے لیے اپنوں سے بھیک مانگ رہی تھی۔

نہ جانے یہ کتنے سیکنڈ تھے... کتنے منٹ... گھنٹے یا زمانے... پُرآسیب سناٹے میں جیسے خون کی مہک شامل ہو چکی تھی۔ اب کہیں کوئی حرکت نہ تھی۔ جب غنی کو ہوش آیا تو وہ اپنی پناہ گاہ سے باہر آیا۔ ممتاز نے یا اس کے قاتلوں میں سے (جو اس کے اپنے تھے) کسی نے بھی غنی کا نام نہیں لیا تھا۔ کوئی اس کی تلاش میں بھوت مندر تک نہیں آیا تھا۔ وہ سب ممتاز کی لاش کو سمیٹ کر لے گئے تھے۔ مردہ قدموں کو گھسیٹتا وہ اس جگہ تک پہنچا جہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ چاند نے ایک درخت کی اوٹ سے نکل کے اسے روشنی فراہم کی۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکا تو اس نے زمین کی سرخی دیکھی اور بیٹھ گیا۔ بے اختیار اس نے اپنا ہاتھ اس مٹی پر رکھا۔ لہو کی نمی رکھنے والی مٹی اس کے ہاتھوں سے چمٹ گئی۔ اس نے خون کو دیکھا... سونگھا... پھر پاگلوں کی طرح اس نے خون آلود مٹی کو اکٹھا کیا۔ اس ساری مٹی کو اس نے اپنی جھولی میں بھرا۔ اسے پتا ہی نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ خود اس کے دل کا لہو آنسو بن کر اس مٹی میں شامل ہو رہا ہے۔

''ممتاز! اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' اس نے یہ آواز بلند کہا۔ ''صبح تک ہم نکل جائیں گے۔ بہت دور... جہاں ہمیں نہ کوئی دیکھ سکے گا اور نہ پکڑ سکے گا۔''

اچانک کسی نے اس کو جھنجوڑا۔ ''غنی! یہ کیا کر رہا ہے تو؟''

غنی نے شیدے کی طرف دیکھا۔ ''وہ آئی تھی شیدے، ممتاز...''

''آئی تھی؟ پھر کہاں گئی؟'' شیدے نے بے یقینی سے کہا۔

غنی نے اپنی جھولی پھیلائی۔ ''جاتی کہاں... وہ میرے ساتھ ہے۔ یہ دیکھ... یہ ہے نا ممتاز میری آغوش میں۔''

شیدے پر لرزہ طاری ہو گیا۔ غنی سے پوچھے بغیر اس نے سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ غنی اب زمین پر گر گیا تھا اور دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ''انہوں نے اسے مار دیا شیدے۔ وہ آئی تھی اپنا وعدہ نبھانے، میرے ساتھ جانے۔''

شیدے نے اسے تسلی دی۔ ''غنی! یہ دیوانگی چھوڑ... ہوش میں آ... جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب نہ تو کچھ کر سکتا ہے نہ میں... تیرے حق میں بہتر یہی ہے کہ ابھی اسی وقت نکل جا... یہ نہ ہو اس کہانی میں کہیں تیرا نام بھی آ جائے۔ ممتاز کو بھلا دے۔ جیسے ایک دن پہلے وہ تیرے لیے کچھ نہیں تھی، آج بھی نہیں ہے۔ اس کے غیرت مند چاچے مامے اس کو کہیں دفنا دیں گے، ان کا بال بھی بیکا نہیں ہو گا۔ جنازہ ممتاز کا اٹھے گا... ان کی غیرت کا نہیں۔''

''میں ان میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا شیدے۔''

''پہلے تو خود اپنے زندہ ہونے کا سوچ۔'' شیدے نے کہا۔ ''صبح ہونے سے پہلے غائب ہو جا۔ میں کہہ دوں گا کہ وہ تو صبح ہی چلا گیا تھا۔''

شیدے نے زبردستی غنی کے خون آلود کپڑے اتارے اور اسے اپنے کپڑے پہنائے۔ وہ خود برہنہ کھڑا رہا۔ ''میری فکر مت کر۔ میں ان کپڑوں کو بھی جلا دوں گا اور خود بھی اندھیرے میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ کپڑے مل جائیں گے مجھے۔''

شیدا اندھیرے میں غائب ہو گیا تو غنی نے محسوس کیا کہ وہ غنی نہیں ہے۔ وہ غنی مر گیا تھا جس نے ممتاز کو مرتے دیکھا تھا۔ گاؤں والوں کی مرغیاں، بکریاں چرانا بھی جرم تھا مگر جوانی کا ایک بے ضرر اور پُرخطر کھیل... قتل جیسا سنگین جرم اس نے اپنی آنکھوں سے ہوتا دیکھا تھا اور خود بھی اپنی بزدلی کے باعث ان لوگوں میں شامل ہو گیا تھا جو اس جرم کا کوئی حوالہ کہیں دینا نہیں چاہتے تھے۔ جو بے غیرت، بزدل، بے ضمیر اور شیطان تھے۔ اسے زندگی سے اتنا پیار تھا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا چند قدم چلا پھر اس کی نظر نے چاند کے مدھم اجالے میں ہموار زمین پر کچھ پڑا ہوا دیکھا۔ یہ کپڑوں کا ایک بنڈل سا تھا۔ وہیں بیٹھ کے اس نے چھوٹی سی گٹھڑی کو کھولا۔ یہ نیلے رنگ کا ایک دوپٹا تھا جس پر زرد پھول تھے۔ اندر ایک ریشمی پیلی شلوار تھی، دوپٹے جیسی ریشمی قمیص تھی۔ کپڑوں کا بنڈل کھولتے ہی اندر سے سونے کی چوڑیاں، کنگن، بالیاں، بندے اور دو نیکلس نکل کے باہر گر گئے۔

www.paksociety.com

ان کے ساتھ نوٹوں کے بنڈل تھے۔ اندھیرے میں بھی غنی کی نگاہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ بڑے نوٹ تھے۔ لاکھوں کا زیور اور لاکھوں نقد کے ساتھ ممتاز اپنے لیے صرف ایک اضافی جوڑا لے کر گھر سے نکل آئی تھی۔ غنی کے ساتھ زندگی کے لیے، پُرخطر اور جان لیوا سفر پر روانہ ہوگئی تھی۔ ظاہر ہے یہ سب غنی کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے تھا۔ وہ جانتی تھی کہ غنی کے پاس ایک مضبوط ارادے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ خود اپنے لیے تو اس نے تن پر ایک جوڑا رکھا تھا اور ایک اضافی جوڑا جس میں اس نے یہ مال و متاع چھپا لیا تھا۔

یکلخت غنی کو دکھ کی ایک اور لہر بہا کے لے گئی۔ وہ دیوانہ وار چلّا چلّا کے رونے لگا۔ ممتاز کے کپڑوں کو اپنے منہ پر ملنے لگا جس میں سے اس کے بدن کی خوشبو اسی طرح پھوٹ رہی تھی جیسے مٹی سے اس کے خون کی مہک اٹھی تھی۔ وہ زمین پر سر مارتا رہا۔ ممتاز... ممتاز... یہ تُونے کیا قرض چھوڑ دیا مجھ پر... اسے میں کیسے ادا کروں گا... سوچے سمجھے بغیر تو گھر سے ایسے سفر کے لیے نکل گئی جس میں واپسی نہیں تھی اور سفر کے آغاز سے پہلے ہی راہ بدل لی۔ وہ صبح تک خاک بسر وہیں لیٹا رہا۔ یہ احساس دل کے دورے والے درد کی طرح اسے بار بار تڑپاتا تھا کہ وہ جس کی ایک محبت بھری نظر کے لیے زمانہ ترستا تھا، کتنی خاموشی سے وہ اسے چاہتی رہی۔ اس کی محبت کو ٹی بی کے مرض کی طرح روگ بنا کے پالتی رہی۔ انتظار کرتی رہی کہ کبھی تو خود غنی بھی اس کے سامنے آئے گا۔ ان سب کی قطار میں جو اپنا امیدوں کا کشکول لیے اس سے نگاہِ کرم کی بھیک مانگتے تھے اور پھر وہ اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دے گی۔ اسے بتا دے گی کہ وہ تو کب سے اس کے انتظار میں تھی لیکن یہ نہ ہوا اور پھر اس سے پہلے کہ غنی ہمیشہ کے لیے دنیا کی بھیڑ میں کھو جاتا، اس نے بتا دیا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلے گی۔

آثارِ سحر کے نمودار ہونے سے پہلے نیم بیداری کی کیفیت میں اس نے ممتاز کی آواز سنی۔ ”غنی... غنی... اٹھو اور نکل جاؤ یہاں سے... تمہیں میری قسم ہے... یہ سب تمہارا ہی ہے جو میں لائی تھی۔ جب میں جسم و جاں کے ساتھ تمہاری ہو چکی تھی تو پھر یہ کیا چیز ہے۔“ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔

ممتاز کو اس نے ایک سفید سائے کی طرح عین اسی جگہ دیکھا جہاں اس کے لہو نے زمین کو سیراب کیا تھا۔ ”ممتاز!“ وہ چلّایا اور دیوانہ وار اس کی طرف دوڑا مگر وہ تاریکی میں تحلیل ہوگئی۔ ”کہاں ہو تم ممتاز... ممتاز...“ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور اسے پکارتا رہا مگر جواب میں ایک سرگوشی سی گونجتی رہی... ”تمہیں میری قسم ہے... جاؤ... چلے جاؤ...“

اس نے سب کچھ لپیٹ کر بغل میں دبایا اور چل پڑا۔ جی ٹی روڈ تک تین کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی جب اس نے ویگن اڈے پر ایک سوزوکی پک اپ کو آتا دیکھا۔ دن میں یہاں بڑی گہما گہمی ہوتی تھی اور لاہور کے لیے ہر قسم کی سواری مل جاتی تھی۔ کچھ پرائیویٹ کاروں والے سوا سو روپے سواری پر چار افراد کو لے جاتے تھے مگر اس وقت کوئی موجود نہ تھا۔ وہ پک اپ میں بیٹھ گیا۔ وہ لاہور کا نام لیتے لیتے رک گیا۔ اس کی خطرے سے خبردار کرنے والی چھٹی حس نے اسے محفوظ راستہ اختیار کرنے کی راہ سجھائی۔ اس نے وزیر آباد کا سودا کیا۔ دن کے دس بجے ناشتا کر کے وہ ویگن میں سیالکوٹ پہنچا اور ایک رات ہوٹل میں رہا۔ اگلی صبح وہ علامہ اقبال ایکسپریس سے لاہور پہنچا۔

اس لمبے سفر میں اس کا سارا وقت سوچتے ہوئے گزرا تھا۔ ممتاز کا تصور اور خیال اب بھی اس کے اعصاب پر سایہ فگن تھا۔ وہ جس کے بارے میں غنی نے کبھی ایسے نہ سوچا تھا، اس کی زندگی پر بجلی بن کر گری تھی اور سب کچھ خاکستر چھوڑ گئی تھی۔ اسے کوئی شک نہ تھا کہ ممتاز اس سے محبت کرتی تھی اور اس کے ایک اشارے کی منتظر تھی۔ یہ اشارہ ملتے ہی اس نے فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگائی۔ اعتماد اسے خود پر تھا کہ غنی اس کی محبت کے حصار کو توڑ کے کہیں جا ہی نہیں سکتا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے رہی ہے۔ کوئی جوا نہیں کھیل رہی ہے جس میں ہار کا امکان ہو۔ اپنی تباہی کا کوئی سامان نہیں کر رہی ہے۔ ہاں، یہ اسے ضرور اندازہ ہوگا کہ...... غنی کے ساتھ بھاگ جانے سے اس کے خاندان کی کیسی رسوائی ہوگی۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اس کے باپ کی ”پگ“ کبھی نیچی نہ ہوئی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اس پر ہاتھ ڈالے۔ جب خود اپنی بیٹی اسے سب کے سامنے فرشِ خاک پر گرا دے تو پھر زندگی بھر وہ نظر اٹھا کے کسی سے بات بھی کرے تو کیسے... سر اٹھا کے عزت کے غرور میں رہنا تو دور کی بات ہے... کچھ عجب نہیں کہ وہ خودکشی کر لے۔ وہ بوڑھا، بلڈ پریشر کا مریض اور مغرور شخص انتہائی خود پرست تھا اور پھر اس کے بھائی...

اس کے باوجود ممتاز نے ایک فیصلہ کیا تو اس پر قائم رہی۔ آخر اس کی رگوں میں بھی اسی ضدی خاندان کا خون دوڑ رہا تھا۔ اس نے اپنا تمام ذاتی استعمال کا زیور لیا ہوگا۔ کیا

پتا ماں کا زیور بھی سمیٹ لیا ہوگا۔ وہ صرف زمیندار ہی نہیں چاول کے بہت بڑے آڑھتی بھی تھے اور حافظ آباد کا باسمتی ایکسپورٹ بھی کر رہے تھے۔ وہ لاکھوں روپے کے سودے کرتے تھے۔ بینک کے ساتھ پیسا ان کے گھر میں بھی موجود رہتا تھا۔ بعد میں غنی نے شمار کیا تو وہ ڈھائی لاکھ سے اوپر کی رقم تھی۔ اس کا ذہن یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا کہ ممتاز کی چوری کس نے پکڑی اور کیسے... قضا کے نامہ بر نے کیسے خون کا رشتہ رکھنے والوں کو مطلع کیا کہ وہ کب نکلی ہے اور کہاں گئی ہے؟ کیا اس کے قاتلوں کو یہ بھی اندازہ ہوگا کہ وہ کس کے ساتھ جانے کے لیے نکلی تھی؟ شاید نہیں...!

ممتاز کے بارے میں اسے کوئی شک نہیں تھا کہ اب تک وہ قبرستان میں بے نام مٹی کے ایک ڈھیر کے سوا کچھ نہیں ہوگی۔ عزت داروں نے اس کی موت پر بھی عزت کا جھوٹا پردہ ڈال دیا ہوگا۔ کہا ہوگا کہ اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ وہ مغرب کے وقت نہانے کے بعد کھلے بالوں کے ساتھ چھت پر چلی گئی تھی۔ کسی جن نے دبوچ لیا۔ رات کو بس ایک خون کی الٹی آئی اور ختم۔ کس کی مجال کہ چودھری کے بیان پر شک کرے۔ سب اکلوتی بیٹی کے یوں مرنے پر اس کے ساتھ دکھی ہوں گے۔ اس کے جنازے میں سارا گاؤں شریک ہوا ہوگا اور مولوی صاحب نے اس کی مغفرت کی دعا بھی کی ہوگی جس پر اس کے قاتلوں نے ہرگز آمین نہیں کہا ہوگا۔ خیر، کچھ دن میں معلوم ہو جائے گا کہ فریقِ ثانی کے طور پر غنی کا نام بھی ممتاز کے جرم میں لیا جا رہا ہے یا نہیں۔ ممتاز کے گھر والے اپنی عزت کی چادر سے اپنا جرم چھپانے میں کامیاب رہیں گے مگر وہ ”دوسرے بندے“ کو تلاش ضرور کریں گے۔ آخر کون تھا وہ ماں کا خصم جس نے اتنی جرأت کی اور اتنی خاموشی سے ہماری عزت پر ڈاکا ڈالا... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے سزا نہ ہو۔

اپنے طور پر غنی بھی طے کر چکا تھا کہ وہ ممتاز کے بے گناہ لہو کا قرض ضرور اتارے گا۔ خواہ اس میں کتنا بھی وقت لگے۔ ایک ایک کر کے وہ ان سب کو اسی طرح مارے گا جیسے انہوں نے ممتاز کو اس کی نظروں کے سامنے مارا تھا۔ بیس جولائی کی تاریخ اس کے دماغ میں لوحِ مزار بن کے نقش ہو چکی تھی۔ وہ گاؤں ضرور جائے گا۔ بیس جولائی کو ہر سال اس کی قبر پر پھول رکھے گا اور اس کے لیے دعا کرے گا۔ وہ شیدے سے کہہ دے گا کہ قبر کا نشان مٹنے نہ دے۔

موبائل فون صرف شیدے کے پاس تھا اور اس کا نمبر بھی غنی کو یاد تھا۔ لاہور پہنچتے ہی غنی نے اپنے لیے ایک اچھا سا موبائل فون لیا اور چند روز فرضی نام سے ریلوے اسٹیشن کے پاس ایک ہوٹل میں رہا۔ دن کے وقت وہ باہر نکلتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں پولیس اسے تلاش نہ کرتی پھر رہی ہو۔ اس کا کسی کالج میں داخلہ لے کر بی اے کرنے کا خیال اپنی جگہ تھا بلکہ اب وسائل دستیاب ہونے کے باعث پہلے سے زیادہ راسخ ہو گیا تھا مگر اس کے لیے وہ اپنی زندگی کو داؤ پر نہیں لگانا چاہتا تھا۔ اگر ممتاز کے گھر والے پیچھے لگے تو وہ ہر کالج سے معلوم کر سکتے ہیں کہ غنی نام کے لڑکے نے کہاں داخلہ لیا ہے۔

آٹھویں دن ڈرتے ڈرتے غنی نے شیدے کو رات کے وقت فون کیا۔ یہ خیال اس کے دل میں ضرور تھا کہ شک ہوا تو شیدے سے بھی تفتیش ہوگی۔ پتا نہیں وہ کہاں ہوگا... کسی تھانے میں ہوا تو اس کا موبائل فون بھی اس کے پاس نہیں، کسی تھانے دار کی تحویل میں ہوگا۔ غنی طے کر چکا تھا کہ ایسا ہوا تو وہ فوراً موبائل تباہ کر کے دوسرا خرید لے گا لیکن جواب میں شیدے کی پُرسکون آواز سن کے غنی کو اطمینان ہوا۔ اس نے کہا۔ ”شیدے! میں غنی ہوں۔“

جواب میں غنی نے وہ گالی سنی جو شیدا اس کے نام کے ساتھ استعمال کرتا تھا۔ ”تو کہاں ہے؟“

”وہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے بتا تُو تھانے میں تو نہیں ہے؟“

”تھانے میں؟ پاگل ہوا ہے... اپنے گھر میں ہوں میں۔“

”اچھا اچھا... دراصل مجھے شک تھا کہ میرا پتا پوچھنے کے لیے پولیس میرے گھر والوں کو پکڑے گی یا دوستوں کو... ہماری باتیں تو نہیں سن رہا ہے کوئی...؟“

”نہیں، میں گھر سے باہر آ گیا ہوں۔ تُو مجھ سے چھپا رہا ہے کہ کہاں ہے؟“

”یار! میں لاہور میں ہوں۔ ایک ہوٹل میں۔ مجھے ڈر تھا کہ ممتاز کے گھر والوں نے میرا نام نہ لکھا دیا ہو...“

شیدا ہنس پڑا۔ ”تیرا نام کہیں بھی نہیں آیا۔ کسی کو بھی تجھ پر شک نہیں۔ اور شک کیسے ہوتا... میں بھی یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ ممتاز سب کو چھوڑ کے تیرے ساتھ جا سکتی ہے۔ پوچھا ضرور ہے انہوں نے سب کے بارے میں... خود ممتاز نے کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ کس کے ساتھ جانے کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ مارنے والوں نے اسے موقع بھی نہیں دیا تھا۔ تیرے بارے میں گھر والوں نے کہا کہ اس پر تو لاہور جا کے کالج میں داخلہ لینے کا بھوت سوار تھا۔ میں نے کہا کہ وہ تو کل ہی چلا گیا تھا۔“

www.paksociety.com

"اور ممتاز کے قتل پر انہوں نے کیسے پردہ ڈالا؟"

"وہ کیا مشکل تھا ان کے لیے... اگلے دن شام تک انہوں نے خبر چھپائی۔ میرا خیال ہے لاش کو انہوں نے صاف کیا۔ ایسے کہ خون کا ذرہ نظر نہ آئے۔ جب خون سوکھ گیا تو ہو سکتا ہے ٹانکے لگوائے ہوں۔ یہ صرف میرا خیال ہے پھر انہوں نے مشہور کیا کہ اس نے خودکشی کر لی ہے۔ گندم کو کیڑوں سے بچانے والی گولیاں کھا کے... کیونکہ اس کی ضد چل رہی تھی۔ وہ دسویں کا امتحان پرائیویٹ دینا چاہتی تھی اور کہتی تھی کہ مجھے خالہ کے پاس گجرات بھیج دو۔ ہم اس کی شادی کا فیصلہ کر چکے تھے اور ایک جگہ تو اس نے صاف انکار بھی کیا تھا۔ اس پر باپ بھی ناراض تھا اور بھائی بھی خفا تھے۔ کل دوسرے رشتے کی بات کی تو وہ پھر اڑ گئی کہ دسویں کے بعد کالج میں بھی پڑھنا ہے۔ اکلوتی تھی۔ اپنی ہر بات منوا لیتی تھی۔ اس بات پر سب نے کہا کہ یہ ناممکن ہے۔ اب ہم انکار نہیں سنیں گے۔ بس اسی بات پر ممتاز نے کہا کہ میں جان دے دوں گی اور ایک بھائی نے کہا کہ مرتی ہے تو مر جا... ہم زبان دے چکے ہیں۔ یہ کسے پتا تھا کہ وہ سچ مچ مر جائے گی۔ یہ کہانی چلی... سب نے بڑا افسوس کیا مگر رات تک اسے دفنا دیا گیا۔"

"دیکھ شیدے... خیال رکھنا... اس کی قبر کا نشان رہے۔"

وہ ہنسا۔ "کیوں؟ واپس آ کے تُو نے مجاور بننا ہے؟"

"مجاور چاہے نہ بنوں... مگر سال کے سال میں ضرور آؤں گا اور ان تینوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"اوئے پاگل خانے... جو کرنا ہے کر مگر اس کا اعلان مت کرا ایسے... رہی آنے کی بات تو تجھے روکا کس نے ہے، کل آ جا... قبر میں دکھا دوں گا رات کے وقت میں۔"

"ٹھیک ہے میں اور کسی سے نہیں ملوں گا... کل رات قبرستان کے باہر مل۔" غنی نے کہا اور فون بند کر دیا۔

شیدے کے اطمینان دلانے کے باوجود غنی اگلے روز ٹیکسی کر کے اپنے گاؤں پہنچا تو اس نے پرانی طرز کے مگر نئے شٹل کاک برقع میں خود کو روپوش کر لیا تھا۔ ٹیکسی واپس چلی گئی تو وہ باہر ہی باہر سے قبرستان کی طرف چلا گیا۔ اسی وقت رات کی سیاہ چادر بھی اسے چھپانے کے لیے ہر طرف پھیل گئی تھی۔ قبرستان اس کا دیکھا بھالا تھا... گاؤں میں عورتوں کا قبرستان جانا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ برقع اتار کے ایسا کرنا اس کی حیثیت کو مشکوک بنا دیتا کہ آخر وہ ممتاز کی قبر پر رات کے وقت کیوں فاتحہ خوانی کرنے آیا تھا۔ وہ خالہ زاد تھا اور کہہ سکتا تھا کہ ابھی لاہور سے پہنچا ہے مگر سوال یہ اٹھتا کہ آخر اسے کس نے اطلاع دی اور اسے معلوم ہو گیا تھا تو وہ تعزیت کے لیے پہلے خالہ خالو کے پاس کیوں نہیں گیا تھا۔

برقع اتار کے وہ ایک ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے وہ گاؤں کی طرف سے آنے والے شیدے کو دیکھ سکتا تھا مگر خود اسے کسی کی نظر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شیدا عشا کی اذان کے ختم ہوتے ہی نمودار ہو گیا۔ اب اس کی نظر غنی کو تلاش کر رہی تھی۔ غنی اچانک اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ دونوں خاموشی سے اندر چلے گئے۔ اندھیرے میں دھنسی ہوئی قبروں سے بچتے بچاتے وہ ممتاز کی قبر پر جا کھڑے ہوئے۔

بچپن سے پڑی ہوئی عادت کے مطابق دونوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے مگر اندر سے غنی کا دل رو رہا تھا۔ اس کا غم تازہ ہو گیا تھا۔ یہاں آ کے اس وقت کا ہر منظر غنی کی نظر میں یوں ٹھہر گیا تھا جیسے چلتے چلتے فلم رک جائے۔ ایک کے بعد دوسرا سین... وہ وقت جب ممتاز کا ہیولا چاندنی کے دھندلکے میں ابھرا تھا۔ وہ بے رحم لمحہ جب اس کے قاتل نمودار ہوئے تھے۔ ان کا ممتاز پر وار کرنا۔ ممتاز کی چیخ۔ اس کے جسم کا کٹے ہوئے درخت کے تنے کی طرح گرنا اور تڑپ کے ساکت ہونا۔ پھر قاتلوں کا اسے سمیٹ کر لے جانا۔ یہ سب وہ پھر دیکھتا رہا۔ اس نے ممتاز کے خون میں گندھی ہوئی مٹی کا جیلی جیسا چکنے والا لمس اپنی انگلیوں میں محسوس کیا اور اس کی پاگل کر دینے والی بُو کو احساس میں اترتا دیکھا۔

پھر شیدے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "چل بہت دیر ہو گئی... دعا اتنی لمبی نہیں ہوتی۔"

غنی کو احساس ہوا کہ وہ ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا مگر دعا نہیں مانگ رہا تھا۔ رسماً ہاتھوں کو منہ پر پھیر کے وہ وہیں بیٹھ گیا اور اپنا ایک ہاتھ قبر کی مٹی پر رکھ کے روتا رہا۔ شیدے نے اسے تسلی دی۔ "چل حوصلہ کر غنی! زندگی میں حادثات بھی ہوتے ہیں۔"

"وہ میری وجہ سے ماری گئی شیدے..."

"اگر میں کہوں کہ یہ غلط ہے... فیصلہ تو اس نے خود ہی کیا تھا نا... تیرے ساتھ جانے کا۔ تُو نے تو اسے نہیں کہا تھا۔ اپنے دل پر مت لے پتر... بس اس کو قضا لے آئی تھی ادھر... یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ کسی کو معلوم نہ ہوتا اور تم نکل جاتے... لیکن تقدیر کے لکھے کو مٹا سکتا ہے کوئی...؟"

شیدے کی باتوں سے غنی کو بڑا سکون اور حوصلہ ملا۔

"میں نے کبھی سوچا ہی نہیں، کتنی اچھی لڑکی تھی وہ۔"

"اس گاؤں کا کوہِ نور ہیرا تھی ممتاز۔" شیدے نے آہ بھری۔

"ایک بات پوچھوں شیدے... تُو نے ایک بار کہا تھا کہ دو بار تُو نے ممتاز کا بوسہ لیا تھا۔"

شیدے نے دونوں کان پکڑ لیے۔ "اللہ مجھے معافی دے۔ اس کی قبر پر بیٹھ کے میں کیسے جھوٹ بولوں۔ بکواس کی تھی میں نے، بڑ ماری تھی۔ ایک بار، صرف ایک بار میں نے اس کا راستہ روک کے کہا تھا... سوہنیو ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں... اور اس نے جوتی اتاری تھی کہ مجھے ان عورتوں جیسا مت سمجھنا جو تیرے لیے رات کو دروازے کھول دیتی ہیں یا تیرے بلانے پر کھیتوں میں آ جاتی ہیں۔ اسے ایک ایک کا نام معلوم تھا یار... میری بڑی سخت بے عزتی کی تھی اس نے۔"

غنی نے کئی بار سوچا مگر پھر ممتاز کے لائے ہوئے نقد اور زیور کے بارے میں کچھ بتانے کا ارادہ بدل دیا۔ ممتاز کے بارے میں گھر والوں نے جو کچھ مشہور کیا تھا، اس میں مال و زر کا کوئی حوالہ نہ تھا۔ نہ انہوں نے چوری کی رپورٹ لکھوائی تھی اور نہ ڈاکے کی۔ اعتماد کے باوجود غنی کے دل میں شبہ تھا کہ اتنی دولت کا سن کے شیدے کے دل میں حصہ طلب کرنے کا خیال نہ آ جائے۔ دولت کی ہوس ایسی ہی ہوتی ہے۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ غنی! آخر میں نے بھی تیری مدد کی تھی کہ تن کے کپڑے اتار کے دے دیے تھے اور خود برہنہ اپنے گھر گیا تھا۔

"چل! میں گھر تک تیرے ساتھ چلتا ہوں۔" شیدا بولا۔

"نہیں یار! میں واپس جاؤں گا۔ آج کسی سے نہیں ملوں گا۔ خوامخواہ شک نہ آئے کسی کے دل میں... لیکن میں پھر آؤں گا۔ تجھ پر بھروسا ہے اس لیے بتا رہا ہوں۔ میں سب سے پہلے اس کے باپ کو قتل کروں گا پھر بھائیوں کو... ہر سال بیس جولائی کو ان میں سے کسی ایک کا خون ممتاز کی قبر پر ڈالوں گا۔ مجھے اس کا بدلہ ضرور لینا ہے۔"

"پاگل مت بن غنی! جا کے لاہور میں داخلہ لے اور بی اے کر جیسے تُو چاہتا تھا۔ میں ملتا رہوں گا تجھ سے۔"

"میں بھی فون کرتا رہوں گا... صرف تجھے... مگر میرے بارے میں کسی کو بھی نہ بتانا... میرے ماں باپ کو بھی نہیں... جن کے لیے میں مر گیا ممتاز کے ساتھ ہی۔"

دونوں دوست پیدل ساڑھے تین کلومیٹر چل کے جی ٹی روڈ تک گئے۔ وہاں انہوں نے ایک روڈ سائڈ ریسٹورنٹ کی کھلی جگہ پر لگی کرسیوں پر بیٹھ کے کھانا کھایا۔ برقع غنی نے واپسی پر ایک کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔ شیدے پر اپنی مالی حیثیت ظاہر نہ کرنے کے لیے وہ اس کے سامنے لاہور جانے والی ویگن پر سوار ہو گیا۔ اب وہ مطمئن اور پُراعتماد تھا۔ مجرم سمجھے جانے کے خوف سے نجات ملنے کے بعد وہ ایک بدلا ہوا غنی تھا جس کو اب اپنے مستقبل کی کامیابی کا سفر جاری رکھنا تھا۔ وہ سفر جس کے لیے وہ اکیلا نکلنا چاہتا تھا مگر ممتاز نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا کہ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ وہ خود نہ رہی تھی مگر اس کی آواز ہر وقت یہ کہتی محسوس ہوتی تھی کہ غنی... تم وہ سب کرو گے جو تم کرنا چاہتے تھے۔ اب تو میں بھی تم پر بوجھ نہیں۔ میں نے تمہیں کامیابی کی بنیاد فراہم کر دی ہے۔ تمہارے مالی مسائل اب کوئی رکاوٹ نہیں۔

غنی نے کالج میں داخلہ لیا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنا اکاؤنٹ ایک بینک میں کھولا اور وہاں تھوڑی تھوڑی رقم جمع کراتا رہا۔ اپنی رہائش کے لیے اس نے ریلوے اسٹیشن کے سامنے ایک پرانے ہاسٹل میں کمرا حاصل کر لیا تھا جہاں اب طالب علم کم تھے، ملازمت پیشہ افراد زیادہ تھے جو طالب علم کے طور پر نام لکھا کے یا کئی گنا زیادہ کرایہ دے کر رہتے تھے۔ اس نے زیور کو بھی ایک سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے ٹھکانے لگایا۔ اس نے مظلوم اور مصیبت زدہ بن کے "ماں" کا زیور ان سناروں کو دیا جو چوری کا مال بھی خریدتے تھے مگر بہت کم قیمت پر... یہ رقم بھی اس کے بینک اکاؤنٹ میں ہی گئی۔

وقت وہ مسیحا ہے جو یادوں کے ناسوروں سے نجات کی تلاش میں سرگرداں انسان کو ہر بہانے کا مرہم فراہم کر دیتا ہے۔ آدمی کے اندر کی خود غرضی اسے ماضی کے جذباتی رشتوں سے دور دھکیلتی ہے۔ وہ صرف اپنے لیے جینے کے چکر میں اپنی نظر کو مستقبل پر مرکوز کر دیتا ہے۔ پہلا سال گزرنے تک غنی پر ممتاز پوری طرح سایہ فگن رہی۔ وہ بیس جولائی کو گاؤں بھی گیا۔ خاندان کی رسوائی کا سبب بننے والی اس عورت کی برسی کسی کو یاد رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ شیدا اور وہ ممتاز کی قبر پر رات کے وقت گئے تو آس پاس چند نئی قبروں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہاں کوئی لوحِ مزار نہ تھی جس سے قبر کی شناخت ہوتی۔ اتفاق رائے سے وہ ایک قبر پر رک گئے۔ غنی نے اپنے دوست کو بالکل یاد نہیں دلایا کہ اسے ممتاز کی قبر کو محفوظ رکھنا تھا اور اس کی مٹی کو بارش کے بہاؤ سے بچانا تھا۔ شیدے نے بھی غنی سے نہیں پوچھا کہ وہ ممتاز کے باپ کو قتل کیوں نہیں کر سکا۔ وہ دو ماہ قبل طبعی موت مر گیا تھا۔

www.paksociety.com

دوسرے سال خود غنی کو بیس جولائی یاد نہ رہی۔ ممتاز کا خیال اب کبھی کبھی اس کے تصور میں کسی پرانی تصویر کی طرح ابھرتا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح غنی کے خوابوں میں نہیں آتی تھی۔ چار دن بعد چوبیس جولائی کو اسے یاد آیا کہ وعدے کے مطابق وہ ممتاز کی قبر پر حاضری دینا بھول گیا تھا۔ اسے شرمندگی ضرور ہوئی مگر اس نے خود سے کہا۔ چلو تاریخ وفات نہ سہی ممتاز کی یاد تو نہیں بھولی... لیکن بی اے میں پہنچنے تک وہ سب ہوا جس کی غنی کو امید نہ تھی۔ انتہائی کمینگی، خودغرضی اور سفاکی کے ساتھ وہ ممتاز کو عمرِ رفتہ کے ایک حادثے کی طرح بھول گیا۔ یہ بھی بھول گیا کہ اس کا بینک بیلنس اس کا نہیں ممتاز کا ہے۔ وہ بھول گیا کہ اس نے اپنے باپ کے سامنے کالج کی تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کیا دعوے کیے تھے کہ وہ دن میں پڑھے گا اور رات کو کام کرے گا۔ ٹیوشن پڑھائے گا یا رکشا چلائے گا۔ اب اس کے پاس کفالت کے لیے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ غنی یہ بھی بھول گیا کہ آمدنی نہ ہو تو خرچ کے لیے قارون کا خزانہ بھی ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ لاہور میں رہ کے اس نے صرف تعلیمی اخراجات اور رہائش یا کھانے پینے پر ہی رقم صرف نہیں کی، آہستہ آہستہ وہ شہر کے ماحول میں ڈھلتا گیا۔ اس کے کچھ نئے دوست بن گئے تو شیدے سے کبھی کبھار کا فون پر رابطہ بھی نہ رہا۔ اس نے اچھے کپڑے پہن کے سیر و تفریح کے مواقع بھی تلاش کر لیے اور بینک سے رقم نکلواتے وقت کبھی یہ نہیں دیکھا کہ باقی کتنا بچا ہے۔

اس کے نئے دوستوں میں غلام عباس کے باپ کی لبرٹی مارکیٹ میں ریڈی میڈ گارمنٹس کی دکان تھی۔ ارشد محمود کا باپ بجلی کے محکمے کا ایس ڈی او تھا اور اس کی اندھی کمائی تھی۔ صفدر علی کا باپ ٹھیکے دار تھا۔ وہ سب باپ کی کمائی پر عیش کرتے تھے۔ غنی کے لیے ان کے برابر خرچ کرنا ممکن ہی نہ تھا مگر وہ ذہین اور چالاک تھا۔ اس نے آسانی سے ہر ایک کے خوشامدی مشیر جیسی حیثیت حاصل کر لی اور اخلاقیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سب کے ذاتی کام کرنے لگا۔ صفدر علی تو اسے کئی جگہ اپنے سیکریٹری کی حیثیت سے متعارف کرا چکا تھا۔ اس نے ارشد محمود کو بی اے کی تیاری کرائی اور غلام عباس کو امتحان پاس کرنے کے لیے نقل کرائی۔ جائز ناجائز دیکھے بغیر وہ ان کا ہر کام کر دیتا تھا یا کرا دیتا تھا۔ اس کے بدلے میں وہ ان کی گاڑیوں میں ہر جگہ ساتھ گھومتا پھرتا ...اور عیش کرتا تھا۔

ظاہر ہے کہ ذاتی مفادات اور خودغرضی پر استوار یہ دوستی کا رشتہ قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ چند ایک نے اسے چھوڑ دیا۔ کہیں خود اس کے لیے کسی کا ذلت آمیز رویہ ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ اس نے نئے دوست بنائے۔ بالآخر اس نے بی اے کر لیا۔ کالج کا زمانہ ختم ہوا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ پھر تنہا ہے۔ اس کے پرانے دوست اب نظر بھی آتے تھے تو منہ پھیر لیتے تھے۔ وہ سب اپنے اپنے خاندانی کاروبار میں لگ گئے تھے۔ جب ایم اے کا رزلٹ آیا تو فرسٹ کلاس آنے پر اسے خوشی سے زیادہ غرور محسوس ہوا لیکن اس خوشی پر یہ دکھ کا احساس غالب رہا کہ اپنی خوشی میں وہ تنہا ہے۔ وہ ماں باپ، بہن بھائی جنہوں نے اس کے میٹرک میں کامیاب ہونے پر مٹھائی بانٹی تھی اور برادری کی دعوت کی تھی، اب کہیں تھے تو اس کے نہ تھے۔ اس دن غنی برسوں بعد ممتاز کو یاد کر کے بھی رویا اور اس نے اپنے بچپن کے یاروں کو بھی یاد کیا جن کے ساتھ مل کے وہ مرغیاں اور بکرے چوری کرتا تھا اور دعوتیں اڑاتا تھا۔

پرانی یادوں کی اس خلش نے غنی کو اتنا پریشان کیا کہ اگلی صبح وہ بس میں سوار ہو کے کاموکے منڈی پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ وہ جگہ کتنی بدل چکی ہے۔ مین روڈ سے ساڑھے تین کلومیٹر دور جہاں اس کا گھر تھا، اب نئی آبادی تھی اور چاول کے کارخانے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے ایک پرانے دوست کا سراغ لگایا۔ وہ بھی اب شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ اس نے بتایا کہ غنی کے ماں باپ تو دو سال قبل آگے پیچھے ہی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ اس کے بھائیوں نے اپنے حصے کی زمین اچھے بھاؤ فروخت کر دی تھی کیونکہ یہ جگہ کارخانے دار خرید رہے تھے جو سڑک سے قریب تھی۔ اس کے بھائیوں میں سے ایک کسی کارخانے میں ملازم تھا۔ باقی یہاں سے ہجرت کر کے نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ خورشید اب دبئی میں تھا مگر اس کا کسی سے رابطہ نہ تھا۔ سخت مایوس اور دل شکستہ غنی میں ہمت نہ تھی کہ وہ قبرستان میں ممتاز کی قبر پر دعائے مغفرت کے لیے جائے مگر وہ ڈھیٹ بن کے گیا۔ وہاں وہی ہوا جس کی اسے امید تھی۔ سیکڑوں اضافی قبروں کے درمیان ممتاز کہیں گم ہو گئی تھی۔ روزِ حشر سے پہلے اس کے مدفنِ بے نشاں کا سراغ لگانا عملاً ناممکن تھا۔

غنی جب لاہور پہنچا تو اسے شدت سے احساس ہوا کہ اب وہ اتنی بڑی دنیا میں تنہا ہے اور اس کا مقابلہ وقت سے ہے۔ وقت جو کسی کا نہ تھا۔ کسی کا انتظار نہ کرتا تھا۔ وقت صرف ان کا تھا جو اسے قابو کرنا جانتے تھے۔ غنی کے سامنے مستقبل

ایک چیلنج کی طرح تھا۔ مفاد پرست اور زمانہ ساز وہ ہمیشہ سے تھا۔ شہر کے تجربات نے اسے جو عملی سبق دیے تھے وہ کتابی علم سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور خود اس کے سوا کسی کے لیے اہم نہیں چنانچہ اس پر تمام اختیار بھی اسے حاصل ہے۔ خوش قسمتی کسی کے در پر بار بار دستک نہیں دیتی چنانچہ جو پہلی دستک پر لبیک نہیں کہتا، وہ کامیابی کے سفر میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ سیاست کی طرح معاشیات کا بھی اخلاقی اصولوں سے دور کا... رشتہ نہیں... پیسا صرف پیسا ہوتا ہے...

اس کے باوجود غنی میں اتنی ہمت اور طاقت نہ تھی کہ ایک جست میں کامیابی کے آخری زینے پر پہنچ جائے اور راتوں رات دولت مند ہو جائے۔ ایسا ہو سکتا تھا اگر وہ کسی بینک میں ڈاکا ڈالے اور ایک کروڑ سمیٹ کے زندہ سلامت نکل آئے یا وہ ساڑھے سات سو روپے والا پرائز بونڈ خریدے اور اسے دو کروڑ کا انعام مل جائے۔ لیکن غنی الہ دین کے چراغ والے جن پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ وہ ناممکن کو خود ممکن بنانا چاہتا تھا۔ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے والے کو بھی پہلا قدم ہی چوٹی تک لے جاتا ہے۔ ملازمت یا بزنس... اس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یہ جاننے کے لیے کہ اب اس کا سرمایہ کتنا ہے، اس نے بینک سے معلوم کیا تو اسے ایک اور صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ اس کے اکاؤنٹ میں بس اتنے ہی پیسے تھے کہ وہ دو چار مہینے تنگی ترشی سے گزار لے۔

پچھتانا لاحاصل تھا۔ لاکھوں کی رقم ایک دن میں غبار بن کے نہیں اڑی تھی۔ ممتاز نے چھ سال اس کی کفالت کی تھی۔ وہ اپنی محبت اور اپنی زندگی تو غنی کو نہ دے سکی لیکن اسے ایم اے کی ڈگری دلا گئی۔ اگر وہ پڑھنے کے ساتھ کچھ کام کرتا اور اپنے اخراجات پورے کر لیتا تو وہ سرمایہ آج دگنا ہوتا اور وہ کوئی بھی چھوٹا موٹا کاروبار کر لیتا۔ اس نے کالج کے زمانے میں جو دوست بنائے تھے، ان سے بھی وقتی فائدہ حاصل کیا۔ کسی ہوٹل میں ایک شام... کوئی تحفہ... کسی زر خرید حسینہ کے ساتھ آخری پہر کی خیرات میں ملنے والی شبِ وصل... کسی کی اترن کے بیش قیمت کپڑے جوتے... ایسا کوئی نہیں جس کا اثر رسوخ آج اسے آگے بڑھانے میں کام آئے۔ جو ہاتھ تھام کے اسے اوپر کھینچ لے اور بلندی کا سفر شروع ہو جائے۔

مجبوراً غنی نے ملازمت کی تلاش کا آغاز کیا۔ قدرتی طور پر اس کے ذہن میں وہ ملازمت تھی جہاں صرف تنخواہ پر بسر نہ ہو، اوپر کی آمدنی کے راستے کھلے ہوں۔ اوپر جانے یا باہر نکلنے کے مواقع میسر ہوں۔ فوراً نہ سہی دو چار سال میں وہ اس منزل تک پہنچ جائے جس کے بعد راستے خود بلاتے ہیں۔ رکے بغیر چلنے والا جس منزل کا چاہے انتخاب کر لے... لیکن... وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں۔ اس کا اندازہ غنی کو چند مہینے کی دربدری میں ہو گیا۔ اس نے آسانی کے لیے اسلامیات کے مضمون کو منتخب کیا تھا اور فرسٹ کلاس بھی لے لی تھی مگر اب اسے ہر جگہ احساس دلایا گیا کہ اس نے صرف وقت ضائع کیا تھا۔ آخر تم نے انگلش... ریاضی اور سائنس کیوں نہیں پڑھی... اسلامیات میں ایم، اے تو مسجد میں پیش امام ہی ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ کسی فرقے سے وابستہ ہو کے جان کی بازی لگا دے یا اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد خود بنا لے۔ ناکامیوں نے اسے شاعر بنا دیا اور اس نے اپنا تخلص بھی غمگین کر لیا تھا۔ ایک دن وہ پاک ٹی ہاؤس میں چائے پی رہا تھا جو دوبارہ کھولا گیا تھا۔ لمبے لمبے بالوں... دھنسے ہوئے گالوں اور موٹے گول شیشوں کی عینک لگائے ایک کھدر پوش اس کی میز پر آ بیٹھا۔ اس نے دو بار چائے منگوائی اور غنی کو دو غزلیں اور چار نظمیں سنانے کے بعد پوچھا کہ تمہیں بھی شعر و ادب سے کچھ لگاؤ ہے... غنی نے بتایا کہ تک بندی وہ بھی کر لیتا ہے اور غمگین تخلص رکھتا ہے۔"

غنی کی نظم سن کے وہ شخص دم بخود رہ گیا۔ "یہ واقعی تم نے لکھی ہے... میرا مطلب ہے چوری تو نہیں کی ہے؟"

"لاحول ولاقوۃ... بچپن میں مرغیاں چرائی تھیں۔ اب چوری کا خیال آیا تو کسی کا مال چراؤں گا یا کسی سیٹھ کی بیٹی کی عزت پر ڈاکا ڈالوں گا۔"

"تم کرتے کیا ہو برخوردار؟"

"ابھی تو بس یہی شاعری... وقت ضائع کرنے کے لیے... اور کوئی کام جو نہیں... ایم اے فرسٹ کلاس ہوں مگر مجھ سے زیادہ بھکاری کما رہے ہیں۔ آپ کو بھی ایک سامع کی تلاش تھی اس لیے چائے پلا دی۔"

"بس بس میاں غمگین... ہم سمجھ گئے تمہارا سارا غم... اب دیکھو ایک پیشکش ہے ہماری طرف سے... خالص کاروباری، تمہاری یہ شاعری تمہارے کام نہیں آسکتی... لیکن ہم اسے کارآمد بنا سکتے ہیں۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"چلو آسان اردو میں سنو۔ ہر روز تم جتنی غزلیں نظمیں لکھو... سو روپیا فی غزل اور نظم ہمیں دے دو۔ اسی جگہ ہوگا نقد سودا... اگر منظور ہے تو یہ لو سو روپے ایڈوانس۔"

www.paksociety.com

غنی بھونچکا رہ گیا۔ ''آپ کیا کریں گے ان کا؟''

''دیکھو میاں، تم اپنی پیداوار دو اور نقد لو... کیا سمجھے۔''

غنی اگر کچھ سمجھا تھا تو یہ کہ اس کے مقابل بیٹھا ہوا کارٹون درحقیقت ایک ہوشیار بیوپاری ہے جو کسی آڑھتی کی طرح اس کا مال اٹھائے گا اور کسی شہرت کی منڈی میں اپنے دام پر دے گا۔ اصل منافع اسے حاصل ہوگا۔ اس نے کہا۔ ''حضرت! ایک نظم ایک رات میں تولد ہوتی ہے اور یہ ذہنی تخلیق کی اذیت کسی صورت دردِزہ سے کم نہیں ہوتی۔ آپ میرے یہ لختِ جگر صرف سو روپے میں خریدنا چاہتے ہیں۔''

''چلو میاں، دو سو لے لو۔''

''جسم فروشی سے بھی ارزاں سخن فروشی؟ نہیں بندہ پرور۔'' وہ اٹھنے لگا۔ ''پانچ سو لینا بھی میری مجبوری ہے ورنہ...''

چند دن غنی نے ہزار روپے روز کمائے۔ یہ کام اس کے لیے مشکل نہیں تھا لیکن یہ کام بہرحال نہیں تھا۔ ایک دن اسے فٹ پاتھ پر سے کچھ بہت پرانے ادبی رسالے مل گئے۔ اس نے غیر معروف شعراء کا کلام نقل کرکے اس شعر و سخن کے تاجر کو بیچ دیا۔ وہ ہر روز ایک جگہ ایک ہی وقت پر ملتا تھا۔ پاک ٹی ہاؤس میں چائے پینے کے ساتھ وہ اخبارات بھی دیکھتا تھا۔ وہیں اس نے پروفیسر عباسی کا اشتہار دیکھا۔ یہ آئیڈیا اسے اچھا لگا۔ کیا ہے اگر وہ کسی طرح برطانیہ چلا جائے۔ ملازمت کے لیے یا سیاحت کے لیے جانے کا تو چانس ہی نہیں تھا۔ تعلیم ایک بہانہ بن سکتی تھی۔ تعلیمی اخراجات وہاں ملازمت کرنے سے خودبخود پورے ہو جائیں اور بعد میں دو سال کا جاب ویزا بھی ملے تو اور کیا چاہیے۔ صرف جانے کا کرایہ تو کیا جا سکتا ہے۔ پھر واپس کون آتا ہے۔ لندن کے لاکھوں غیر قانونی تارکینِ وطن میں گم ہو جانے والے کو کون تلاش کرے گا۔ کچھ رقم اس کے اکاؤنٹ میں تھی۔ کچھ مزید شاعری بیچ کے حاصل کی جا سکتی تھی۔

اگلی صبح وہ مال پر واقع اس ہوٹل میں پہنچ گیا جس کا پتا اشتہار میں دیا گیا تھا۔ وہاں چالیس پچاس نوجوان اور بھی بیٹھے تھے۔ اس کی باری آتے آتے شام ہوگئی۔ انٹرویو دے کر آنے والے کسی کو کچھ بتائے بغیر سیدھے نکل جاتے تھے۔ ان کی صورت سے امید یا ناامیدی کے جذبات کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ غنی کو پہلے نسبتاً چھوٹے کمرے میں پروفیسر کی سیکریٹری نے ریسیو کیا۔ وہ ایک ہوش اڑا دینے والی فرنگی حسینہ تھی جو اندر قدم رکھنے والے کے ہوش و حواس پر بجلی بن کے گرتی تھی۔ سنہری بالوں، نیلی آنکھوں اور میدہ و شہاب جسم والی یہ بائیس چوبیس سالہ لڑکی جتنی لباس کے اندر تھی، اس سے کہیں زیادہ باہر تھی۔ اس کا حسن و شباب اس چار گرہ کپڑے سے بھی ابل کر باہر آنے کے لیے بے قرار تھا۔

اس نے غنی سے رسمی قسم کے چند سوالات کیے۔ ایک فارم بھرا اور اسے اندر بھیج دیا۔ اندر ڈرائنگ روم جیسے ماحول میں پروفیسر عباسی نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا شائستہ آدمی تھا جس کی زیادہ توجہ خود کو برطانوی نژاد ثابت کرنے پر تھی۔ اس کے لیے وہ لباس سے زیادہ لب و لہجے سے کام لیتا تھا۔ اس نے مختصراً اپنی داستان حیات سنائی کہ کیسے ایک بٹلر کا بیٹا آج ایک انتہائی نامور یونیورسٹی میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ پھر غنی پر ثابت کیا کہ ایسی کامیابی ہر ایک حاصل کر سکتا ہے۔ غنی کی ایم اے میں فرسٹ کلاس اس کی ذہانت اور محنت کی عادت کو ظاہر کرتی تھی۔

غنی کے خواب اس وقت ٹوٹے جب پروفیسر نے کہا کہ اسے ایک سال تک لندن میں رہائش کا خرچ ایڈوانس جمع کرانا ہوگا اور کم سے کم دو سیمسٹر کی فیس بھی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا بینک اسٹیٹمنٹ لائے جس میں کم سے کم بیس لاکھ کی رقم ہو۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ کسی جاننے والے سے یہ رقم عارضی طور پر ادھار لے کر اپنے اکاؤنٹ میں ڈال سکتا ہے اور بینک سے اسٹیٹمنٹ دینے کے بعد واپس کر سکتا ہے۔

غنی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''شاید کچھ لوگ ایسا کر سکتے ہوں مگر میں نہیں کر سکتا۔''

عباسی نے کہا۔ ''پھر تو میں بھی تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔''

غنی باہر والے دروازے کے پاس پہنچ کے رکا۔ ''اگر یہ سب آپ اشتہار میں واضح کر دیتے تو نہ آپ کا وقت ضائع ہوتا نہ میرا۔''

شفاف شیشے والے دروازے کے پیچھے غنی کو ایک اور لڑکی نظر آئی۔ اس کے بھی بال سنہری تھے اور رنگ روپ میں بھی وہ اس فراڈ شخص کی بے شرم و حیا والی حسینہ سے بہتر تھی مگر وہ پاکستانی تھی اور اس کا لباس بھی قابل اعتراض نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ وہ اگلی امیدوار تھی جو اس انتظار میں تھی کہ غنی باہر نکلے تو وہ اندر جائے۔ انٹرویو کے منتظر امیدواروں میں لڑکیاں بھی تھیں مگر غنی نے اس لڑکی کو نہیں دیکھا تھا اور یہ ناممکن لگتا تھا کہ وہ کہیں موجود ہو اور نظر نہ آئے۔ اس کے پیچھے غنی کو ایک نوجوان نظر آیا جو اس کا جائزہ لے رہا تھا لیکن یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ غنی کو دیکھ رہا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

باہر والے کمرے میں وہ میڈ ان انگلینڈ حسینہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ غنی باہر آیا تو اس کا جائزہ لینے والا نوجوان پلٹ کے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ غنی کو اب اس کے ہاتھ میں ڈیجیٹل کیمرا نظر آیا۔ شاید اس نے غنی کی تصویر اتاری تھی۔ غنی کے سوال پر اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔ ”یہاں آنے تک نہ جانے کتنے کیمروں کی آنکھ نے تمہیں دیکھا ہوگا۔ یہ تو سیکیورٹی سسٹم کا حصہ ہے۔ تمہاری ویڈیو فلم بھی بنی ہوگی۔ میں تمہاری تصویر لے کر کیا کروں گا؟“

غنی باہر آ گیا۔ لاؤنج میں اس وقت بھی ایک درجن کے قریب امیدوار موجود تھے۔ ان میں دو لڑکیاں بھی تھیں مگر ایک بھی دیکھنے کے قابل نہ تھی۔ خصوصاً دو حسن کے شاہکار دیکھنے کے بعد... غنی پروفیسر عباسی سے زیادہ خود سے خفا تھا۔ بیس لاکھ کے بینک اسٹیٹمنٹ کی توقع اس غریب ملک کے ایک بے روزگار آدمی سے جو خواب میں بھی بیس لاکھ نہیں دیکھتا... آخر کیا حق پہنچتا ہے ان خواب فروشوں کو جو فائیو اسٹار ہوٹلوں میں اپنے امپورٹڈ خوابوں کی دکان سجا لیتے ہیں۔ چلو چلو ڈالروں کی سرزمین... کینیڈا... آسٹریلیا... اٹلی... ساری دنیا تمہارے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے بیٹھی ہے۔ سب نے خزانوں کے منہ کھول دیے ہیں کہ آئے کوئی لوٹنے والا۔ اور جب اس جیسے پڑھے لکھے گدھے ان خوابوں کو آنکھوں میں بسائے آتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ حقیقت کتنی مختلف اور بے رحم ہے — غزلیں چرا کے اور نظمیں بنا کے پانچ پانچ سو میں ایک فراڈیے سے فراڈ کرنے والا بیس لاکھ کی بینک گارنٹی کیسے فراہم کرے گا۔

ہوٹل کے بیرونی دروازے تک پہنچنے سے قبل ہی کوئی بولا۔ ”آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“

غنی کو اندازہ ہوا کہ غصے کی کیفیت میں وہ خود کلامی کر رہا تھا۔

اس نے دیکھا تو یہ وہی شخص تھا جو عباسی کے آفس کے باہر کھڑا تھا اور جس پر اسے شک تھا کہ اس نے غنی کی فوٹو اتاری ہے۔ تھرڈ فلور سے وہ اس کا تعاقب کرتا ہوا آیا تھا۔

”آپ کون ہیں؟“ غنی نے مشتبہ لہجے میں سوال کیا۔

اس نے غنی کا بازو تھاما۔ ”آئیے میرے ساتھ... میں بتاتا ہوں۔“

اجنبی کے اخلاق نے غنی کو بے بس کر دیا۔ وہ لاؤنج میں جا بیٹھے۔ چائے کا آرڈر اس نے دیا اور پھر غنی سے مخاطب ہوا۔ ”میں اس لڑکی کے ساتھ آیا تھا جو آپ کے بعد اندر گئی۔ میری کلاس فیلو تھی کسی زمانے میں... امیر ماں باپ کی بیٹی ہے۔ یہاں نظر آئی تو میں اوپر تک ساتھ چلا گیا تھا۔“

غنی نے تلخی سے کہا۔ ”اس کا سلیکشن تو لازمی ہو جائے گا۔ دولت بھی ہے اور دولتِ حسن بھی۔ خود تم یہاں کس لیے آئے تھے؟“

”میں کام کرتا ہوں یہاں... اسسٹنٹ منیجر ہوں، سب کو یہی بتاتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ویٹر ہوں۔ اس وقت وردی میں نہیں ہوں کیونکہ میری ڈیوٹی آٹھ بجے شروع ہوگی... صبح کے آٹھ تک۔ میرا نام عبداللہ ہے۔ ایم اے پاس ہوں۔“

غنی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ”ایم اے کر کے تم یہاں بیرا گیری کر رہے ہو؟“

”فاقے کرنے سے تو بہتر ہے... اور کیا تمہیں معلوم ہے کہ ویٹر یہاں کتنا کماتے ہیں؟ پچاس ہزار سے اوپر... تنخواہ تو ملتی ہے پندرہ ہزار، باقی ٹپ اور انعام... جتنا کوئی لے سکے... دینے والوں کے پاس کمی نہیں۔ ان ہوٹلوں میں خدمت کے معیار کا صلہ ملتا ہے۔ وہ کامیاب ہے جو ہر کام ”یس سر“ اور ”یس میڈم“ کے ساتھ سر جھکا کے کر دے۔ غلط صحیح کے چکر میں نہ پڑے... جو دیکھے اور سنے بھول جائے... اگر تم چاہو تو...“

”میں کبھی نہیں چاہوں گا مسٹر عبداللہ... مجھے گھر اس لیے چھوڑنا پڑا تھا کہ باپ مجھے میٹرک کے بعد پڑھنے کی اجازت دینے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ زمیندار تھا۔ اتنی محنت کے بعد میں نے ایم اے فرسٹ کلاس کیا ہے ویٹر بننے کے لیے؟“

عبداللہ مسکرایا۔ ”میں تمہیں ایک ویٹر سے ملواتا... لیکن وہ جیل میں ہے... اس کے پاس ہر مضمون میں ایم اے کی ڈگری تھی، ہر یونیورسٹی کی ڈگری... انگلش... اردو... پولیٹیکل سائنس... فزکس... کیمسٹری... جرنلزم...“

”تم مذاق کر رہے ہو۔“

عبداللہ بولتا رہا۔ ”ایک ہی سال میں دو ایم اے، بیک وقت کراچی اور لاہور سے اور سب میں فرسٹ کلاس لیکن سب جعلی۔“

غنی اچھل پڑا۔ ”وہ جعلی ڈگریاں تھیں؟“

”یس... کیا تم نے ایک مشہور فلاسفر کا یہ قول نہیں سنا کہ ڈگری تو ڈگری ہوتی ہے۔ اصلی ہو یا جعلی۔ لوگوں نے یہاں پی ایچ ڈی کر لیا۔ تھیسس عام فروخت ہوتے ہیں اور

بہت سستے... بتیس ہزار میں تمہیں مل سکتا ہے لیکن پھر ہوتا یہی ہے، آدمی انٹرویو میں بھی کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عملی زندگی کے امتحان میں اس کی قابلیت کا پول کھل جاتا ہے۔ اچھا دیکھو... اب میری ڈیوٹی کا وقت شروع ہونے والا ہے۔ مجھے وردی پہننی ہے... تم مجھے اپنا سیل نمبر دے جاؤ۔“

”وہ کس لیے... میں بتا چکا ہوں کہ یہ کام میں نہیں کر سکتا۔“

”مجھے اندازہ ہو گیا ہے لیکن یہاں آنے والے وہ ہوتے ہیں جو میرے تمہارے جیسوں کو ملازم رکھتے ہیں۔ کچھ میرے خاص مہربان ہیں... میں ان سے ذکر کروں گا۔ اب اس کا بُرا مت منانا کہ تمہاری سفارش کرنے والا ایک ویٹر ہے۔ دنیا کے کام اسی طرح چلتے ہیں۔“

غنی نے اسے اپنا فون نمبر دے دیا۔ یہ خیال اسے رات کو آیا کہ آخر عبداللہ صرف اسی پر اتنا مہربان کیوں ہوا؟ وہاں تو سارے ہی ضرورت مند تھے پھر اسے احساس ہوا کہ وہ خبطی ہوتا جا رہا ہے... اسے آم کھانے سے غرض ہونی چاہیے، پیڑ گننے کی کیا ضرورت ہے... کوئی اجنبی اس کے ساتھ نیکی کرنا چاہتا ہے تو اس میں بُرائی کیا ہے۔ حیرت انگیز طور پر تین دن بعد اس کے فون کی گھنٹی بجی تو دوسری طرف عبداللہ تھا۔ ”ایک بہت اچھی جاب ہے تمہارے لیے... ایڈریس نوٹ کر لو۔“

”کچھ کام کی نوعیت کے بارے میں نہیں بتاؤ گے؟“ غنی نے کہا۔

”کام تمہاری مرضی کا ہوگا، باعزت... معاوضہ معقول۔ مالک انتہائی مہذب... اور مجھے کچھ پتا نہیں... تم جاؤ اور بات کر کے کام سمجھ لو۔ کرنا نہ کرنا تمہاری مرضی... فون پر ٹائم لے کر جانا۔“

غنی نے پتا نوٹ کر لیا اور فون کیا تو کسی سیکریٹری نے اٹھایا۔ ”مجھے جمشید علی آغا سے ملنا تھا۔“

”کس سلسلے میں؟“

”انہوں نے مجھے جاب کے لیے بلایا ہے۔ عبداللہ نے ان سے کہا تھا۔“ غنی بولا۔

”پلیز ایک منٹ ہولڈ کریں۔“ سیکریٹری نے کہا اور فوراً ہی جواب دے دیا۔ ”آپ کل رات دس بجے کے بعد آ جائیں۔“ اس کے ساتھ ہی لائن منقطع ہو گئی۔

غنی کو بالکل اندازہ نہ تھا کہ جمشید علی آغا کا بزنس کیا ہے اور ایک ایم اے اسلامیات ان کے لیے کس طرح کارآمد ہو سکتا ہے جس کو ساری دنیا مسترد کر چکی تھی کہ وہ کسی لائق نہیں... اگلے دن اس نے فون پر عبداللہ سے پوچھا تو اس کی عقل خبط ہو گئی۔ وہ ایک پوری بزنس ایمپائر کا ہیڈ تھا۔ آغا کا نام ٹیکسٹائل پراڈکٹس میں سند کی حیثیت رکھتا تھا۔ ملک کے اندر بھی اور باہر بھی۔ وہ کروڑوں کا مال ایکسپورٹ کرتے تھے اور بیرونِ ملک سے بھی بہت کچھ منگواتے تھے۔ خلافِ توقع اسے فوراً ہی اپائنٹمنٹ مل گیا تھا۔ غنی حیران تھا کہ جمشید علی آغا جیسے بزنس میگنیٹ کو اس سے کیا کام ہو سکتا تھا۔ بہرحال وہ رات کو ٹھیک دس بجے اس کے آفس پہنچ گیا۔ وہ اپنا پرانا مگر سب سے اچھا سوٹ پہن کے گیا تھا۔ سیکریٹری نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ غنی کے لیے حیرانی کے بہت سے مواقع تھے۔ سب سے پہلے تو ملاقات کا وقت تھا۔ جب وہ یہاں پہنچا تو وہ پوری بلڈنگ تقریباً خالی اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی جس میں آغا کا آفس تھا۔ گیٹ لائٹس کے علاوہ لاؤنج روشن تھا جس میں لفٹس لگی ہوئی تھیں لیکن کاؤنٹر پر یا رکی ہوئی کسی لفٹ کے سامنے کوئی نہ تھا۔ اوپر نیچے کی منزلوں پر کہیں کہیں کوئی کھڑکی روشن تھی۔ کوریڈور کے علاوہ زینہ روشن تھا مگر تمام کمروں کے دروازے بند تھے جن کے باہر مختلف ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ خالص کاروباری عمارت تھی جس میں صرف دفاتر تھے۔ ٹاپ فلور کا نصف حصہ اوپن ایئر ریسٹورنٹ کے لیے وقف تھا مگر وہ بھی بند تھا۔ شاید وہ چلا ہی نہیں تھا کیونکہ رات کے وقت لوگ اس طرف فیملی کے ساتھ آنا ہی پسند نہیں کرتے تھے۔

غنی کو حیرت کا دوسرا جھٹکا سیکریٹری کو دیکھ کے لگا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو پی سی میں اس کے بعد انٹرویو کے لیے گئی تھی اور جس کے بارے میں عبداللہ نے کہا تھا کہ وہ بڑے باپ کی بیٹی ہے اور اس کی کلاس فیلو رہی تھی۔ یہاں وہ سیکریٹری بنی بیٹھی تھی۔ اس معاملے میں غنی کو دھوکا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اتفاق سے اس نے حسن کے دو ایک جیسے نمونے ایک ہی وقت میں ایک جگہ دیکھ لیے تھے۔ ایک مغربی انداز کا شاہکار تھا اور دوسری یہ مشرق کی محدود آزاد خیالی کا نمونہ... دونوں میں یکسانیت کا پہلو ان کا اجلا رنگ اور سنہری بال تھے۔ پی سی والی ولایتی حسینہ کی آنکھیں نیلی تھیں۔ پاکستانی لڑکی کی آنکھیں سیاہ تھیں۔ دونوں کی صورتوں میں مماثلت تھی اور دونوں کے حسن و شباب کی آتش فشانی میں فرق نہ تھا۔

سیکریٹری نے اچانک سوال کر دیا۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آپ مجھے؟“

غنی شرمسار ہو گیا۔ ”آئی ایم سوری... دراصل... مجھے شک ہوا کہ آپ کو میں چند دن قبل پی سی میں دیکھ چکا

www.paksociety.com

ہوں۔ آپ وہاں برطانیہ میں تعلیم کے خواہش مندوں کے ساتھ انٹرویو کے لیے گئی تھیں... آپ کا نمبر میرے بعد تھا۔''

''آپ کو شدید غلط فہمی ہوئی ہے مسٹر غنی!'' اس نے رواں انگریزی میں شائستگی سے کہا۔ ''میں پہلے ہی برطانیہ سے ایم بی اے کر آئی ہوں اور دوبارہ بھی جا سکتی ہوں اگر چاہوں... مجھے کسی فراڈ ایجنٹ کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

''آئی... آئی ایم ریئلی سو سوری... صورتوں میں مماثلت سے غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ کیا آغا صاحب فری ہیں؟''

''میں ان سے ملوا سکتی تو آپ کو یہاں کیوں بٹھائے رکھتی... آپ کی صورت دیکھنے کے لیے یا آپ کو اپنی صورت دکھانے کے لیے... فار یور انفارمیشن... اندر کوئی نہیں ہے۔ آغا جی آئیں گے تو بتا دوں گی۔''

غنی نے خود کو سخت بے عزت محسوس کیا لیکن ضرورت مندی کی مجبوری آڑے آ گئی اور وہ خاموش بیٹھا رہا۔ سیکریٹری کا جارحانہ انداز بھی اس کی حوصلہ شکنی کر رہا تھا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ دس بجے کے بعد والا انٹرویو آدھی رات کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کچھ کھا کے نہیں آیا تھا۔ اس خیال سے کہ انٹرویو کی رسمی کارروائی دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لے گی۔ اب اس کی آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں اور وہ خود لاحول پڑھ کے یا پھر بھی سہی کہہ کے اٹھنے ہی والا تھا کہ اس بد اخلاق حسینہ نے لیپ ٹاپ پر سے نظر اٹھائے بغیر اس سے کہا۔ ''جائیے اندر۔'' اور کسی سے چیٹنگ میں مگن رہی۔

غنی اندر گیا تو حیران تھا کہ آخر سیٹھ صاحب کہاں سے ٹپک پڑے۔ وہ اس کے سامنے سے تو گزرے نہیں تھے۔ یہ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ آغا صاحب آفس میں آنے کے لیے اپنی پرائیویٹ لفٹ استعمال کرتے تھے جس کا دروازہ ان کے آفس کی عقبی دیوار میں تھا۔ آفس خلافِ توقع بہت عالی شان اور مرعوب کن نہیں تھا۔ اس نے جمشید علی آغا کو گردے کی شکل والی شیشے کی آفس ٹیبل کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر براجمان دیکھا۔ جس بات نے غنی کو سب سے زیادہ چونکایا، وہ اس کی اور آغا جی کی صورتوں میں مماثلت تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو حیرت نے اس کے قدم روک لیے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے کرسی پر اس کا اپنا ہم زاد بیٹھا ہے... فلمی اسٹائل کا جڑواں بھائی۔ سو فیصد ایک سی شکل رکھنے والے جڑواں بھائی عملی زندگی میں عام تھے مگر غنی نے آج سے پہلے نہ آغا کا نام سنا تھا اور نہ کبھی اس سے ملا تھا۔ یہ اتفاق فلمی تھا۔

آغا اس کی حیرانی کو سمجھ کے مسکرایا۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''بیٹھو مسٹر غنی۔''

اب غنی کی سمجھ میں آنے لگا تھا کہ اس حد تک یکسانیت کے دیگر اسباب بھی تھے۔ آغا نے بالکل ویسا ہی سوٹ پہن رکھا تھا جیسا غنی پہن کے آیا تھا۔ اس کی ٹائی کے ڈیزائن میں بھی فرق نہ تھا۔ عمر میں وہ غنی سے کچھ سال زیادہ ہوگا لیکن قدرتی طور پر اس کی جسمانی ساخت ایسی تھی یا اس نے خود کو ڈائٹ اور ایکسرسائز سے اتنا فٹ رکھا تھا کہ وہ غنی کا ہم عمر لگتا تھا۔ وہ قد و قامت میں برابر تھے، ان کے ہیئر اسٹائل ایک جیسے تھے لیکن بلاشبہ ان کی صورت کے نقوش بھی بہت ملتے تھے۔

''تمہارے بارے میں مکمل معلومات مجھے حاصل ہو گئی ہیں... اس لیے میں رسمی سوال جواب میں وقت ضائع نہیں کروں گا غنی! میں سیدھا کام کی بات پر آتا ہوں۔'' آغا نے کہا۔ ''صورت حال تمہارے سامنے ہے۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ تمہاری صورت مجھ سے کتنی ملتی ہے... میں نے خاص طور پر یہ سوٹ اور ٹائی منگوائے تھے تاکہ میں دیکھ سکوں... تم کس حد تک مجھ سے مشابہ ہو۔''

غنی کی عقل خبط ہو گئی۔ ''مجھے صرف اس لیے منتخب کیا گیا ہے...''

اس کی بات کاٹ کے آغا نے کہا۔ ''یس... دس واز دی اونلی ریزن... تم میری ضرورت پوری کرتے ہو... ناؤ دی چوائس از یورس۔''

''میں ابھی تک سمجھ نہیں پایا کہ میرے کام کی نوعیت کیا ہوگی؟''

آغا بولتا رہا۔ ''تمہیں ایک خاص اور بے حد اہم ذمے داری سونپی جائے گی اور اسی کے مطابق معاوضہ ملے گا۔ یو ول بی مائی ڈبل... جب ضرورت پڑے گی، تمہیں میری جگہ جمشید علی آغا بن کے جانا ہوگا... ناٹ عبدالغنی۔''

غنی سخت بے یقینی، شکوک اور خوف میں مبتلا بیٹھا رہا۔ قدرتی طور پر اس کے اندر کی آواز میں چھٹی حس اسے خبردار کر رہی تھی کہ یہ کام خطرناک ہے لیکن اتنی دیر انتظار میں صبر سے کام لینے کے بعد وہ صورتِ حال کو سمجھے بغیر جانا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

آغا نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اگر اس ذمے داری کو صحیح طور پر نبھا سکے تو تمہیں ایک لاکھ روپے ماہانہ ملیں گے پہلے مہینے... دوسرے مہینے سے یہ دو لاکھ ہو جائیں گے... رہائش کے لیے جگہ اور آمد و رفت کے لیے دفتر کی گاڑی اس کے علاوہ... تم میری اجازت کے بغیر گھر سے بھی نہیں نکلو گے... مجھے ہر وقت معلوم ہونا چاہیے کہ تم کہاں ہو... تمہیں ایمرجنسی میں بھی طلب کیا جا سکتا ہے اور ہو سکتا ہے طویل عرصے تک تم سے کوئی کام نہ لیا جائے... لیکن تمہیں الرٹ اور ہر وقت تیار رہنا ہوگا۔ جب تم باہر جاؤ گے تو بالکل مختلف گیٹ اپ میں۔ ایسے کہ میرے جیسے نظر نہ آؤ۔''

''میں کچھ کچھ سمجھ گیا۔ کیا آپ مجھے چند سوالات پوچھنے کی اجازت ہے؟'' غنی نے کہا۔

آغا نے کہا۔ ''تمہیں ہر طرح سے مطمئن کرنا میرے لیے ضروری ہے۔''

''پہلی بات تو یہ سر... کہ آپ نے اپنا ڈپلی کیٹ رکھنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟''

''پرسنل سیکیورٹی کے لیے دنیا میں بہت سے لوگ ایسا کرتے آئے ہیں اور کرتے ہیں... ہٹلر اور چارلس ڈیگال کے بارے میں ایسا مشہور تھا۔ مجھے معلوم نہیں اس میں کتنی صداقت ہے مگر میں نے شاہ رخ خان... اسامہ بن لادن... اور اپنے ملک کے کچھ وی وی آئی پی کا درجہ رکھنے والے لوگوں کے بارے میں بھی ایسا سنا ہے اور نہ جانے کتنے سربراہ ایسا کرتے ہوں گے۔ ملکوں کے یا ملٹی نیشنل اداروں کے... یو سی... یہ آسان اور موثر طریقہ ہے... ہم صورت مل جاتے ہیں ورنہ بنائے بھی جا سکتے ہیں۔''

''آپ کو کس سے خطرہ ہے؟''

''یہ میں خود نہیں جانتا۔ پتا نہیں کون کیا ارادے رکھتا ہے۔ وہ اعلان تو نہیں کرتا ہوگا۔''

''آپ کے دشمن کون ہیں... یہ بھی نہیں جانتے آپ؟''

''تمہارے دشمن کون ہیں... ایسا کون ہے جس کے دشمن نہ ہوں... میں نے ہمیشہ دوست بنائے ہیں اور کسی کو موقع نہیں دیا کہ وہ دشمن ہو... مگر دلوں کا حال خدا کے سوا کون جانتا ہے؟''

''کیا میری جان خطرے میں ہوگی؟''

وہ ہنسا۔ ''ہر شخص کی جان ہر وقت خطرے میں رہتی ہے۔ سڑک پر حادثہ ہو جائے... جہاز گر جائے... کسی وجہ کے بغیر ٹرمینل تباہ ہو جائے... جو زلزلہ ابھی دو چار سال پہلے آیا تھا، اس میں لوگ گھر میں سو رہے تھے کہ مارے گئے اور وہیں دفن ہوئے تھے۔ زندگی، موت کی سواری ہے... ہر وقت... ہر جگہ۔''

''اگر کبھی میں یہ کام نہ کرنا چاہوں؟''

''آف کورس... زبردستی کوئی نہیں... تم جب چاہو جا سکتے ہو... اگر اتنا وقت دے دو کہ تمہارا متبادل تلاش کیا جا سکے تو اچھی بات ہوگی۔''

''مجھے کیسے تلاش کیا گیا تھا؟''

''میرے آدمی ہیں۔ پی سی جیسے ہوٹلوں میں ہر قسم کے انٹرویو ہوتے رہتے ہیں۔ پہلے بھی دو ملے تھے مگر ان کو بنانا پڑتا... تم ریڈی میڈ ہو... ٹریننگ تمہاری بھی ہوگی اور کچھ گرومنگ... دیکھ لو تم کب سے بے روزگار پھر رہے ہو... یہاں رہو یا باہر جاؤ... اتنی آمدنی تم اپنی صلاحیت کے مطابق حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ چانس تمہیں قسمت نے دیا ہے۔ اگر میرے اعتماد پر پورے اترو گے تو بہت فائدے میں رہو گے... لیکن...'' وہ بات کرتے کرتے رک گیا اور غنی کو گھورنے لگا۔

غنی نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''لیکن کیا سر؟''

''کسی غلط خیال کو دل میں مت آنے دینا۔ کیا میں غلط خیال کی وضاحت کروں؟ انٹر میں تم نے ایک ڈراما پڑھا ہو گا... پرزنر آف زینڈا... کہیں بھی میری جگہ لینے کی احمقانہ جرأت نہ کرنا... میرے آفس میں، میرے گھر کے بیڈ روم میں... ایک سو ایک جگہ تم اس مماثلت کا غلط استعمال کرنے کا سوچ سکتے ہو، ایسا کرو گے تو مارے جاؤ گے۔ میری سیکیورٹی بہت مستعد ہے اور میری ایک خفیہ سروس ہے جس میں نامعلوم لوگ ہیں۔ اندر کے بھی اور باہر کے بھی... پھر دیگر ذرائع ہیں، خفیہ کیمرے، مائک اور دیگر سراغ رسانی کے آلات... کسی کو پتا ہی نہیں چلے گا کہ جمشید علی آغا نمبر دو کہاں گیا۔ ایمان داری، وفاداری اور فرض شناسی... یہ تین اصول تمہارے پیش نظر رہنے چاہئیں... اپنی کوئی پرابلم ہو تو مجھے بتاؤ... دیٹ از آل... مجھے اور کچھ نہیں کہنا... تمہیں اور کچھ پوچھنا ہے؟''

غنی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''مجھے کب اور کہاں ڈیوٹی کے لیے رپورٹ کرنا ہوگی... اور کس کو...؟''

وہ مسکرایا۔ ''تم اسی لمحے سے ڈیوٹی پر ہو۔''

''میں نے تو ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا سر!''

''نیچے گاڑی کھڑی ہے، وہ تمہیں لے جائے گی۔ جہاں تمہیں رہنا ہے، وہاں سب کچھ مل جائے گا۔'' اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ ''گڈ نائٹ مسٹر آغا۔''

غنی نے کہا۔ ''آپ کا مجھ پر ٹرسٹ قائم رہے گا... جب تک میں زندہ ہوں۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

''ناٹ دس وے... میری لفٹ ادھر ہے۔'' آغا

www.paksociety.com

نے کہا۔

☆☆☆

غنی نے بہت سوچ سمجھ کے جواری بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ اپنی زندگی کے ایک پرانے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے کہ خوش قسمتی صرف ایک بار آپ کے دروازے پر دستک دیتی ہے... اگر وہ فیصلے میں دیر لگاتا تو یہ موقع گنوا دیتا۔ بظاہر اس کو خطرے کی بات نظر نہیں آتی تھی مگر آغا کی بات اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ زندگی موت کی سواری ہے۔ شیر کی سواری کا محاورہ اس نے سنا تھا۔ یہ محاورہ بہترین تھا۔ آپ ہر گھڑی ہر لمحہ موت پر سوار ہیں یا موت آپ پر سوار ہے۔ دونوں کا مطلب ایک ہی تھا۔ اس نے زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ پورے حساب کتاب کے ساتھ۔ اگر اس نے پوری عافیت کے ساتھ ایک سال بھی گزار لیا تو اس کے پاس ہوں گے پچیس لاکھ... اور سال گزر گیا تو پھر دوسرا سال زیادہ یقینی ہوگا... اسے کیا ضرورت ہے کہیں جانے کی یا ادھر ادھر دیکھنے کی... ساری دنیا اس کی قوتِ خرید میں ہوگی۔ اس کا دماغ خراب ہے کہ وہ غلط خیال کو دل میں آنے دے اور خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارے... بلکہ گردن پر...

رہائش کے لیے اسے جو گھر دیا گیا، وہ آبادی کے درمیان ہونے کے باوجود الگ تھا۔ یہ اونچی دیواروں والا ایک ایکڑ یعنی آٹھ کنال کا پلاٹ جوہر ٹاؤن میں تھا۔ اس کے گیٹ سے کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اندر کوٹھی ہے یا کچھ اور۔ یہاں کچھ لوگوں نے اپنے فارم ہاؤس اور سوئمنگ پول بھی بنا رکھے تھے۔ گیٹ بند رہتا تھا لیکن اندر ایک کیبن میں سیکیورٹی گارڈ چوبیس گھنٹے موجود رہتا تھا۔ دیوار پر کہاں خفیہ کیمرے تھے اور کہاں انفراریڈ شعاعوں کا نظر نہ آنے والا حصار... غنی کو کبھی اندازہ نہ ہوسکا۔ اندر گھنے درختوں والے باغ کے درمیان دو بیڈروم والا کاٹیج بنا ہوا تھا جس میں عیش و آرام کے تمام لوازمات مہیا کیے گئے تھے۔ غنی کی خدمت کے لیے ایک میاں بیوی ہمہ وقت حاضر تھے جو ظاہر ہے آغا کے جاسوس اور سیکیورٹی اسٹاف میں شامل ہوں گے۔ عورت اندر کے سارے کام کرتی تھی اور غنی کو اس کی فرمائش کے مطابق کھانا، ناشتا ملتا تھا۔ مرد باہر کے کام کرتا تھا جس میں ڈرائیونگ بھی شامل تھی۔

بیڈروم کے اندر کی وارڈروب میں درجنوں سوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے آغا پہنتا تھا۔ اس کے جوتے بھی ویسے ہی تھے۔ تیسرے دن نمودار ہونے والی دو عورتوں کی ٹیم نے اس کے ہیئر اسٹائل اور چہرے پر محنت کی۔ دو دن وہ گھر میں آرام کرتا رہا اور منتظر رہا کہ اسے کوئی ڈیوٹی دینے کے لیے طلب کیا جائے۔ اس کے پاس ایک الگ بلیک بیری موبائل فون تھا جس پر اسے ہدایات اور احکامات موصول ہوسکتے تھے لیکن یہ پیغامات نہ کوئی اور سن سکتا تھا اور نہ سمجھ سکتا تھا۔ یہ مخصوص مواصلاتی نظام جس کمپنی کی ایجاد تھا اس کا نام ''ریسرچ ان موشن'' تھا اور وہی تمام پیغامات کا ریکارڈ رکھتے تھے۔ رازداری کی یہی ضمانت دنیا بھر میں بلیک بیری فون کی کامیابی کی وجہ ہے۔

چند دن بعد غنی تنہائی سے اکتا گیا۔ وہ کب تک ٹی وی دیکھتا یا ڈی وی ڈی سے دل بہلاتا۔ گھر میں بات کرنے والی ایک خادمہ مریم تھی یا اس کا شوہر حسین شاہ۔ دونوں عادت یا ہدایت کی وجہ سے غیر ضروری گفتگو نہیں کرتے تھے۔ اب اس کے پاس پیسا بھی تھا اور آنے جانے کے لیے گاڑی بھی تھی تو دوست نہیں تھے۔ تیسرے دن وہ پی سی میں کھانا کھانے چلا گیا۔ اسے ایک سیاہ شیشوں والی گاڑی لے گئی مگر اس وقت لباس اور وضع قطع میں وہ ذرا بھی آغا صاحب جیسا نظر نہیں آرہا تھا۔ غنی نے خود ہی اپنے لیے ایک وضع بنالی تھی۔ وہ سفید کلف لگے چیئرمین لٹھے کی گھیر دار شلوار قمیص کے ساتھ سیاہ واسکٹ، قراقلی ٹوپی اور تلّے کے کام والی سینڈل میں تھا۔ اس نے بغیر نمبر کے شیشوں والے بھاری سیاہ فریم کی عینک لگالی تھی چنانچہ دیکھنے والوں کو وہ کوئی قبائلی تاجر... صوبہ سرحد کا سیاست داں یا سردار نظر آتا تھا۔ بعد میں اسے نقلی گولیوں والی بیلٹ اور پستول بھی فراہم کردیے گئے۔ بیکاری اور تنہائی کے اس دور میں غنی نے بہت شاعری کی مگر اب وہ غنی اے غنی ہوگیا تھا۔

غنی نے کھانے کے دوران ویٹر کو بلا کے پوچھا۔ ''عبداللہ ویٹر ڈیوٹی پر ہے؟''

ویٹر نے سوچ کے جواب دیا۔ ''اس نام کا یہاں تو کوئی ویٹر نہیں ہے سر!''

غنی نے کہا۔ ''کیا پہلے تھا جو اب کہیں اور چلا گیا ہو؟''

ویٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''چار سال سے میں یہاں ہوں۔ میں تو نہیں جانتا اس نام کے کسی ویٹر کو۔''

غنی سمجھ گیا کہ یہ سب آغا صاحب کی سیکرٹ سروس کے لوگ ہیں۔ غنی کو اگلے ہفتے میں دو بار طلب کیا گیا۔ وہ آغا بن کے ان کے ایک غیر ملکی مہمان کو ریسیو کرنے گیا۔ مہمان کو ہوٹل کی قیام گاہ تک چھوڑ کے اس نے رات کو ڈنر پر میٹنگ کی بات کی اور واپس ہوگیا۔ ظاہر ہے رات کو میٹنگ میں خود آغا

www.paksociety.com

صاحب موجود ہوں گے۔ دوسری بار اس نے ایک فہرست کے مطابق شاپنگ کی جس کے لیے اسے نقد رقم دی گئی تھی۔ یہ تمام زنانہ کپڑے اور زیور تھے۔ غنی یہ سوال نہیں کرسکتا تھا کہ یہ کس کے لیے ہیں۔

ایک ہفتے بعد اسے ان پرانے دوستوں سے ملنے کا خیال آیا جو اسے کالج کے زمانے سے جانتے تھے۔ وہ ان کے کام کرتا تھا اور ان کی گاڑیوں میں طفیلی بن کے گھومتا تھا۔ کیا اب وہ اپنی گاڑی میں ان سے ملنے جاسکتا ہے اور انہیں لنچ یا ڈنر پر کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں مدعو کرسکتا ہے؟ آغا صاحب کو کوئی اعتراض نہ تھا بشرطیکہ وہ غنی بن کے جائے۔ اس کا یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ وہ پرانے دوست بڑے لوگ تھے مگر اب غنی بھی کم نہ تھا۔ اس نے اپنی کامیابی اور دولت مندی کا جواز پیش کرنے کے لیے ایک کہانی تیار کی جس پر کوئی شک نہیں کرسکتا تھا۔ سب کی طرح وہ بھی امپورٹ ایکسپورٹ کررہا تھا۔ دبئی، چائنا، ملائیشیا، سنگاپور... اب کاروبار کے یہی ابھرتے ہوئے مراکز تھے۔ دولت منہ سے بولتی ہے اور کامیابی کو سند عطا کرتی ہے پھر کوئی نہ شک کرتا ہے اور نہ تصدیق... غنی اے غنی کے نام سے اس کی شاعری نے بھی بہت شہرت پائی۔

تین مہینے میں غنی کے دوستوں کا حلقہ مزید پھیل گیا۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں سے اس کی راتوں کو رنگین بنانے والی گرل فرینڈز بھی ملیں۔ غنی سیکیورٹی وجوہات کی بنا پر انہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا مگر ان کے ساتھ جاسکتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ آغا صاحب کا کوئی جاسوس ہمہ وقت اس پر نظر رکھتا ہوگا۔ کچھ عجب نہیں کہ اس کی گفتگو بھی سنتا ہو۔ چنانچہ وہ بہت محتاط تھا۔ اوسطاً اسے مہینے میں چار چھ مرتبہ آغا جی... وہ کاروباری حلقے میں اسی نام سے مشہور تھے... بن کے جانا پڑتا تھا۔ آج تک کسی کو شک بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ آغا جی نہیں غنی ہے۔ آغا جی خوب جانتے تھے کہ اسے کہاں استعمال کرنا ہے اور کہاں نہیں۔

جیسے جیسے اعتماد بڑھتا گیا، آغا جی اسے زیادہ مواقع فراہم کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک بار وہ آغا جی کے پاسپورٹ پر دبئی ہو آیا۔ آغا جی نے اسے خوب سمجھا دیا تھا کہ کام کی نوعیت کیا ہے۔ اسے کس سے کیا بات کرنی ہے اور کیا نہیں۔ غنی اس آزمائش میں پورا اترا لیکن اس دورے نے اس کے ذہن میں ایک شک کو بھی جنم دیا بلکہ اس کی تصدیق کردی کیونکہ شک پہلے سے موجود تھا۔ آغا کا اصل کاروبار کچھ اور تھا۔ وہ نہیں جو عبداللہ نے بتایا تھا۔ ٹیکسٹائل میں سارے نام معروف تھے۔ الکرم، گل احمد، داؤد، نشاط، حسین اور ستارہ... ان گنت نئے برانڈ متعارف ہوتے رہتے تھے، جمشید علی آغا کی پراڈکٹ کہیں نہ تھی۔ جن سے غنی ملا تھا ان میں بھی صنعت کار کوئی نہیں تھا۔ ان کے کاروبار کی نوعیت بھی مشکوک تھی۔

غنی نے خود کو قائل کرلیا کہ اسے صرف کام سے کام رکھنا چاہیے۔ تجسس نے بلی کو مروا دیا۔ یہ انگریزی کا محاورہ تھا۔ اسے کیا ضرورت ہے حقائق تک پہنچنے کی۔ سب سے بڑی حقیقت پیسا ہے اور یہ زندگی ہے۔ اس کے باوجود خوف ایک کانٹے کی طرح اس کے احساس میں موجود رہتا تھا اور اس کی خلش غنی کو بے چین کرتی تھی۔ پھر ایک روز یہ خوف ایک حقیقت بن کے سامنے آگیا۔ وہ ائرپورٹ پر آغا جی کے کسی مہمان کو چھوڑ کر واپس آرہا تھا جب فورٹریس اسٹیڈیم کے نزدیک پل پر سامنے سے آنے والی ایک گاڑی سے فائرنگ ہوئی۔ اگر وہ پیچھے نہ بیٹھا ہوتا تو مارا جاتا۔ ایک گولی ڈرائیور کو لگی مگر اس نے گاڑی کو بے قابو ہونے سے پہلے ہی سنبھال لیا ورنہ وہ پل کی ریلنگ توڑ کے نیچے سے گزرنے والی ایک ٹرین پر گرتی۔

غنی نے گاڑی سنبھالی اور ڈرائیور کو اسپتال لے گیا مگر وہ راستے میں ہی ختم ہوگیا۔ غنی نے... بلیک بیری سے آغا جی کو پیغام بھیج دیا تھا۔ اسے ہدایت ملی کہ گاڑی کو گھر لے جاؤ۔ غنی نے تعمیل کی۔ شام تک ڈرائیور کی بیوہ اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ اپنے گاؤں چلی گئی۔ دو دن بعد ملازموں کی نئی جوڑی آگئی۔ یہ دو دن غنی پر بہت سخت تھے اور وہ تقریباً فیصلہ کرچکا تھا کہ اب کسی بہانے اس جان لیوا ملازمت کو خیرباد کہہ دینا چاہیے۔ پہلی آزمائش میں ہی بھاگ لینا شاید مناسب نہ ہوتا لیکن ایک معمولی بات نے اس کے ارادے کا رخ بدل دیا۔ جب آغا جی کی ہدایت پر وہ مردہ ڈرائیور کی لہو آلود لاش لے کر گھر پہنچا تو اس کی بیوی نے بڑا واویلا کیا جو غیر متوقع نہیں تھا۔ اس نے سینہ کوبی کی، اپنے کپڑے پھاڑ لیے اور شوہر کی لاش پر گر کے بے ہوش ہوگئی۔

اچانک صدمے کا یہ ردِعمل غلط نہ تھا۔ چیخ مار کے اپنی بیوگی پر آنسو بہاتے ہوئے اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے تو بہت روکا تھا' جان کا خطرہ لے کر یہ نوکری مت کر... اور کہیں تنخواہ کم ملتی' زندگی تو سلامت رہتی۔ اب پیسوں کا میں کیا کروں... وغیرہ وغیرہ لیکن اس کے بعد جمشید علی آغا خود آگئے اور انہوں نے صورتِ حال کو سنبھال لیا۔ ڈرائیور کی بیوی نے تین چار گھنٹے بعد ایمبولینس میں اپنے شوہر کی لاش

کے ساتھ جاتے ہوئے اس سے کہا۔ ’’اچھا جناب! کہا سنا معاف کر دینا۔ آپ نے اسے بچانے کی کوشش کی مگر اس کی قضا آگئی تھی۔ دشمن اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔‘‘

غنی نے بلاارادہ پوچھ لیا۔ ’’کون تھے یہ دشمن آخر؟‘‘

’’وہی جو نہیں چاہتے تھے کہ وہ مجھ سے شادی کرے۔ میرے ایک ماما کا پتر اور اس کے گھر والے۔‘‘

اس بات نے غنی کے خیالات کا رخ بدل دیا۔ یہ ڈرائیور کی خاندانی دشمنی کا شاخسانہ تھا، وہ جسے مارنے آئے تھے مار کے چلے گئے تھے۔ اس کا آغاجی کے دھندے یا ان کی کاروباری رقابت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس رات لیٹے لیٹے اسے ڈرائیور کی بیوہ کا پہلا بیان بھی یاد آیا جو فی البدیہہ تھا۔ پہلا صحیح اور حقیقی ردِعمل تھا۔ اس نے غالباً بعد میں اپنا بیان آغاجی کے کہنے سے بدلا۔ واللہ اعلم بالصواب... لیکن یہ تبدیلی ایک منطقی وجہ رکھتی تھی۔ شاید آغاجی نے اسے صبر کی تلقین اور رضائے الٰہی پر سر جھکانے کے ساتھ جاں نثار کرنے کا اتنا خطیر معاوضہ دیا تھا... ایک معمولی شرط کے ساتھ کہ وہ قتل کو ذاتی دشمنی کا نتیجہ قرار دے... کہ عورت مجبور ہوگئی۔ پہلے صدمے کی دیوانہ کرنے والی لہر گزر چکی تھی۔ اب عقل غالب آگئی تھی اور ایک پوری زندگی کے چیلنج اس کے سامنے تھے۔ کمانے والا جب نہ رہا تو وہ کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی اور کیسے جیے گی؟ آغاجی نے ایک چیک پر اس کا مختصر سا جواب لکھا اور اسے زبانی بھی سمجھا دیا۔

عورت نے ایک بے جان جسم کی طرف دیکھا جو مٹی کا ڈھیر تھا اور پھر دولت کے اس ڈھیر کو جو شوہر کی جگہ اس کے مستقبل کا محافظ تھا اور اس معمولی شرط کو پورا کر دیا۔ وہ ایسا نہ کرتی تو بڑے گھاٹے میں رہتی۔ اس کی فریاد کون سنتا۔ وہ سارے زمانے میں انصاف اور قصاص کے لیے چلاتی پھرتی۔ شاید اس کی آواز کو خاموش کرانا آسان ہوتا... اگر آغاجی نے اسے کہا کہ یہ رقم دیت کے طور پر قبول کرلے کیونکہ وہ خود کو اس قتل کا ذمے دار سمجھتے ہیں تو کسی نہ کسی حوالے سے یہ شرع کی تفسیر بھی قابلِ قبول تھی۔

آغاجی کا رویہ بھی اسی پالیسی کا مظہر تھا۔ انہوں نے مرنے والے کی خدمات کو سراہا اور دکھ کا اظہار بھی کیا کہ ایسا وفادار نمک خوار نہ رہا لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ ان لوگوں کے ساتھ یہی مسئلہ ہے... گاؤں، دیہات سے آتے ہیں تو زر، زن، زمین کے تنازعات ساتھ لاتے ہیں اور انجام پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی انہوں نے کسی خوف یا شک کا اظہار نہیں کیا کہ حملہ آوروں کا نشانہ وہ خود بھی ہوسکتے تھے۔

ابھی غنی شش و پنج میں تھا اور دونوں طرف کے موافق اور مخالف دلائل کی قوت میں پنڈولم کی طرح کبھی ایک طرف ہوتا تھا تو کبھی دوسری طرف... ڈرائیور کی موت کا اصل سبب وہ بھی ہوسکتا تھا جو بتایا گیا یا بنایا گیا۔

لیکن کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے ہی ایک واقعے نے صورتِ حال کو الٹ کے رکھ دیا۔ چند دن بعد اسے اپنے بلیک بیری پر ہدایات موصول ہوئیں کہ وہ فلاں کالج کے فنکشن میں آغاجی کی جگہ مہمانِ خصوصی بن کر جائے۔ انعامات تقسیم کرے اور لکھے ہوئے خطبۂ صدارت کو تقریر کی صورت میں سنا دے۔ غنی نے تعمیل کی۔ اسے جمشید علی آغا کے طور پر ریسیو کیا گیا اور ڈائس پر جگہ دی گئی۔ اس کے دائیں جانب کالج کی پرنسپل تھی۔ بائیں طرف مالک جو ایک ریٹائرڈ جنرل تھے۔ پرنسپل انہی کی بیگم تھیں۔ غنی کو اندازہ تو ہوگیا تھا کہ ضرور آغاجی کی کوئی بیٹی یہاں پڑھتی ہوگی لیکن آج تک اسے نہ گھر بلایا گیا تھا، نہ اس کے سامنے گھر کے کسی فرد کی بات ہوئی تھی۔ وہ نہ بلااجازت آفس میں داخل ہوسکتا تھا اور نہ بتائے بغیر گھر سے نکل سکتا تھا۔ ایسے سخت کنٹرول میں کوئی غلط خیال، جسے آغاجی نے فلمی قرار دیا تھا، اس کے دماغ میں کہاں سے آتا۔ نہ آغاجی کے دستخط اس نے کبھی دیکھے تھے کہ غبن کا سوچ بھی سکتا۔ آغاجی بن کے ان کے بیڈروم میں پہنچنا تو اتنا ہی ناممکن تھا جتنا زندہ رہتے ہوئے جنت الفردوس میں داخل ہونا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جب اسے کہیں بھیجا جاتا ہے تو خود آغاجی کہاں مصروف ہوتے ہیں۔ ایک وقت میں دو جمشید علی آغا پائے جانے کا راز کسی پر فاش کیوں نہیں ہوا... اگر ہوا تو اس کا نتیجہ کیا نکلا؟

وہ اپنے خیالوں میں گم تھا کہ پرنسپل نے کالج میں اسٹیج پرفارمنس پر ڈانس اور ایکٹنگ کا پہلا انعام دینے کا اعلان کیا اور تب غنی نے ایک اور حیرانی کا شاک جھیلا۔ اسٹیج پر آغاجی کی بیٹی آگئی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو انٹرویو کے وقت رات بارہ بجے تک اپنے والد کی سیکریٹری کا رول کر رہی تھی۔ اس کی بددماغی کا سبب بھی اب سمجھ میں آیا۔ وہ کسی کی ملازم نہیں تھی۔ مالک کی بیٹی تھی۔ شاید صرف رازداری کے لیے خود آغاجی نے اس سے کہا تھا کہ وہ سیکریٹری بن کے ان کی مدد کر دے۔ وہ یقیناً جانتی تھی کہ اس کے ابا نے غنی کو اپنے ڈپلی کیٹ کے طور پر ملازم رکھا تھا۔ اس کا نام نسیم تھا۔ پھر اور لڑکیاں آئیں جن کو مختلف شعبوں میں اچھی کارکردگی دکھانے پر انعامات دیے گئے۔ ایک اور لڑکی نے اسے متاثر کیا جو سادہ، بے داغ

سفید شلوار قمیص دوپٹا سر کے گرد لپیٹے اور دونوں ہاتھوں میں موتیے کی کلیوں کے کنگن پہنے اس کے لیے سرخ گلابوں کا ایک گلدستہ لے کر آئی۔ اپنی نزاکت اور رعنائی کے ساتھ وہ سادگی و پرکاری کا متاثر کرنے والا شاہکار لگ رہی تھی۔ وہ اپنے نام کی طرح ناز آفریں تھی اور غنی کو یہ بھی اچھا لگا کہ وہ بزم ادب کی صدر تھی۔ اس نے یاد کیا ہوا... خطبۂ صدارت پڑھا اور ایک رسمی قسم کے لنچ میں بھی شریک ہوا جہاں سارے انعام پانے والے بھی تھے۔ نسیم اپنے مداحوں کے حلقے میں مگن تھی۔ غنی نے ناز آفریں کو قریب کھڑے دیکھا تو پوچھ لیا۔ ’’آپ کو اردو ادب سے شغف ہے؟‘‘

ناز آفریں نے کہا۔ ’’جی اور ادب میں شاعری۔‘‘

’’آپ خود بھی لکھتی ہیں؟‘‘

’’تھوڑی بہت تک بندی کر لیتی ہوں۔‘‘ اس نے سادگی سے کہا۔

صرف بات بڑھانے کے لیے غنی نے پوچھا۔ ’’کسے پسند کرتی ہیں؟‘‘

اس نے آہستہ سے کہا۔ ’’ن، م، راشد، مجید امجد، فیض، فراز... اور آپ۔‘‘

غنی کے ہاتھ سے پلیٹ گرتے گرتے بچی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ ناز آفریں کا یہ جواب کسی اور نے تو نہیں سنا۔ اس کے سنبھلنے تک وہ جا چکی تھی اور تین چار لڑکیوں میں گھری کھڑی تھی۔ بے شک اس کی منظومات اب اخباروں، رسالوں کی زینت بنتی تھیں اور اس تک پہنچنے والے تبصرے بڑے حوصلہ افزا تھے مگر ابھی تک نہ وہ کسی مشاعرے میں شریک ہوا تھا اور نہ ٹی وی پر اس کا کوئی انٹرویو آیا تھا۔ پھر ناز آفریں کیسے جانتی ہے کہ وہی غنی اے غنی ہے؟

واپسی پر سخت کنفیوژن میں وہ اپنی گاڑی تک پہنچا تو ڈرائیور موجود نہیں تھا۔ ایک اور کار کے ڈرائیور نے بتایا کہ اچانک اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا تھا اور وہ نسیم کی گاڑی میں اس کے شوفر کے ساتھ اسپتال گیا ہے۔ نسیم نے موبائل فون پر اپنے شوفر سے بات کی تو پتا چلا کہ وہ درد اپنڈکس کا تھا چنانچہ اسے آپریشن کے لیے داخل کرانا پڑے گا۔ آغاجی کی ہدایات کے مطابق گاڑی کی چابی صرف ڈرائیونگ کے وقت شوفر کو دی جاتی تھی۔ کہیں بھی گاڑی چھوڑتے وقت غنی اس سے چابی لے لیتا تھا۔ نسیم نے اپنے شوفر سے کہا کہ وہ اسپتال میں رکے اور اسے داخل کرا کے آئے۔

ڈرائیونگ خود غنی نے سنبھالی اور نسیم اس سے بات کیے بغیر مالکانہ شان سے پیچھے بیٹھ گئی۔ مطلب صاف تھا کہ پہلے مجھے گھر چھوڑو پھر جہاں چاہو جاؤ۔ آخری وقت میں جب گاڑی کمپاؤنڈ سے نکل رہی تھی، اس نے کہا۔ ’’گاڑی روکو۔‘‘ اور پھر شیشے اتار کے آواز دی۔ ’’نازو۔‘‘ اور غنی نے ناز آفریں کو گاڑی کے پچھلے دروازے سے نسیم کے ساتھ بیٹھتے دیکھا۔

سڑک پر آنے کے بعد غنی نے آغاجی کی طرح پوچھا۔ ’’یہ آپ کی سہیلی ہیں بیٹا؟‘‘

نسیم نے چیخ کے کہا۔ ’’بیٹا! مائی فٹ... تم غنی ہو... میرے باپ بننے کی فضول کوشش مت کرو۔ میں جانتی ہوں۔‘‘

آواز غنی کے حلق میں پھنس گئی۔ ’’آپ... جانتی ہیں... کیسے؟‘‘

’’جیسے تم دنیا کے سارے مردوں میں اپنے باپ کو پہچان لوگے۔ خواہ وہ کسی بھی حلیے اور کسی بھی نام سے تمہارے سامنے آئے۔ ہاں ناز آفریں میری فرینڈ ہے اور تمہاری فین... بہت اچھی طرح جانتی ہے کہ تم ہی غنی اے غنی ہو۔ تمہاری ہر نظم اس نے رسالے، اخبار سے کاٹ کے ایک کاپی میں لگا رکھی ہے۔ مجھے تو شاعری سمجھ آتی نہیں۔ یہ پھر بھی مجھے سناتی ہے، میرا خیال ہے تم پر ہی کڑی... (غنی ازان لووِ یو)۔‘‘

ناز آفریں نے گھبرا کے کہا۔ ’’خدا کے لیے نسیم! تم بولنے پر آتی ہو تو جو منہ میں آئے بک دیتی ہو۔‘‘

نسیم ہنسی۔ ’’مگر میں جھوٹ نہیں بولتی۔ ناؤ مسٹر غنی! پہلے تم مجھے گھر چھوڑو گے... نہیں... پہلے ہم کہیں بیٹھ کے چائے پئیں گے۔ ناٹ پی سی... مجھے تم سے کچھ کہنا ہے اور یہ اچھا موقع ہے۔ نازو کو کہنا ہوگا تو یہ بھی کہہ دے گی۔ میرا ڈرائیور گاڑی وہیں لے آئے گا۔ میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ تم نازو کو اس کے گھر چھوڑ دینا۔‘‘

نسیم کی چوائس پر وہ انہیں دوسرے فائیو اسٹار ہوٹل میں لے گیا جہاں انہیں ایک گوشۂ خلوت بھی میسر آگیا۔ غنی بہت نروس اور خفت کا شکار تھا۔ آغاجی کے رول کا سارا اعتماد ہوا ہوگیا تھا۔ اب وہ محض ایک ذاتی ملازم تھا۔ نازو کے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ ایک خفیف سی شرمیلی مسکراہٹ اور جھکی ہوئی نظر اس کی صورت کے حسن کا حصہ تھی۔ غنی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ نسیم کے بے باک الفاظ پر نازو سے کچھ کہے تو کیا کہے اور کیسے کہے...؟

اس مشکل کو خود نسیم نے آسان بنایا۔ ’’غنی صاحب! میرا رویّہ آپ کو غیر مہذب اور غرور آمیز لگتا ہے تو سوری... میں جیسی ہوں ویسی ہوں اور ظاہر ہے میرے ماحول نے اور

www.paksociety.com

تربیت نے مجھے مزید بگاڑا ہے، نازو کی طرح سنوارا نہیں۔ کچھ لوگ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، کچھ لوگ بگڑنے۔ میں دوسری صف میں شامل ہوں۔ یہ بات کہنے کا موقع مجھے آج ملا ہے۔ میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتی تھی۔ جو آپ کے لیے ہو۔''

غنی کی کچھ ہمت بڑھی۔ ''یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ شاعر غنی اے غنی میں ہی ہوں؟''

''میرے والد کی نظر ہر وقت تم پر رہتی ہے۔ تمہارے آنے سے پہلے تمہاری ایک مکمل فائل انہیں پیش کر دی گئی تھی جس میں سب تھا کہ تم کون ہو... کیا کرتے رہے رہو... کہاں سے آئے ہو... تمہارے دوست کون ہیں... اس میں لکھا تھا کہ تم ایک شخص کو اپنی نظمیں فروخت کرتے رہے ہو... پانچ سو روپے فی نظم... اس نے اپنا دیوان شائع کرالیا ہے۔ یہاں بھی تمہاری عدم موجودگی میں تمہاری ہر حرکت پر نظر رکھی جاتی ہے اور رپورٹ آغاجی کو دی جاتی ہے۔ تمہیں پتا نہیں چلا ہوگا لیکن وہ ڈائری جس میں تم لکھتے ہو، آغاجی کو پیش کی گئی تھی اور نازو نے بھی دیکھی تھی۔''

غنی نے نازو کی طرف دیکھا تو وہی متانت آمیز سوچ، شرمیلی مسکراہٹ اور خاموش نگاہ۔

''اس نے مجھے کہا کہ یہ تم نے کیسے آدمی کو کام پر لگا رکھا ہے۔ میں نے کہا شاعر صرف شاعری ہی تو نہیں کرتے۔ زندگی گزارنے کے لیے انہیں کوئی کام بھی کرنا پڑتا ہے اور غنی صاحب تو موج کر رہے ہیں۔ نازو نے کہا کہ یہ کام کتنا پُرخطر ہے۔ اس کو اندازہ ہی نہیں اگر وہ مارا گیا تو اس پیسے کی خاطر جان بھی جائے گی اور اس کا ٹیلنٹ بھی خاک میں مل جائے گا۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں کچھ حقائق سے آگاہ کر دوں۔ آگے فیصلہ کرنا تمہارا کام... ابھی جو ڈرائیور قاتلانہ حملے میں ہلاک ہوا اس کا نشانہ وہ نہیں تھا، آغاجی تھے۔ تم کو جو کہانی سنائی گئی بکواس تھی۔ اس کی بیوہ کو آغاجی نے بیس لاکھ دیے اور یہ کہا کہ گاؤں میں اس کے خاندان کا کوئی فرد یا بدخواہ اس کی طرف بری نظر سے دیکھے یا اس کے پیسے کی طرف تو وہ انہیں فون کر کے بتائے۔''

''آپ یقیناً اس قاتلانہ حملے کی وجہ بھی جانتی ہوں گی؟''

''خود تمہیں اندازہ ہونا چاہیے۔ نہیں ہے تو میں بتا دوں۔ ان کا بزنس وہ نہیں ہے جو تمہیں بتایا گیا ہے۔''

''کچھ اندازہ میں نے بھی کر لیا تھا۔''

''وہ بہت سے کام کرتے ہیں جو خطرناک ہیں اور غیر قانونی ہیں۔ اس میں پیسا بہت ہے مگر جان جانے کا خطرہ اس سے بھی زیادہ۔ ایک بار تم بچ گئے، ہو سکتا ہے دوسرے حملے سے مارے جاؤ۔ تم آغاجی کے لیے بلٹ پروف کی طرح ہو۔ ڈرائیور کی بیوہ تو بیس لاکھ لے گئی اور اسے دوسرا زیادہ اچھا شوہر بھی مل جائے گا۔ تمہارا بچایا ہوا پیسا کہاں جائے گا؟ بہتر ہے جان بچا کے نکل جاؤ۔ زندگی نہ ملے گی دوبارہ۔ تم نے یہ فلم دیکھی ہے؟''

''یہ تو آپ نے ٹھیک مشورہ دیا۔'' غنی نے اس کے سوال کا جواب نفی میں سر ہلا کے دیا۔ ''مگر مس نسیم آغا! کیا یہ اتنا ہی آسان ہوگا... آغاجی جانے دیں گے مجھے؟''

''اس کی ذمے داری میری... تمہیں اجازت مل جائے گی۔''

''کاروباری معاملات میں بھی؟''

''یس... ہر معاملے میں... اس کی ایک وجہ ہے مسٹر غنی! جب میں بارہ سال کی تھی تو میری ماں نے علیحدگی لے لی۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ پاپا نے مجھے پالا اور دوسری شادی صرف میری خاطر نہیں کی۔ مطلب یہ کہ گھر میں دوسری مالکن نہیں آئی۔ عورتیں ان کی زندگی میں آتی جاتی رہی ہوں گی۔ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پاپا نے میری خاطر بڑی قربانی دی۔ اب میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں لیکن ان کے بعد یہ بزنس نہیں چلا سکتی جو وہ کر سکتے ہیں۔ آہستہ آہستہ وہ خود کو دوسرے بزنس کی طرف لے جا رہے ہیں۔ انڈسٹری کی طرف۔ ان کی ٹیکسٹائل مل فیصل آباد میں آئندہ سال سے پروڈکشن دے گی۔ وہ میں سنبھال لوں گی۔ پاپا کو میری ذہانت اور ہمت پر بھی بہت بھروسا ہے۔ ایم بی اے میں لندن سے کر چکی ہوں اور میں نے ایک لائف پارٹنر بھی منتخب کر لیا ہے۔ وہ پاپا کے ایک فرینڈ کا بیٹا ہے۔ اے ڈائنامیک پرسنالٹی... اجازت تمہیں میں دلوا دوں گی اور سیکیورٹی کی ضمانت بھی۔ تم جلد از جلد نکل جاؤ۔ سیونگز کتنی ہیں تمہاری؟''

''میرا خیال تھا آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا... تقریباً بیس لاکھ۔''

''پاپا ضرور جانتے ہوں گے... کیا یہ کافی ہوگی تمہیں؟''

''کافی کس مقصد کے لیے؟ زندگی گزارنے کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی کم پڑتا ہے۔ مجھے کوئی کام تو کرنا ہی پڑے گا۔ آپ یقین کریں، سوچا میں نے بھی یہی تھا کہ پچیس لاکھ ہوں گے تو میں چلا جاؤں گا لیکن پھر دنیا دیکھی تو یہ رقم

بہت تھوڑی لگی اور میں نے سوچا کہ ابھی جلدی کیا ہے۔ میں نے پچاس لاکھ کا ٹارگٹ رکھ لیا۔ دوسرے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ شاید میرا آنا آسان تھا، جانا مشکل... بلکہ ناممکن ہوگا۔''

''تمہارے دو تو مسئلے حل ہو جائیں گے۔ تمہیں پچاس لاکھ مل جائیں گے اور اجازت بھی میں دلوا دوں گی۔''

''میں پوچھ سکتا ہوں مجھ پر اس عنایت کی وجہ؟'' غنی نے کن انکھیوں سے نازو کو دیکھا۔

''وجہ تمہارے سامنے ہے۔'' نسیم نے بلاتکلف کہا۔ ''اس سے زیادہ میں نہیں کہوں گی۔ نازو خود کہہ دے گی اگر اسے کہنا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنے شوفر کو بلا لوں؟''

غنی کی زندگی میں یہ انقلاب بالاکوٹ کے زلزلے سے کم تہلکہ خیز نہیں تھا۔ ایک ساتھ قدرت نے اسے بہت سے انعامات کی لاٹری سے نواز دیا تھا۔ سرفہرست نازآفریں تھی۔ پھر آزادی کی نوید۔ پچاس لاکھ کا محفوظ سرمایہ۔ وہ اس وقت بھی مفلوج سا بیٹھا رہا جب نسیم نے بیگ اٹھا کے کہا۔ ''او کے ڈیئر... میں چلتی ہوں... میرا شوفر آ گیا ہے۔ ہیو اے نائس ٹائم۔'' اور ان کا جواب سنے بغیر وہ لاؤنج میں موجود ہر شخص پر بجلیاں گراتی نکل گئی۔

ٹیبل پر صرف وہ اور نازو رہ گئے تو غنی نے کہا۔ ''اگر نسیم کی کوئی بات آپ کو بُری لگی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔''

وہ زیرلب مسکرائی۔ ''وہ ایسے ہی بات کرتی ہے لیکن کوئی ایسی بات نہیں کہ آپ معافی طلب کریں، وہ بھی مجھ سے۔''

غنی اسے دیکھتا رہا۔ ''مجھے اپنی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔ ہمارے بھی ہیں قدرداں کیسے کیسے؟''

''وہ ضرورت سے زیادہ منہ پھٹ ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ دل کی کتنی اچھی ہے۔'' نازو نے رک کے کہا۔ ''میں واقعی آپ کی شاعری کو بہت پسند کرتی ہوں۔ مگر شاعر سے یہ توقع رکھنا کہ وہ بھی آپ کو پسند کرے، زبردستی والی بات ہے۔ آپ اور میں ذاتی طور پر ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں۔''

''اب میں یقیناً آپ کو جاننا چاہتا ہوں۔ کیا مجھے اس کا موقع ملے گا؟''

نازو نے نظر اٹھا کے اسے کچھ دیر دیکھا۔ ''آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟''

''اگر اس میں کوئی حرج نہ ہو تو... میرا فون نمبر ہے آپ کے پاس؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر بیگ میں سے کچھ تلاش کرنے لگی۔ ایک چھوٹی سی نوٹ بک اور بال پوائنٹ نکال کے اس نے کہا۔ ''بتائیے۔'' اس نے کچھ لکھنے کے بعد کاغذ کا ایک پرزہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس پہ نازو نے اپنا سیل نمبر لکھا تھا۔

اس پہلی ملاقات نے ہی ان کے درمیان سارے فاصلے مٹا دیے تھے تو اس کی وجہ نسیم تھی۔ وہ بہت بولڈ لڑکی تھی۔ عام حالات میں یہ قربت اور اپنایت کئی ملاقاتوں کے بعد پیدا ہوتی۔ نازآفریں ایک قدامت پرست فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا مذہبی ذہن رکھنے والا باپ لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف تھا مگر ماں نے نازو کو اجازت دلوا دی کیونکہ اپنے دوسرے بھائی بہنوں کے مقابلے میں وہ بہت ذہین تھی۔ باپ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ نازو شاعری کرتی ہے۔

آنے والے دن اس کے لیے کتنے پُرتلاطم اور صبر آزما ہوں گے اس کا غنی اے غنی کو ابھی اندازہ نہیں تھا۔ نازو سے ملاقات اس کی زندگی کا سب سے سنسنی خیز اور مسرت بخش تجربہ ثابت ہو رہا تھا۔ ایسا نہ عام زندگی میں ہوتا تھا اور نہ فلموں میں کہ نازو جیسی لڑکی جب غنی جیسے ہیرو سے ملے تو پہلے سے اس کی محبت میں گرفتار ہو۔ یہ انکشاف کوئی اور کرے، اعتراف وہ خود کر لے۔ نہ راہ و رسم بڑھانے کا مرحلہ، نہ اظہارِ محبت کا۔ نازو جیسی لڑکی پر سو جان سے فریفتہ نہ ہونا جیسے غنی کے اختیار میں ہی نہ تھا۔

اس کے فون رات کو آتے تھے۔ گفتگو میں کتنا وقت گزر جاتا ہے، اس کا اندازہ تب ہوتا تھا جب دونوں میں سے کسی ایک کا بیلنس ختم ہونے سے کال منقطع ہو جاتی تھی۔ غنی کی اس سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اور اس کے عشق میں دیوانگی آتی گئی۔ اس نے محبت کے اس انوکھے تجربے سے لطف اندوز ہونے کے لیے سوچا تھا کہ نوکری کو کچھ عرصہ جاری رکھے لیکن بہت جلد اسے احساس ہو گیا کہ نازو سے ایک دن جدا رہنا بھی اس کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔ وہ اسے دن رات ہر وقت اپنے سامنے، اپنے ساتھ دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ شادی کر لیں۔

ایک رات نازو کے ساتھ ڈنر کرتے ہوئے غنی نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ ''ایسے چھپ چھپ کے ملنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں، ہمیں ایک ہو جانا چاہیے۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں... پہلے نوکری چھوڑوں یا پہلے تمہارے گھر والوں سے ملوں؟ ملنا تو مجھے خود ہی پڑے گا۔''

نازو نے اس کی بات سکون سے سنی۔ ''اس سے کچھ نہیں ہوگا، سوائے خرابی کے اور اس کی بہت سی وجوہات

www.paksociety.com

ہیں۔ سب سے پہلی یہ کہ میرے ابا سخت روایت پسند ہیں۔ ابھی تک لڑکیاں قبیلے سے باہر نہیں دی جاتیں۔ وہ خود لاہور میں ہیں مگر باقی خاندان اندرونِ سندھ آباد ہے۔ ابا کے لیے قبیلے کے بڑوں کی بات نہ ماننا ممکن ہی نہیں۔''

''کیا قبیلے کے بڑے سب جاہل ہیں؟''

''نہیں، ان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ میری طرح اور لڑکیاں بھی پڑھ رہی ہیں۔ ایک ڈاکٹر بن چکی ہے مگر اس کے لیے اپنی پسند سے شادی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے کزن سے منسوب تھی۔ اس نے میڈیکل کالج میں ایک کلاس فیلو کو پسند کرلیا تھا لیکن اس کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ اپنے کسی جاہل کزن سے اس کا رشتہ طے تھا۔''

''کیا تمہاری نسبت بھی طے ہے؟''

''طے ہی سمجھو... خاندان کا بڑا اشارہ دیتا ہے کہ میرے خیال میں اس کی فلاں کے ساتھ شادی ہونی چاہیے۔ اب ماں باپ خاموش رہیں تو بات پکی۔ وہ کہیں کہ یہ مناسب نہیں تو پھر دوسرا نام پیش کردیا جاتا ہے۔ تیسرے کے بعد انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ معاملہ پنچایت میں چلا جاتا ہے کہ فلاں نہ جانے کیا سوچ رہا ہے۔ اسے یہاں بلایا جائے۔ وہاں فیصلہ ہوجاتا ہے۔''

غنی نے مایوسی سے کہا۔ ''پھر تو ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے شادی کرلیں۔''

''شادی تو کرلیں گے۔ اس کے بعد کہاں رہیں گے؟ یہاں تو میرے قبیلے والے آکے ہم دونوں کو ماردیں گے... تمہارے آگے پیچھے تو کوئی ہے نہیں۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہم روپوش ہوجائیں۔''

''کہاں روپوش ہوجائیں؟ پاکستان میں تو یہ ممکن نہیں۔ وہ ہر جگہ ہر وقت ہمیں تلاش کریں گے۔ جب تک ہم مل نہیں جاتے۔''

''کیسی بات کرتی ہو؟ اٹھارہ کروڑ کی آبادی ہے اس ملک کی۔ ہم یہاں نہ سہی پشاور، اسلام آباد، کراچی میں رہ سکتے ہیں۔ مجھے کس نے دیکھا ہے اور میرے بارے میں بتائے گا کون؟ صرف تمہاری نسیم جانتی ہے۔ تم گھر میں رہوگی اور باہر جاؤ گی تو برقع میں جاسکتی ہو۔ اس ملک ہی پر کیا منحصر... ہم باہر بھی جاسکتے ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کل حالات بدل جائیں لیکن آج پیسا ہماری نئی زندگی کا ضامن بن جائے گا۔ ہم نئے نام سے شناختی کارڈ بنواسکتے ہیں۔ پھر پاسپورٹ اور اس کے بعد کہیں بھی جاکے رہ سکتے ہیں۔ برطانیہ، امریکا نہ سہی... ملائیشیا، سری لنکا، سنگاپور محفوظ ملک ہیں۔ سی آئی ڈی والے بھی ہمیں تلاش نہیں کرسکتے۔''

نازو مسحور سی اسے دیکھتی رہی۔ ''تم یہ سب کروگے... میرے لیے؟''

''تم ہاں کرکے تو دیکھو... آخر فرہاد نے بھی تو دودھ کی نہر نکالی تھی۔ ناممکن کو ممکن کردیتا ہے عشق۔''

نازو نے سر جھکالیا۔ ''پھر میں تیار ہوں۔''

غنی کو خوشی نے پاگل کردیا۔ لیکن اب وہ جذبات کی رو میں بہہ کے نازو کی زندگی کو داؤ پر لگانا نہیں چاہتا تھا۔ اس دن کے بعد احتیاط اور رازداری کو پیشِ نظر رکھ کے اس نے ایک پلان ترتیب دیا۔ سب سے پہلے اس نے نازو کو ملنے سے روک دیا۔ ایسا نہ ہو کہ پلان فائنل ہونے سے قبل ہی رازِ عشق افشا ہوجائے۔ اسے ہر کام مرحلہ وار کرنا تھا۔ سب سے پہلے اس نے ایک ایجنٹ کو پکڑا جو شناختی کارڈ بنواتا تھا۔

پہلا مرحلہ ہی مشکل تھا۔ اس میں غنی کے ایک لاکھ روپے ضرور صرف ہوئے مگر وہ محفوظ طریقے سے جینوئن کام چاہتا تھا۔ جب نازو کا اور اس کا اپنا شناختی کارڈ اس کے ہاتھ میں آیا تو اس میں نام، ولدیت اور تاریخ پیدائش سب مختلف تھا۔ صرف فنگر پرنٹس ان کے اپنے تھے۔ اس کام میں ایک مہینا صرف ہوگیا۔ بعد میں غنی نے شناختی کارڈ کی اپنے طور پر تصدیق کی۔ وہ جینوئن تھے۔

دوسرا مرحلہ بہت آسان تھا کیونکہ باقی کاموں کی ذمے داری نسیم نے لے لی تھی۔ نکاح خواں اور شادی کے سب گواہ بھی نسیم کی طرف سے ہوتے۔ غنی کی خواہش تھی کہ نازو جب اس تقریب میں شرکت کے لیے آئے تو پھر لوٹ کے نہ جائے۔ اس مقصد کے لیے غنی نے گلبرگ میں ایک اینکسی کرائے پر حاصل کرلی تھی جو پوری طرح فرنشڈ تھی۔ دو بیڈ کی یہ اینکسی چار کنال کی کوٹھی کا حصہ تھی اور اس کے عقبی حصے میں تھی مگر اس تک پہنچنے کا راستہ الگ تھا۔ مین گیٹ سے اندر جانے والی سڑک کوٹھی کے بائیں جانب سے سیدھی نکل جاتی تھی اور پیچھے سے گھوم کر باہر جانے والے گیٹ سے مل جاتی تھی۔ دو بیڈ کی اینکسی غنی کے خیال میں محفوظ ترین جگہ تھی۔

نکاح کی تقریب کے لیے غنی نے نازو کے اور اپنے لیے دولہا، دلہن کے ڈریس ریڈی میڈ خریدے تھے۔ ان کی سب سے اہم مددگار اور معاون نسیم ہی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دو ایسے دوستوں کو گواہ بنایا تھا جو پوری طرح قابلِ اعتماد تھے اور ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے بھی تیار تھے۔ اس کے باوجود نازو نے نکاح کو فی الحال خفیہ رکھنے پر اصرار کیا۔ یہ ایک قانونی ضرورت تھی کیونکہ غنی کو بیرونِ ملک

سفر کے لیے ویزا کی درخواست کے ساتھ نکاح نامے کی مصدقہ نقل بھی لگانی تھی۔ غنی کے دل کی بے قراری نکاح کے بعد شبِ وصل کا مزید التوا برداشت نہیں کرسکتی تھی مگر نازو نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ چند دن میں اس کا بی اے کا رزلٹ آنے والا تھا۔

نازو بظاہر پُرسکون تھی لیکن اندر سے اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوچکا تھا۔ نکاح سے ایک دن پہلے وہ گھر سے آئی تو اس کی حالت دیکھ کے غنی ڈر گیا۔ ''یہ تمہیں کیا ہوتا جارہا ہے نازو؟'' اس نے نازو کے ویران چہرے، اداس آنکھوں کے حلقے اور اس کی ذہنی کیفیت کو دیکھ کے کہا۔ وہ دائمی شرمیلی سی مسکراہٹ جو اس کے پُرسکون چہرے پر روشن رہتی تھی، نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔ وہ برسوں کی بیمار لگتی تھی۔ بے وجہ چونک کے خوف زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی تھی اور بات کرتے کرتے اچانک کہیں کھوجاتی تھی۔

نازو نے چڑ کے کہا۔ ''ایسا کیا نظر آرہا ہے تمہیں؟''

''ٹیک اٹ ایزی نازو! مجھے پتا ہے یہ تمہارے لیے بہت بڑی آزمائش ہے۔''

وہ پھٹ پڑی۔ ''خاک پتا ہے تمہیں... تم کیا جانو اس آزمائش کا مطلب... نہ تمہارا کوئی خاندان ہے، نہ کسی سے جذباتی رشتہ... تمہیں ماں باپ کی عزت اور زندگی داؤ پر نہیں لگانی ہے۔ اپنی بہنوں کا مستقبل تباہ نہیں کرنا ہے۔ مجھے بتاؤ یہ محبت ہے یا میری کمینگی اور خود غرضی... صرف اپنی خوشی کے لیے میں کس کس کے اعتماد کا قتل کررہی ہوں۔ تمہارے لیے خون کے رشتوں کا خون کررہی ہوں، اس کے لیے جسے آج سے سال بھر پہلے میں نام سے بھی نہیں جانتی تھی۔ تمہارے لیے وہ گھر چھوڑ رہی ہوں جہاں میں نے چوبیس سال گزارے ہیں۔ ایک دودھ پیتے بچے سے اسکول گرل اور پھر بی اے کرنے تک زندہ رہنے کی قوت پائی ہے۔'' وہ زاروقطار رونے لگی۔

غنی کو لگا جیسے اس کی امیدوں کا وہ روشن چراغ جس نے اس کے دل میں اجالا کررکھا تھا، بجھ گیا ہے۔ محبت ایک سراب ثابت ہوئی ہے۔ امید کے ساحل تک پہنچنے سے پہلے ہی مستقبل کے خوابوں کا سفینہ ڈوب گیا ہے۔ ''خود کو سنبھالو نازو۔''

اس نے سر اٹھا کے اسے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔ ''کیسے... یہ کہنا تمہارے لیے بہت آسان ہے... مگر کیسے... میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟''

''میں فیصلہ کرلیتا تو اس پر قائم رہتا... کسی پشیمانی یا پریشانی کے بغیر۔''

''ہاں کیونکہ تم مرد ہو۔ عورت کو خاندان کی عزت، ناموس اور غیرت سب کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانا پڑتا ہے۔ اپنی صلیب کی طرح۔ اس کی زندگی اپنی نہیں ہوتی۔ وہ سیتا کی طرح جوئے میں ہار دی جاتی ہے۔ سنگسار ہوتی ہے۔ مرد کے جرم کی پاداش میں ونی اور سوارا جیسی روایات کی بھینٹ چڑھتی ہے اور محبت کا فریب دے کر کوٹھے پر بٹھادی جاتی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوتا؟''

''تم جذباتی ہورہی ہو...''

''ہاں، یہ سارا جذبات کا جوا ہے جس میں ہار صرف میرے لیے ہے۔ تم محفوظ ہو۔ میرے پاس کون سی گارنٹی ہے جس پر میں بھروسا کررہی ہوں کہ تم کبھی مجھے چھوڑو گے نہیں۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی، اگر میں تمہیں چھوڑ دوں لیکن مجھ پر تو زندگی کے دروازے بند ہوجائیں گے۔ میں کہاں جاؤں گی؟ کیا کروں گی... خودکشی یا پیشہ؟''

''او مائی گاڈ! تم واقعی پاگل ہوگئی ہو۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں سکون کی ضرورت ہے۔ میں تم پر کوئی ظلم کرنا نہیں چاہتا۔ ہم کچھ دن اور ٹھہر جاتے ہیں۔ تم اور سوچ لو لیکن اس سے پہلے جاؤ کسی ڈاکٹر... کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس جو تمہیں سکون بخش دوائیں دے۔ تمہاری یہ حالت ہرگز ایسی نہیں کہ تم ٹھنڈے دماغ کے ساتھ کوئی فیصلہ کرسکو۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' نازو نے اپنے آنسو پونچھے۔ ''میں نہ جانے کب سے راتوں کو جاگ رہی ہوں، جب سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ شادی کرکے تمہارے ساتھ چلی جاؤں۔ ان سب سے دور جو آج تک میرے سب سے قریب تھے کیونکہ وہی مجھے اس جرمِ محبت پر سزائے موت دے سکتے ہیں۔ دوسری طرف مجھے یہ خود غرضی کی انتہا لگتی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں اپنے جاہل کزن کے بجائے تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ زندگی تمہارے ساتھ بسر کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ اہم نہیں؟ باقی سب جائیں جہنم میں، جو مجھے جہنم میں جھونکنا چاہتے ہیں۔ اِدھر اُدھر دونوں طرف سے سوالات مجھ پر برچھی لے کر حملہ آور ہوتے ہیں اور میرے وجود کو لہولہان کردیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو واقعی مجھے خیال آتا ہے کہ سکون صرف موت میں ہے۔ مجھے خودکشی کرلینی چاہیے۔''

غنی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کم آن... ہم ابھی جائیں گے کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس، تمہاری یہ ذہنی حالت خطرناک ہے۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتا کہ کل میرے لیے کیا ہوگا۔ تم

www.paksociety.com

سے نکاح یا تمہاری موت کی خبر۔‘‘

غنی اسے زبردستی ایک سائیکاٹرسٹ کے پاس لے گیا اور اسے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے آدھے گھنٹے تک نازو سے بات کی۔ پھر غنی کو طلب کیا۔ پندرہ منٹ تک اس سے بہت کچھ پوچھنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔ ’’ابھی میں صرف ایک گولی دوں گا۔ صبح وہ سو کے اٹھے گی تو بالکل نارمل ہوگی۔ لیکن اس ذہنی کیفیت کا یہ علاج نہیں ہے، اس کے اعصاب کمزور ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ علاج ریگولر ہو تو سال دو سال میں آپ پر اعتماد اسے نارمل زندگی گزارنے کے قابل بنا دے۔ علاج دوا سے زیادہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہر عورت اندر سے بہت کمزور ہوتی ہے کیونکہ یہ مردوں کی دنیا ہے۔ اس کی طاقت مرد بنتا ہے۔‘‘

’’میں بعد میں سب سنبھال لوں گا۔ ابھی مجھے کیا کرنا چاہیے؟‘‘ غنی نے کہا۔

’’سکون آور دوائیں خطرناک بھی ہوتی ہیں۔ ان کو باقاعدگی سے استعمال کرنا بھی ضروری ہے۔ خود اس پر بھروسا کرنے میں بہت رسک ہے۔ یہ ذمے داری آپ کو اٹھانی پڑے گی... ابھی... اسی وقت سے۔‘‘

’’میں اس کے لیے تیار ہوں ڈاکٹر۔‘‘

ڈاکٹر مسکرایا۔ ’’پہلے آپ مس نازآفریں سے بھی پوچھ لیں۔ کیا وہ ابھی اسی وقت سے خود کو آپ کی ذمے داری بنانے کے لیے راضی ہیں؟‘‘

ڈاکٹر کی بات بالکل ٹھیک تھی لیکن نازو نے بحث کے باوجود لوٹ کے گھر نہ جانے کی بات نہیں مانی۔ ’’مجھ پر بھروسا رکھو۔ میں کل آجاؤں گی۔‘‘

غنی کے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ نازو کو جانے دے۔ اس کے ساتھ زبردستی کرنے میں خطرہ زیادہ تھا۔ کچھ دیر میں وہ سو جاتی پھر آنکھ کھلتی تو غنی کے ساتھ انیکسی میں ہوتی۔ اس وقت نہ جانے اس کا ردعمل کیا ہوتا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ صبح وہ سو کے اٹھے گی تو نارمل ہوگی۔ غنی نے رسک نہیں لیا اور نازو کو اس کے گھر پہنچانا ہی بہتر جانا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ گولی کھا کے سو جائے گی اور اگلے روز نکاح کے لیے پہنچ جائے گی۔ مگر غنی کو اب اس کے وعدے پر سو فیصد اعتبار نہ رہا تھا۔

نازو سے اس کی ساری ملاقاتیں دن میں ہوتی تھیں۔ وہ آغا جی سے یہ پوچھتا تھا کہ انہیں کوئی کام تو نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی ذاتی حیثیت میں کہیں بھی جاسکتا تھا۔ وہ نازو کو عموماً اس کی گلی کے گھر سے لیتا تھا اور پھر وہیں چھوڑتا تھا۔ اس کا ڈرائیور ان تمام ملاقاتوں کا چشم دید گواہ تھا لیکن غنی کو اس کی فکر نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اب تک اس کے اور نازو کے تعلقات اور ملاقاتوں کی تفصیلی رپورٹ انہیں مل چکی ہوگی۔ یہ غنی کا ذاتی معاملہ تھا جس سے آغا جی کو سروکار نہ تھا اور ان کے گھر میں نسیم موجود تھی جو ان کی اصل معاون اور طاقت تھی۔

اس رات غنی کے لیے سونا مشکل ہوگیا۔ وہ رات بھر جاگتا رہا۔ کافی پیتا رہا اور باہر باغ میں ٹہلتا رہا۔ اسے بہت کم یقین تھا کہ نازو آئے گی۔ زیادہ وہ نازو کی کیفیت سے ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھے۔ اس نے خودکشی کی بات کی تھی اور یہ ناممکن نہیں تھا کہ ایسے جینے پر وہ مرنے کو ترجیح دے۔ غنی کو اندازہ نہ تھا کہ اندر سے وہ اتنی کمزور ثابت ہوگی لیکن وہ بہرحال ایک حساس لڑکی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ نازو نکاح کے لیے پہنچ گئی تو پھر یہ پہاڑ سر ہو جائے گا۔ خود اسے اندازہ ہو جائے گا کہ اب واپسی ممکن نہیں رہی تو آگے بڑھنے کی ہمت آجائے گی۔

صبح تک خود غنی کی حالت خراب تھی مگر وہ انتظار کا ہر لمحہ گن کے کاٹتا رہا۔ دس بجے اس کا فون بجا تو ایک لمحے کے لیے اس کا دل ڈوب گیا۔ یہ پیغام رساں آلہ اچھی خبر دے گا کہ بری۔ اس نے موبائل کی اسکرین کو دیکھا تو نازو کا نمبر دیکھ کے اس کا حوصلہ بحال ہونے لگا۔ یہ صرف چند سیکنڈ کا پیغام تھا۔ ’’میں آرہی ہوں...‘‘ جس نے غنی کی کایا کلپ کر دی۔ ایک دم وہ سارے تفکرات اور پریشان کرنے والے خیالات کی دلدل سے نکل گیا۔ اس کا موڈ، حوصلہ، مورال سب... بلندی افلاک تک پہنچ گئے۔ کہیں شک کے کانٹے کی ایک خلش آخری وقت تک موجود رہی۔

پھر نسیم نے اسے مطلع کیا۔ ’’میں دلہن کو لے کر آرہی ہوں۔ تم تیار ہو جاؤ۔‘‘

’’وہ ٹھیک تو ہے نا؟‘‘ غنی نے پوچھا۔

’’کچھ دیر میں خود دیکھ لینا۔‘‘ وہ ہنسی۔

رسمی تیاری کے لیے وقت نہ تھا ورنہ نازو شاید بیوٹی پارلر سے تیار ہو کے آتی۔ وہ نکاح کے وقت سے ایک گھنٹا پہلے پہنچی۔ اسے عروسی لباس میں نکاح کے لیے لانے کا سارا کام نسیم نے خود کیا۔ غنی سخت نروس تھا مگر یہ وقتی کیفیت تھی۔ اس کا سبب وہ خوشی کا سیلاب تھا جو اس کے اندر سے پھوٹ رہا تھا۔ عین وقت پر گواہ آگئے۔ قاضی ان کے ساتھ تھا۔ سارے کام پلان کے مطابق ہوئے مگر غنی کا دل کسی انجانے خطرے کے خیال سے آخر تک دھڑکتا رہا۔ نازو بالآخر اس کی بیوی بن گئی تھی۔

www.paksociety.com

کھانے کے بعد دو گھنٹے میں سب رخصت ہو گئے۔ انیکسی میں نازو کے ساتھ صرف نسیم رہ گئی۔ انہوں نے اپنے دولہا، دلہن والے لباس اتار دیے تھے۔ نازو خاموش اور گم صم تھی لیکن گزشتہ روز والی کیفیت بہرحال نہیں تھی۔ یہ معرکہ سر کر لینے کے بعد رسا کشی ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ پوری طرح غنی کے ساتھ تھی۔ مستقبل کے سارے ڈرانے والے اندیشے خواب میں ڈرانے والے عفریت تھے جو بے وجود ہو چکے تھے۔

’’میں اب جاؤں گی۔‘‘ نازو نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ قطعی لہجے میں کہا۔

’’میں ایک بار پھر کہوں گا کہ نہ جاؤ... اب تم میری ہو۔ میری ذمے داری پر یہاں رہو۔‘‘

وہ مسکرائی۔ ’’اب تمہیں بھی بھروسا رکھنا چاہیے مجھ پر۔ بس چند روز کی بات ہے۔ پھر زندگی بھر تمہارے ساتھ ہوں گی... ہر جگہ۔‘‘

نسیم نے کہا۔ ’’اب تمہیں بھی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ پہلے تمام انتظامات کرلو۔‘‘

غنی نے کہا۔ ’’کیا آغا جی کو سب معلوم ہے؟‘‘

’’ان سے کچھ بھی پوشیدہ کیسے رہ سکتا ہے؟‘‘ نسیم نے کہا۔

’’مطلب یہ کہ میں ان کی خدمت میں اپنا استعفا پیش کردوں؟ خطرے کی بات تو نہیں؟‘‘

’’پہلے تم ان سے بات کرو۔ پھر میں سب سنبھال لوں گی۔‘‘ نسیم نے کہا۔

’’تم نے جس طرح ہماری مدد کی ہے...‘‘

’’میں نے صرف نازو کی مدد کی ہے۔ اگر تم نے اس کو شکایت کا کوئی موقع دیا یا اسے کوئی تکلیف دی تو میں پھر نازو کی مدد کروں گی، تمہاری نہیں۔‘‘

غنی نے خفت سے کہا۔ ’’ایسا کبھی نہیں ہوگا۔‘‘

’’نہ ہو تو اچھا ہے تمہارے ہی حق میں۔ یہ بھی اسی لیے بتا رہی ہوں کہ تمہیں کوئی غلط فہمی نہ رہے کہ نازو کا دنیا میں کوئی نہیں۔ گھر والوں سے اس کو بچائے رکھنا تمہاری ذمے داری ہے۔ لیکن تم سے بچائے رکھنا میں اپنی ذمے داری سمجھتی ہوں۔‘‘

’’تم کیا سمجھ رہی ہو کہ میں اس کے ساتھ کوئی غلط سلوک کروں گا... اسے لاوارث سمجھ کے؟‘‘ غنی نے خفگی سے کہا۔

نسیم نے صاف کہا۔ ’’ایسا ہوسکتا ہے کیونکہ دنیا میں ہوتا ہے۔ گھر والوں کی حمایت نہ ہو تو لڑکی مرد کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایسا نہیں کرسکتے۔ نازو کا فیصلہ جذباتی ہوسکتا ہے۔ میں تجربے اور مشاہدے کی بنا پر کہہ رہی ہوں۔ آغا جی میرے والد ہیں اور انہوں نے تمہیں پاس کر دیا تھا۔ یہ کہا تھا کہ تم بھروسے کے قابل ہو۔‘‘

غنی کو ایک سال میں خوب اندازہ ہو گیا تھا کہ جمشید علی آغا کی حقیقت کیا ہے۔ ظاہر میں وہ ایک عام سے بزنس مین تھے جن کے کاروبار کے پھیلاؤ کا اندازہ آسانی سے نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ خود غنی نے اس کا سراغ لگانے کی کوشش ہی نہیں کی کہ وہ اسٹاک ایکسچینج کی لسٹ پر ہیں یا نہیں۔ ان کے نام کی ہر کمپنی کی ’’سیکیورٹی ایکسچینج کمیشن‘‘ میں رجسٹری ہے یا نہیں اور وہ ہر سال ایف بی آر کو جو ریٹرن فائل کرتے ہیں، اس میں آمدنی کتنی ظاہر کرتے ہیں اور ٹیکس کتنا دیتے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ انتہائی احمقانہ اور لاحاصل کام کتنا خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔ آغا جی سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں تھا۔ ابھی تک اس نے وہی کیا تھا جس کی آغا جی نے ہدایت یا اجازت دی تھی چنانچہ وہ محفوظ تھا اور ایک پُرخطر ذمے داری نبھانے کا معاوضہ اسے بہت اچھا مل رہا تھا۔ اگر اس کی کوئی فیملی ہوتی تو مارے جانے کی صورت میں آغا جی اس کا ’’خون بہا‘‘ اتنا ادا کرتے کہ فیملی کسی کی محتاج نہ رہتی۔

آغا جی، ان کے جاسوس اور نگرانی کرنے والے سسٹم نے غنی کے روز و شب کے ہر لمحے پر نظر رکھی تھی۔ صرف ایک کام غنی نے رسک لے کر کیا تھا۔ اس نے جعلی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوانے میں اپنی طرف سے مکمل رازداری برتی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس کے اور نازو کے علاوہ صرف نسیم یہ بات جانتی ہے۔ اس سے کوئی خطرہ اس لیے نہیں ہوسکتا تھا کہ وہی نازو کی اور غنی کی مددگار تھی ورنہ یہ شادی بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ غنی کی بات آغا جی سے ہوتی، اسے دوسرے دن شام کے وقت نازو کا فون موصول ہوا۔

’’نازو! سب ٹھیک ہے نا... تمہاری طبیعت کیسی ہے؟‘‘ غنی نے بے قراری سے پوچھا۔

’’سب ٹھیک ہے جی۔‘‘ اس کا لب و لہجہ روایتی بیویوں والا ہو گیا تھا۔ ’’ایک بات ہے۔‘‘

’’کہو نا جی... ہم گوش برآواز ہیں۔‘‘ غنی ہنسا۔

’’یہ جو ہمارا نکاح ہوا ہے... کیا یہ ٹھیک تھا؟‘‘

’’کیا مطلب... مولوی صاحب نے کچھ غلط پڑھ دیا تھا یا تم نے بدحواسی میں قبول ہے کے بجائے کچھ اور کہہ دیا تھا؟‘‘

’’مذاق کی بات نہیں، نکاح ہوا ہے ارجمند بانو کا غفور احمد سے جو ہم نہیں ہیں۔‘‘

’’اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرا تمہارا نام کیا ہے،

پتا کیا ہے۔ یہ بدل سکتے ہیں۔ ہماری ولدیت درست ہے۔ تاریخِ پیدائش اور فنگر پرنٹس درست ہیں۔''

''ہم نے فارم پر جو دستخط کیے تھے؟''

''نازو... وہموں میں مت پڑو۔ تم نے مجھے اور میں نے تمہیں نکاح میں قبول کیا تھا۔ یہ حقیقت ہے یا نہیں؟ خدا جانتا ہے کہ ہماری نیت کیا تھی۔ نکاح کے معاملے میں ہم کسی کو دھوکا نہیں دینا چاہتے تھے۔ ہم نے صدقِ دل سے ایک دوسرے کو قبول کیا۔ باقی سب جان بچانے کے لیے تھا، اگر غلط بھی تھا۔'' غنی نے اسے سمجھایا۔

''اچھا، آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔'' اس نے جیسے سر تسلیم خم کر دیا۔

''بات سنو... تم دوا کھا رہی ہو نا؟'' غنی نے پوچھا۔

''جی کھا رہی ہوں۔'' نازو نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا اور فون بند کر دیا۔

اگلے روز اس کی درخواست پر آغا جی نے اسے طلب کر لیا۔ ''رات دس بجے آ جاؤ۔''

غنی کو اندازہ تھا کہ ملاقات ایسے ہی ہوگی۔ احتیاط ملحوظ رکھتے ہوئے غنی اپنی شناخت بدل کے گیا۔ یہ آغا جی نمبر ون اور آغا جی نمبر دو کی ملاقات نہیں تھی۔ آقا اور خادم کی ملاقات تھی۔ وہ عام راستے سے گیا اور آغا جی کے کمرے میں داخل ہی ہوا تھا کہ آغا جی کی آواز سنائی دی۔ ''اندر آ جاؤ۔'' انہوں نے عمارت میں داخل ہوتے ہی اسے دیکھ لیا ہوگا اور اس کے دروازے پر پہنچنے تک ساری نقل و حرکت اپنے مانیٹر پر دیکھی ہوگی۔ انٹرویو کے وقت جس کمرے میں نسیم ان کی سیکریٹری بنی بیٹھی تھی، وہ خالی پڑا تھا۔ غنی سیدھا اندر جا کے آغا جی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے بیٹھنے کا حکم دیا تو وہ بیٹھ گیا۔ ''کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''سر! میں انتہائی مجبور ہوں کہ یہ ملازمت چھوڑ دوں۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ تنخواہ بھی بہت ہے اور آپ کی مہربانیاں بھی کم نہیں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ میں نے انتہائی ایمان داری سے آپ کی خدمت کی۔''

''لیکن اب تم نے شادی کر لی ہے۔''

''یس سر! آپ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔ میری بیوی میرے سمجھانے کے باوجود سمجھتی نہیں۔ وہ کہتی ہے کہ اس میں جان کا خطرہ ہے۔ تم آغا جی کی جگہ مارے جاؤ گے۔ میں نے سمجھایا بھی کہ ایک واقعہ ضرور ہوا تھا مگر اس میں نشانہ ڈرائیور تھا۔ لیکن عورت ذات کو کون سمجھائے۔ وہ کہتی ہے کہ میں بیوی بن کے رہنا چاہتی ہوں، بیوہ بن کے نہیں۔ تمہارے بدلے کروڑوں ملیں تو میرے لیے بیکار ہیں۔''

''اس کی بات جذباتی اور منطقی دونوں اعتبار سے درست ہے۔'' آغا جی مسکرائے۔

''درخواست سبکدوشی کی جرأت میں نے اس لیے کی کہ خود آپ نے تقرری کے وقت کہا تھا کہ زبردستی کوئی نہیں۔''

''یس... مجھے یاد ہے۔ سبکدوشی کے بعد کیا کرو گے... کوئی بزنس؟''

''نہیں سر! حالات ایسے ہیں کہ میں پاکستان میں نہیں رہ سکتا۔ ہماری جان کو خطرہ ہوگا۔''

''آئی سی... لڑکی کے گھر والے روایت پرست ہیں۔ تمہارا فیصلہ درست ہے۔ تم کہاں جاؤ گے؟''

''ہمارا ارادہ تو ہے کہ ملائیشیا چلے جائیں چھ ماہ کا ویزا لے کر۔ پھر آئیں تو سری لنکا یا سنگاپور۔''

''ساری زندگی یہی کرتے رہو گے؟''

''نہیں سر! بالآخر ہم کہیں سیٹل ہو جائیں گے۔ بات پرانی ہو جائے گی تو سب بھول جائیں گے۔''

آغا جی نے سر ہلایا۔ ''اوکے، جیسا تم اپنے لیے بہتر سمجھتے ہو کرو۔ ایک مشورہ ہے گر مانو تو۔''

''آپ حکم کریں سر! یقیناً اس میں بہتری ہوگی۔'' غنی نے مصلحت کا رویہ رکھا۔

''اب کچھ دن میں رمضان کا مبارک مہینا شروع ہو گا۔'' آغا جی نے نرمی سے کہا۔ ''بہت سے لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ یہ مہینا وہ خانہ کعبہ میں بسر کریں۔ تم ملائیشیا کے بجائے پہلے سعودی عرب کیوں نہیں چلے جاتے۔ ایک مہینا کیا تم وہاں تین ماہ کے قیام کا ویزا حاصل کر سکتے ہو۔''

غنی کی آنکھیں کھل گئیں۔ ''ہم خرما و ہم ثواب... روپوشی اپنی جگہ... مسجد نبوی میں عبادات کا ثواب اپنی جگہ۔ آپ کا مشورہ نہیں... ہدایت کی روشنی ہے جو میری آنکھوں سے اوجھل تھی۔ مجھے آپ نے صراطِ مستقیم دکھائی ہے۔''

''چلو اب مجھے زیادہ گناہ گار مت کرو۔ فوراً ویزا کے لیے اپلائی کرو۔ سعودی حکومت ان کا اجرا کافی پہلے بند کر دیتی ہے۔ تم میرے ٹریول ایجنٹ سے ملو۔'' آغا جی نے کہا۔ ''اگر کوئی پرابلم ہو تو میرا حوالہ دینا۔''

''آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ آپ کے پاس آ کے میری یہ دنیا تو بدلی ہی تھی، اب وہ دنیا بھی سنور گئی۔ یہاں مجھے وہ شریکِ حیات ملی جو ساری دنیا کی خاک چھان کے نہ ملتی۔'' فرطِ جذبات میں غنی نے آغا جی کا ہاتھ چوم لیا۔

www.paksociety.com

ان کے پاسپورٹ تیار تھے۔ ویزا بند ہونے میں چند دن رہ گئے تھے چنانچہ ٹریول ایجنٹس نے ہمت بڑھا دی تھی۔ عام دنوں میں لوگ تین دن میں عمرہ کر کے لوٹ آتے تھے، رمضان کا پورا مہینا گزارنے کے لیے ویزا کی فیس زیادہ تھی۔ تاہم غنی نے آغاجی کا حوالہ دیا تو ایجنٹ کا رویہ بدل گیا۔ تین ماہ کا ویزا دلوانے کے معاوضے میں اس نے کوئی کمی نہیں کی لیکن اس بات کی یقین دہانی کرا دی کہ ایک ہفتے میں ویزا مل جائے گا۔

غنی کے لیے یہ بہت بڑی خوش خبری تھی۔ اس نے وہ چند دن بڑی بے چینی سے گزارے۔ نازو سے اس کے نکاح کو ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ وہ ابھی تک بی اے کے رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی مگر یونیورسٹی کے نتائج کے اعلان کی کوئی تاریخ مقرر نہیں ہوئی۔ اس نے فون پر نازو کو مطلع کیا۔ ”ہمارے پاسپورٹ جمع ہو گئے ہیں۔ ایک ہفتے بعد ہماری روانگی ہے۔“

”مجھے یقین ہے اس سے پہلے رزلٹ آجائے گا۔“

”یار! یہ رزلٹ خواہ مخواہ تمہارے پاؤں کی زنجیر بنا ہوا ہے۔ کیا ہوگا رزلٹ آنے سے؟ تم جانتی ہو کہ پاس ہو جاؤ گی۔ کتنے نمبر تھے، یہ تمہیں بعد میں تسنیم بھی بتا سکتی ہے۔ ڈگری تمہیں فوراً مل نہیں سکتی۔“

”مجھے تمہاری بے قراری کا اندازہ ہے۔“

”نہیں، تمہیں کوئی اندازہ نہیں ہے۔ اب شاید معاملہ الٹا ہو چکا ہے۔ تمہیں دوا کھانے سے رات بھر نیند آتی ہوگی مگر میں نہیں سو سکتا۔“

وہ ہنسی۔ ”تم بھی لے لو وہ دوا۔“

”میری دوا ہو تم۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ کیوں مجھے جرم محبت کی سزا دے رہی ہو۔ میری ہو کے بھی تم میری نہیں ہو۔ تمہیں اب آجانا چاہیے۔ دو چار دن کا ہنی مون ہم یہاں بھی منا لیں۔ ہمیں جانے کی تیاری بھی کرنی ہے۔“

اس نے جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اچھا، آج میں آجاؤں گی تمہارے پاس ہمیشہ کے لیے۔ اب خوش؟“

یہ خوشی کی خبر غنی کے دماغ میں تند شراب کا نشہ بن کے چڑھ گئی۔ وہ سارا دن آنے والی رات کے تصور میں گم رہا اور گھڑی کی سوئیوں کو دیکھتا رہا جو اس کے خیال میں اس کے صبر کو آزمانے کے لیے سست چل رہی تھیں۔ دن سے شام ہوئی اور شام سے رات۔ غنی دیدہ و دل چشم راہ کیے گیٹ پر کھڑا رہا۔ پھر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس اس کے پاس آکے ٹھہر گئیں اور نازو ٹیکسی سے اتری۔ اس کے پاس ایک فائل کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

نازو اور غنی کی شب عروسی چوبیس گھنٹے چلتی رہی۔ اس سے اگلی رات آ گئی۔ پھر صبح ہوئی تو انہوں نے آنکھیں کھول کے ایک نئی دنیا کو دیکھا جو ان کی نئی زندگی کے لیے چشم براہ تھی۔ نازو اب پہلے سے زیادہ پُراعتماد تھی۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ خوف اپنی انتہا کو پہنچ کے ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ غنی کے ساتھ جینے کے لیے بھی تیار تھی اور مرنے کے لیے بھی۔

اگلے دو دن انہوں نے سفر کی تیاری میں صرف کیے۔ انہیں بہت زیادہ سامان کی ضرورت نہیں تھی لیکن نازو گھر سے بالکل خالی ہاتھ آئی تھی۔ وہ بہت کچھ خریدنا چاہتی تھی۔ غنی نے اسے سمجھایا۔ ”پاگل، ہم جہاں جا رہے ہیں وہاں سب ملتا ہے اور یہاں سے اچھا۔ دنیا بھر سے امپورٹ ہونے والی سب سے اعلیٰ کوالٹی کے جوتے، کپڑے، زیور۔“

”وہاں مہنگے بھی تو ہوں گے۔“ نازو نے کہا۔

”یار! ایک مہینے بعد ہم دبئی آجائیں گے۔ ڈیوٹی فری شاپ شاپنگ کریں گے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ سعودی عرب میں سفارت خانے سے ملائیشیا، سنگاپور کا ویزا لگوانا زیادہ آسان ہے۔ تم فکر کیوں کرتی ہو۔ پیسا بہت ہے اور آغاجی سے اتنا ہی اور مل جائے گا۔“

”آخر کتنے ہیں تمہارے پاس؟ اور آغاجی سے مل کے کتنے ہو جائیں گے؟“

”تمہارے پاس نہیں ہمارے پاس کہو... تقریباً بائیس تیئس لاکھ بینک میں ہیں۔ آغاجی پچیس لاکھ اور دیں گے۔ زندگی گزارنے کے لیے یہ کم ہیں؟“

”کیا ہم ساری رقم ساتھ لے جائیں گے؟“

”یہاں چھوڑ سکتے ہیں لیکن کیا ضرورت ہے؟ ہم ٹریولرز چیک بنوا لیں گے۔ جہاں گئے کیش کرا لیے۔“

اسی روز ٹریول ایجنٹ نے فون پر کہا۔ ”آپ کو مبارک ہو جناب! آپ کا ویزا لگ گیا ہے۔ بکنگ کب کی ہوگی... اور سعودیہ سے جائیں گے... امارات سے یا پی آئی اے سے؟“

”میرا خیال ہے امارات... ورنہ سعودیہ۔“

”اکانومی یا بزنس۔“ ایجنٹ نے کہا۔

غنی نے اپنی نئی دلہن کی طرف دیکھا اور رئیسانہ شان سے کہا۔ ”آف کورس بزنس۔“

☆☆☆

تین دن بعد وہ دونوں احرام باندھے کراچی کے قائداعظم انٹرنیشنل ائرپورٹ پر تھے۔ اب انہیں آغاجی کا انتظار تھا۔ ان کی لاہور سے روانگی کے وقت وہ کراچی میں

تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ فلائٹ سے پہلے انہیں خدا حافظ کہنے ائرپورٹ آئیں گے تو انہیں وہ رقم بھی ادا کر دیں گے جو ان کی طرف سے غنی کے لیے جاں نثاری اور وفاداری کے ساتھ خدمت کا انعام ہے۔ دلہن کے لیے منہ دکھائی تو ان دونوں کے لیے شادی کا تحفہ... آغاجی زبان دے کر پھرنے والے نہیں تھے۔ اگر کسی وجہ سے انہیں دیر ہو جاتی اور وہ فلائٹ کے ٹائم سے پہلے نہ پہنچ پاتے، تب بھی فکر کی بات نہیں تھی۔ رقم انہیں بعد میں کہیں بھی مل جاتی۔ سعودی عرب میں یا دبئی میں یا ملائیشیا اور سنگاپور میں۔ آغاجی کے لیے ساری دنیا ایک ہی شہر تھی۔

آغاجی اچانک نمودار ہوئے۔ خلافِ توقع وہ اکیلے تھے۔ انہوں نے سیکیورٹی گارڈ کو ساتھ لانا مناسب نہیں سمجھا۔ ”سوری بیٹی! ٹریفک جام میں پھنس گیا تھا۔“

لاؤڈ اسپیکر پر ایک خوش گلو اناؤنسر نے اعلان کرنا شروع کیا۔ ”جدہ جانے والے سعودیہ ائرلائن کے وہ مسافر...“

آغاجی نے کہا۔ ”تمہاری فلائٹ کے لیے اناؤنسمنٹ ہو رہی ہے، یہ لو۔“

غنی نے خوب صورت ڈبے کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا ہے سر؟“

”کھول کے دیکھو... اور میرے سامنے اپنی بیوی کو پہنا دو۔ یہ اس کی منہ دکھائی ہے۔“

غنی نے ڈبا کھول کے بیش قیمت ہار نکالا اور نازو کو پہنا دیا۔ اس نے سلام کیا تو آغاجی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ ”اس ڈبے میں ریال ہیں اور ڈالرز۔ اس سے زیادہ جتنے کا میں نے وعدہ کیا تھا، بہتر ہے یہ ہار بھی اسی میں رکھ لو۔“

”کیا یہ میں اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں؟“

آغاجی ہنسے۔ ”کیوں نہیں، یہ کوئی جرم نہیں۔ کرنسی ڈیلر تو پیٹی بھر بھر کے لاتے ہیں۔ یہ تو بہت تھوڑی سی رقم ہے۔“

غنی نے وہ پیکٹ اپنے ہینڈ کیری میں رکھ لیا۔ آغاجی سے گلے ملا اور نازو کے ساتھ ڈیپارچر لاؤنج کی طرف چل پڑا۔ کسی دشواری کے بغیر وہ بورڈنگ کارڈ لینے میں کامیاب رہے اور اگلے اعلان کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ ڈیپارچر لاؤنج بھرا ہوا تھا۔ شیشوں کے پار غنی کو ان گنت جہاز نظر آ رہے تھے۔

نہ جانے کیوں اس وقت غنی کو اپنا کاموں کے منڈی والا گھر، محلہ... کھیت اور دکان یاد آئے۔ یہ اس کی کامیابی کے سفر کا آغاز ہونے سے پہلے کی تصویر تھی۔ کتنا صحیح اور بروقت فیصلہ کیا تھا اس نے۔ ماں باپ کے چہرے تو بہت پیچھے رہ جانے والے ماضی کی گرد میں گم ہو چکے تھے۔ اسے اپنے بھائی یاد آئے، وہ نہ جانے کہاں ہوں گے۔ شاید کسی رائس مل میں معمولی حیثیت کی نوکری کر رہے ہوں گے اور ویسے ہی کسی چھوٹے سے تاریک گھر میں قید کی زندگی گزار رہے ہوں گے جیسی وہ کئی پشتوں سے گزارتے آئے تھے۔ رتبہ ملا اسے جو وطن سے نکل گیا۔ وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا۔ اسے اپنے ماسٹر کا سنایا ہوا یہ شعر یاد آیا۔

اور اسے ممتاز یاد آگئی۔ برسوں بعد اس کی یاد نے سرگوشی میں کہا۔ ”زندگی کا نیا سفر مبارک ہو غنی! جانا تو مجھے تھا تمہارے ساتھ لیکن ساری بات قسمت کی ہے۔ جو تمہارے ساتھ جا رہی ہے اسے میرے بارے میں ضرور بتانا۔ یہ زندگی کے سفر میں تمہاری شریک ہے مگر کامیابی کے سفر میں تو میں نے ہی تمہیں سہارا دیا تھا۔ ساتھ نہ ہونے کے باوجود۔“

نازو نے اسے جھنجوڑا۔ ”چلیے اٹھیے... روانگی کا اعلان ہو رہا ہے۔“ اور وہ اٹھ کے سب مسافروں کے ساتھ جہاز کے اندر پہنچانے والے راستے پر چل پڑا۔

جب جہاز نے ٹیک آف کیا تو غنی کے دل کی عجیب حالت تھی۔ زمین سے آسمان کی جانب پرواز نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کاموں کے منڈی میں چاول کاشت کرنے والے کا بیٹا آج کہاں پہنچ گیا تھا۔ بے شک قسمت نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا لیکن باقی اس کی اپنی محنت تھی۔ سارے رسک اس نے لیے تھے اور دنیا میں کامیابی کے اصول نظرانداز نہیں کیے تھے۔ اس نے مان لیا تھا کہ دولت صرف دولت ہوتی ہے۔ ناجائز یا جائز نہیں۔ نو رسک نو گیم۔ کامیابی کے لیے اس نے زندگی بھی داؤ پر لگائی تھی اور آغاجی کا ڈپلی کیٹ بننے کا خطرہ مول لیا تھا۔ وہ مارا جا سکتا تھا۔ جیسے ان کا ڈرائیور مارا گیا تھا۔ آغاجی کا دو نمبر بننا موت کو للکارنے کے مترادف تھا کیونکہ آغاجی خود دو نمبر آدمی تھے۔ دو نمبر کام کرتے تھے۔ وہ خود بھی دو نمبر تھا۔ اس نے اپنی اور دوسروں کی شاعری ایک دو نمبر شاعر کو بیچ دی تھی۔

حد تو یہ ہے کہ اس کی شادی دو نمبر تھی۔ جعلی شناختی کارڈ پر ہوئی تھی۔ جعلی نام سے۔ ان کا یہ مقدس سفر بھی دو نمبر پاسپورٹ پر تھا۔ ان کی نیت بھی دو نمبر تھی۔ وہ عمرہ کرنے نہیں روپوش ہونے جا رہے تھے۔ وہ اپنی سوچ سے باہر نہیں آیا تھا کہ جہاز کے اترنے کا اعلان ہونے لگا۔ نازو نے درمیان میں اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اپنے خیالوں میں گم تھا۔ پھر وہ اپنے خیالوں میں کھو گئی تھی۔

آہستہ آہستہ تمام عمرہ کرنے والوں کے ساتھ وہ امیگریشن کے مراحل سے گزرنے کے لیے قطار میں کھڑے

www.paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے
اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ آنلائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں
For more details kindly visit
http://www.paksociety.com

ہو گئے۔ خواتین کے کاؤنٹر الگ تھے۔ وہ نازو کو دیکھ سکتا، تب بھی پہچان نہیں سکتا تھا۔ سب نے ایک جیسے احرام باندھ رکھے تھے اور قطار بھی بہت لمبی تھی۔

وہ اس وقت چونکا جب اسباب چیک کرنے والے نے اس سے انگریزی میں پوچھا۔ ''تم انگریزی سمجھتے ہو؟''

غنی نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''یس، کیا بات ہے؟''

''بات ابھی معلوم ہو جائے گی۔ میرے ساتھ آؤ۔'' اس کے دونوں طرف وردی والے آگئے۔

''آخر معاملہ کیا ہے؟'' غنی نے احتجاج کیا۔

''تم پر بہت سنگین الزامات ہیں۔ یہ تمہارے بیگ میں تھا جس میں تمہارا پاسپورٹ تھا۔'' پولیس آفیسر نے اسے ایک ڈبا دکھایا۔ ''کیا ہے اس میں؟''

''ایک ہار... اور کرنسی... کرنسی لے جانا کوئی جرم نہیں۔''

''یس مگر یہ بہت بڑا جرم ہے۔'' اس نے کرنسی نوٹوں کے درمیان سے ایک دوا کا پیکٹ برآمد کیا۔ ''اس میں جو کیپسول ہیں، ان میں ہیروئن ہے۔ اور یہ ریال اور ڈالر... یہ بھی دو نمبر ہیں۔ جیسے وہ ہار دو نمبر ہے۔''

امیگریشن سے فارغ ہو جانے والی نازو نے گھڑی دیکھی۔ شاید مردوں کی قطار میں زیادہ وقت لگتا ہے۔ اس نے سوچا پھر دو موٹی اور تنومند خواتین پولیس افسر نے اس کا نام پوچھا۔ ''آپ ہمارے ساتھ آئیں۔'' انہوں نے کہا۔

☆☆☆

گھڑی میں رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ نسیم کے سامنے بیٹھے ہوئے ملازمت کے امیدوار نے کہا۔ ''کیا آغاجی مصروف ہیں؟''

''مصروف؟'' نسیم نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ ''ابھی وہ آئے ہی نہیں ہیں۔ میں نے کیا آپ کو صورت دیکھنے کے لیے اور اپنی صورت دکھانے کے لیے بٹھا رکھا ہے؟''

کس قدر بدتمیز اور غیر مہذب سیکریٹری ہے۔ امیدوار نے سوچا لیکن یہ دولت مند تو صرف حسن و شباب دیکھ کے قیمت لگاتے ہیں۔ ہم جیسے ڈگریاں لیے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔

''جایئے، سیٹھ صاحب آگئے ہیں۔'' نسیم نے نظر اٹھائے بغیر کہا اور چیٹنگ میں مصروف رہی۔

جب آغاجی نے اسے طلب کیا تو اس نے گھڑی دیکھی۔ بیس منٹ میں آغاجی نے اپنا ڈپلی کیٹ رکھ لیا تھا۔ وہ اندر گئی تو امیدوار آغاجی کی پرائیویٹ لفٹ سے جا چکا تھا۔ وہ آغاجی کے سامنے بیٹھ گئی۔ ''آپ نے اسے اپائنٹ کر لیا؟''

''ظاہر ہے... ضرورت تو تھی۔''

''اس کو اپنے جیسا بنانے اور دکھانے پر بہت محنت ہوگی۔''

آغاجی نے کہا۔ ''ہاں، اب غنی جیسا بار بار تو نہیں ملتا۔ وہ تھا سو فیصد میرے جیسا۔''

''پھر بھی معاوضہ وہی دیں گے جو غنی لیتا تھا؟'' نسیم نے ناگواری کا اظہار کیا۔

''ارے بیٹا! اسے معاوضہ مت کہو۔ یہ صدقہ ہے تمہارے باپ کی جان کا۔ دیکھو نا، کالا بکرا محض اس لیے مارا جاتا ہے کہ وہ کالا ہے۔ جو میرے ہم شکل نہیں ہیں، ان بکروں کی طرح ہیں جو کالے نہیں ہیں۔ غنی بھی صدقے کا بکرا ہی تھا۔ کالے بکرے ذرا مہنگے ہوتے ہیں۔ خیر چھوڑو، اب کیا کرے گا تمہارا وہ بوائے فرینڈ...''

''وہی جو میں کہوں گی۔ یہ نازو خوامخواہ درمیان میں آگئی تھی۔ اس کا بھی ڈسپوزل ہو گیا۔ پاگل لڑکی۔ اس ڈپلی کیٹ غنی اے غنی کی شاعری پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ کتنے جھوٹ بولنے پڑے اور نازو کو سکھانے پڑے۔ خاندان کی روایات اور قبیلے سے جان کا خطرہ۔ غنی کی ایسی مت ماری گئی کہ اس نے تصدیق کی کوشش بھی نہیں کی۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''شاعر نہ سہی وہ ایکٹریس اچھی تھی۔''

''اس بے چارے کا گزشتہ جمعے سر قلم کر دیا گیا... ہیروئن اسمگل کرنے کے جرم میں۔''

''نازو کا کچھ پتا چلا ڈیڈی؟''

''وہ وہیں جیل کے مینٹل وارڈ میں ہے۔ وہ کبھی پاکستان نہیں آسکتی۔ اس کا نام پتا سب دو نمبر تھا۔''

''مجھے ان کا افسوس ضرور ہے ڈیڈی... مگر میں کیا کرتی۔''

''جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔ بقا کی جنگ میں سب جائز ہے۔ ان سب کو جو کام آجاتے ہیں، ٹشو پیپر سے زیادہ اہمیت نہ دو۔ وہ سب استعمال ہوتے ہیں یہاں۔ سیاست میں، تجارت میں، مذہب کے نام پر، زندگی کے ہر شعبے میں... کیونکہ ان کی حیثیت ہی ٹشو پیپر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ عقل کے مفلس۔''

نسیم بیزاری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''پاپا... نیند سے بُرا حال ہے میرا... آپ نے لیکچر شروع کر دیا۔''

آغاجی مسکرا کے اٹھے اور بیٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے لفٹ کا بٹن دبا دیا۔

paksociety.com